DUE DATE

Cl. No. ______ *Acc. No.* ______

Late Fine **Rs. 1.00** per day for first 15 days.
Rs. 2.00 per day after 15 days of the due date.

الرسالہ

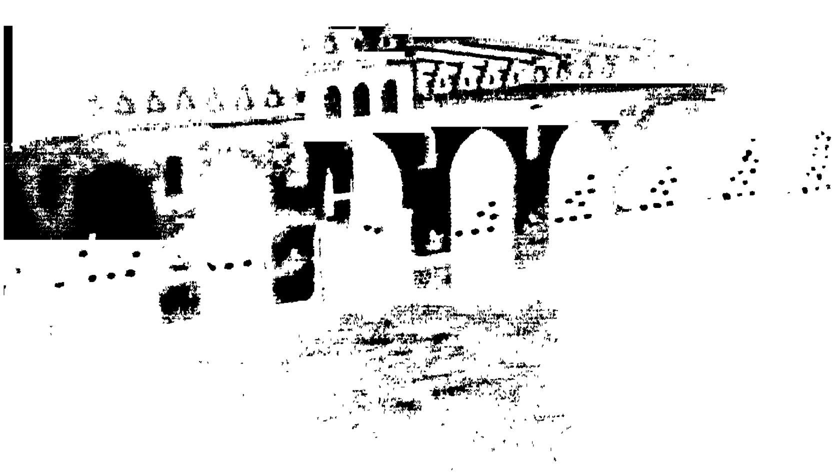
١٩

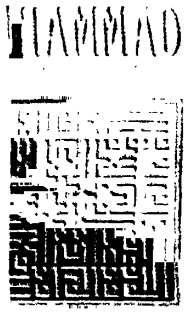
Al-Risala

January 1999 • No. 266 • Rs. 9

DEC

دشمن کے مسئلہ کو حل کرنے کی زیادہ آسان تدبیر یہ ہے کہ دشمن کو دوست بنالیا جائے۔





ze 23 5×16cm
jes 228 Rs 125



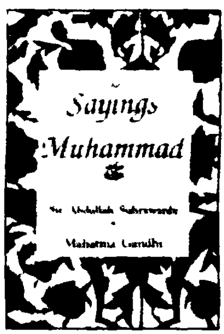
Size 14×14cm
Pages 150 Rs 95



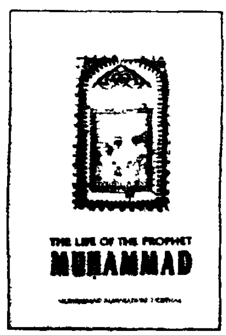
Size 22×14 5cm
Pages 255 Rs 95



12 5×19 cm
s 192 Rs 125



Size 11 5×15 cm
Pages 128 Rs 75



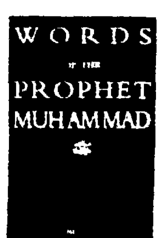
Size 11 5×15 cm
Pages 64 Rs 75



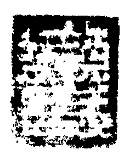
Size 12 5×19cm,
Pages 200, Rs 175



e 12 5×19cm
es 168, Rs 165



Size 11 5×15cm,
Pages 112, Rs 75



Size 11 5×15cm
Pages 92, Rs 75



Size 22×14 5cm,
Pages 96, Rs 55

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic @axcess.net.in

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, Near DVB Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

جنوری ۱۹۹۹ شمارہ نمبر ۲۶۶

فہرست — صفحہ

[redacted] روزہ کا مقصد آدمی کی روحانیت کو جگانا

اور اس کو ربانی انسان بنانا ہے۔

قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ۔۔۔ تم لوگ ربانی بنو (آل عمران ۷۹) اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رب والے یا اللہ والے بن کر زندگی گذارو۔ خود پرستی کی زندگی کو چھوڑ کر خدا پرستی کی زندگی اختیار کرو۔

دنیا میں زندگی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے اپنی خواہشوں کے زیر اثر زندگی گذارنا۔ اور دوسرا ہے خدا کی مرضی کے زیر اثر زندگی گذارنا۔ ربانی انسان وہ ہے جو خدا کو اپنا سب کچھ بنالے۔ وہ اسی کی یاد میں جیئے۔ وہ ہر معاملہ میں خدا کی مرضی کو جاننے کی کوشش کرے اور جو خدا کی مرضی ہو اس پر اپنی زندگی کو ڈھال لے۔ اس کے برعکس غیر ربانی انسان وہ ہے جو اپنے آپ میں جیتا ہو۔ جس کے لئے اس کی خواہشیں ہی سب کچھ ہوں۔ جو اپنی خواہشوں کی تکمیل کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے ہوئے ہو۔

رمضان کے مہینے کا روزہ کسی آدمی کو ربانی انسان بنانے کی تربیت ہے۔ روزہ آدمی کی ذاتی خواہشوں پر پابندی لگاتا ہے۔ روزہ یہ سبق دیتا ہے کہ اپنی ذات کے لئے جینے کے بجائے خدا کے لئے جیو۔ اپنی خواہشوں کو سب کچھ سمجھنے کے بجائے صرف خدا کو اپنا سب کچھ بنالو۔

روزہ آدمی کو ربانی انسان بنانے کی ایک سالانہ تربیت ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے دنیا اور آخرت کی کامیابیاں مقدر کی گئی ہیں۔

روزہ کیا ہے .....

روزہ اخلاقی ڈسپلن کی سالانہ تربیت ہے

نظم یا ڈسپلن ہر معاملہ میں کامیابی کے لئے ضروری ہے، خواہ وہ دنیا کا معاملہ ہو یا دین کا معاملہ۔ نظم یا ڈسپلن صحتِ کار کی ضمانت ہے۔ کسی کام کی بخوبی ادائیگی اس کے بغیر ممکن نہیں۔

اسلام میں نماز کو مقرر اوقات میں فرض کیا گیا ہے۔ روزہ اور دوسری عبادات بھی مقرر تاریخوں میں اور مقرر وقت پر ادا کی جاتی ہیں۔ یہی معاملہ تمام دینی اعمال کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظم اور ڈسپلن کے بغیر کوئی بھی اسلامی عمل صحیح طور پر ادا نہیں کیا جاسکتا۔

روزہ نظم اور ڈسپلن کی اسی اسپرٹ کو پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ رمضان کا پورا مہینہ روزہ دار کو سخت ڈسپلن کے تحت گذارنا ہوتا ہے۔ سونا اور جاگنا، کھانا اور پینا، غرض ہر مشغولیت کو ایک سخت قسم کے نظام الاوقات کے تحت انجام دینا ہوتا ہے۔ اس طرح کی ایک منظم زندگی پورے مہینہ تک جاری رہتی ہے۔ اس طرح کی ایک ماہانہ زندگی آدمی کو اس قابل بنادیتی ہے کہ وہ سال کے بقیہ مہینوں میں بھی نظم اور ڈسپلن کے تحت زندگی گذارے۔

روزہ ایک مومن کے لئے اخلاقی ڈسپلن کی سالانہ تربیت ہے۔ روزہ آدمی کے اندر یہ مزاج پیدا کرتا ہے کہ وہ دنیا میں اس طرح رہے کہ وہ ایک بااصول انسان بنا ہوا ہو۔ وہ اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے کنٹرول میں دیئے ہوئے ہو۔

روزہ خود انضباطی (سلف کنٹرول) کی مشق ہے۔ وہ ذمہ دارانہ زندگی گذارنے کی ایک سالانہ تربیت ہے۔

میزان، حدید

قرآن کی سورہ نمبر ۵۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ ۔۔۔ ہم نے اپنے رسولوں کو نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ اتارا کتاب اور ترازو، تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا اتارا جس میں بڑی قوت ہے اور لوگوں کے لئے فائدے ہیں اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے بن دیکھے، بے شک اللہ طاقت والا، زبردست ہے (الحدید ۲۵)

اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں انسان کی ہدایت کے لئے پیغمبر بھیجے۔ ان پیغمبروں کے ساتھ ایک طرف ایسی روشن نشانیاں ہوتی تھیں جو ان کے پیغمبر خدا ہونے کو ثابت کر رہی ہوں۔ دوسری طرف ان کے ساتھ خدا کی کتاب ہوتی تھی جس میں انسان کے لئے صحیح رہنمائی درج ہو۔ اب محمد ﷺ خدا کے آخری رسول ہیں اور قرآن خدا کی آخری کتاب۔ خدائی کتاب کے مطابق، انسان کی دو ذمہ داریاں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خود قسط (انصاف) پر قائم ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ حق کے لئے اٹھنے والوں کی نصرت (مدد) کرے۔ ان دو طرفہ ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے بعد ہی کوئی انسان خدا کی نظر میں اس قابل بنتا ہے کہ اس کو ابدی انعام سے سرفراز کیا جائے۔ اسی کے ساتھ خدا نے یہ کیا کہ دونوں قسم کے عمل کے لئے دنیا میں مادی مثالیں قائم کر دیں۔ یہ مادی مثالیں یہ ہیں۔ ترازو اور لوہا۔

ترازو ٹھیک اور صحیح ناپ کا ذریعہ ہے، وہ کبھی کسی چیز کو کم یا زیادہ نہیں ناپتا۔ یہی صفت انسان کے اندر اخلاق کے اعتبار سے ہونا چاہئے وہ لین دین میں یا معاملہ کرنے میں پورا پورا انصاف برتے، وہ قسط کی روش سے ذرا بھی نہ ہٹے۔ اس کا کیریکٹر ترازو کی طرح عادلانہ کیریکٹر بن جائے۔

اسی کے ساتھ دوسری مطلوب چیز یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ حق و صداقت کا ساتھ دے۔ جب بھی کچھ لوگ کسی امر حق کے لئے اٹھیں تو وہ ان کا قابل اعتماد مددگار بن جائے۔ اس معاملہ میں وہ لوہے جیسی پختگی کا ثبوت دے۔ حق کی نصرت کے لئے وہ لوہا پرش بن جائے۔ وہ حدیدی کردار کے ساتھ حق کی حمایت کرے۔

بامعنی زندگی

زندگی ہر ایک کو ملتی ہے۔ مگر کوئی بے معنی زندگی گذار کر مر جاتا ہے۔ اور کوئی شخص اپنی زندگی کو بامعنی بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ دو انسانوں میں یہ فرق کیسے ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام انسان فطرت سے یکساں صلاحیت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ پھر وہ کیا چیز ہے جو ایک ہی قسم کے دو انسانوں میں اتنا بڑا فرق پیدا کر دیتی ہے۔ اس کا بنیادی سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے شعور کا استعمال یا عدم استعمال۔

ایک انسان وہ ہے جو اپنے شعور کو کام میں نہ لائے بلکہ دوسروں کے زیر اثر عمل کرے۔ بلکہ وہ حالات کا معمول بن کر زندگی گذارے۔ اس کے گرد و پیش کے احوال اس کو جیسا بننے کے لئے کہیں وہ ویسا ہی بنتا چلا جائے۔ دنیا اس کو جس سانچے میں ڈھالے، وہ اسی میں ڈھلتا چلا جائے، خواہ وہ سانچہ صحیح ہو یا غلط۔

یہ وہ انسان ہے جس کی زندگی معنویت سے خالی رہی۔ وہ ایک حیوان کی طرح جیا اور ایک حیوان کی طرح مر گیا۔ فطرت نے اس کو ایک بامعنی وجود کے ساتھ دنیا میں بھیجا تھا، مگر جب وہ دنیا سے رخصت ہوا تو صرف ایک بے معنی وجود کی حیثیت رکھتا تھا۔

دوسرا انسان وہ ہے جس نے اپنے شعور کو زندہ رکھا۔ جس نے اپنے عقل کو استعمال کیا۔ اس نے آزادانہ غور و فکر کے تحت اپنے آپ کو بھی جانا اور دنیا کو بھی۔ اس نے صحیح اور غلط میں فرق کیا۔ اس نے اخلاق انسانی کے ابدی اصولوں کی پابندی کی۔ اس نے ایک بااصول اور ایک باکردار انسان کی زندگی گذاری۔ وہ اسی پر جیا اور اسی پر مرا۔ یہ دوسرے قسم کا انسان ہی حقیقی انسان ہے۔ اس کی زندگی بھی بامعنی تھی اور اس کی موت بھی بامعنی۔

جلدی نہیں

جب میں نوجوان تھا اور یوپی کے ایک گاؤں میں رہتا تھا تو مجھے یہ شوق ہوا کہ میرے گھر کے آنگن میں آم کا ایک درخت ہو۔ اب ایک صورت یہ تھی کہ میں آم کا ایک چھوٹا پودا اپنے آنگن میں لگاؤں اور سالوں تک اس کے بڑھنے کا انتظار کروں۔ مگر نوجوانی کے جوش میں میں اس انتظار کے لئے تیار نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اچانک ہی میرے گھر میں آم کا ایک بڑا سا درخت دکھائی دینے لگے۔

وہاں میرا آموں کا باغ تھا۔ اس میں پانچ سال کا ایک درخت تھا جو بڑھتے بڑھتے انسانی قد سے اونچا ہو چکا تھا۔ اور خوب ہرا بھرا تھا۔ میں نے کئی مزدور اس پر لگا دیئے۔ وہ دن بھر اس کی کھودائی کرتے رہے آخر کار شام کو وہ درخت ایک بڑی چارپائی پر رکھ کر گھر کے اندر لایا گیا اور آنگن میں گڈھا کھود کر اس کو وہاں لگا دیا گیا۔

میں بہت خوش تھا کہ میں نے بڑا درخت لگا کر پانچ سال کا سفر ایک دن میں طے کر لیا ہے۔ مگر رات کو سو کر جب میں صبح کو اٹھا تو درخت کے پتے مرجھائے ہوئے نظر آئے۔ لیکن ابھی میں مایوس نہیں ہوا۔ میں نے اس میں خوب پانی ڈالا میں نے سمجھا کہ پانی پا کر اس کے پتے ہرے ہو جائیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اگلے دن اس کے پتے اور زیادہ مرجھا گئے۔ یہاں تک کہ چند دنوں میں وہ درخت بالکل سوکھ گیا۔

نوجوانی کی عمر کا یہ تجربہ میرے لئے بہت سخت ثابت ہوا۔ وہ میرے لئے زندگی بھر کا تجربہ بن گیا۔ اس سے میرے اندر گہرائی کے ساتھ یہ سوچ پیدا ہوئی کہ زندگی میں کوئی شارٹ کٹ نہیں۔ زندگی ایک لمبا سفر ہے اور اس کو ہر حال میں لمبے دنوں ہی میں پورا کرنا ہے۔

اس واقعہ کے بعد مجھ پر یہ کھلا کہ دنیا میں انسان کا معاملہ ففٹی ففٹی جیسا ہے۔ یعنی دنیا میں جو کام بھی کرنا ہو اس میں ایک حصہ انسان کا ہوتا ہے اور دوسرا حصہ نیچر کا۔ دنیا میں ہر واقعہ انسان اور نیچر دونوں کی مطابقت سے پورا ہوتا ہے۔ انسان اگر جلدی چاہے اور نیچر کا طریقہ جلدی کا طریقہ نہ ہو تو ایسی حالت میں محض انسان کے چاہنے سے کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ اس واقعہ نے مجھے ہمیشہ کے لئے اس معاملہ میں محتاط بنادیا۔

انسان اور نیچر کی مثال کاگ وہیل جیسی ہے۔ کاگ وہیل میں دونوں کاگ ایک ساتھ چلتے ہیں۔ اگر ایک کاگ اپنی رفتار کو دوسرے کاگ سے تیز کرنا چاہے تو سارا نظام بگڑ کر رہ جائے گا۔ انسان کا کاگ کمزور ہے اور نیچر کا کاگ طاقت ور۔ ایسی حالت میں اگر انسان اپنی کاگ کی رفتار بڑھانا چاہے تو اس کا انجام صرف یہ ہوگا کہ انسان کا کاگ ٹوٹ جائے۔ کیونکہ نیچر کا کاگ تو اتنا طاقتور ہے کہ وہ کسی حال میں ٹوٹنے والا نہیں۔

درخت کے معاملہ میں مجھ کو جو تجربہ ہوا، وہ میری زندگی کا آخری تجربہ بن گیا۔ اس کے بعد پھر میں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ جو کام دھیرے دھیرے ہونے والا ہو اس کو اچانک کرنا چاہوں۔ اس کے بعد ہر کام میں میں یہ سوچنے لگا کہ اس کا حقیقی اسٹارٹنگ پوائنٹ کیا ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں آپ درمیان سے یا آخر سے اپنا سفر شروع نہیں کر سکتے۔ آپ کو ہر حال میں وہیں سے اپنا سفر شروع کرنا ہے جہاں سے نیچر کے مطابق وہ شروع ہوتا ہے۔

شاک ٹریٹمنٹ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے (لقد خلقنا
الانسان فی کبد) اسی طرح قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ بے شک انسان گھاٹے میں ہے
ان الا نسان لفی خسر) اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں انسان کا کیس لازمی طور پر
سران کا کیس ہے۔ یہ خود خالق کا مقدر کیا ہوا ہے، اس لئے یہ ناممکن ہے کہ کوئی انسان اس
سے بچ سکے۔

اب سوال یہ ہے کہ گھاٹے کے اس معاملہ میں نفع کا پہلو کیا ہے۔ غور کرنے سے
علوم ہوتا ہے کہ وہ اس کا روحانی پہلو ہے۔ عملی اعتبار سے اس دنیا میں ہر انسان کو نقصان
ر تباہی سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ہر انسان کے لئے لازمی طور پر یہ مقدر ہے کہ وہ غلطیاں
رے۔ اب کامیاب وہ ہے جس کے اندر ان تلخ تجربات کے بعد خود احتسابی کا جذبہ جاگے۔
واپنے آپ پر نظر ثانی کر کے زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

خود احتسابی کا یہ تعمیری عمل صرف اس انسان کے اندر جاری ہوتا ہے جو اعتراف پر
اضی ہو۔ جو واقعات کا بے لاگ جائزہ لے اور پھر اپنی کوتاہیوں کا کھلے طور پر اعتراف کرے۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس دنیا میں آنے والا ہر آدمی مریض ہے۔
ندگی کے تجربات اسی فطری بیماری کو دور کرنے کے لئے شاک ٹریٹمنٹ کی حیثیت رکھتے
ہیں۔ ہر آدمی گویا ایک مریض ذہن ہے۔ کامیاب وہ ہے جس کا خاتمہ اس طرح ہو کہ وہ
پنے مریض ذہن کی اصلاح کر کے اس کو ایک صحت مند ذہن بنا سکا ہو۔ ایسے ہی لوگ
موت کے بعد والی دنیا میں کامیاب زندگی کے حق دار ہوں گے۔

فطرت سے انحراف

قرآن (النساء ۱۱۹) میں بتایا گیا ہے کہ آدم کو سجدہ نہ کرنے پر جب اللہ تعالی نے شیطان کو نکالا تو اس نے کہا کہ میں آدم کی ذریت کو گمراہ کروں گا۔ اس سلسلہ میں اس نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ۔۔۔ اور میں ان کو حکم دوں گا تو وہ خدا کی بناوٹ کو بدل دیں گے (ولامرنهم فليغيرن خلق الله)انسان کو گمراہ کرنے کے لئے شیطان کا جو طریقہ ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ انسان کی سوچ کو فطرت کے راستہ سے ہٹا دے۔ لوگ فطرت کے اصولوں کو چھوڑ کر خود ساختہ اصولوں پر زندگی کی تشکیل کرنے لگیں۔ اسی کو یہاں تغییر خلق کہا گیا ہے۔

اس تغییر خلق کی بہت سی صورتیں تاریخ میں ملتی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں اس کی ایک مثال مغرب کا وہ نظریہ ہے جو عورت اور مرد کے تعلق کے بارے میں قائم کیا گیا ہے۔ فطرت کے مقرر اصول کے مطابق، عورت اور مرد کے درمیان صحیح ازدواجی تعلق یہ ہے کہ اس کو نکاح کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔ مگر جدید مغربی تہذیب نے اس کو نکاح کے بجائے محبت (love) کی بنیاد پر قائم کر دیا۔ یعنی عورت اور مرد کے درمیان ازدواجی تعلق کے لئے صرف محبت کافی ہے، نکاح کی کوئی ضرورت نہیں۔

فطرت کے نقشہ میں یہ تبدیلی اتنی سنگین تھی کہ اس نے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو فساد اور بگاڑ سے بھر دیا۔ عورت اور مرد کا رشتہ تقدس پر قائم نہ رہا بلکہ صرف مسرت (pleasure) پر قائم ہو گیا۔ انسانی تعلقات میں ساری اہمیت اس کے مادی پہلو کو حاصل ہو گئی۔ عورت اور مرد حیوانوں کی مانند زندگی گزارنے لگے۔ حرام وحلال کی حد

بندی کا خاتمہ ہو گیا۔ لطیف احساسات ی جگہ صرف لذت اندوزی، زندگی کا مرکز د محور بن گیا۔

یہ تبدیلی اتنی دوررس تھی کہ اس کے نتیجہ میں اقدار کا نظام (value system) پوری طرح بدل گیا۔ انسانی اخلاق کسی اعلیٰ اصول کا پابند نہ رہا بلکہ صرف مادی تقاضوں کا پابند بن گیا۔

مغربی تہذیب کی تمام غلطیوں میں شاید سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے عورت اور مرد دونوں کو فطرت کے راستہ سے ہٹادیا۔ فطرت کے مطابق، عورت اور مرد کے درمیان ازدواجی تعلق کی واحد درست بنیاد نکاح ہے۔ لیکن مغربی تہذیب نے اس تعلق کو نکاح کے بجائے محبت (بالفاظ دیگر شہوت) کی بنیاد پر قائم کردیا۔ اس تبدیلی کا بھیانک نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی معاشرت کا یہ شعبہ فساد کا شکار ہو کر رہ گیا۔

محبت ایک جذباتی کیفیت ہے، جب کہ نکاح ایک ذمہ داری کا عنوان ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان خدا نے طرفین کے لئے ایک فطری کشش رکھی ہے۔ اس بنا پر جب ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت آزادانہ طور پر باہم ملیں تو دونوں اپنے دل میں ایک دوسرے کے لئے کشش محسوس کرتے ہیں۔ اسی کشش کو مغربی تہذیب میں محبت کا نام دیا گیا ہے۔ حالانکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ صرف شہوت ہوتی ہے۔ اس طرح مغربی تہذیب میں شہوت کو محبت کا خوبصورت نام دے کر جنسی بے راہ روی کو جائز قرار دے دیا گیا۔ نکاح کا طریقہ طرفین پر لازم قرار دیتا ہے کہ وہ اس فطری جذبہ کو فطرت کی حد میں رکھیں۔ وہ محبت کو ذمہ داری کے تابع بنائیں نہ کہ ذمہ داری کو محبت کے تابع کردیں۔ جس کا نتیجہ بدترین سماجی فساد ہے۔

خود پسندی

عورت اور مرد دونوں کی مشترک کمزوری یہ ہے کہ دونوں پیدائشی طور پر خود پسند ہوتے ہیں۔ عورت کی خود پسندی اس کو ذاتی آرائش کی طرف لے جاتی ہے۔ جس کا اشارہ قرآن کی سورہ الزخرف (آیت ۱۸) میں کیا گیا ہے۔ مرد کی خود پسندی اس کے اندر فخر اور عظمت کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔ جس کا ذکر قرآن کی سورہ النساء (آیت ۳۶) میں ملتا ہے۔

عورت اور مرد کے اندر یہ جذبات پیدائشی طور پر موجود ہوتے ہیں۔ مگر وہ صرف آزمائش کے لئے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں عورت اور مرد دونوں کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ اس آزمائش میں جو کامیاب ہو وہی کامیاب ہے، اور جو ناکام ہو وہی ناکام۔

عورت کا رجحان فطری طور پر آرائش کی طرف ہوتا ہے۔ مگر عورت کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اس جذبہ پر کنٹرول کرتے ہوئے اپنے آپ کو سادگی پسند بنائے۔ وہ نمائشی چیزوں سے اپنے آپ کو بچا کر مفید عملی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔

اسی طرح مرد کے اندر اگرچہ فطری طور پر خود پسندی کا جذبہ ہے مگر وہ اس لئے نہیں ہے کہ آدمی اس کا اظہار کرتا پھرے۔ کامیاب انسان وہ ہے جو خود پسندی اور فخر کے اس جذبہ کو کنٹرول کرے۔ وہ فخر و مباہات کے بجائے تواضع اور انسانی خدمت کو اپنا دستور حیات بنائے۔ خدا اپنی دنیا میں ایسے عورت اور مرد دیکھنا چاہتا ہے جو ذاتی نمائش یا ذاتی فخر کے جذبات سے بلند ہوں۔ وہ اپنے لئے جینے کے بجائے دوسروں کے لئے جئیں۔ وہ خود پسندی کے بجائے خدا پرستی کو اپنا شیوہ بنائیں۔ وہ ذاتی خول سے باہر نکل کر فطرت کے آفاقی نقشہ میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کریں۔

وقت کی پابندی

اسلام میں جو عبادتیں فرض کی گئی ہیں۔ وہ سب کی سب وقت اور مدت کے ساتھ فرض کی گئی ہیں۔ مثلاً روزہ اور حج کی فرضیت سال کے مخصوص مہینوں میں ہے۔ ایسا نہیں کیا گیا کہ جب چاہے روزہ رکھ لو اور جب چاہے حج ادا کرلو۔ نماز کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ بے شک نماز اہل ایمان پر مقرر وقت کے ساتھ فرض ہے (ان الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا) النساء ۱۰۳

نماز کو متعین وقت پر ادا کرنے کا حکم کوئی سادہ بات نہیں، یہ نمازیوں کی پوری زندگی کی تنظیم و تربیت ہے ۔ حدیث میں آیا ہے کہ مسجدیں متقیوں کا گھر ہیں (المساجد بیوت المتقین) دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسجد تقویٰ کی تربیت کا مرکز ہے۔ اس تربیت کا ایک اہم جزء بلا شبہ وقت کی پابندی ہے۔ اہل ایمان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنی عبادتوں کو ان کے مقرر وقت پر ادا کریں۔ اور اسی طرح اپنی زندگی کے تمام معاملات کو نظم وضبط اور ڈسپلن کے اصول پر قائم کریں۔

اہل ایمان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ گھڑی کے مطابق اپنے رات اور دن کا نقشہ بنائیں۔ ہر کام کو اس کے متعین وقت پر ادا کریں۔ جب بھی کوئی وعدہ کریں تو ٹھیک وقت پر اس کو پورا کریں۔ ہر وہ معاملہ جس کا تعلق وقت سے ہو اس کو وہ عین اس کے مقرر وقت پر انجام دیں۔ عبادتوں کو وقت کے ساتھ باندھ کر یہ سبق دیا گیا ہے کہ مومن کی پوری زندگی اوقات کے نظام کے ساتھ بندھی ہوئی ہونی چاہئے۔ عام زندگی میں وقت کی پابندی نہ کرنا بھی اتنا ہی غیر اسلامی ہے جتنا نماز کے معاملہ میں وقت کی پابندی نہ کرنا۔

غلو نہیں

قرآن (النساء ۱۷۱) میں اہل کتاب کے تذکرہ کے ذیل میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم لوگ اپنے دین میں غلو نہ کرو (لاتغلوا فی دینکم) یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے کہ تم لوگ دین میں غلو سے بچو کیوں کہ پچھلی امتیں دین میں غلو کی وجہ سے ہلاک ہو گئیں۔ (ایاکم والغلو فی الدین فانما ھلك من کان قبلکم بالغلو فی الدین) مسند احمد بن حنبل ۱/ ۲۱۵

غلو کا مطلب ہے زیادہ ہونا، حد سے تجاوز کرنا۔ حدیث کے مطابق، ہر قسم کے معاملات میں توسط اور اعتدال کی راہ ہی درست راہ ہے۔ اعتدال یا میانہ روی کا طریقہ ہمیشہ کامیابی کی طرف لے جاتا ہے اور غلو کا طریقہ ہمیشہ نقصان اور ناکامی کی طرف۔ یہ خود فطرت کا قانون ہے۔ اسی لئے عالمی سطح پر اس کا اعتراف کیا گیا ہے۔ انگریزی کا ایک مقولہ ہے کہ زیادتی ہر چیز میں بری ہے:

an excess of everything is bad

غلو کا تعلق ہر معاملہ سے ہے۔ مثلاً عقیدہ میں پختہ ہونا بہت اچھی بات ہے مگر عقیدہ کے کھلے اظہار میں اگر جان کا خطرہ ہو تو ایسی حالت میں اپنی جان بچانے کے لئے اخفا کا حکم دیا گیا۔ نماز اور روزہ، ذکر اور تلاوتِ قرآن، سب مطلوب اعمال ہیں مگر ان کی غیر معتدل کثرت مطلوب نہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بلاشبہ ضروری اعمال میں سے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص اس کو تشدد کی حد تک لے جائے تو وہ درست نہ ہوگا۔

یہی معاملہ اخلاقی اصولوں کا بھی ہے۔ مثلاً خود اعتمادی ایک اعلیٰ اخلاقی صفت ہے۔

لیکن خود اعتمادی اگر کسی کو غیر حکیمانہ اقدام تک لے جائے تو وہ پسندیدہ نہ ہوگا۔ عزتِ نفس اور خودداری بلاشبہ پسندیدہ اعمال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر عزتِ نفس کسی کو اس حد تک لے جائے کہ وہ اس کے لئے اپنی غلطی کے اعتراف میں رکاوٹ بن جائے تو وہ بھلائی نہیں رہے گی بلکہ ایک برائی بن جائے گی۔

اسی طرح یہ ایک اچھی صفت ہے کہ آدمی کسی کی مدد نہ لے، وہ کسی کا احسان لینا گوارہ نہ کرے۔ وہ اپنی کفالت آپ کرنا چاہے۔ لیکن کسی کا یہ مزاج اگر اس کے اندر فخر اور بڑائی کا جذبہ پیدا کرنے کا سبب بن جائے تو یہ اس کے حق میں ایک بری عادت ہوگی نہ کہ کوئی اچھی عادت۔

آدمی کی یہ کمزوری ہے کہ کسی چیز میں کوئی امتیازی پہلو دیکھتا ہے تو اس کے بارے میں مبالغہ آمیز تصور قائم کرلیتا ہے۔ وہ اس کا مقام متعین کرنے میں حد سے آگے نکل جاتا ہے اسی کا نام غلو ہے۔ شرک اور شخصیت پرستی کی تمام قسمیں اصلاً اسی غلو کی پیداوار ہیں۔

دین میں غلو یہ ہے کہ دین میں کسی چیز کا جو درجہ ہے، اس کو اس کے واقعی درجہ پر نہ رکھا جائے۔ بلکہ اس کو بڑھا کر زیادہ بڑا درجہ دینے کی کوشش کی جائے۔۔۔ اللہ اپنے ایک بندے کو باپ کے بغیر پیدا کرے تو کہہ دیا جائے کہ یہ خدا کا بیٹا ہے۔ اللہ کسی کو کوئی بڑا مرتبہ دیدے تو سمجھ لیا جائے کہ وہ کوئی مافوق شخصیت ہے اور بشری غلطیوں سے پاک ہے۔ دنیا کی چمک دمک سے بچنے کی تاکید کی جائے تو اس کو بڑھا چڑھا کر ترک دنیا تک پہنچا دیا جائے زندگی کے کسی پہلو کے بارے میں کچھ احکام دیئے جائیں تو اس میں مبالغہ کرکے اسی کی بنیاد پر ایک پورا دینی فلسفہ بنا دیا جائے۔

اس قسم کی تمام صورتیں جن میں کسی دینی تعلیم کو اس کے واقعی مقام سے بڑھا کر مبالغہ آمیز درجہ دیا جائے تو وہ غلو کی فہرست میں شامل ہوگا۔

حکمتِ نبوی

پیغمبر اسلام ﷺ کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ آپ صاحب حکمت تھے اور لوگوں کو حکیمانہ روش اختیار کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ اس سلسلہ میں آپ کے بہت سے اقوال حدیث کی کتابوں میں آئے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ نے فرمایا: لاحسد الا فی اثنتین رجل آتاه الله مالا فسلطه علی هلکته فی الحق ،واخر اتاه الله حکمة فهو یقضی بها ویعلمها (فتح الباری ،بشرح صحیح البخاری ۱۲۸/۱۳)

یعنی حسد نہیں سوا دو قسم کے آدمیوں پر۔ ایک وہ آدمی جس کو اللہ نے مال دیا تو وہ اس کو حق کے راستہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔ اور دوسرا آدمی وہ جس کو اللہ نے حکمت دی تو وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور اس کی تعلیم دیتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور کہا کہ اے اللہ اس کو حکمت عطا فرما (ضمنی النبی ﷺ الی صدره وقال اللهم علمه الحکمة)فتح الباری ۱۲۶/۷

اسی طرح اور بہت سی روایتیں ہیں جن سے حکمت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نعم المجلس مجلس ینشر فیه الحکمة (الدارمی مقدمه) یعنی کیا ہی اچھی ہے وہ مجلس جس میں حکمت کی بات کی جائے۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ **لیس هدیة افضل من کلمة حکمة (الدارمی ، مقدمه)** یعنی حکمت کی بات سے زیادہ افضل کوئی تحفہ نہیں۔

حکمت کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کی بابت یہ تعلیم دی گئی کہ دوسری قوموں میں

اگر کوئی حکمت کی چیز ملے تو اس کو لینے سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: الکلمة الحکمة ضالة المومن حیث وجدھا فھو احق بھا (الترمذی، کتاب العلم) یعنی حکمت کی بات مومن کا گم شدہ سرمایہ ہے وہ جہاں اس کو پائے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔

بعض روایت کے مطابق، حکمت اور تفقہ کی اہمیت عبادت سے بھی زیادہ ہے۔ چنانچہ الترمذی اور ابن ماجہ میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد (مشکاۃ المصابیح ۱/۷۵) یعنی ایک فقیہ، شیطان کے اوپر ہزار عابدوں سے بھی زیادہ بھاری ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی پوری زندگی حکمت کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ نبوت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے آپ نے ہر موقع پر اور ہر مرحلہ میں حکمت کا طریقہ اختیار فرمایا۔ یہاں اس سلسلہ میں آپ کی زندگی سے چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

نزاع کے موقع پر

پیغمبر اسلام ﷺ کی عمر جب ۳۵ سال تھی اس وقت مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا۔ کعبہ کی عمارت بعض اسباب سے منہدم ہو گئی۔ اس کے بعد قریش کے لوگوں نے اس کی نئی تعمیر کی۔ اس دوران یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ حجر اسود کو کون اٹھائے اور اس کو دوبارہ اس کی جگہ پر کعبہ کی دیوار میں نصب کرے۔ یہ چونکہ فضیلت کا ایک معاملہ تھا، ہر ایک یہ چاہنے لگا کہ وہی اس کو اٹھا کر نصب کرے اور اس شرف کا مالک بنے۔

اس سوال پر قریش کے لوگوں میں کئی دن تک جھگڑا جاری رہا اور کوئی اتفاقی فارمولا طے نہ ہو سکا آخر کار قریش کے ایک بزرگ کی تجویز کے مطابق وہ اس پر راضی ہوئے کہ

کل صبح کو جو آدمی سب سے پہلے کعبہ میں داخل ہو، وہی اس مسئلہ کا فیصلہ کرے اور تمام لوگ اس کے فیصلہ کو مان لیں۔ اگلی صبح کو جب لوگ دوبارہ کعبہ میں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ کعبہ میں داخل ہونے والے سب سے پہلے شخص رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ہر ایک نے بیک زبان کہا: هذا الامين رضينا هذا محمد (سیرت ابن ہشام ۱/ ۲۱۴) یعنی یہ تو محمد الامین ہیں، ہم ان کے فیصلہ پر راضی ہیں۔

رسول اللہ نے لوگوں سے کہا کہ ایک چادر لے آؤ۔ وہ لوگ چادر لائے تو آپ نے اس کو زمین پر پھیلایا اور حجر اسود کو اٹھا کر اس کے اوپر رکھ دیا۔ پھر آپ نے لوگوں سے کہا کہ تم سب لوگ چادر کے کناروں کو پکڑو اور اس کو اٹھا کر کعبہ کی دیوار کے پاس لے چلو۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر آپ نے حجر اسود کو چادر سے اٹھایا اور اس کو کعبہ کی دیوار میں نصب کر دیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ عمل ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نزاعی معاملہ کو کس طرح خوش اسلوبی کے ساتھ طے کیا جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ حکیمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے ہر ایک کو اس میں شریک کر لیا جائے۔ اس طرح کا معاملہ لوگوں کے لئے اکثر وقار کا سوال بن جاتا ہے۔ اگر حسن تدبیر سے لوگوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ ان کا وقار محفوظ ہے تو مسئلہ کو حل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو گی۔

آغاز کار

پیغمبر اسلام ﷺ کو جب مکہ میں نبوت ملی تو آپ نے اپنے عمل کا یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ آپ لوگوں کے پاس جاتے اور ان سے کہتے کہ اے لوگو، کہو کہ ایک اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں، تم فلاح پاؤ گے (ايها الناس قولوا لا اله الا الله تفلحوا) یعنی تم لوگ شرک کو

چھوڑدو اور ایک خدا کی پرستش کا طریقہ اختیار کرو، تم فلاح پاؤ گے۔

اس وقت کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ اب ایک صورت یہ تھی کہ کعبہ کو بتوں سے پاک کر کے اس کو توحید کے مرکز کے طور پر بنایا جاتا۔ مگر اس وقت وہ عملاً شرک وبت پرستی کا مرکز بن گیا تھا۔ ان حالات میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے دو مختلف راستے تھے۔ ایک یہ کہ کعبہ سے بتوں کو نکال کر وہاں دوبارہ توحید کا ماحول قائم کریں اور اس کو مرکز بنا کر اپنی موحدانہ تحریک چلائیں۔

ایک صورت قولی دعوت سے آغاز کرنے کی تھی۔ اور دوسری صورت عملی اقدام سے آغاز کرنے کی۔ جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے، آپ نے عملی اقدام سے مکمل طور پر پرہیز کیا، اور صرف قولی دعوت کے نہج پر مکہ میں اپنا پیغمبرانہ مشن جاری فرمایا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت یا اسلامی تحریک کا صحیح پیغمبرانہ طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلے پر امن فکری مہم کے ذریعہ لوگوں کی سوچ اور کردار میں تبدیلی لائی جائے۔ یہ ابتدائی کام جب قابل لحاظ حد تک انجام پا جائے، اس کے بعد حسب حالات عملی اقدام کا آغاز کیا جائے۔

توہین کو برداشت کرنا

مشہور سیرت نگار ابن اسحٰق بتاتے ہیں کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کا نام مذمم رکھا تھا۔ پھر وہ آپ کا سب وشتم کرتے تھے۔ اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھیوں سے فرماتے تھے کہ کیا تم کو اس پر تعجب نہیں کہ اللہ نے کس طرح مجھ کو قریش کی ایذارسانی سے بچالیا۔ وہ سب وشتم کرتے ہیں اور ایک مذمم شخص کی ہجو کرتے ہیں اور میں محمد ہوں۔

وكانت قريش انما تسمى رسول الله ﷺ مذمما ثم يسبونه فكان رسول الله ﷺ يقول: "الا تعجبون لما صرف الله عنى من اذى قريش يسبون ويهجون مذمما وانا محمد" (سيرت ابن هشان ۱/ ۳۷۹)

پیغمبر اسلام ﷺ کا اصل نام محمد تھا جس کا مطلب ہے تعریف کیا ہوا۔ مکی دور میں جب قریش کو آپ کے ساتھ عناد پیدا ہوا تو انھیں پسند نہیں آیا کہ وہ آپؐ کو محمد (تعریف کیا ہوا) جیسے نام سے پکاریں۔ انھوں نے اپنے جذبہ عناد کی تسکین کے لئے بطور خود آپ کا نام مذمم رکھ دیا جس کے معنی ہیں مذمت کیا ہوا۔ قریش جب آپ کو برا بھلا کہتے تو وہ آپ کے لئے محمد کا لفظ استعمال نہ کرتے بلکہ وہ مذمم کا لفظ بول کر آپ کو برا بتاتے۔ حتی کہ ابولہب کی بیوی ام جمیل نے خود آپ کے سامنے آکر کہا: **مذمما عصينا** (صفحہ ۳۷۹) یعنی یہ مذمم ہیں اور ہم ان کو نہیں مانتے۔

یہ بلاشبہ ایک اشتعال انگیزی تھی اور آپ کی توہین بھی۔ لیکن پیغمبر اسلام نے ایک خوبصورت جواب دے کر اس کو نظر انداز کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ مذمم کی سب وشتم کرتے ہیں۔ مگر ان کی سب وشتم میرے اوپر پڑنے والی نہیں کیوں کہ میرا نام محمد ہے نہ کہ مذمم۔

پیغمبر اسلام ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو یہاں عبداللہ بن ابی آپ کا شدید مخالف بن گیا۔ اس نے اگرچہ اسلام قبول کر لیا تھا مگر حسد کے جذبہ کے تحت وہ آپ کا شدید مخالف بن گیا۔ آپ کی توہین کرنا، آپ کا سب وشتم کرنا اور آپ کے خلاف بری باتیں پھیلانا اس کا سب سے بڑا مشغلہ بن گیا۔ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ وہ سب سے بڑا شاتم رسول تھا۔ حضرت عمر فاروق نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کو قتل

کردوں۔ آپ نے فرمایا: **دعه لا یتحدث الناس ان محمدا یقتل اصحابه.** (فتح الباری ۸/ ۵۲۰) یعنی اس کو چھوڑ دو۔ لوگ یہ نہ کہیں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔

اس واقعہ سے پیغمبر اسلام ﷺ کا ایک خاص اسوہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ...... توہین کو برداشت کرلو۔ کیونکہ اگر تم نے توہین کو برداشت نہ کیا تو اس سے بھی زیادہ بڑی برائی سامنے آئے گی، اور وہ خدا کے دین کی بدنامی ہے۔

قبل از وقت اقدام نہیں

پیغمبر اسلام ﷺ تقریباً ۱۳ سال تک مکہ میں رہے یہاں کی اکثریت آپ کی مخالف بنی رہی۔ انھوں نے ہر طرح آپ کو ستایا۔ تاہم آپ کے دعوتی جدوجہد کے نتیجہ میں وہاں کے تقریباً دوسو مرد اور عورت اسلام میں داخل ہوگئے۔ یہ لوگ بار بار آپ سے یہ کہتے کہ ہم ظلم کے خلاف جہاد کریں گے۔ مگر آپ ہمیشہ انھیں صبر کی تلقین کرتے رہے۔ مثلاً حضرت عمر فاروق نے قریش کے مظالم کے خلاف جہاد کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا: **یا عمر انا قلیل** (سیرت ابن کثیر ۱/ ٤٤١) یعنی اے عمر ہم تھوڑے ہیں۔

مکی دور کے آخر میں مدینہ کے تقریباً دوسو آدمی اسلام میں داخل ہوگئے۔ ان لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ مکہ کے لوگ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو ظلم وزیادتی کا نشانہ بنارہے ہیں تو انھوں نے بھی کہا کہ ہم کو ان ظالموں کے خلاف لڑنے کی اجازت دیجئے مگر ان سے بھی آپ نے یہی فرمایا کہ صبر کرو کیوں کہ مجھے قتال کی اجازت نہیں دی گئی۔ (**اصبروا فانی لم اومر بالقتال**)

پیغمبر اسلام ﷺ نے ہر قسم کے ظلم وزیادتی کے باوجود تقریباً ۱۵ سال تک یکطرفہ

طور پر صبر و برداشت کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کے بعد پہلی بار آپ غزوۂ بدر کے موقعہ پر اپنے اصحاب کو لیکر دشمنوں سے مقابلے کے لئے نکلے۔ یہ بھی آپ نے اس وقت کیا جب کہ اللہ تعالی کی طرف سے یہ کھلا وعدہ آگیا کہ آسمان سے فرشتے تمہاری مدد کے لئے آئیں گے۔ (الانفال۹)

پیغمبر اسلام ﷺ کا طریقہ یہ نہیں کہ جب بھی کوئی ظلم کرے تو فوراً اس کے خلاف کارروائی شروع کر دی جائے۔ آپ کی سنت یہ ہے کہ ظلم کے باوجود صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ عملی اقدام صرف اس وقت کیا جائے جب کہ اس کا نتیجہ خیز ہونا یقینی بن گیا ہو۔

مقام نزاع سے ہٹ جانا

پیغمبر اسلام ﷺ نبوت کے بعد تقریباً ۱۳ سال تک مکہ میں رہے۔ کچھ لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا مگر مکہ کی اکثریت آپ کی شدید مخالف بنی رہی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ صرف مخالفت آپ کے مشن کو ختم کرنے کے لئے کافی نہیں تو وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے قتل کے درپے ہوگئے۔ انھوں نے طے کیا کہ مکہ کے تمام سردار بیک وقت حملہ کر کے آپ کو قتل کر دیں۔ تا کہ آپ کی تحریک توحید کا خاتمہ ہو جائے۔

یہ ایک نازک موقع تھا۔ بظاہر ایک صورت یہ تھی کہ آپ اپنے ساتھیوں کو لیکر ان سے مقابلہ کریں۔ مگر آپ نے اس معاملہ کو نتیجہ کے اعتبار سے دیکھا چونکہ اس وقت کے حالات میں مسلح مقابلہ غیر مفید ہوتا اس لئے آپ نے اعراض کے اصول پر عمل فرمایا اور مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی سنت نزاع سے ٹکرانا نہیں ہے بلکہ نزاع کے مقام سے ہٹ جانا

ہے۔اس طرح آدمی کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو بچا کر انھیں زیادہ مفید طور پر استعمال کر سکے۔

اغیار کی رعایت

اسلام میں ایک مستقل اصول وہ ہے جس کو قرآن میں تالیف قلب کہا گیا ہے۔(التوبہ ٦٠) تالیف قلب کا مطلب ہے دلوں کو جوڑنا، لوگوں کو اپنے سے مانوس کرنا۔یہ مقصد صرف اس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے کہ دوسروں کی رعایت کی جائے۔دوسروں کے جذبات اور مفادات کا احترام کیا جائے۔تالیف کا یہ اصول اسلامی دعوت کا ایک اہم اصول ہے۔وہ ابدی طور پر ہر انسانی سماج میں مطلوب ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں تالیف قلب کے اس اصول پر عمل فرمایا۔ مثلاً جب آپ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو اس وقت وہاں اہل ایمان کے ساتھ مشرکین اور یہود بھی آباد تھے۔اس وقت آپ نے اپنی طرف سے ایک منشور جاری فرمایا جس کو عام طور پر صحیفۂ مدینہ کہا جاتا ہے۔اس میں آپ نے اعلان فرمایا کہ ہر گروہ کو اپنے مذہب اور کلچر کی آزادی ہوگی۔ہر قبیلہ کے نزاعی معاملات اس کی اپنی قبائلی روایات کے تحت طے کئے جائیں گے۔ عقیدہ اور کلچر کے معاملہ میں کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔

یہود کے ساتھ آپ نے خصوصی رعایت کا معاملہ فرمایا، رمضان کے روزہ کی فرضیت سے پہلے آپ بھی انھیں دنوں میں روزہ رکھتے رہے جب کہ یہود روزہ رکھتے تھے۔تحویل قبلہ کا حکم آنے سے پہلے تقریباً سترہ مہینہ تک آپ نے یہود کے قبلہ (بیت المقدس) کو اپنا قبلہ بنائے رکھا۔۔یہود کے قبلۂ عبادت کو اپنا قبلہ بنانا اس لئے تھا کہ آپ امید رکھتے تھے کہ اس طرح وہاں کے یہود آپ سے مانوس ہوں گے اور آپ کے قریب

آجائیں گے۔(تفسیر القرطبی ۲/۱۵۰)

پیغمبر اسلام ﷺ کا طریقہ مخالفت کے جواب میں مخالفت نہ تھا۔ بلکہ مخالفت کے جواب میں رعایت تھا۔ آپ کی سوچ یہ نہیں تھی کہ لوگوں کو دبا کر انھیں اپنا تابع بنائیں۔ اس کے برعکس آپ کا طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کے ساتھ شفقت اور رعایت کا معاملہ کیا جائے، ان کے دل کو نرم کر کے انھیں اپنا ساتھی بنایا جائے۔

رازداری

فتح مکہ کے واقعات کے ذیل میں آیا ہے کہ مدینہ میں آپ نے سفر کے لئے تیاری کا حکم دیا۔ عام مسلمان ضروری تیاری میں مصروف ہوگئے۔ اس زمانے میں حضرت ابو بکر صدیق اپنی صاحبزادی عائشہ کے گھر میں آئے جو پیغمبر اسلام ﷺ کی اہلیہ تھیں۔ وہ اس وقت ضروری تیاری کر رہی تھیں۔ حضرت ابو بکر صدیق نے اپنی صاحبزادی سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے تم کو اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ ہاں۔ حضرت ابو بکر صدیق نے دوبارہ پوچھا کہ یہ تیاری کہاں کے سفر کے لئے ہے۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم مجھ کو نہیں معلوم (واللہ ما ادری) سیرت ابن ہشام ۴/۱۴)

پیغمبر اسلام ﷺ کی سنتوں میں سے ایک سنت یہ تھی کہ آپ نازک معاملات میں ہمیشہ رازداری کا طریقہ اختیار فرماتے تھے۔۔ یہی آپ نے فتح مکہ کی مہم میں کیا۔ مدینہ سے آپ اپنے دس ہزار اصحاب کے ساتھ نکلے مگر آپ نے لوگوں کو یہ نہیں بتایا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم چلتے ہوئے اس مقام پر پہنچے جہاں سے راستہ سیدھا مکہ کی طرف جاتا تھا، اس وقت ہم نے جانا کہ یہ سفر مکہ کے لئے ہے۔

نازک اجتماعی معاملات میں رازداری بے حد اہم ہے اکثر اوقات کامیابی کا انحصار اس

پر ہوتا ہے کہ فریق ثانی کو آپ کے منصوبہ کا پیشگی علم نہ ہو سکے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس حکمت کو نہایت اہتمام کے ساتھ اپنی زندگی میں اختیار فرمایا۔

صورت موجودہ کو مان لینا

جب بھی دو آدمیوں یا دو گروہوں میں نزاع پیدا ہو تو بالآخر دونوں کے درمیان ایک عملی حالت قائم ہو جاتی ہے۔ جس کو اسٹیٹس کو (Status quo) کہا جاتا ہے۔ اس اسٹیٹس کو کو بدلنے کی کوشش اکثر حالات میں بے نتیجہ ہوتی ہے۔ کیونکہ فریق ثانی اپنی پوری طاقت کے ساتھ جوابی کارروائی کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صورت موجودہ (اسٹیٹس کو) بدستور باقی رہتی ہے۔ مزید نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس بے نتیجہ کوشش میں طرفین کے حاصل شدہ مواقع بھی بے فائدہ طور پر ضائع ہو جاتے ہیں۔

اس طرح کے نزاعی معاملہ میں پیغمبر اسلام کی سنت یہ ہے کہ موجودہ حالت (اسٹیٹس کو) کو مان لو۔ اس اسٹیٹس کو ازم کا یہ عظیم فائدہ ہوتا ہے کہ آپ کو یہ فرصت مل جاتی ہے کہ اپنی قوتوں کو مزید استحکام میں لگا دیں۔ مقام نزاع سے ہٹ کر اپنے آپ کو اتنا مضبوط بنائیں کہ آخر کار طاقت کا توازن بدل جائے اور کسی بڑے ٹکراؤ کے بغیر معاملہ کا فیصلہ کیا جا سکے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے حدیبیہ کے موقع پر یہی حکمت اختیار فرمائی۔ آپ مدینہ سے روانہ ہو کر حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو مکہ کے لوگ بھی چل کر وہاں آگئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو آگے جانے نہیں دیں گے۔ اس طرح حدیبیہ کے مقام پر ایک تعطل کی حالت پیدا ہو گئی۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسا نہیں کیا کہ اس تعطل کو توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں بلکہ آپ حدیبیہ ہی سے دوبارہ مدینہ واپس آگئے۔

یہ گویا اپنے اور فریق ثانی کے درمیان قائم شدہ اسٹیٹس کو کو مان لینا تھا۔ اس حکمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیغمبر اسلام کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے آپ کو مزید مستحکم کر سکیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور صرف دو سال کے اندر آپ کے لئے مکہ میں فاتحانہ داخلہ ممکن ہو گیا۔

مشکل میں آسانی

پیغمبر اسلام ﷺ نے ۸ھ میں مکہ فتح کیا۔ اس کے بعد آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ سے طائف کے لئے روانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں عرب میں ہموار سڑکیں نہیں تھیں۔ چلتے ہوئے ایک جگہ ایک تنگ راستہ آیا جو دو پہاڑیوں کے درمیان سے گذرتا تھا۔ چنانچہ یہ راستہ اپنی اسی صفت کے ساتھ مشہور ہو گیا تھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ جب اس جگہ پہنچے تو آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ اس راستہ کا نام کیا ہے (**ما اسم هذه الطريق**) لوگوں نے جواب دیا کہ اس کا نام تنگ راستہ ہے (**فقيل له الضيقة**) آپ نے جواب دیا کہ نہیں، یہ ایک آسان راستہ ہے (**فقال بل هي اليسرى**) سیرت ابن ہشام ۴/۱۲۷)

اس وقت پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ دس ہزار سے زیادہ آدمی تھے۔ یہ لوگ اگر افقی انداز میں پھیل کر چلتے تو یقیناً ان کے لئے اس راستہ سے گذرنا مشکل ہوتا، ایسی حالت میں وہ ان کے لئے تنگ بن جاتا۔ لیکن یہی لوگ اگر قطار بنا کر چلیں تو ان کے لئے راستہ سے گذرنا مشکل نہ رہے گا، اور وہ بظاہر تنگی کے باوجود ان کے لئے عملی طور پر آسان ہو جائے گا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے جواب میں اسی عملی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا.

پیغمبر اسلام ﷺ کے اس واقعہ سے زندگی کا ایک اہم راز معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ حسب حالت تدبیر ہے۔ اس حکیمانہ تدبیر کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ اس

تدبیر کو استعمال کرکے زندگی کی ہر مشکل کو آسان بنایا جاسکتا ہے۔

تدبیری پسپائی

پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے میں ۸ھ میں ایک جنگ ہوئی۔ یہ شام کی سرحد پر مؤتہ کے مقام پر ہوئی اسی نسبت سے اس کو جنگ مؤتہ کہا جاتا ہے۔ اس جنگ کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔ اس کے مقابلہ میں فریق ثانی کی فوجی تعداد غیر متناسب طور پر بہت زیادہ تھی۔ آخری مرحلہ میں خالد بن الولید اس کے سردار مقرر ہوئے انھوں نے لڑائی کو غیر مفید سمجھ کر واپسی کا فیصلہ کیا۔ وہ تدبیری پسپائی (Tactical retreat) کے اصول پر مؤتہ سے واپس ہو کر مدینہ چلے گئے۔

عربوں کا مزاج لڑنے مرنے کا مزاج تھا۔ وہ اس پسپائی کی حکمت کو سمجھ نہ سکے۔ چنانچہ جب وہ مدینہ پہنچے تو وہاں کے نوجوانوں نے یافرار کہہ کر ان کا استقبال کیا۔ یعنی اے بھاگنے والو۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس کو سنا تو آپ نے اس کی تردید فرمائی۔ آپ نے کہا کہ یہ لوگ بھاگنے والے نہیں ہیں بلکہ خدا نے چاہا تو وہ اقدام کرنے والے ہیں۔ (لیسوا بالفرار ولکنهم الکرار انشاء الله تعالی) (سیرت ابن ہشام ۴۳۸/۳)

پیغمبر اسلام ﷺ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک صحیح اقدام وہ ہے جو نتیجہ خیز ثابت ہو سکے۔ محض جوش اور وقار کے لئے لڑ کر مر جانا کوئی مطلوب اسلامی کام نہیں۔ اگر اہل ایمان کے مقابلے میں فریق ثانی کی طاقت فیصلہ کن حد تک زیادہ ہو تو ایسی حالت میں مقابلہ کے لئے اقدام نہیں کیا جائے گا۔ حتی کہ اگر مقابلہ پیش آجائے تو تدبیری پسپائی اختیار کی جائے گی۔ تاکہ مزید تیاری کرکے اپنے آپ کو نتیجہ خیز اقدام کے قابل بنایا جاسکے۔

اصلاح میں تدریج

ایک روایت کے مطابق، حضرت عائشہ نے فرمایا کے قرآن میں سب سے پہلے وہ آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت کا اور جہنم کا ذکر تھا۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوگئے تو اس کے بعد حلال و حرام کے احکام اترے۔ اور اگر ایسا ہوتا کہ شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ تم لوگ شراب نہ پیو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اسی طرح اگر شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے۔ (صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن، بحوالہ فتح الباری، ۸/۶۵۵)

اس روایت سے ایک عظیم حکمت نبوی معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہی عملی حکمت ہے جس کو تدریج (Graduation) کہا جاتا ہے۔ انسان کی اصلاح ایک مشکل اور پیچیدہ کام ہے۔ انسان عام طور پر کچھ خیالات اور عادات سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ وہ اسی کو درست سمجھنے لگتے ہیں۔ اس بنا پر وہ کسی نئی چیز کو فوری طور پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ایسی حالت میں انسانوں کی اصلاح کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کام کو حکمت اور تدریج کے ساتھ کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے عرب میں پہلے لوگوں کی سوچ کو بدلا۔ لوگوں کے اندر قبولیت کا مزاج پیدا کیا۔ یہاں تک کہ جب ان کے اندر اصلاح کو قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو گئی تو اس کے بعد آپ نے شرعی احکام کا نفاذ فرمایا۔ اگر آپ فکری تطہیر اور مزاج سازی کے بغیر شریعت کے قوانین نافذ کرتے تو یہ انسانی فطرت کے خلاف ہوتا، اور وہ انقلابی نتیجہ برآمد نہ ہوتا جو عرب کے سماج میں برآمد ہوا۔

عملی حالات کی رعایت

پیغمبر اسلام ﷺ نے ذی الحجہ ۹ھ میں حج کا فریضہ ادا فرمایا۔ اس کو عام طور پر حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان اکٹھا تھے۔ آپ نے اپنے خطبہ میں جو باتیں فرمائیں ان میں سے ایک وہ تھی جس کو انسانی مساوات کا اعلان کہا جاسکتا ہے۔ آپ نے اس موقع پر یہ تاریخی الفاظ فرمائے کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں، کسی سفید فام کو کسی سیاہ فام پر فضیلت نہیں۔ فضیلت کا تعلق صرف دین اور تقوی سے ہے۔

اس خطبہ کے تقریباً ڈھائی ماہ بعد مدینہ میں آپ کی وفات ہوگئی۔ آپ کی وفات کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ کس کو خلیفہ بنایا جائے۔ مذکورہ اعلان کے مطابق بظاہر صرف یہ ہونا چاہئے تھا کہ دین اور تقوی کی بنیاد پر خلافت کا فیصلہ کیا جائے نہ کہ نسل اور قبیلہ کی بنیاد پر۔ مگر عملاً ایسا نہیں ہوا۔

آپ کی وفات کے بعد مدینہ کی ایک چوپال (ثقیفہ بنی ساعدہ) میں مسلمانوں کا اجتماع ہوا۔ لوگوں کا پہلا رجحان یہ تھا کہ سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنایا جائے جو مدینہ کے ایک قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس وقت حضرت ابو بکر صدیق نے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث پیش کی کہ الائمۃ من قریش۔ یعنی خلیفہ یا امام قریش سے ہوگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سعد بن عبادہ چونکہ قبیلہ قریش سے نہیں ہیں اس لئے ان کو خلیفہ نہیں بنایا جاسکتا۔ کسی قدر بحث کے بعد آخرکار لوگوں کا اس پر اتفاق ہوگیا کہ قبیلہ قریش ہی کے کسی شخص کو خلیفہ بنایا جائے۔ اس کے مطابق حضرت ابو بکر صدیق خلیفہ اول مقرر ہوئے جو کہ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔

بظاہر یہ ایک متضاد بات ہے۔ پھر پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسا کیوں فرمایا۔ اس کے

پیچھے ایک عظیم حکمت تھی۔ وہ یہ کہ خلیفہ یا حکمراں کو ایک وسیع انسانی سماج پر احکام کا نفاذ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ لوگ خلیفہ کی اطاعت پر راضی ہو جائیں۔ یہ اطاعت رضاکارانہ ہونا چاہئے۔ جبری اطاعت کے ذریعہ وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جو اسلامی خلافت کا مقصود ہے۔

قدیم عرب میں سیکڑوں سال کی تاریخ کے نتیجہ میں قریش کے لوگوں کو سرداری کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ عوامی نفسیات کسی ایسے شخص کی سیادت کو آسانی کے ساتھ قبول کر لیتی تھی جس کا تعلق قریش کے قبیلہ سے ہو۔ اسی سماجی صورت حال کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ الائمۃ من قریش۔ یہ کوئی ابدی حکم نہیں تھا۔ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ کسی قوم میں جس گروہ کو قریش جیسی سیاسی حیثیت حاصل ہو جائے، وہاں اسی گروہ کے کسی فرد کو قوم کے اوپر حاکم بنایا جائے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عملیت (Pragmatism) بھی رسول اللہ ﷺ کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ انفرادی معاملہ میں ایک شخص کو ہمیشہ نظری معیار سامنے رکھنا چاہئے۔ مگر اجتماعی معاملات میں بعض اوقات نظری معیار قابل عمل نہیں ہوتا، اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ ایسے معاملہ میں نظری معیار کو چھوڑ کر عملی تقاضے کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو زندگی کا نظام ہموار طور پر نہیں چل سکتا۔

مستقبل بینی

فتح مکہ کے بعد عرب میں وہ دور آیا جس کو تاریخ میں عام الوفود کہا جاتا ہے۔ عرب کے قبائل مدینہ آکر اسلام قبول کرنے لگے۔ ان میں سے ایک قبیلہ ثقیف بھی تھا جو طائف سے آیا تھا۔ یہ لوگ مدینہ آئے تو انھوں نے ایک انوکھی شرط پیش کر دی۔ انھوں نے کہا کہ

ہم اسلام تو قبول کرلیں گے لیکن ہم نہ زکوٰۃ دیں گے اور نہ جہاد کریں گے۔

یہ ایک نازک مسئلہ تھا۔ عام لوگ اس قسم کے اسلام کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے حال سے اوپر اٹھ کر مستقبل کو دیکھا۔ آپ نے اپنی بصیرت کے تحت یہ سمجھا کہ یہ لوگ جب اسلام میں داخل ہو کر مسلم معاشرہ کا جزء بن جائیں گے تو وہ اپنے آپ سب کچھ کرنے لگیں گے۔ چنانچہ آپ نے ان کی شرطوں کو مانتے ہوئے انھیں اسلام میں داخل کرلیا۔ لوگوں کے اشکال کو رفع کرنے کے لئے آپ نے فرمایا کہ جب وہ اسلام قبول کرلیں گے تو اس کے بعد وہ زکوٰۃ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔ (سیتصدقون ویجاھدون اذااسلموا) سیرت ابن کثیر ۴/۵۶۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے اس اسوہ سے ایک عظیم حکمت معلوم ہوتی ہے۔ یہ حکمت ایک لفظ میں مستقبل بینی ہے۔ انسان کوئی پتھر نہیں ہے جو تاثر کو قبول نہ کرے۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ انسان کے حال پر اس کے مستقبل کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ آدمی سے معاملہ کرتے ہوئے ہمیشہ اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہئے۔ بوقت معاملہ فوری تبدیلی پر اصرار سے ضد پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر وسعت ظرف کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اپنے آپ ایسا ہوگا کہ آدمی مستقبل میں عین وہی بن جائے گا جیسا کہ حال میں ہم اس کو دیکھنا چاہتے تھے۔

زیر طبع کتاب مطالعۂ سیرت (صفحات ۲۰۸) کا ایک باب

سوال

آپ نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ اسلام دور جدید کا خالق ہے۔ یہ کتاب انگریزی میں بھی اس نام سے چھپ چکی ہے۔ Islam creator of the modern age لیکن میں نے مریم جمیلہ صاحبہ کا ایک تبصرہ پڑھا جس میں وہ لکھتی ہیں کہ اسلام دور جدید کا خالق نہیں ہے بلکہ اسلام دور جدید کا انتخاب ہے:

Islam is not the creator of modern age ,but the option of modern age

یہ بات انھوں نے اپنی کتاب Islam and the west میں لکھی ہے۔ آپ اس کے جواب میں کیا کہتے ہیں (ابرار آئی رفعت، سورت)

جواب

یہ بات درست ہے کہ اسلام دور جدید کا انتخاب (choice) ہے۔ جدید ذہن سائنٹفک مذہب چاہتا ہے، اور ایسا مذہب صرف اسلام ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی بلاشبہ درست ہے کہ اسلام جدید سائنسی دور کا خالق ہے۔ مریم جمیلہ صاحبہ کو اس معاملہ میں غلط فہمی شاید اس لئے ہوئی کہ انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ میں ڈائرکٹ معنوں میں یہ بات کہتا ہوں۔ یعنی ڈائرکٹ طور پر اسلام دور جدید کا خالق ہے۔ مثلاً یہ کہ کار اور ہوائی جہاز کی ٹکنالوجی قرآن نے دی ہے۔ مگر یہ میرا کہنا نہیں۔ جب میں کہتا ہوں کہ اسلام دور جدید کا خالق ہے تو میں اس کو بالواسطہ مفہوم (indirect sense) میں کہتا ہوں۔ اسلام کا مقصد اصلاً شرک کو ختم کرنا اور توحید کو قائم کرنا تھا۔ مگر مشرکانہ ذہن کا خاتمہ جدید سائنس کے آغاز کا سبب بن گیا۔ جیسا کہ میں نے اپنی کتاب (اسلام دور جدید کا خالق) میں دکھایا ہے کہ

قدیم زمانہ میں ساری دنیا میں مشرکانہ عقائد کا غلبہ تھا۔ اس مشرکانہ عقیدہ نے نیچر ورشپ پیدا کی اور نیچر ورشپ نیچر کی تحقیق میں رکاوٹ بن گئی۔ اسلامی انقلاب کے ذریعہ اس ذہنی رکاوٹ (mental block) کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں تاریخ میں نیچر کی آزادانہ تحقیق کا عمل شروع ہوا جو بالآخر جدید سائنسی انقلاب تک پہنچا۔

سوال

مسلمانوں کا یہ دعوی ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے۔ جس کی کئی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ چودہ سو سال پہلے قرآن نے جن چیزوں کے بارے میں مجمل اشارے کئے تھے وہ تمام اشارات حالیہ سائنسی انکشافات کے نتیجہ میں صحیح ثابت ہوئے ہیں۔ گویا کہ ثابت شدہ سائنس اور قرآن کے درمیان کوئی تضاد نہیں۔ لیکن دوسری طرف دیگر مذاہب سے متعلق قومیں (یہود و نصاریٰ) بھی اپنی اپنی مقدس کتابوں کے بارے میں یہی دعویٰ کرتی ہیں۔ اور یہ قومیں بھی اپنی کتابوں کے حق میں سائنسی تصدیقات موجود ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا قرآن کے دعوے میں ایسی کوئی وجہ امتیاز ہے جو اس کو دوسرے دعاوی سے الگ کرتی ہو (ابرار رفعت، سورت)

جواب

قدیم آسمانی کتابوں میں اگرچہ تحریف ہوئی ہے اور ان میں انسانی کلام شامل ہو گیا ہے۔ تاہم ان میں اب بھی ایسے کچھ اجزاء موجود ہیں جو خدائی الہام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اجزاء میں ایسی باتیں ہیں جو بعد کو دریافت ہونے والی سائنسی حقیقتوں سے مطابقت رکھتی ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ان میں انسانی کلام کا جو حصہ ملا ہوا ہے اس کا معاملہ اس سے مختلف

ہے۔ اس دوسرے جزء میں واضح طور پر ایسی مثالیں موجود ہیں جن کی تصدیق سائنسی دریافتوں سے نہیں ہوتی۔ اس طرح دوسری مقدس کتابوں میں دونوں قسم کے اجزاء پائے جاتے ہیں، مطابق بھی اور غیر مطابق بھی۔ مگر قرآن کی صفت یہ ہے کہ وہ پورا کا پورا محفوظ الہام کی حیثیت رکھتا ہے، وہ انسانی ملاوٹ سے مکمل طور پر پاک ہے اس لئے قرآن پورا کا پورا سائنسی حقیقتوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ جو چیز دوسری مقدس کتابوں میں صرف جزئی طور پر پائی جاتی ہے وہ قرآن میں کلی طور پر موجود ہے یہی اس معاملہ میں قرآن کا امتیازی وصف ہے۔ اس معاملہ کی تفصیلی مثالیں راقم الحروف کی کتابوں (مثلاً عظمت قرآن وغیرہ) میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

سوال

آج کل ہمارے یہاں یہ ذکر زوروں پر ہے کہ آپ نے وندے ماترم کہنا مسلمانوں کے لئے جائز کر دیا ہے۔ اگر یہ جائز ہو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے بہت قریب لادے گا۔ دشمنی ختم ہونا شروع ہو جائے گی۔ لیکن اگر مسلمان زمین کی وندنا کر سکتا ہے تو پھر ہمالہ، گنگا، سرسوتی، گائے وغیرہ کی وندنا کیوں نہیں کر سکتا۔ اور اگر کر سکتا ہے تو پھر شرک کیا ہے (شاکر وارث۔ مراد آباد)

جواب

وندے ماترم کی شرعی نوعیت کے بارے میں میری رائے وہی ہے جو دوسرے علماء کی رائے ہے۔ اس معاملہ میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی اس کی ذمہ داری اردو کی زرد صحافت پر ہے۔ اس موضوع پر میرے آرٹیکل کا عنوان یہ تھا۔۔۔ وندے ماترم: اشویاتان اشو۔ اردو اخبار والوں نے اس کو بدل کر "وندے ماترم، جائز یا ناجائز" بنا دیا۔ اس بدلے ہوئے عنوان

کی بنا پر لوگوں نے یہ سمجھا کہ میں وندے ماترم کو جائز بتارہا ہوں۔ حالانکہ اصولی اعتبار سے اس کے جائز ہونے کا کوئی سوال نہیں اور نہ میں نے کبھی ایسا کہا۔ میرا مدعا صرف یہ ہے کہ اس معاملہ کو عوامی احتجاج کا اشو نہ بنایا جائے۔ کیونکہ اس طرح کے معاملات میں عوامی احتجاج صرف الٹا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ علماء کا کہنا ہے کہ اسکولوں میں وندے ماترم کو لازمی ٹھہرانا دستور کے خلاف ہے۔ مجھے اس سے اتفاق ہے۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ دستوری نزاع کا فیصلہ جلسوں اور تقریروں کے اسٹیج پر نہیں ہوتا۔ اس کے فیصلہ کا مقام عدالت ہے۔ اس معاملہ میں ہمیں چاہئے کہ ہم ایک طرف متبادل اسکول قائم کریں اور دوسری طرف اپنی جد وجہد کے لئے عوامی مظاہرہ کے بجائے عدالتی طریقہ اختیار کریں۔ گویا کہ میرا اختلاف نفس مسئلہ کے بارے میں نہیں ہے بلکہ طریق کار کے بارے میں ہے۔ ہندستان جیسے جمہوری ملک میں کسی اقلیت کے لئے مظاہراتی طریقہ ہمیشہ ناکام ہوگا۔ اور عدالتی طریقہ ہمیشہ کامیاب۔ مظاہراتی طریقہ میں فیصلہ کن چیز تعداد ہوتی ہے۔ یہاں اقلیتی گروہ اپنی عددی کمی کی بنا پر کمزور پڑ جاتا ہے۔ اس کے برعکس عدالتی طریقہ میں سارا انحصار دلیل پر ہوتا ہے اس لئے جو گروہ حق پر ہو اس کی کامیابی یقینی بن جاتی ہے گویا کہ ایک صورت میں فیصلہ کی بنیاد ہمارے ہاتھ میں ہوتی ہے اور دوسری صورت میں فیصلہ کی بنیاد فریق ثانی کے ہاتھ میں۔ وندے ماترم ابھی تو لازم نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کو لازم کیا جائے تو اس کو چیلنج کرنے کی صحیح جگہ عدالت ہے نہ کہ عوامی اسٹیج

سوال

قرآن میں نماز قائم کرنے کا حکم ہے۔ نماز پڑھنے کا نہیں تو موجودہ پڑھی جانے والی نماز کن احکامات کی روشنی میں پڑھی جارہی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز قائم کرنے کا مطلب نظم ونسق درست کرنا ہے اور یہ کہ سجدہ کا مطلب تعمیل حکم ہے یہ کہاں تک درست ہے (محمد بدرالدین شمیم، ناگپور)

جواب

صلّی کا مطلب نماز پڑھنا نہیں ہے بلکہ نماز ادا کرنا ہے۔اسی طرح اقام کا مطلب نافذ کرنا نہیں ہے بلکہ حسن وخوبی کے ساتھ انجام دینا ہے۔اس طرح اقام کا مطلب بھی وہی ہے جو صلی کا مطلب ہے۔ البتہ اقام کے لفظ میں اہتمام کے ساتھ ادائیگی کا مفہوم شامل ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک غیر علمی اعتراض ہے۔ قرآن میں نماز کا حکم صرف اقام کے لفظ کے ساتھ نہیں آیا ہے بلکہ مختلف الفاظ کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً صلّی، حافظ، وغیرہ۔ان الفاظ کے لغوی معنی میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ مگر سب کا مشترک مفہوم یہ ہے کہ نماز کو پورے اہتمام کے ساتھ ادا کیا جائے۔ قرآن میں اقام کے سوا جن الفاظ کے ساتھ نماز کا حکم آیا ہے ان میں سے کچھ کے حوالے یہ ہیں :القیامۃ۳۱، العلق ۱۰، الکوثر ۲، المعارج ۲۲، المدثر ۴۲، النساء ۱۰۲، البقرہ ۴۵، البقرہ ۱۵۳ البقرہ ۲۳۸ وغیرہ۔ احادیث میں بار بار نماز کا ذکر لفظ اقامت کے بغیر آیا ہے۔ تاہم صل کا مطلب بھی عین وہی ہے جو اقم الصلاۃ کا ہے۔ اقامت کا لفظ دراصل برائے وضاحت ہے۔ اسی طرح قرآن میں دوسرے وضاحتی الفاظ بھی آئے ہیں مثلاً محافظت یا خشوع وغیرہ۔ان سب کا مطلب یہ ہے کہ نماز کو پوری پابندی کے ساتھ اور ظاہر و باطن کے اعتبار سے اس کے تمام آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ادا کیا جائے۔ نماز کو اس کے ظاہر اور اس کے باطن دونوں کے اعتبار سے انجام دیا جائے۔ یہی مطلب ہے نماز کی اقامت کا۔ نماز ثابت شدہ طور پر ایک عبادتی فعل ہے۔ اسلام میں نظم و نسق اور احکام کی تعمیل بھی ہے۔ مگر ان چیزوں کا حکم دوسری آیات سے نکلتا ہے نہ کہ نماز کی آیات سے۔ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ جن آیتوں میں اقامت کا لفظ آیا ہے وہاں بھی نماز قائم کرنے کا حکم ہے نہ کہ کچھ اور قائم کرنے کا۔اس لئے ان آیتوں میں بھی

نماز ہی کی اقامت، بالفاظ دیگر نماز کی کامل ادائیگی مراد ہوگی نہ کہ نماز کے سوا کسی اور خود ساختہ چیز کی اقامت یا ادائیگی۔

سوال

ہمارے علمی حلقہ کے ایک دوست کا اصرار ہے کہ آپ سے ایک سوال معلوم کیا جائے۔ وہ یہ کہ ان کے ایک دوست جو کبھی آپ کے بہت قریب رہا کرتے تھے۔ کسی وقت ان کا آپ کے بیت الخلا میں جانے کا اتفاق ہوا اور انھوں نے آپ کے بیت الخلا میں بخاری شریف کو رکھا ہوا دیکھا۔ ایسے مقام پر بخاری شریف کا پایا جانا ان کے لئے نفرت کا سبب بن گیا۔ اور وہ آپ سے دوری اختیار کر گئے۔ اور ہمارے علمی حلقہ میں سبھی اس تعلق سے وضاحت چاہتے ہیں کہ آیا یہ ایک حقیقت ہے یا پھر آپ کی دشمنی میں ایک غلط بات اڑادی گئی ہے (محسن احمد، حیدر آباد)

جواب

یہ صحیح ہے کہ میرے مطالعہ کے کمرہ سے ملحق باتھ روم میں ایک الماری پر کچھ جلدیں رکھی ہوئی ہیں۔ مگر یہ جلدیں صحیح البخاری کی نہیں ہیں بلکہ وہ اخبار کی جلدیں ہیں۔ اور جدید طرز کے ایک صاف ستھرے باتھ روم کی ایک الماری میں کسی اخبار کی جلدیں رکھنے میں یقینی طور پر کوئی حرج نہیں۔ صحیح البخاری میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ : ایا کم الظن فان الظن اکذب الحدیث) فتح الاری بشرح النووی ٤٩٦/١٠) یعنی تم لوگ گمان سے بچو کیوں کہ گمان سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ آپ کے دوست نے خود صحیح البخاری کی اس روایت پر عمل نہیں کیا۔ انھیں چاہئے تھا کہ باتھ روم میں رکھی ہوئی جلد کو کھول کر دیکھتے یا مجھ سے اس کی بابت پوچھتے۔ ایسا نہ کر کے انھوں نے صرف گمان کی بنیاد پر

ایک بے بنیاد رائے قائم کی اور اس کو پھیلانا شروع کردیا۔ یہ نہ صرف ایک غیر ذمہ دارانہ فعل ہے بلکہ وہ حدیث کے الفاظ میں ایک قسم کا کذب ہے۔

سوال

الرسالہ اکتوبر ۹۸ صفحہ ۴۳ پر قولی دعوت و فعلی دعوت کے جواب میں آپ نے فعلی دعوت کی نفی کی ہے۔ جب کہ قرآن سے فعلی دعوت ثابت ہے۔ مثال کے طور پر سورہ القلم کی یہ آیت انك لعلی خلق عظیم (محسن احمد، حیدر آباد)

جواب

الرسالہ کی عبارت آپ نے غور سے نہیں پڑھی، ورنہ اس میں پوری بات موجود ہے۔ فعل بلاشبہ مطلوب ہے۔ مگر فعل یا کردار آدمی کی ذاتی ذمہ داری ہے نہ کہ دعوت کی شرط۔ آپ نے قرآن کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے اس سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ مفسر ابن کثیر نے لکھا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ تبلیغ کے لئے عمل شرط نہیں ہے۔ عمل بلاشبہ ایک شخص کی لازمی ذمہ داری ہے اور اس کے ترک پر اس سے یقیناً باز پرس ہوگی۔ مگر یہ کہنا صحیح نہیں کہ دعوت کا کام وہی شخص کر سکتا ہے جو پورے معنوں میں باعمل بن چکا ہو (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ۱/۸۵)

سوال

دریائے سندھ کے اس پار جو لوگ بستے ہیں ان کو خود مسلم فاتحین نے ہندو کہا تھا۔ اس کے مطابق، ہمارا کہنا ہے کہ بھارت میں بسنے والے تمام لوگ ہندو ہیں۔ خواہ مذہب کے اعتبار سے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلمان۔ پھر آپ لوگ اپنے آپ کو ہندو کہلانے کو کیوں برا مانتے ہیں (نشانت کمار، نئی دہلی)

جواب

ہندستان یا بھارت اس وقت مسلم فاتحین کے زیر حکومت نہیں ہے۔ آزادی کے بعد یہاں کا سیاسی اور سماجی نظام دستور ہند کے تحت چل رہا ہے۔ اس دستور میں اس ملک کے تمام باشندوں کو انڈین بتایا گیا ہے۔ چنانچہ پاسپورٹ وغیرہ میں اس ملک کا ہر رہنے والا اپنے آپ کو انڈین لکھتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا کہ اس ملک کے تمام باشندوں کی عیشنلٹی ہندو ہے دستور کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ اگر کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک کے تمام بسنے والوں کو ہندو کہا جائے تو ان کو سب سے پہلے دستور ہند میں ترمیم کر کے اس کی متعلقہ دفعات کو بدلنا چاہیئے۔ موجودہ حالت میں اس قسم کا مطالبہ کرنا دستور ہند کے خلاف ہے، اس لئے کسی کو ایسا کہنے کا حق ہی نہیں۔

سوال

حال ہی میں ہوئے بہار شریف میں فرقہ وارانہ ہندو مسلم فسادات کی خاص وجہ یہ تھی کہ ہندو نے 'درگا' کی مورتی کو لے کر مسلم محلّہ میں آگئے اور اشتعال انگیز نعرہ لگانے لگے۔ کہ مسلمان ہندستان کے غددار ہیں، مسلمان پاکستانی ایجنٹ ہیں، ان کو ہندستان سے مار بھگاؤ۔ اس موقع پر مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے تھا (شاہ فیصل، دیاؤ نالندہ)

جواب

اس سوال کا جواب پیشگی طور پر خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق نے دے دیا ہے۔ وہ انھیں کے الفاظ میں یہ ہے: امیتو ا الباطل بالصمت عنه (باطل کو ہلاک کرو اس سے چپ رہ کر) مذکورہ قسم کے مسائل کا بہترین حل یہ ہے کہ ان کے بارے میں خاموشی اور اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اعراض سے یہ مسئلہ صرف دو منٹ کے نعرہ پر ختم ہو جاتا

ہے اور جب مسلمان اس طرح کے مواقع پر خاموشی کے بجائے جوابی اقدام کا طریقہ اختیار کریں تو غیر ضروری طور پر وہ برا انجام سامنے آجاتا ہے جو بہار شریف اور بھاگلپور جیسے مقامات پر پیش آیا۔

سوال

جہاد کشمیر کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ یہ کوئی اسلامی تحریک بھی ہے یا نہیں (پیر محمد امین ترحکام، کشمیر)

جواب

میرے علم کے مطابق یہ اور اس قسم کی دوسری مسلح تحریکیں قومی لڑائی ہیں نہ کہ اسلامی جہاد۔ اسلام میں جہاد (بمعنی قتال) کوئی انفرادی یا جماعتی عمل نہیں ہے۔ وہ مکمل طور پر ریاست کا ایک عمل ہے۔ فقہ کا ایک متفقہ مسئلہ ہے کہ: الرحیل للا مام۔ یعنی کسی قوم کے خلاف جنگ کا اعلان کرنا حاکم کا کام ہے۔ اس قسم کی سوجودہ جنگیں حکومتوں کی طرف سے نہیں لڑی جارہی ہیں بلکہ انفرادی اشخاص بطور خود یہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔ یہ بلا شبہ ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ مزید یہ کہ کوئی مسلم حکومت اگر اس قسم کی کسی تحریک کو خفیہ مدد پہنچائے تو اس بنا پر وہ اسلامی جہاد نہیں ہو جائے گا۔ اس حکومت کو کھلے طور پر اس کا اعلان کرنا پڑے گا۔ اعلان کے بغیر خفیہ جنگ چھیڑنا بذات خود جائز نہیں۔

سوال

نفاذ اسلام کی تحریکیں موجودہ دور میں کیوں ناکام ہو رہی ہیں (پیر محمد امین، ترحکام، کشمیر)

جواب

اس ناکامی کا سبب یہ ہے کہ اسلامی قانون کے نفاذ کی تحریک چلانے والے رہنما،

ایک قدیم مثل کے مطابق، گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا چاہتے ہیں۔ نفاذ شریعت کے سلسلہ میں پہلا کام یہ ہے کہ سیاسی تحریک چلانے سے پہلے فکری تحریک چلائی جائے۔ لوگوں کی ذہنی اصلاح کر کے ان کے اندر قبولیت کا مادہ پیدا کیا جائے۔ اور جب لوگوں میں قبولیت کا مادہ پیدا ہو چکا ہو اس کے بعد قانون کا نفاذ کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے عرب میں یہی تدریجی طریقہ اختیار فرمایا۔ موجودہ زمانہ کا نام نہاد انقلابی طریقہ اسلامی طریقہ نہیں۔ وہ مارکس اور لینن کی تقلید ہے نہ کہ پیغمبر اسلام کی تقلید۔ موجودہ قسم کی ہنگامہ آرائیوں سے نہ اسلامی قانون نافذ ہوا ہے اور نہ وہ آئندہ کبھی نافذ ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی تحریکیں اسلام کی خدمت نہیں ہیں بلکہ وہ صرف اسلام کو بدنام کرنے کا ذریعہ ہیں۔

سوال

اسلام کا پولٹیکل سسٹم کیا ہے۔ اسلام میں ریاست کا ہیڈ کس طرح مقرر کیا جائے گا۔ اگر شوریٰ کے ذریعہ صدر ریاست کا انتخاب ہو تو اس انتخاب کا طریقہ کیا ہے۔ امریکہ کے مسلمانوں میں اس معاملہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جو مسلمان جس ملک سے یہاں آئے ہیں وہ اپنے ہی ملک کے رائج اسلامی تعبیر کے مطابق اس کا جواب دیتے ہیں۔ اس معاملہ میں صحیح بات کیا ہے۔ (ڈاکٹر غنی خاں، میامی، امریکہ)

جواب

اس معاملہ میں اسلام میں کوئی واحد متعین طریقہ نہیں ہے۔ قرآن یا حدیث میں سیاسی معاملات کے بارے میں صرف بنیادی یا اساسی تعلیمات موجود ہیں۔ مزید یہ کہ اسلام میں چار خلیفہ کو معیاری مانا گیا ہے۔ مگر چاروں کے معاملہ میں انتخاب کا طریقہ الگ الگ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں سیاسی سسٹم کا معاملہ نماز جیسا نہیں ہے۔ نماز کا

ایک معلوم اور متعین طریقہ ہے مگر ٹھیک اسی طرح سیاست کا کوئی واحد مقرر سسٹم نہیں۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ اسلام میں سیاسی معاملات کے بارے میں کافی آزادی دی گئی ہے۔ قرآن وحدیث سے سیاست کے بنیادی اصول کو لے کر ہم اپنے حالات کے لحاظ سے اس کا آزادانہ نقشہ بنا سکتے ہیں۔ جب تک اسلام کی کسی تعلیم کی کھلی خلاف ورزی نہ ہو حالات کی مطابقت سے بنایا ہوا ہر ڈھانچہ اسلامی ڈھانچہ ہو گا۔

سوال

ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ آپ نے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے خلاف کتاب اس لئے لکھی کہ انھوں نے آپ کے اعتراضات کا جواب نہیں دیا۔ لیکن آپ نے بھی تو ایسا ہی کیا۔ آپ کے خلاف تنقیدیں چھپتی ہیں مگر آپ ان کا جواب نہیں دیتے۔ (محمد خالد ندوی)

جواب

ایک صورت یہ ہے کہ معترض خط کی صورت میں براہ راست اپنا اعتراض لکھ کر بھیجے ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنا اعتراض یا تنقید اخبار اور رسالے میں شائع کرے۔ علماء اسلام کا مسلک یہ ہے کہ وہ براہ راست کئے گئے اعتراض کا جواب تو دیتے ہیں مگر چھپنے والے اعتراض کے بارے میں زیادہ تر خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ میرا مسلک بھی یہی ہے۔ مولانا مودودی کو میں نے کتاب چھپنے سے پہلے اپنے اعتراض لکھ کر بذریعہ ڈاک بھیجے تھے مگر اصرار کے باوجود انھوں نے جواب نہیں دیا۔ اس بنا پر دونوں معاملہ یکساں نہیں۔ خط کے ذریعہ موصول ہونے والے اعتراض کا جواب میں ہمیشہ دیتا ہوں۔ مگر چھپے ہوئے مضمون کا جواب صرف اس وقت دیتا ہوں جب کہ وہ سب وشتم نہ ہو بلکہ اس میں واقعۃً کوئی قابل وضاحت نکتہ موجود ہو۔

خبر نامہ اسلامی مرکز ۱۳۷

۱۔ ٹائمس آف انڈیا (نئی دہلی) کی نمائندہ مسز سکینہ یوسف خاں نے ۱۴اگست ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق مسلمانوں کے موجودہ حالات سے تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ موجودہ ہندستانی مسلمان متشدد (militant) ہو رہے ہیں یا پست ہمت (subdued) ہو رہے ہیں۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ وہ نہ متشدد ہو رہے ہیں اور نہ پست ہمت بلکہ وہ زیادہ باشعور ہو رہے ہیں، وہ نئے عزم کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ پورے ملک میں مسلمانوں کے درمیان تعلیمی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔

۲۔ کالکاجی مندر (نئی دہلی) میں ۱۴اگست ۱۹۹۸ کو ایک سمّیلن ہوا۔ اس کا موضوع مذہب اور تعلیم تھا۔ ہر مذہب کے علماء کو اس میں اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ صدر اسلامی مرکز کو اس میں اسلام کی نمائندگی کے لئے بلایا گیا تھا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کچھ حدیثیں سنائیں اور ان کی روشنی میں اسلام کا تعارف پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اسلام کوئی لڑائی بھڑائی کا مذہب نہیں، وہ اخلاق اور انسانیت کا مذہب ہے۔ اسلام میں تمام مذہبوں کا احترام کرنا سکھایا گیا ہے۔

۳۔ بخارسٹ (رومانیہ) میں ۳۱اگست سے ۲ ستمبر ۱۹۹۸ تک ایک انٹر نیشنل کانفرنس ہوئی۔ اس کا موضوع امن اور مذہب تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ وہاں انھوں نے ایک پیپر پیش کیا جس کا عنوان تھا: Speaking of God today۔ اس کے علاوہ وہاں کے ڈسکشن میں حصہ لیا۔ اس سفر کی روداد سفر نامہ کے تحت، انشاءاللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۴۔ نوبھارت ٹائمس (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر راوت نے ۵ ستمبر ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے لیڈر جو پاکستان کے اسلامی کرن کی بات کرتے ہیں ان کو سب سے پہلے خود اپنا اسلامی کرن کرنا چاہئے۔ پاکستان کا ایک ایک لیڈر بھرشٹاچار میں ڈوبا ہوا ہے۔ اگر سچ مچ وہ اسلام چاہتے ہیں تو سب سے پہلے انھیں اپنی زندگیوں میں اسلام کی تعلیمات کو اپنانا چاہئے۔

۵۔ سینٹ اسٹیفنس کالج (نئی دہلی) میں ۱۶ ستمبر ۱۹۹۸ کو ایک اجتماع (Assembly) تھا۔ اس میں کالج کے طلبہ اور اساتذہ شریک ہوئے۔ کالج کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور لوگوں سے خطاب کیا۔ ان کی تقریر کا موضوع تھا: اسلام کے بارے میں غلط فہمی۔ تقریر میں مختلف غلط فہمیوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کا جواب دیا گیا۔ اور اسلام کی صحیح تصور پیش کی گئی۔ ایک بات یہ کہی گئی کہ اسلام کو خود اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں دیکھنا چاہئے نہ کہ مسلمانوں کے عمل کی روشنی میں۔

۶۔ ساون کرپال روحانی مشن کا دس روزہ سمّیلن نئی دہلی میں ہوا۔ اس کی دعوت پر اس کے آخری دن ۲۰ ستمبر ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور روحانیت کے اسلامی تصور پر ایک تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ روحانیت کا مطلب دنیا سے الگ رہنا نہیں ہے۔ بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے اپنے اندر روحانی شخصیت کی تعمیر کرنا ہے۔

۷۔ ٹی وی ٹوڈے (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۲۵ ستمبر ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات سے متعلق تھا۔

ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ پچھلے پانچ سال کے اندر اس اعتبار سے ہندستان میں نمایاں فرق ہوا ہے۔ اب ملک میں پہلے کی طرح فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوتے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہندو مسلمان دونوں کی شعوری پختگی ہے۔ ۴۵ سالہ تجربہ کے بعد دونوں نے جان لیا ہے کہ فرقہ وارانہ فساد کا نقصان ہمیشہ دونوں فریقوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ ایک فرقہ کی طرف سے کوئی ناخوش گوار بات پیش آئے تو دوسرا فرقہ شدید رد عمل کا اظہار کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ فساد تھا۔ اب بھی ہمارے سماج میں ناخوشگوار واقعات ہوتے ہیں مگر کوئی فرقہ شدید رد عمل کا اظہار نہیں کرتا۔ اس لئے فساد کی نوبت بھی نہیں آتی۔

۸۔ گاندھی جینتی کے موقع پر اکتوبر ۱۹۹۸ کے پہلے ہفتہ میں بھوپال میں ایک سمینار ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور مختلف اجتماعات کو خطاب کیا۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۹۔ زی ٹی وی (نئی دہلی) نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۸ کو ایک پینل ڈسکشن ریکارڈ کیا۔ اس میں اسلام کی طرف سے صدر اسلامی مرکز اور ہندو دھرم کی طرف سے بیکنٹھ لال شرما پریم اور مسیحیت کی طرف سے فادر جوٹل ڈی کو نھا تھے۔ اس کا موضوع کنورزن تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مذہبی آزادی اور کنورزن دونوں لازم ملزوم ہیں۔ چونکہ انڈیا اپنے شہریوں کو مذہبی آزادی دینے کا پابند ہے اس لئے یہاں کے شہریوں کو کنورزن کا حق بھی لازماً حاصل رہے گا۔ یہ کہنا کہ کنورزن جبری ہوتا ہے بے معنی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ جبری کنورزن ہوا ہے۔ اس کے فیصلہ کا حق صرف کنورٹ کو ہے۔ کسی تھرڈ پارٹی کو اس کا حق ہرگز حاصل نہیں۔

۱۰ نشانت کمار (فری لانس جرنلسٹ) نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ملکی مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ آزادی کے بعد نہ ہندستان میں کوئی حقیقی ترقی ہوئی اور نہ پاکستان میں۔ ترقی کا معیار میرے نزدیک ایٹمی ہتھیار نہیں ہے۔ ترقی کا اصلی معیار یہ ہے کہ عوام کو امن اور خوشحالی ملے۔ دفتروں میں رشوت کے بغیر کام ہو۔ عدالتوں میں انصاف ملے۔ بازار میں چیزیں بغیر ملاوٹ کے مل رہی ہوں۔ خالص ہوا اور خالص پانی میسر ہو۔ یہ چیزیں نہ ہندستان کے لیڈر دے سکے اور نہ پاکستان کے لیڈر۔ البتہ دونوں ایٹمی دھماکہ کر کے اس پر فخر کر رہے ہیں۔ یہ کوئی ترقی کی بات نہیں۔

۱۱۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے موضوع پر ایک نئی کتاب تیار ہوئی ہے۔ اس کا نام مطالعۂ سیرت ہے۔ وہ ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس وقت زیر طبع ہے۔ انشاءاللہ جلد ہی شائع ہو جائے گی۔ یہ کتاب سیرت کا علمی اور تاریخی مطالعہ ہے۔

۱۲۔ ایک نئی کتاب چھپ کر آگئی ہے۔ جس کا نام ہے: اسلام ایک تعارف۔ یہ ۳۳۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے ابواب یہ ہیں --- اسلام کیا ہے، ایہا الناس، دین رحمت، اخلاقیات، حکمت اسلام، فلاح انسانیت۔ اس کتاب کا ہر مضمون ایک صفحہ پر مشتمل ہے۔ اس میں آسان انداز میں اسلام کی آفاقی تعلیمات کو بتایا گیا ہے۔ اس کا ایک باب (ایہا الناس) علیحدہ کتاب کی صورت میں انگریزی میں بھی چھپ گیا ہے اس کا نام یہ ہے:

The Qur'an for all Humanity

ہے۔مادی انسان صرف مخلوق کو دیکھتا ہے مگر روحانی انسان مخلوق میں خالق کا جلوہ پالیتا ہے، وہ مخلوق میں خالق کا تجربہ کرنے لگتا ہے۔اور ظاہر ہے کہ خالق کی یافت میں کسی آدمی کو جو چیز ملے گی وہ مخلوق کی یافت میں نہیں مل سکتی۔

مزید یہ کہ روحانی دنیا میں غم اور راحت دونوں بالکل ایک بن جاتے ہیں۔ روحانی انسان لذت کے تجربہ میں جو چیز پاتا ہے وہی بلکہ اس سے زیادہ بڑی چیز وہ اس سے محرومی میں پالیتا ہے۔اس کے لئے خوشی کے قہقہہ سے بھی زیادہ پر لذت، درد کے وہ آنسو ہوتے ہیں جو تڑپتے ہوئے دل سے نکلیں۔ خدا کی یاد خود اپنی ذات میں اس کے لئے تمام لذتوں سے زیادہ بڑی لذت بن جاتی ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: الا بذکر الله تطمئن القلوب (۲۸: ۱۳) یعنی اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔

یہاں اطمینان سے مراد حقیقی اطمینان ہے۔ وقتی یا سطحی قسم کا اطمینان وسکون تو آدمی کو کسی بھی چیز سے مل سکتا ہے۔ مگر حقیقی نوعیت کا اطمینان وسکون کا سرچشمہ صرف خالق ہی کی ذات ہو سکتی ہے۔انسان پیدائشی طور پر ایک معیار پسند مخلوق ہے۔ معیار سے کم تر درجہ کی کوئی چیز وقتی طور پر اس کے دل کو اپنی طرف مائل کر سکتی ہے۔ مگر حقیقی اور دیرپا سکون معیار کامل ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔

مادیت کی سطح پر جینا گویا حیوان کی سطح پر جینا ہے۔ مادیت دوسرے لفظوں میں سطحیت پسندی کا نام ہے۔ حقیقی انسان وہ ہے جو روحانیت کی اعلیٰ سطح پر اپنے لئے جینے کا راز پالے۔مادیت میں اگر لذتِ قہقہہ ہے تو روحانیت میں لذتِ درد۔مادیت اگر محدود میں جینا ہے تو روحانیت کا مطلب ہے لامحدود میں جینے کا راز پالینا (ڈاکٹر فریدہ خانم)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, Near DVB Office,
New Delhi-110013
Tel. 4626666, 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

فروری ۱۹۹۹ شمارہ نمبر ۲۶۷

فہرست	صفحہ

دین کے نام پر بے دینی

مدنی دور میں ایک بار ایک خلاف عادت واقعہ پیش آیا۔ اس کا تعلق حضرت عائشہ صدیقہؓ سے تھا۔ اس واقعہ کو خود ساختہ مفہوم دے کر کچھ لوگوں نے ایک بیہودہ افسانہ بنایا۔ یہ لغو افسانہ فوراً ہی سارے مدینہ میں پھیل گیا۔ اپنے خیال میں وہ اشاعت حق کر رہے تھے مگر اصل حقیقت کے اعتبار سے وہ صرف اِشاعت باطل تھی۔ چنانچہ وہ کیفیت ہو گئی جس کو قرآن (النور ۱۵) میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: جب کہ تم اس جھوٹ کو اپنی زبانوں سے نقل در نقل کر رہے تھے (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی) یہ فتنہ صرف اس وقت ختم ہوا جب کہ سورہ النور اتری اور براہ راست آسمانی وحی کے ذریعہ اس کی تردید کر دی گئی۔

اس سلسلہ میں سورہ النور میں مسلمانوں کو کچھ ہدایات دی گئیں تاکہ وہ آئندہ اس قسم کی مجرمانہ غلطی کا اعادہ نہ کریں۔ ان میں سے ایک خاص ہدایت یہ تھی۔۔۔ ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ بات سنی تو مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کی بابت خیر کا گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ تو ایک کھلا ہوا بہتان ہے (النور ۱۲) اس کی تفسیر میں ابن کثیر نے لکھا ہے۔۔۔ یعنی اس بات کو وہ خود اپنے اوپر قیاس کرتے۔ پس اگر وہ خود ان کے لئے مناسب نہ تھا تو ام المومنین زیادہ مستحق ہیں کہ وہ اس سے بری ہوں (تفسیر ابن کثیر ۳/۲۷۳)

جب کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان کے بارے میں کوئی بدگمانی پیدا ہو تو پہلے ہی مرحلہ میں یہ سوچ کر اس کو رد کر دینا چاہیے کہ کیا میں ایسا کر سکتا ہوں اور جب اس کا ضمیر یہ کہے کہ میں تو ایسا نہیں کروں گا تو اسی پر قیاس کر کے سمجھ لینا چاہیے کہ دوسرے مسلمان نے بھی یقیناً ایسا نہیں کیا ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے مواقع پر ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کون واقعی صاحب ایمان ہے اور کون ایمان کا صرف دعویدار ہے۔ کسی کے دین پر قائم ہونے کا ثبوت یہ نہیں ہے کہ وہ انقلاب خیر کا نعرہ لگاتا ہو۔ اس کا اصل ثبوت یہ ہے کہ وہ خود عملاً ظن خیر کے مذکورہ قرآنی اصول پر قائم ہو۔ انقلاب خیر کا نعرہ لگانا

صرف دین کے نام پر لیڈری ہے اور ظن خیر کے اصول پر خود قائم ہونا حقیقی معنوں میں دین خداوندی کی پیروی

حضرت عائشہ صدیقہ کا یہ قصہ تذکیر القرآن یا تفسیر کی دوسری کتابوں میں سورہ النور کی تفسیر کے تحت دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں اس کی تفصیلات نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

قابل لحاظ بات یہ ہے کہ حضرت عائشہ معروف طور پر مدینہ کی ایک باعزت خاتون تھیں۔ ان کی پوری زندگی اسلام کی خدمت میں گزری تھی۔ مدینہ کے کچھ لوگوں نے آپ کے ایک واقعہ کو لے کر اس کو شوشہ بنایا اور اسے آپ کو بدنام کرنے کے لئے استعمال کیا۔ مگر انھیں لوگوں نے کبھی یہ نہیں کیا تھا کہ وہ حضرت عائشہ کی اعلیٰ دینی خدمات کا چرچا کریں۔ ان کی مجلسیں حضرت عائشہ کے تذکرہ سے اس طرح خالی تھیں جیسے کہ مدینہ میں نہ کوئی عائشہ ہیں اور نہ ان کی کوئی دینی خدمات۔

مگر جیسے ہی انھیں حضرت عائشہ کے بارہ میں ایک ایسی بات ملی جس کو خود ساختہ مفہوم دے کر وہ اس کو آپ کے خلاف استعمال کر سکیں تو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ان کا پورا گروہ متحرک ہو گیا۔ اس نے اپنے تمام ذرائع کو استعمال کر کے اس جھوٹے قصہ کو پھیلایا۔ انھوں نے ایک ایک شخص کے کان میں اس کو ڈال کر اسے حضرت عائشہ سے بدگمان کرنے کی کوشش کی۔ حتی کہ پورے مدینہ کو ان کے خلاف بدگمانیوں اور افواہوں سے بھر دیا۔ اپنے خیال کے مطابق، یہ لوگ ایک "واقعہ" کی اشاعت کر رہے تھے مگر اللہ کے نزدیک وہ بدترین قسم کے مجرم تھے۔ ایسا کر کے وہ خدا کے دین کی کوئی خدمت نہیں کر رہے تھے بلکہ صرف شیطان کے مقصد کو پورا کر رہے تھے۔

ایک شخص جو اللہ کی پکڑ سے ڈرتا ہو، اس پر فرض کے درجہ میں لازم ہے کہ وہ حقائق کی بنیاد پر رائے قائم کرے نہ کہ شوشوں کی بنیاد پر۔ اگر کبھی کوئی غلط فہمی ہو جائے تو متعلقہ شخص سے مل کر اپنی غلط فہمی کو رفع کیا جائے نہ کہ اس کو حقیقت سمجھ کر اس کا عمومی چرچا کیا جانے لگے۔

اسی قسم کے کردار کا نام منافقانہ کردار ہے اور قرآن کے مطابق، منافقانہ کردار والے لوگوں کے لئے کافروں سے بھی زیادہ سخت سزا مقرر ہے، الا یہ کہ وہ توبہ کریں اور کھلے طور پر اپنی مجرمانہ روش کا اقرار کر کے متعلقہ اشخاص سے معافی مانگیں۔

توحید۔ انسانیت کی منزل

توحید کا مطلب ایک خدا کو ماننا ہے اور اپنے سارے دل اور اپنے سارے دماغ کے ساتھ اس سے وابستہ ہو جانا ہے۔ یہی خدا انسانیت کی منزل ہے۔ اس دنیا میں وہی انسان کامیاب ہے جو ایک خدا کو اپنا سب کچھ بنالے۔ ہر انسان ایک نامکمل وجود ہے۔ خدا کے ساتھ وابستہ ہو کر وہ اپنے آپ کو مکمل کرتا ہے۔ خدا انسانیت کے تمام تقاضوں کی واحد تکمیل ہے۔

ہر انسان ایک روحانی تلاش میں ہے۔ ہر انسان اپنے لئے سکون واعتماد کا ایک مرکز چاہتا ہے۔ یہ مرکز صرف ایک خدا ہے۔ خدا انسان کی روحانی تلاش کا واحد جواب ہے۔ جس انسان نے خدا کو پالیا، اس نے گویا وہ سب کچھ پالیا جس کو وہ اپنے فطری تقاضے کے تحت پانا چاہتا تھا۔

موجودہ دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے انسان کو ایک دستور حیات درکار ہے جو اس کو بتائے کہ لوگوں کے درمیان اس کو کس طرح رہنا ہے اور کس طرح نہیں رہنا ہے۔ جو اس کو زندگی کی گائڈ بک عطا کرے۔ انسان کی اس طلب کا ماخذ بھی خدا ہے۔ خدا ہی انسان کو وہ قابل اعتماد رہنمائی دیتا ہے جس کی مدد سے وہ روشنی اور اندھیرے میں یکساں طور پر درست سفر کر سکے۔

خدا انسان کا خالق اور مالک ہے۔ وہی اس کا حق دار ہے کہ وہ انسان کو بتائے کہ زندگی کیا ہے اور موت کیا ہے۔ انسانیت کا قافلہ کہاں سے شروع ہوا اور وہ کہاں جارہا ہے۔ وہ صحیح راستہ کیا ہے جس پر چل کر وہ بھٹکے بغیر منزل پر پہنچ سکے۔

ہر انسان کی سب سے پہلی اور سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ وہ اس خدا کو پائے، وہ اپنے آپ کو خدا سے وابستہ کرے، وہ اس سے محبت کا تعلق قائم کرے۔ وہ اپنی پوری زندگی کا رخ خدا کی طرف موڑ دے۔ خدا رخی زندگی (God oriented life) ہی اس دنیا کی واحد درست زندگی ہے۔ جو ایسی زندگی کو اپنائے وہی کامیاب ہے اور جو ایسا نہ کر سکے وہی محروم اور ناکامیاب۔

توحید اور شرک

قرآن خدا کی کتاب ہے۔ قرآن خدا کی مرضی کا مستند اعلان ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ انسان کے لئے کون سا راستہ فلاح کا راستہ ہے اور کون سا راستہ خسران کا راستہ۔ انسانی زندگی کے دستور کے لئے قرآن ہی واحد مستند ماخذ ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان حالت امتحان میں ہے۔ یہ امتحان کس چیز میں ہے اسی کو بتانے کے لئے خدا نے قرآن اتارا۔

قرآن کے مطابق، شرک کا عقیدہ تمام انسانی برائیوں کی جڑ ہے۔ اس کے مقابلہ میں توحید کا عقیدہ تمام انسانی خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ قرآن میں واضح الفاظ میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ ۔۔۔ بے شک اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے۔ لیکن اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کو جس کے لئے چاہے گا بخش دے گا۔ اور جس نے کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرایا اس نے بڑا طوفان باندھا۔ (النسائ۔۴۸)

توحید کی حقیقت

توحید کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو ایک مانا جائے۔ یہ یقین کیا جائے کہ تمام طاقتیں اور ہر قسم کے اختیارات صرف ایک خدا کو حاصل ہیں۔ وہی تنہا عبادت کا مستحق ہے۔ عبادت کی قسم کا کوئی بھی فعل خدا کے سوا کسی اور کے لئے جائز نہیں۔ خدا ہی انسان کی مرادیں اور حاجتیں پوری کرتا ہے۔ خدا ہی کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔ برتری صرف ایک خدا کا حق ہے، کسی اور کو اس دنیا میں حقیقی برتری حاصل نہیں۔ ایسا ہر عقیدہ باطل ہے جس میں ان تمام پہلوؤں میں خدا کے سوا کسی اور کو شریک کیا جائے۔

قرآن میں توحید کے عقیدہ کو ایک آیت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔۔۔ اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ ہے، سب کا تھامنے والا۔ اس کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ کون ہے جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش

کرے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔ اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے، مگر جو وہ چاہے۔ اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے۔ وہ تھکتا نہیں ان کے تھامنے سے اور وہی ہے بلند مرتبہ والا اور بڑا (آل عمران۔ ۲۵۵)

خدا کی پرستش کرنا اپنے خالق و مالک کی پرستش کرنا ہے جو واقعی طور پر انسان کی پرستش کا حق دار ہے۔ اس کے برعکس کوئی آدمی جب غیر خدا کے آگے سر جھکاتا ہے تو وہ اپنے جیسی ایک مخلوق کے آگے سر جھکاتا ہے جو اس کا حقدار نہیں کہ اس کے آگے سر جھکایا جائے۔ خدا کی پرستش انسان کو عظمت عطا کرتی ہے اور غیر خدا کی پرستش اس کو پستی میں گرا دیتی ہے۔ خدا کی پرستش انسان کو حقیقت پسند بناتی ہے اور غیر خدا کی پرستش اس کو توہمات میں مبتلا کر دیتی ہے۔ خدا کی پرستش سے معرفت حق کے دروازے کھلتے ہیں اس کے برعکس آدمی جب غیر خدا کی پرستش کرتا ہے تو وہ حق کی معرفت کے دروازوں کو اپنے اوپر بند کر لیتا ہے۔

توحید صرف ایک ہے، مگر شرک کی ہزاروں قسمیں ہیں۔ موحد انسان کا مرکزِ توجہ اور مرکزِ عبودیت صرف ایک خدا ہوتا ہے۔ وہ ہر حال میں اور اپنی پوری زندگی میں اسی ایک خدا کو اپنا سب کچھ بنائے ہوئے رہتا ہے۔ مگر مشرک انسان کا کوئی ایک مرکزی نقطہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ شرک کی بے شمار قسمیں بن جاتی ہیں۔۔۔ ستارہ پرستی، زمین پرستی، بت پرستی، ارباب پرستی، قبر پرستی سے لے کر نفس پرستی، دولت پرستی، اقتدار پرستی، مفاد پرستی، اولاد پرستی وغیرہ

یہ تمام چیزیں درجہ بدرجہ غیر اللہ کی پرستش میں شامل ہیں۔ اور قرآن میں ان کی کھلی مذمت کی گئی ہے۔ موحد انسان وہ ہے جو ہر قسم کی برتر حیثیت صرف ایک خدا کو دے۔ اسی سے اپنی مراد مانگے۔ اسی کے سامنے مراسم پرستش بجالائے، اسی پر سب سے زیادہ بھروسہ کرے، اسی کو ہر اعتبار سے برتر حیثیت دے۔ پرستش کسی سے تعلق کے اظہار کا آخری درجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرستش کی تمام صورتیں صرف ایک خدا کا حق ہیں۔ پرستش کی نوعیت کی کوئی چیز کسی غیر

خدا کے لئے جائز نہیں۔

آدمی جب خدا کو اپنا معبود بناتا ہے تو وہ ایک ایسی ہستی کو اپنا معبود بناتا ہے جو حقیقی طور پر موجود ہے۔ اس کے برعکس جب کوئی آدمی غیر خدا کو اپنا معبود بنائے تو اس نے ایک ایسی چیز کو اپنا معبود بنایا جس کا واقعات کی دنیا میں سرے سے کوئی وجود ہی نہیں، خواہ بظاہر اس نے اس مفروضہ معبود کی ایک صورت بنا کر اپنے سامنے رکھ لی ہو۔ جو آدمی خدا کو اپنا معبود بنائے اس نے طاقت کے حقیقی سرچشمہ کو پالیا۔ اس کے برعکس جو آدمی غیر خدا کو اپنا معبود بناتا ہے وہ ایک ایسے توہماتی مفروضہ سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے جس کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں۔ خدا کا عبادت گزار ابدی سعادت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس غیر خدا کے عبادت گزار کے لئے ابدی محرومی کے سوا کوئی اور چیز نہیں۔

خدا کائنات کا نور

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (النور ۳۵) یعنی اس پوری کائنات میں جہاں بھی کوئی روشنی ہے وہ خدا کی ذات سے ہے۔ خدا اگر روشنی نہ دے تو کہیں اور سے کسی کو بھی روشنی ملنے والی نہیں۔

سورج اگر نہ ہو تو زمین پر ہر طرف اندھیرا چھا جائے۔ اسی طرح اگر ستارے نہ ہوں تو ساری کائنات گہری تاریکی میں ڈوب جائے۔ خدا نے ساری کائنات میں بے شمار تعداد میں انتہائی روشن قسم کے متحرک اجسام پھیلا دئے ہیں جو کائنات کے ہر حصہ کو مسلسل طور پر روشنی کا تحفہ دے رہے ہیں۔ اگر یہ کائناتی انتظام نہ ہو تو دنیا اپنی ساری وسعتوں کے باوجود تاریکی کا ایک بھیانک غار بن جائے گی۔

یہ مادی روشنی کا معاملہ ہے۔ یہی معاملہ فکری اور روحانی روشنی کا ہے۔ اس دنیا میں بسنے والے ہر انسان کو ضرورت ہے کہ اس کے ذہن کو وہ رہنمائی ملے جس کی روشنی میں وہ صحیح طور پر

سوچے اور اس کو وہ روحانی خوراک ملے جو اس کے سینہ میں حکمت حیات کا باغ اگادے۔ اس فکری اور روحانی روشنی کا سرچشمہ بھی صرف اور صرف خداوند ذوالجلال ہے۔ یہ روحانی روشنی بھی ایک خدا کے سوا کہیں اور سے انسان کو ملنے والی نہیں۔

آدمی جب خدائے واحد پر سچا یقین کرتا ہے تو نفسیاتی سطح پر خدا سے اس کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد روحانی تاروں پر اس کی پوری ہستی جگمگا اٹھتی ہے۔ وہ اپنی یادوں میں خدا کو پانے لگتا ہے۔ وہ اپنے آنسوؤں میں خدا کی جھلک دیکھنے لگتا ہے۔ اس کی سوچ اور جذبات میں خدا اس طرح بس جاتا ہے جیسے کہ وہ خدا کے پڑوس میں پہنچ گیا ہو، جیسے کہ وہ خدا کے رحمت بھرے سایہ میں زندگی گزارنے لگا ہو۔

قرآن میں شرک کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے (لقمان ۱۳) ظلم کا مطلب ہے کسی چیز کو غیر جگہ پر رکھ دینا (وضع الشی فی غیر موضعہ) یعنی شرک (خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک کرنا) اس کائنات میں سراسر اجنبی ہے۔ اس دنیا میں شرک کا عقیدہ رکھنے یا مشرکانہ فعل کرنے کے لئے کائنات میں کوئی جگہ نہیں۔

اس دنیا کا خالق ایک ہی خدا ہے۔ وہی اس کا مالک ہے۔ وہی اس کو سنبھالنے والا ہے۔ اسی کے پاس ہر قسم کے اختیارات ہیں۔ ایسی حالت میں جو شخص خدا کے سوا کسی اور کو خدا ماننے یا کسی اور کو خدا کی خدائی میں شریک کرے اس نے ایک خود ساختہ مفروضہ کو واقعی حقیقت کا درجہ دیا۔ اس نے ایک ایسی چیز کو موجود فرض کیا جس کا اس دنیا میں سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔

مشرکانہ طرز فکر تمام برائیوں میں سب سے بڑی برائی ہے۔ جس آدمی کا ذہن مشرکانہ طرز پر سوچے، جس آدمی کے دل میں مشرکانہ خیالات پرورش پائیں، وہ ایک بے حقیقت چیز کو اختیار کرتا ہے۔ کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کی تردید کرتی ہے۔

شرک کا عقیدہ یا نظریہ آدمی کو فکری غذا دینے والا نہیں۔ وہ اس کو اس روحانی روشنی

سے منور کرنے والا نہیں جس کے بغیر آدمی کا پورا وجود ہی اس دنیا میں بے معنی ہو جاتا ہے۔

توحید اور شرک کا فرق

توحید کا مطلب خالق کو پالینا ہے اور شرک کا مطلب یہ ہے کہ آدمی مخلوقات میں اٹک کر رہ جائے۔ توحید حقیقت کی سطح پر جینے کا نام ہے اور شرک کا مطلب توہمات کی سطح پر جینے کا نام۔ توحید اپنی فطرت کی دریافت کا نتیجہ ہے اور شرک اپنی فطرت سے بے خبری کا نتیجہ۔ اہل توحید ہی اس دنیا کے مطلوب انسان کی حیثیت رکھتے ہیں کیوں کہ یہی لوگ ہیں جو خالق کی منشا کے مطابق ہیں۔

دنیا کے بنانے والے نے اس کو جس منصوبے کے تحت بنایا ہے اہل توحید اس منصوبہ الٰہی کی تکمیل کر رہے ہیں۔ وہ اسی نقشہ پر ہیں جس نقشہ پر انسان کو ہونا چاہئے۔ اہل توحید خدا کے مطلوب انسان ہیں۔ وہ دنیا میں دنیا کے مالک کی مرضی کو پورا کر رہے ہیں۔

شرک اور اہل شرک کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ شرک خدا کی دنیا میں ایک اجنبی تصور ہے۔ اہل توحید اگر اس دنیا میں مطلوب لوگ (wanted people) ہیں تو اہل شرک اس کے برعکس غیر مطلوب لوگ (unwanted people)۔ شرک کے عقیدہ کو اس دنیا میں اس کے مالک کی سند حاصل نہیں۔ شرک کی روش اس دنیا میں ایک ایسی روش ہے جس کی اجازت دنیا کے مالک نے دنیا میں بسنے والوں کو نہیں دی۔

گول خانہ میں کوئی چوکور چیز رکھی جائے تو وہ اس کے اندر فٹ نہیں بیٹھے گی۔ جب کہ گول خانہ میں گول چیز بالکل فٹ بیٹھ جاتی ہے۔ یہی معاملہ توحید اور شرک کا ہے۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے صرف توحید کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے توحید کا تصور یا موحدانہ زندگی اس کی فطرت کے عین مطابق ہے جب کہ شرک کا عقیدہ یا مشرکانہ زندگی انسانی فطرت کے مطابق نہیں۔

مشرک انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہو تا ہے۔ غیر خدائی چیزیں اس کی توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس لئے پیش آنے والے مختلف حالات میں اس کا رویہ بھی انھیں غیر خدائی ہستیوں کی نسبت سے متعین ہو تا ہے۔ وہ اپنی کامیابی میں بھی انھیں کی طرف دوڑ تا ہے اور ناکامی میں بھی وہ انھیں کی پناہ تلاش کرنا چاہتا ہے۔

اس کی مفروضہ غیر خدائی ہستیاں ہی ہر صورت حال میں اس کے دل و دماغ پر چھائی رہتی ہیں۔ موحد انسان اگر اپنے تجربات سے توحید کی غذا پاتا رہتا ہے تو مشرک انسان کے لئے اس کے تجربات مشرکانہ غذا کے حصول کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

آدمی ہر لمحہ کچھ حالات کے درمیان جیتا ہے۔۔۔ خوشی کے حالات یا غم کے حالات، تکلیف کے حالات یا آرام کے حالات، کامیابی کے حالات یا ناکامی کے حالات، اختیار و اقتدار کے حالات یا بے اختیاری کے حالات، غلبہ کے حالات یا مغلوبیت کے حالات، موافق حالات یا غیر موافق حالات۔ ان مختلف حالات میں ایک رویہ (response) موحدانہ رویہ ہے اور دوسرا رویہ مشرکانہ رویہ۔

موحد انسان خدا کی عظمت میں جی رہا ہو تا ہے اس لئے اس کی زندگی میں پیش آنے والا ہر واقعہ اس کو خدا کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ اس کا رویہ ہر موقع پر وہی ہو تا ہے جو اس کے عقیدۂ توحید کے مطابق ہو۔ وہ ہر صورت حال میں ایک سچا خدا پرست انسان ثابت ہو تا ہے۔ وہ زندگی کے اتار چڑھاؤ میں اپنے اعتدال کو نہیں کھوتا۔ وہ خواہ جس حال میں ہو، ہمیشہ اپنے خدا سے وابستہ رہتا ہے۔ خدا اس کی تمام توجہات کا مرکز بن جاتا ہے، وہ کسی بھی حال میں اس سے نہیں ہٹتا۔

توحید خدا کی نظر میں سب سے زیادہ باقیمت چیز ہے اور شرک خدا کی نظر میں سب سے زیادہ بے قیمت چیز۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس معاملہ کا تعلق اس انتہائی مخصوص چیز سے ہے جو انسان کا سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ ہے۔ اور وہ ہے کسی سے گہرا قلبی تعلق۔ یہ انسان کی سب سے

زیادہ اعلیٰ متاع ہے۔ اسی گہرے قلبی تعلق کا صرف ایک خدا سے وابستہ ہو جانے کا نام توحید ہے۔ اگر یہ گہری وابستگی خدا کے سوا کسی اور سے ہو تو اسی کا نام شرک ہے۔

اس گہرے قلبی تعلق کا اظہار دو قسم کے جذبات کی صورت میں ہوتا ہے۔ ایک محبت، اور دوسرے خوف۔ قرآن میں موحد انسان کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ اس کو سب سے زیادہ محبت صرف ایک خدا سے ہوتی ہے (البقرہ ۱۶۵) اور سب سے زیادہ خوف بھی صرف ایک خدا سے (التوبہ ۱۸)

یہ حب شدید اور خوف شدید صرف اس ہستی کا حق ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے، جو اس کا مالک اور رب ہے۔ جو آدمی یہ مخصوص تعلق کسی اور سے قائم کرے تو اس نے شرک کیا۔ اس نے وہ چیز کسی اور کو دے دی جو صرف ایک خدا کا حصہ تھی۔

آدمی کو جس چیز سے یہ گہرا قلبی تعلق ہو جائے وہ ہر لحہ اس کے بارہ میں سوچتا ہے۔ اس کے جذبات میں وہی ہر وقت سمایا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اسی کو پانے سے خوش ہوتا ہے، اس سے محرومی کا اندیشہ اس کو تڑپا دیتا ہے۔ اس کے دل میں شوق کا طوفان اٹھتا ہے تو اسی کے لئے اٹھتا ہے۔ اس کو چھننے کا خوف ہوتا ہے تو اسی سے۔ وہ پانے کی امید رکھتا ہے تو اسی سے۔ اس کی آنکھیں روتی ہیں تو اسی کو یاد کر کے روتی ہیں۔ اس کی سوچ پر غلبہ رہتا ہے تو صرف اسی ایک کا غلبہ رہتا ہے۔ اس کا وجود کسی کے آگے ڈھ پڑتا ہے تو وہ صرف یہی ایک اعلیٰ اور برتر ذات ہوتی ہے۔

اسی لطیف انسانی جذبہ کو عبودیت کہا جاتا ہے۔ اس جذبۂ عبودیت میں خدا کسی کی شرکت کو گوارا نہیں کرتا۔ اس جذبۂ عبودیت کا مستحق صرف ایک خدائے عظیم ہے، اس کے سوا کوئی نہیں جو ادنیٰ درجہ میں بھی اس کا مستحق ہو۔

پیغمبروں کا مشن

پچھلے زمانوں میں خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے وہ سب اسی لئے آئے کہ وہ انسان کو

شرک سے ڈرائیں اور انھیں توحید کی تعلیم دیں، تاکہ انسان اس کے مطابق، اپنی زندگی کی اصلاح کرے اور دنیا اور آخرت کی سعادت حاصل کر سکے۔ مگر انسانیت کی لمبی تاریخ میں تقریباً ہر پیغمبر کے ساتھ ایسا ہوا کہ لوگوں کی زیادہ تعداد نے ان کی بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ خاص طور پر سماج کے بڑے لوگ کبھی پیغمبر کو ماننے یا ان کا ساتھ دینے پر راضی نہیں ہوئے۔ اس تاریخی واقعہ کو قرآن میں اس طرح بتایا گیا ہے۔۔۔ افسوس ہے بندوں کے اوپر، جو رسول بھی ان کے پاس آیا وہ اس کا مذاق ہی اڑاتے رہے (یٰسین: ۳۰)

خدا کے پیغمبروں کو نظرانداز کرنے کا یہ معاملہ اس حد تک بڑھا کہ پچھلے دور میں آنے والے پیغمبروں کو انسانی تاریخ کے ریکارڈ سے حذف کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ماضی کی مدون تاریخ میں بادشاہوں کی داستانیں تو پڑھتے ہیں مگر پیغمبروں کا تذکرہ مدون تاریخ میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ اس معاملہ میں صرف پیغمبر اسلام ﷺ کا واحد استثنا ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد حاصل ہوئی۔ چنانچہ آپ نے پہلی بار ردّ شرک اور اثبات توحید کی تحریک کو ایک ایسی زندہ تحریک بنا یا جس نے اس تحریک کو فکری مرحلہ سے اٹھا کر عملی انقلاب کے مرحلہ تک پہنچا دیا اور اس کی ایک مستقل تاریخ بنا دی۔

ردّ شرک اور اثبات توحید کی یہ تحریک قدیم زمانہ میں کیوں عملی انقلاب کے درجہ تک نہ پہنچ سکی۔ اس کا سبب خاص طور پر دو تھا۔ ایک بادشاہت کا نظام، دوسرے، توہماتی افکار کا غلبہ۔ یہی دو بنیادی اسباب تھے جو پیغمبروں کے مشن کے خلاف ایک مستقل رکاوٹ بنے رہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ سے پہلے کے دور میں مشرکانہ بادشاہت کا نظام قائم تھا۔ موجودہ زمانہ میں جمہوری سیاست کا اصول رائج ہے۔ سیاسی لیڈر عوامی ووٹوں کے ذریعہ اپنے لئے حکمرانی کا حق حاصل کرتے ہیں۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ اس کے برعکس یہ کرتے تھے کہ وہ لوگوں کو یہ یقین دلا کر حکومت کرتے تھے کہ ہم خدا کے نمائندے ہیں۔ ہم خدا کی اولاد ہیں۔ اسی نظریہ کے تحت

قدیم زمانہ میں سورج ونشی اور چندر ونشی کا عقیدہ پیدا ہوا۔ گویا موجودہ زمانہ میں حکومت کی بنیاد سیکولر جمہوریت ہے جب کہ قدیم زمانہ میں حکومت کی بنیاد مشرکانہ عقیدہ پر ہوتی تھی۔ اسی واقعہ کی طرف قرآن میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: انا ربکم الاعلی (النازعات ٢٤) اس بنا پر یہ بادشاہوں کے عین سیاسی مفاد میں تھا کہ شرک کا عقیدہ دنیا میں قائم رہے۔

چنانچہ ان کی خصوصی سرپرستی کے تحت عبادت گاہ سے لے کر جینے مرنے کی رسموں تک زندگی کا پورا نظام شرک کے اوپر قائم ہو گیا تھا۔

یہ مشرکانہ نظام قدیم زمانہ میں ہزاروں سال تک تمام دنیا میں چھایا رہا۔ بادشاہوں کی سرپرستی کی بنا پر یہ مشرکانہ نظام اتنا زیادہ طاقتور ہو گیا کہ وہ ہمیشہ پیغمبروں کے خلاف ایک موثر رکاوٹ بنا رہا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ قدیم زمانہ میں پیغمبروں کی تحریک صرف پیغام رسانی کے مرحلہ تک محدود رہی، وہ وسیع تر عملی انقلاب کے مرحلہ تک نہ پہنچ سکی۔

اس سلسلہ میں دوسری رکاوٹ وہ تھی جس کو توہماتی افکار کا دور کہا جا سکتا ہے۔ قدیم زمانہ میں جب کہ جدید قسم کی سائنسی دریافتیں نہیں ہوئی تھیں، انسان فطرت کے مظاہر کی صحیح نوعیت کو نہیں سمجھ پایا تھا۔ وہ دیکھتا تھا کہ دنیا میں مختلف قسم کی حیران کن چیزیں ہیں۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ اور سمندر، زمین اور آسمان، درخت اور حیوانات وغیرہ وغیرہ۔ مظاہر کے اس تعدد کو دیکھ کر انسان اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ ان کے خالق بھی کئی ہیں یا یہ کہ مختلف مظاہر خود مختلف خداؤں کا ظہور ہیں۔ اس طرح تعدد مظاہر کی بنا پر تعدد الٰہ کا نظریہ پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ سورج اور چاند کو ان کے غیر معمولی پن کی بنا پر خدا یا دیوتا سمجھا جانے لگا۔ انسان کے لئے یہ ناقابل یقین ہو گیا کہ جب مخلوقات میں اتنا زیادہ تنوع اور تعدد ہے تو ان سب کا خدا ایک کیسے ہو سکتا ہے۔

اسی حقیقت کی طرف خدا کے پیغمبر حضرت ابراہیم نے ان الفاظ میں اشارہ کیا تھا: رب انهن اضللن كثيراً (ابراهيم ٣٦) یعنی فطرت کے یہ نمایاں مظاہر (سورج، چاند وغیرہ) نے

انسان کو دھوکہ میں ڈال دیا۔ لوگ انہیں مظاہر کو عظیم سمجھنے لگے۔ حالانکہ انھیں چاہیے تھا کہ وہ ان تمام چیزوں کو عظیم خدا کی مخلوق سمجھیں۔ مگر اس کے برعکس انھوں نے خود مخلوقات ہی کو خدا سمجھ کر ان کو پوجنا شروع کر دیا۔ موجودہ زمانہ میں مذکورہ دونوں افسانوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ایک طرف جمہوری افکار کے ذریعہ ساری دنیا میں جو طاقتور سیاسی انقلاب آیا اس نے قدیم طرز کی مشرکانہ بادشاہت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ اب آج کی دنیا میں قدیم طرز کے بادشاہوں کا کہیں وجود نہیں۔ وہ جدید جمہوریت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ اس جدید سیاسی انقلاب کے بعد مشرکانہ عقیدہ یا مشرکانہ نظام اس موثر سرپرستی سے محروم ہو گیا جو ردّ شرک اور اثبات توحید کی دعوت میں طاقتور رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اب یہ امکان پوری طرح کھل گیا ہے کہ پیغمبرانہ دعوت کو بھرپور طور پر جاری کیا جائے اور اس کو اس طرح چلایا جائے کہ اول سے آخر تک کسی بھی مرحلہ میں اس کو کسی مزاحمت کا خطرہ نہ ہو۔

سائنس کے دور میں

اسی طرح جدید سائنس کے ظہور نے شرک کی دوسری بنیاد کو بھی ختم کر دیا۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی دریافتوں کے ذریعہ یہ افسانہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا کہ فطرت کے مظاہر میں کوئی حقیقی تعدد ہے یا انھیں کوئی ذاتی عظمت حاصل ہے۔

جدید سائنس نے ایک طرف یہ کیا کہ اپنے تجزیہ اور تجربہ کے ذریعہ آخری طور پر یہ ثابت کر دیا کہ تمام چیزیں، ظاہری تعدد کے باوجود، اپنے آخری تجزیہ میں صرف ایٹم کا مجموعہ ہیں۔ اور ایٹم برقیاتی لہروں کا مجموعہ ہے۔ اس دریافت کے بعد فطرت میں تعدد کا افسانہ ختم ہو گیا۔ تمام چیزیں ظاہری فرق کے باوجود، اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ثابت ہو گئیں۔ گویا علم کی اگلی ترقی نے مشرکانہ نظریہ کو رد کر کے توحید کے نظریہ کے لئے ایک ثابت شدہ بنیاد فراہم کر دی۔

اسی کے ساتھ جدید سائنس نے دوسری بات یہ ثابت کی کہ زمین میں یا وسیع خلا میں جتنی بھی چیزیں ہیں وہ سب کی سب بے بس مخلوق ہیں۔ سب کی سب ایک محکم قانون فطرت میں بندھی ہوئی ہیں۔ انھیں کسی بھی درجہ میں کوئی ذاتی اختیار یا اقتدار حاصل نہیں۔

اسی کے ساتھ ایک اور بات ثابت ہو گئی جو عقیدۂ شرک کے سراسر خلاف اور عقیدۂ توحید کے سراسر موافق ہے۔ وہ یہ کہ ساری کائنات اپنے تمام مختلف اجزا کے ساتھ ایک ہی قانون فطرت کے تحت چل رہی ہے جس کو سائنس داں اپنی زبان میں واحد ڈوری (single string) سے تعبیر کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ خود علم انسانی کی دریافتوں کے مطابق کائنات کا صرف ایک خدا ہے۔ اس کے سوا نہ کوئی خدا ہے اور نہ کوئی معبود۔ شرک کی اصل توہماتی طرز فکر (superstitious thinking) میں ہے۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی تحقیقات نے قدیم زمانہ کے توہمات (superstitions) کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ اس طرح شرک کی جڑیں موجودہ زمانہ میں خالص علمی اعتبار سے ختم ہو گئیں۔ اب کوئی سائنٹفک ذہن (scientific mind) شرک کو بطور حقیقت ماننے کے لئے تیار نہیں۔ تاہم ابھی تک شرک کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا۔

پہلے زمانہ میں انسان یہ عقیدہ قائم کئے ہوئے تھا کہ فلاں فلاں دیوی دیوتا ہیں جو ہوائیں چلاتے ہیں، جو بارش برساتے ہیں، جو پراسرار طور پر ان واقعات کے پیچھے کام کر رہے ہیں جن کو ہم صبح و شام دیکھتے ہیں۔ مگر اب سائنسی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ سب واقعات معلوم فطری قوانین (laws of nature) کے تحت ظہور میں آتے ہیں۔ وہ کسی پراسرار دیوی یا دیوتا کا کرشمہ نہیں۔ اس طرح قدیم طرز کے شرک کا اب بڑی حد تک خاتمہ ہو چکا ہے۔

ایک جاہل اور بے خبر شخص نے جب پہلی بار ایک کار کو دوڑتے ہوئے دیکھا تو اس نے سمجھا کہ یہ کوئی جادوگر ہے جو اپنے لوہے کے کمرہ کو جادو کے زور پر دوڑا رہا ہے۔ مگر ایک باخبر انجینئر اس قسم کی بات کو مضحکہ خیز سمجھے گا۔ کیوں کہ اس کو یقین ہو گا کہ ایسا کوئی جادو واقعہ

میں موجود ہی نہیں۔

اسی طرح مشرکانہ عقائد یا فرضی معبودوں کا نظام موجودہ زمانہ کے ایک تعلیم یافتہ انسان کے لئے پوری طرح مضحکہ خیز بن چکا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ بارش کا برسنا یا فصل کا اگنا اور اس طرح کے دوسرے واقعات تمام تر فطرت کے اصولوں پر مبنی (based) ہیں۔

قدیم توہماتی دور میں شرک کا عقیدہ قابل قبول ہو سکتا تھا۔ مگر اب ترقی یافتہ علم کے زمانہ میں شرک کا پورا ڈھانچہ عقیدہ سے لے کر عمل تک، سراسر بے اصل قرار پا چکا ہے۔ ترقی یافتہ زمانہ میں شرک کا جو حال ہوا اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی اندھیرے کمرے کے بارے میں یہ سمجھ لیا جائے کہ اس کے اندر بڑی بڑی سینگوں والا کوئی خطرناک عفریت بیٹھا ہوا ہے۔ مگر جب کمرہ کو روشن کیا جائے تو معلوم ہو کہ وہاں ایسی کوئی چیز سرے سے موجود ہی نہ تھی۔

سائنس کے ظہور سے پہلے دنیا میں توہماتی خیالات کا غلبہ تھا۔ اس وقت کم فہمی کے تحت لوگ شرک کے فریب میں مبتلا ہو سکتے تھے۔ مگر اب سائنس کی روشنی پھیل جانے کے بعد اس کا امکان ختم ہو گیا ہے کہ شرک دوبارہ لوگوں کے ذہن میں اپنی جگہ بنا سکے۔

تاہم خود توہمات کا ابھی تک خاتمہ نہیں ہوا۔ ذاتی زندگی میں آج بھی ساری دنیا میں کروڑوں لوگ پراسرار قسم کے توہمات میں یقین رکھتے ہیں۔ اہل علم طبقہ کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو دیوی دیوتاؤں کو تو نہیں مانتی مگر اب بھی وہ خدائے واحد تک نہیں پہنچی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کی پچھلی نسلیں اگر دیوی دیوتاؤں میں اٹکی ہوئی تھیں تو اب قانون فطرت کے نام سے انھوں نے ایک اور معبود کو فرض کر لیا ہے اور اس کو اپنے ذہن میں اسی طرح بٹھائے ہوئے ہیں جس طرح قدیم انسان دیوی دیوتاؤں کو بٹھائے ہوئے تھا۔

اس طرح انسانی تاریخ گردش کرتے ہوئے اب ایک ایسے دور میں پہنچ گئی ہے جب کہ پیغمبروں کی تحریک کے راستہ کی تمام رکاوٹیں ختم ہو گئی ہیں۔ آج رد شرک اور اثبات توحید کی

تحریک کو آزادانہ طور پر اور انتہائی موثر انداز میں برپا کیا جاسکتا ہے۔ دور جدید میں سیاسی اور بین اقوامی فضا بھی پوری طرح اس کے موافق ہو چکی ہے۔ تمام علمی دلائل اسی کی تائید کر رہے ہیں۔ حتی کہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آج توحید کی تحریک بلامقابلہ کامیابی (unopposed victory) حاصل کرنے کی پوزیشن میں پہنچ گئی ہے۔ اس کے راستہ میں اب کسی بھی قسم کی کوئی رکاوٹ حائل نہیں اب ضرورت ہے کہ اہل توحید نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ اٹھیں اور دنیا کی تمام قوموں کو نئی طاقت کے ساتھ توحید کی حیات بخش حقیقت سے آشنا کردیں۔

قدیم زمانہ میں انسانی زندگی میں اور انسانی سماج میں بے شمار برائیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان کے نتیجہ میں انسان اپنی فطری عظمت سے محروم ہو گیا تھا۔ یہ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے ذریعہ اٹھائی ہوئی تحریک توحید تھی جس نے دنیا کو اس المناک دور سے نکالا اور انسانیت کو حقیقی معنی میں ترقی کے دور میں داخل کیا۔ انسان پہلی بار ان سعادتوں سے ہمکنار ہوا جو خدا نے اس کے لئے مقدر کی تھیں مگر خود ساختہ توہمات کے نتیجہ میں اس نے اپنے آپ کو ان سے محروم کر رکھا تھا۔ انسانیت تاریکی کے طویل دور سے نکل کر روشنی کے نئے دور میں داخل ہو گئی۔ اب بظاہر مادی ترقیوں کے باوجود انسان دوبارہ مسائل کے اندھیروں میں گرفتار ہو گیا ہے۔ خوشنما تمدن کے اندر وہ حقیقی خوشی اور سکون سے محروم ہے۔ انسان کی فطری عظمت دوبارہ پستیوں کے نئے کھڈ میں جاگری ہے۔

اب ضرورت ہے کہ توحید کی دعوت کو از سر نو نئی طاقت کے ساتھ زندہ کیا جائے۔ ایک طرف اس کے نئے دلائل اور نئے اسلوب کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ قابل قبول بنایا جائے اور دوسری طرف جدید ذرائع اشاعت کو استعمال کر کے اس کو ساری دنیا میں پھیلا دیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جس کو پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی ایک تاریخی گوئی میں اس طرح فرمایا تھا کہ ـــــ ایک وقت آئے گا جب کہ خدا کے دین کا پیغام ساری دنیا میں پھیل جائے گا۔ کوئی گھر یا خیمہ ایسا نہ بچے گا جس کے اندر توحید کا کلمہ پہنچ نہ گیا ہو۔

ایک آزمائش

قرآن کی سورہ نمبر ۲۲ میں ارشاد ہوا ہے کہ ۔۔۔ اور ہم نے تم سے پہلے جو بھی رسول اور نبی بھیجا تو جب اس نے کچھ پڑھا تو شیطان نے اس کے پڑھنے میں ملادیا۔ پھر اللہ شیطان کے ڈالے ہوئے کو مٹادیتا ہے۔ پھر اللہ اپنی آیتوں کو پختہ کر دیتا ہے۔ اور اللہ علم والا، حکمت والا ہے (الحج: ۵۲)

حق کا داعی خواہ وہ پیغمبر ہو یا غیر پیغمبر، اس کے ساتھ ہمیشہ یہ معاملہ پیش آتا ہے کہ جب وہ خدا کی سچی بات کا اعلان کرتا ہے تو معاندین اس کی بات میں طرح طرح کے شوشے نکالتے ہیں تاکہ لوگوں کو اس کی صداقت کے بارے میں مشتبہ کر دیں۔

اس طرح کے شوشے ہمیشہ بے بنیاد ہوتے ہیں۔ جب وہ پیش کئے جاتے ہیں تو داعی کو موقع ملتا ہے کہ وہ ان کی وضاحت کر کے اپنی بات کو اور زیادہ ثابت شدہ بنادے۔ اس سے مخلص لوگوں کے یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد خدا کے ساتھ ان کا تعلق اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ مگر جو لوگ گہری معرفت سے خالی ہوتے ہیں، یہ شوشے ان کے لئے فتنہ بن جاتے ہیں۔ وہ ان کے فریب میں مبتلا ہو کر حق سے دور چلے جاتے ہیں۔

"اللہ ایمان والوں کو ضرور صراط مستقیم دکھاتا ہے" اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ جو لوگ فی الواقع ایمان کے معاملہ میں سنجیدہ ہوں وہ کبھی جھوٹے پروپیگنڈوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ وہ پر فریب الفاظ سے کبھی دھوکہ نہیں کھاتے۔ ان کا ایمان ان کے لئے ایسا علم بن جاتا ہے جو باتوں کو ان کی گہرائی کے ساتھ جان لے نہ کہ محض باتوں کے ظواہر میں اٹک کر رہ جائے۔

یہ ایک آزمائش ہے۔ حق کی دعوت کے ساتھ ہمیشہ اسی طرح کی آزمائشیں پیش آتی ہیں۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے تاکہ مخلص اور غیر مخلص کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ تاکہ غیر مخلص بے نقاب ہو جائیں اور جو لوگ مخلص ہیں ان کا اخلاص عملی طور پر ثابت شدہ بن جائے۔

خطرہ کہاں

ایک عربی پرچہ میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس کا عنوان تھا : الاقلیات المسلمین تواجه خطر اذوبان ۔ یعنی مسلم اقلیتوں کو اس خطرہ کا سامنا ہے کہ وہ اکثریتی فرقہ میں مکمل مل جائیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ الاسلام یعلو ولا یعلیٰ (اسلام ہمیشہ غالب رہتا ہے وہ کبھی مغلوب نہیں ہوتا) فتح الباری ۳/۲۶۱۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام کو اللہ تعالیٰ نے غلبہ کی نسبت عطا فرمائی ہے تو اس کے لئے مغلوب ہونے یا جذب ہو جانے کا خطرہ کیوں محسوس کیا جارہا ہے۔

اس کی وجہ بالکل سادہ ہے اور وہ اسلام اور مسلمانوں میں فرق نہ کرنا ہے۔ کوئی مسلم گروہ اپنے زوال کی بنا پر مذکورہ قسم کے خطرے میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ لیکن اسلام، ایک ربانی نظریہ کی حیثیت سے اس سے ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کو کسی بھی حال میں غیر اسلامی طاقتوں سے مغلوب ہونے یا ان میں جذب ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں کے لئے یہ خطرہ پیدا ہو کہ وہ کسی غیر مسلم طاقت سے مغلوب ہو جائیں گے یا اس میں جذب ہو جائیں گے تو پیشگی طور پر یہ سمجھنا چاہئے کہ اس کی وجہ خود مسلمانوں کا اسلام میں کمزور ہونا ہے نہ کہ غیر مسلموں کا ان کے مقابلہ میں طاقتور ہو جانا۔

اس لئے جب بھی اس قسم کا خطرہ پیدا ہو تو مصلحین کو چاہئے کہ وہ خود مسلم نسلوں کو دوبارہ اسلام پر اٹھانے کی کوشش کریں۔ وہ ان کے کیس کو قولی کیس کے بجائے اسلام کا کیس بنا دیں۔ اس کے بجائے غیر مسلم طاقتوں کے خلاف قولی یا عملی ہنگامہ آرائی کرنا ایک غیر متعلق فعل ہے جس کا خدا کی اس دنیا میں کوئی فائدہ نکلنے والا نہیں۔

محتاط روش

عن اوس بن شرحبیل انه سمع رسول الله یقول من مشی مع ظالم لیقویه وھو یعلم انه ظالم فقد خرج من الاسلام (مشکاة المصابیح ۳/ ۱۴۲۰)

اوس بن شرحبیل کہتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جو شخص ظالم کے ساتھ چلے تاکہ اس کو تقویت حاصل ہو، اور وہ جانتا ہو کہ وہ ظالم ہے، تو ایسا شخص اسلام سے نکل گیا۔

عن ابراھیم بن میسرة قال قال رسول الله ﷺ من وقر صاحب بدعة اعان علی ھدم الاسلام (مشکاة ۱/ ۶۶) ابراہیم بن میسرہؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص بدعت والے کی توقیر کرے تو اس نے اسلام کو منہدم کرنے میں مدد دی۔

کسی آدمی کے برا آدمی ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ براہ راست برائی میں ملوث ہو۔ مثلاً وہ خود برا کام کرے یا برا کام کرنے والے کا باقاعدہ ساتھی بن جائے۔ جو لوگ اس طرح براہ راست انداز میں ملوث ہوں ان کا برا ہونا ایک معلوم اور مسلّم بات ہے۔ تاہم اسلام کی نظر میں صرف وہی شخص برا نہیں ہوتا جو ذاتی طور پر اور براہ راست طور پر برائی میں ملوث ہو۔ اسلام کے نزدیک وہ شخص بھی یکساں طور پر برا ہے جو بالواسطہ انداز میں برائی کے عمل میں ملوث ہوتا ہے۔

اجتماعی زندگی میں آدمی کا ہر عمل یا تو کسی کے موافق ہوتا ہے یا کسی کے مخالف، ہر آدمی اپنے قول و عمل سے ایک روش کی تائید کرتا ہے اور دوسری روش کی تردید، خواہ یہ تائید و تردید براہ راست ہو یا بالواسطہ۔ ایسی حالت میں آدمی کو چاہئے کہ جب بھی وہ کسی معاملہ میں بولے یا کوئی کارروائی کرے تو بولنے یا کرنے سے پہلے یہ سوچ کہ اس کے قول یا عمل کے ذریعہ کس کی حمایت ہوگی اور کس کی مخالفت۔ اور وہ وہی کرے جس سے اہل حق کی حمایت ہوتی ہو۔ ہر حال میں وہ اہل باطل کی حمایت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے حتی کہ بالواسطہ حمایت سے بھی۔

ہرقل کا واقعہ

۲۰ اگست ۶۳۶ کو ایک فیصلہ کن واقعہ ہوا جو تاریخ میں دریائے یرموک کی جنگ (Battle of Yarmuk River) کے نام سے مشہور ہے۔ یرموک ایک دریا کا نام ہے جو شام اور اردن کے درمیان واقع ہے، مذکورہ تاریخ کو یہاں عربوں اور رومیوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ عرب فوج کے سردار خالد بن ولید تھے، اور رومی فوج کی قیادت تذارق (THEODOUS) کر رہا تھا جو شہنشاہ ہرقل کا بھائی تھا۔

اس جنگ میں رومی فوج کو مکمل شکست ہوئی۔ خود تذارق قتل کر دیا گیا۔ یہ جنگ اس پورے علاقہ کے لئے فیصلہ کن تھی۔ چنانچہ اس کے بعد پورا شام تقریباً بلا مقابلہ عربوں کے قبضہ میں آگیا۔ یرموک کی شکست کی اس اہمیت سے شہنشاہ ہرقل بخوبی واقف تھا جو اس وقت حمص (شام) میں تھا۔ اس کے بعد وہ حمص سے روانہ ہو گیا۔ مورخ بلاذری کی روایت کے مطابق، اس وقت اس کی زبان پر یہ کلمہ تھا: سلام علیک یا سوریا، سلاما لا لقا بعدہ (اے شام، تجھ کو آخری سلام، اب تجھ سے میری ملاقات نہیں ہوگی) ہر چیز جو انسان کو ملی ہوئی ہے وہ آخر کار اس کا ساتھ چھوڑنے والی ہے۔ موت سے پہلے یا موت کے وقت۔ مگر انسان آخر وقت تک چیز کو اپنی چیز سمجھتا ہے۔ وہ سوچ نہیں پاتا کہ کوئی چیز اس کی اپنی نہیں۔ ہر چیز خدا کی چیز ہے۔ وہ جب تک چاہے کسی کے پاس رکھے، اور جب چاہے چھین لے۔

آدمی جو کلمہ ملک چھن جانے کے بعد کہتا ہے، اگر وہی کلمہ وہ ملک چھننے سے پہلے کہے تو وہ اس کے نامۂ اعمال میں ایک قیمتی عمل کے طور پر لکھا جائے۔ مگر آدمی اس حقیقت شناسی کا ثبوت نہیں دیتا۔ ہر آدمی چھننے کے بعد کہتا ہے نہ کہ چھننے سے پہلے۔ اور چھننے کے بعد کہنا کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

حضرت لبیدؓ

لبید بن ربیعہ بن مالک العامری (م ۱۴۱ھ) قدیم عرب کے ایک مشہور شاعر تھے۔ ان کا شمار اصحاب المعلقات میں سے ہوتا ہے۔ ہجرت کے بعد انھوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد انھوں نے شاعری چھوڑ دی۔ کہا جاتا ہے کہ قبول اسلام کے بعد انھوں نے صرف ایک شعر کہا تھا جو یہ ہے۔

ما عاتب المرء الكريم كنفسه — والمرء يصلحه الجليس الصالح

عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں ایک بار حضرت لبید سے کہا کہ اپنے کچھ اشعار سنائیے۔ حضرت لبیدؓ نے جواب دیا کہ اللہ نے جب مجھ کو بقرہ اور آل عمران جیسی سورتوں کی تعلیم دی تو اس کے بعد میرے لئے مناسب نہیں کہ میں شعر کہوں(**ما كنت لاقول شعرا فقد ان علمني الله البقرة و آل عمران) ابن عبد البر ، الاستيعاب**

حضرت لبید نے اپنے شعر میں جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ شریف آدمی احتساب غیر کے بجائے احتساب خویش کے معاملے میں زیادہ حساس ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی غلطی پر گرفت کرتے ہوئے نرمی کا انداز اختیار کرتا ہے مگر جب معاملہ خود اپنی غلطی کا ہو تو وہ اس کے لئے بے رحم محاسب بن جاتا ہے۔

شعر کے دوسرے مصرع میں انھوں نے صحبت کی اہمیت بتائی ہے۔ آدمی اگر زیادہ دیر تک برے کی صحبت اختیار کرے تو اندیشہ ہے کہ وہ بھی برا بن جائے۔ اس کے مقابلہ میں جب آدمی اچھے انسان کی صحبت اختیار کرتا ہے تو اس کی صحبت کے اثر سے وہ بھی ایک اچھا آدمی بن جاتا ہے۔ حضرت لبیدؓ نے خلیفہ دوم سے جو بات کہی وہ بظاہر قرآن کے مقابلہ میں ہے مگر وسیع تر معنی میں اس کا تعلق دوسری حقیقتوں سے بھی ہے۔ اور وسیع تر انطباق کے لحاظ سے ہر حق کے مقابلہ میں اپنی زبان بند کر لینے سے۔

سنت الٰہی

پیغمبر اسلام ﷺ نے جب اپنی دعوت حق کا آغاز فرمایا تو وہ تمام لوگ آپ کے مخالف ہوگئے جن کے اوپر اس کی زد پڑتی تھی، جن کے مفادات اس سے مجروح ہو رہے تھے۔ چونکہ یہ لوگ دلائل کے ذریعہ آپ کی دعوت کا توڑ نہیں کر سکتے تھے، انھوں نے یہ تدبیر کی کہ آپ کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا۔ اس صورت حال کا ذکر قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے ---اور انکار کرنے والوں نے کہا کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں خلل ڈالو، شاید کہ تم غالب رہو۔ (حٰم السجدہ ۲۶)

اس آیت کی تشریح میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: قرآن کریم کی آواز بجلی کی طرح سننے والوں کے دلوں میں اثر کرتی تھی۔ جو سنتا فریفتہ ہو جاتا۔ اس سے روکنے کی تدبیر منکروں نے یہ نکالی کہ جب قرآن پڑھا جائے، ادھر کان مت دھرو اور اس طرح ہماری بک بک سے قرآن کی آواز دب جائے گی۔ آج بھی جاہلوں کو ایسی ہی تدبیریں سوجھا کرتی ہیں کہ کام کی بات کو شور مچا کر سننے نہ دیا جائے۔ لیکن صداقت کی کڑک مچھروں اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے کہاں مغلوب ہو سکتی ہے۔ ان سب تدبیروں کے باوجود حق کی آواز قلوب کی گہرائیوں تک پہنچ کر رہتی ہے (تفسیر عثمانی ۶۲۱)

پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کی جو مہم چلائی گئی تھی اس کی بہت سی مثالیں حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک مثال یہ ہے کہ جب قرآن کی سورہ النجم اتری تو آپ نے اس کو ایک ایسے مخلوط مجمع میں سنایا جہاں مسلمانوں کے ساتھ مشرک لوگ بھی موجود تھے۔ اس کو سناتے ہوئے آپ نے یہ آیتیں پڑھیں: افراء یتم اللّٰت والعزی. ومنوٰة الثالثة الاخریٰ (النجم ۱۹-۲۰)

جیسے ہی آپ نے یہ آیتیں پڑھیں حاضرین میں سے ایک مشرک نے اس میں اپنی

طرف سے یہ الفاظ ملادیئے جو وہ جاہلی روایت کے تحت ان بتوں کے بارے میں پڑھا کرتے تھے :

تلك الغرانيق العلى ، وان شفاعتهن لترتجى (یہ بڑی ہستیاں ہیں اور ان کی شفاعت کی قبولیت کی پوری امید ہے) تفسیر ابن کثیر ۲۲۹/۳

اس واقعہ کے بعد مخالفوں کی پروپیگنڈا مشین تیزی سے حرکت میں آگئی۔ انھوں نے مجمع کے اندر ایک مشرک کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو پیغمبر اسلام کی طرف منسوب کرکے یہ کہنا شروع کیا کہ دیکھو، اب تو محمدؐ نے بھی بتوں کی عظمت کو مان لیا۔ وہ بھی مشرکین کی بات کو دہرانے لگے (اس واقعہ کی تفصیل تفسیر کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے)

یہ صرف کوئی ایک واقعہ نہیں، اس قسم کا معاملہ ہر دور میں اور ہر داعیٔ حق کے ساتھ پیش آتا ہے۔ حق کی دعوت جب بھی اٹھتی ہے وہ مضبوط دلائل پر قائم ہوتی ہے۔ وہ انسانی فطرت کو اپیل کرتی ہے۔ لوگ تیزی سے اس کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں۔ یہ صورت حال ان لوگوں کے لئے خطرہ بن جاتی ہے جو غیر حق کو حق بتاکر اپنی قیادت قائم کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو دین کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنالیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا حال ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ وہ دلائل کا مقابلہ دلائل سے کرنے میں اپنے کو عاجز محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ دلائل کا مقابلہ جھوٹے پروپیگنڈوں سے کرنے کے لئے حرکت میں آجاتے ہیں۔

پیغمبروں کے ساتھ اور اسی طرح حق کے داعیوں کے ساتھ بدنام کرنے کا یہ جو معاملہ پیش آتا ہے وہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں۔ اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی گہری مصلحت شامل ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے تاکہ لوگوں کو آزمایا جائے۔ اس طرح وہ لوگ الگ ہوجاتے ہیں جو اپنی خدا ترسی اور معرفت حق کی بنا پر اس میں کامیاب رہتے ہیں کہ وہ حقیقی دلیل اور جھوٹے پروپیگنڈے میں فرق کرسکیں۔ وہ جھوٹے پروپیگنڈوں کو نظر انداز کرکے حق کے ساتھ اپنی وابستگی کو اور زیادہ مضبوط بنالیں۔

دوسری طرف حق کے مخالفین کی اسی مہم کے درمیان وہ لوگ کھل کر سامنے آجاتے ہیں جو بظاہر حق پرست بنے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے اندر حقیقی معنوں میں نہ خدا کا خوف تھا اور نہ ایمان کی سچی روشنی۔ ایسے لوگ اپنے اندھے پن کی بنا پر دلیل اور غیر دلیل میں فرق نہیں کرپاتے۔ وہ جھوٹے الفاظ کو دلیل سمجھ کر ان سے متاثر ہو جاتے ہیں اور داعیان حق کے بارے میں شبہات میں پڑ جاتے ہیں۔ اس طرح وہ حق کی دعوت کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے، البتہ خود اپنی حقیقت کو وہ پوری طرح بے نقاب کر دیتے ہیں۔

یہی وہ خدائی قانون ہے جو قرآن کی ان آیتوں میں پیغمبر کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے: اور ہم نے تم سے پہلے جو بھی رسول اور نبی بھیجا تو جب اس نے کچھ پڑھا تو شیطان نے اس کے پڑھنے میں ملا دیا۔ پھر اللہ شیطان کے ڈالے ہوئے کو مٹا دیتا ہے۔ پھر اللہ اپنی آیتوں کو پختہ کر دیتا ہے۔ اور اللہ علم والا، حکمت والا ہے۔ تاکہ جو کچھ شیطان نے ملایا ہے اس سے وہ ان لوگوں کو جانچے جن کے دلوں میں روگ ہے اور جن کے دل سخت ہیں۔ اور ظالم لوگ مخالفت میں بہت دور نکل گئے ہیں۔ اور تاکہ وہ لوگ جن کو علم ملا ہے جان لیں کہ یہ فی الواقع تیرے رب کی طرف سے ہے۔ پھر وہ اس پر یقین لائیں۔ اور ان کے دل اس کے آگے جھک جائیں۔ اور اللہ ایمان لانے والوں کو ضرور سیدھا راستہ دکھاتا ہے (الحج ۵۲۔۵۴)

خدا کا مطلوب مومن وہ ہے جو خدا کی قائم کی ہوئی ایمانی کسوٹی پر پورا اترے۔ وہ کسوٹی یہ ہے کہ مخالف حالات میں وہ اپنے آپ کو صاحب ایمان ثابت کرے۔ شبہات کا طوفان بھی اس کے یقین کو متزلزل نہ کر سکے۔ ہر قسم کے ناموافق اسباب کے باوجود وہ حق کو پہچان لے اور اپنے آپ کو اس کے ساتھ وابستہ کر دے۔

ہندتو: حقیقت یا افسانہ

خطرے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک حقیقی خطرہ، اور دوسرا فرضی خطرہ۔ اگر حقیقی خطرہ درپیش ہو تو اس کا حل یہ ہے کہ آدمی اس کی نوعیت کو سمجھے اور اس کے مطابق بچاؤ کی ضروری تدبیر کرے۔ لیکن اگر خطرہ محض فرضی ہو تو مسئلہ بالکل بدل جاتا ہے۔ اب اس سے بچاؤ کی تدبیر صرف یہ ہوتی ہے کہ اس کو سادہ طور پر نظر انداز کر دیا جائے۔ فرضی خطرہ کو نظر انداز کر دینا ہی اس سے بچاؤ کی سب سے زیادہ کامیاب تدبیر ہے۔

ہندتو کا خطرہ راقم الحروف کے نزدیک محض فرضی خطرہ ہے، وہ کبھی واقعہ بننے والا نہیں۔ ایسی حالت میں اس کے لیے پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

یہ صحیح ہے کہ آج کل ہندتو کا کافی چرچا ہے۔ کچھ لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ مستقبل کا انڈیا ہندتو کی بنیاد پر تشکیل دیا جائے گا۔ مگر جہاں تک میرا مطالعہ ہے، خود ہندتو کے علم برداروں کے ذہن میں اس کا کوئی واضح نقشہ موجود نہیں ہے۔ اور جس چیز کا نقشہ ہی اب تک واضح طور پر متعین نہ ہوا ہو، وہ انڈیا کے مستقبل کی تشکیل کرنے والا کس طرح بنے گا۔

مسٹر لال کرشن آڈوانی کے الفاظ میں، ہندتو سے مراد کلچرل نیشنلزم (cultural nationalism) ہے۔ یعنی کلچر پر مبنی قومیت۔ وہ کون سا کلچر ہو گا جس پر یہ قومیت تشکیل دی جائے گی۔ اس کا جواب مسٹر جے دوباشی کے الفاظ میں یہ ہے کہ انڈیا میں قومی تشخص صرف ہندو ہی ہو سکتا ہے:

In India, the national identity can only be Hindu. (The Illustrated Weekly of India, March 12, 1993)

اس کے ساتھ مسٹر گری لال جین کے الفاظ ملا لیجئے تو بات مکمل ہو جائے گی۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۱ مارچ ۱۹۹۳) میں خاص اسی موضوع پر مسٹر جین کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے:

Apartheid in reverse — Dangers of minorityism

مضمون نگار کے نزدیک انڈیا کے مسلمانوں کے مسئلہ کا حل یہ ہے کہ وہ اکثریتی فرقہ کے کلچر کو اختیار کر لیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ انڈیا کوئی انسانی چڑیا خانہ نہیں ہے جس میں مختلف انسانی انواع

ایک مقام پر الگ الگ خانوں میں رکھ دی گئی ہوں اور ان کو ایک نہ کیا جا سکتا ہو۔ انڈیا ممتاز طور پر اور ہزاروں سال سے ایک یکساں کلچر کا ملک ہے اگرچہ وہ یک سنگی نہیں :

India is not a human zoo with different species of humanity put together in one physical location in separate enclosures and it cannot be turned into one. It embodies a remarkably homogenous, though not monolithic, culture going back thousands of years. (p.8)

غیر ہندو فرقے اگر ہندتو کے علم برداروں کے اس مطالبہ کو بلا بحث مان لیں تب بھی اصل مسئلہ ختم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یکساں کلچر کو اختیار کرنے کے لیے اس کا ایک ماڈل ہونا ضروری ہے۔ حالاں کہ ایسا کوئی ماڈل سرے سے ملک کے اندر موجود ہی نہیں۔ اور جب ماڈل موجود نہ ہو تو اس کی پیروی کس طرح کی جائے گی۔

وہ چیز جس کو یہ حضرات ہندو کلچر یا بھارتی کلچر کہتے ہیں، وہ بر وقت کسی ایک چیز کا نام نہیں ہے۔ اس میں بیک وقت بے شمار خدا ہیں۔ بابری مسجد کو ڈھانے والے بھارتی کلچر کے نمائندوں نے پُر فخر طور پر اجودھیا میں یہ نعرہ لگایا تھا کہ: ایک طرف ۳۳ کرور، ایک طرف ایک اللہ۔ اسی طرح ہندوؤں میں زبان، کھانا، کپڑا، رہن سہن، ہر چیز میں اختلاف ہے۔ حتیٰ کہ ایک ہندو مبصر کے الفاظ میں، اس ملک میں جتنے ہندو ہیں، اتنی ہی ان کی قسمیں ہیں۔

جب ہندو کی اتنی زیادہ قسمیں ہیں تو سوال یہ ہے کہ وہ کون ہندو ہے جس کو پیروی کے لیے ماڈل سمجھا جائے۔ کیا وہ ہندو جو کوٹ اور پتلون پہنتا ہے یا وہ ہندو جو دھوتی اور کرتا پہنتا ہے۔ وہ ہندو جو مورتی پوجا کرتا ہے یا وہ ہندو جو مورتی پوجا کا کھنڈن کرتا ہے۔ وہ ہندو جو آستک ہے یا وہ ہندو جو ناستک ہے۔ وہ ہندو جو رامائن اور مہابھارت کو تاریخ کہتا ہے یا وہ ہندو جو رامائن اور مہابھارت کو افسانہ (متھ) سمجھتا ہے۔ وہ ہندو جو شاکاہاری ہے یا وہ ہندو جو منساہاری ہے۔ وہ ہندو جو ہندوازم کو مذہب بتاتا ہے یا وہ ہندو جو ہندوازم کو فلاسفی قرار دیتا ہے۔ وہ ہندو جو رام کو ہیرو مانتا ہے یا وہ ہندو جو راون کو ہیرو سمجھتا ہے۔ وہ ہندو جو اونچ ذات اور نیچ ذات میں یقین رکھتا ہے یا وہ ہندو جو ان باتوں کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔

اس قسم کے بے شمار فرق ہیں جو ایک ہندو اور دوسرے ہندو کے درمیان پائے جاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان میں سے کون سا ہندو ہے جو ہندوازم یا ہندو کلچر کے لیے ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں "ہندتو" کے علم برداروں کو پہلے خود ہندوؤں کے اوپر اپنا بلڈوزر چلاکر انھیں ایک کلچر یا یکساں کلچر کا نمونہ بنانا ہوگا ۔ اس کے بعد ہی وہ غیر ہندو فرقوں سے یہ مانگ سکتے ہیں۔ کہ وہ اس "ماڈل ہندو" کی پیروی کریں۔

اگر یہ حضرات سنجیدگی کے ساتھ غور کریں تو انھیں معلوم ہوگا کہ ان اختلافات کو بلڈوز کر کے ہندتو کا کوئی ایک ماڈل بنانا قابل عمل نہیں، اس لئے ہندتو کی بنیاد پر ملک کی تعمیر بھی یقینی طور پر قابل عمل نہیں۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ ہندو سوسائٹی میں اختلافات اتنے زیادہ بنیادی ہیں جو کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالت میں مسٹر گری لال جین کے الفاظ خود ہندو فرقہ پر زیادہ بڑے پیمانہ پر صادق آتے ہیں۔ ہندو فرقہ خود ایک بہت بڑا ہیومن زو ہے۔ اپنے موجودہ تنوعات کے ساتھ ہندو فرقہ کے لیے یکساں کلچر کا نمونہ بننا ممکن نہیں۔ وہ متنوع کلچر (composite culture) کا ماڈل یقیناً ہے مگر وہ یکساں کلچر کا ماڈل ہرگز نہیں۔

ہندتو کی اس کمزوری کا اعتراف خود ہندتو کے علم برداروں کو بھی کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ ہندو کی مشترک تعریف کے لیے کوئی واضح بنیاد موجودہ حالت میں موجود نہیں۔ کیوں کہ وہ دیکھتے ہیں کہ ایک ہندو، عمومی اعتبار سے، سب سے پہلے ایک ذات سے تعلق رکھتا ہے، اس کے بعد ہی وہ ہندو برادری کا حصہ بنتا ہے :

A Hindu, generally speaking, belongs to a caste before he belongs to the Hindu fraternity.

مسٹر گری لال جین (۱۹۲۲۔ ۱۹۹۳) نے اپنے ایک مفصل مضمون میں لکھا تھا کہ ہندو قومیت کی دو قسمیں ہیں، منفی اور مثبت۔ منفی ہندو قومیت درجات کے فرق کے ساتھ محض مسلم مخالف جذبہ پر قائم ہے۔ مثبت ہندو قومیت کا تعلق ایک ہندو شخص کے لیے اپیل کرنے پر ہے۔ مگر چوں کہ یہ شخص ہندوؤں کے درمیان داخلی یکسانیت نہ ہونے کی وجہ سے غیر واقعی ہے اس لیے مثبت ہندو قومیت وجود میں آنے کے قابل نہیں۔ اس طرح جو چیز ممکن ہے وہ مطلوب نہیں اور جو چیز مطلوب ہے وہ ممکن نہیں :

There are two types of Hindu communalism: negative and positive. Negative Hindu communalism consists in being merely anti-Muslim in varying degrees: positive Hindu communalism consists in appealing in the name of a Hindu identity. But since this identity is very shadowy due to Hindu's lack of internal homogeneity, positive Hindu communalism is not viable. Thus what is possible is not desirable and what is desirable is not possible. (The Times of India, New Delhi, July 4, 1987)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہند تو خود اپنے اندرونی مسائل میں اتنا زیادہ مشغول ہے کہ اس کے لیے بیرونی خطرہ بننا تقریباً ناممکن ہے۔ ہندتو بیرونی خطرہ صرف اس وقت بن سکتا ہے جب کہ مسلمان جوش اور ہنگامہ والی سیاست سے اس کو اینٹی مسلم احساس پر کھڑے ہونے کا موقع دے دیں۔ اگر مسلمان ٹکراؤ سے اعراض کی پالیسی اختیار کرلیں تو ہندتو اپنے قیام کی واحد بنیاد سے محروم ہو جائے گا۔ اس کے بعد اس کا جو انجام ہوگا اس کو لفظوں میں بتانے کی ضرورت نہیں۔

زندگی کا ایک محکم اصول یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ ایک بے معنی نعرہ لگا رہے ہوں تو ہمیں چاہیے کہ ہم ان نعروں کو نظر انداز کر کے یہ دیکھیں کہ تاریخ کی طاقتیں کس طرف جارہی ہیں۔ کیوں کہ زندگی میں بالآخر جو چیز باقی رہتی ہے وہ تاریخ کی طاقتیں ہیں نہ کہ کچھ غیر سنجیدہ لوگوں کے بولے ہوئے الفاظ۔

اس سلسلہ میں میں امریکہ اور کناڈا کی مثال دوں گا۔ ان ملکوں میں بھی، انڈیا کی طرح، مختلف کلچر پائے جاتے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد وہاں کچھ انتہا پسند لیڈر اٹھے۔ انھوں نے مختلف کلچر کو ختم کر کے ایک کلچر بنانے کی تحریک چلائی۔ اس تحریک کو عام طور پر یونی کلچرلزم (uniculturalism) کہا جاتا ہے۔ مگر یہ تحریک کامیاب نہ ہوسکی۔ آخر کار انھیں ماننا پڑا کہ ان کے ملک کے لیے قابل عمل چیز صرف متنوع کلچریت (multiculturalism) ہے نہ کہ واحد کلچر۔

یہی واقعہ یقینی طور پر انڈیا میں بھی ہونے والا ہے۔ واحد کلچر کا نعرہ لگانے والے یہاں ناکام ہوکر رہ جائیں گے اور آخر کار جو چیز باقی رہے گی وہ مختلف اور متنوع کلچر کا اصول ہے جو ہزاروں سال سے اس ملک میں موجود تھا اور آج بھی وہ پوری طرح موجود ہے۔ یہی تاریخ کا فیصلہ ہے۔

نئی دہلی میں ۲۵ جولائی ۱۹۹۲ کو ایک میٹنگ تھی۔ اس کی رپورٹ ٹائمس آف انڈیا ۲۶ جولائی میں چھپ چکی ہے۔ یہاں مختلف ہندو دانش وروں نے تقریریں کیں۔ ٹائمس آف انڈیا کے ایڈیٹر

دلیپ پڈگاؤنکر (Dileep Padgaonkar) نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس دنیا میں ہر آدمی کی مختلف حیثیت ہوتی ہے۔ آپ اس قانون قدرت کو بدل نہیں سکتے۔ اس معاملہ میں ہمیں تنگ نظری کے بجائے وسعت نظری کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

انھوں نے کہا کہ میں مہاراشٹر میں پیدا ہوا۔ اب میں دہلی میں رہتا ہوں۔ وطن، زبان، مذہب، تہذیب، تعلیم ہر لحاظ سے میری مختلف حیثیتیں ہیں۔ اسی طرح تاریخ کے اعتبار سے میری مختلف حیثیت ہے۔ میری زندگی میں قدیم بھارتی عہد کا حصہ ہے۔ پھر میری زندگی پر مسلمانوں کے ہزار سالہ عہد کی چھاپ ہے۔ اس کے بعد برٹش عہد آیا۔ اس نے بھی میری زندگی پر اثرات ڈالے۔ اب میں آزاد انڈیا کا ایک فرد ہوں۔ یہ ساری چیزیں میری زندگی کا حصہ ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی میں اپنے سے الگ نہیں کر سکتا۔

اس قسم کی تفصیلات بتاتے ہوئے انھوں نے مشہور انگلش رائٹر والٹ وھیٹمین (Walt Whitman) کا قول دہرایا اور کہا کہ ہمیں ان تمام تضادات کے ساتھ جینا ہے۔ میں اتنا زیادہ وسیع ہوں کہ ان تمام تضادات کو اپنی زندگی میں سمو سکوں:

We all have to live with our contradictions. I am large enough to contain all these contradictions.

والٹ وھیٹمین (۱۸۹۲-۱۸۱۹) کا یہ قول زندگی کی ایک حقیقت کو بتاتا ہے۔ انسان تضادات کا مجموعہ ہے اور تضادات سے نباہ کر کے ہی وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

انڈین کلچر اور انڈین ہسٹری کے مشہور عالم پنڈت بی این پانڈے (۸۸ سال) کا ایک انٹرویو ٹائمس آف انڈیا (۲۲ اگست ۱۹۹۲) میں چھپا ہے۔ ان سے یہ انٹرویو مسٹر ایس کالی داس نے لیا ہے۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مشکل یہ ہے کہ آج کا ہندو تو ہمارے دھرم کی مقدس کتابوں سے بہت کم مناسبت رکھتا ہے۔ اتھروید میں ہے کہ یہ دیش کئی مذہبوں، کئی نسلوں، کئی ذاتوں، کئی زبانوں کا دیش ہے۔ اس کے اندر مزید یہ کہا گیا ہے کہ اس دیش کو مل کر رہنے کے لیے ایک اصول کو مان لینا چاہیے۔ وہ یہ کہ یہ سرزمین ہماری مادر وطن ہے اور ہم سب اس کی سنتان ہیں۔ اس طرح پانچ ہزار سال پہلے ہم اس اصول پر متفق ہو چکے ہیں کہ اس دیس میں زبان، عقیدہ اور کلچر کے اختلاف کے باوجود ہم پُر امن طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے:

The trouble is that today's Hindutva has little in common with the Dharma of our scriptures. The Atharva Veda says: "This is a country of many religions, many ethnicities, many castes, many languages." It further says that to co-exist the people of this country must agree on one principle: "This land is our mother and all of us are her progeny." So even 5000 years ago we had agreed on the principles of peaceful co-existence in a clime of diversity in language, creed and culture.

انڈین کلچر کے بارہ میں یہی صحیح نقطۂ نظر ہے اور آخر کار ہمارے ملک میں یہی باقی رہنے والا ہے۔ ںڈیا ماضی میں ملٹی کلچر کا ملک تھا، حال میں وہ ملٹی کلچر کا ملک ہے، اور مستقبل میں بھی وہ ملٹی کلچر کا ملک ہے گا۔ یہی تاریخ کا فیصلہ ہے۔ یہی عقل کا تقاضا ہے، اور اسی میں ملک کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔ س کے سوا جو کچھ ہے وہ صرف نعرہ بازی ہے، نہ کہ کوئی واقعی نظریہ یا کوئی حقیقی سیاست۔

نئی کتابیں

مطالعۂ سیرت	قال اللہ و قال الرسول
اسباق تاریخ	اسلام ایک تعارف

توحید۔ انسانیت کی منزل

زیر نظر شمارہ فروری ۱۹۹۹ میں ایک مضمون اس عنوان کے تحت شامل ہے "توحید انسانیت کی منزل" ں مضمون کو ۱۶ صفحات کے پمفلٹ کی صورت میں الگ سے شائع کیا جارہا ہے۔ اس کی قیمت فی کاپی 4.0 روپیہ ہوگی۔ اس پمفلٹ کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ جو لوگ مفت تقسیم کے لئے ی تعداد میں منگائیں ان کو خصوصی رعایت دی جائے گی۔

شیطان کا فریب

مدنی دور کا ایک واقعہ حدیث کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ایک بار رات کے وقت مسجد سے گھر جا رہے تھے۔ آپ کے ساتھ ایک خاتون تھیں۔ راستہ میں آپ کی ملاقات انصار کے دو مسلمانوں سے ہوئی۔ آپ نے انھیں بلایا اور کہا کہ یہ میری بیوی صفیہ ہیں۔ ان دونوں آدمیوں نے کہا کہ سبحان اللہ (کیا آپ کے بارے میں ہمیں شک ہو سکتا ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شیطان آدمی کے اندر خون کی گردش کی طرح دوڑتا ہے (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۴ / ۳۳۰)

حقیقت یہ ہے کہ انسان بہت جلد شبہ میں پڑ جاتا ہے۔ وہ کسی کے بارے میں کچھ سنتا یا دیکھتا ہے تو شیطان اس میں آمیزش کر کے اس کو غلط رخ دے دیتا ہے۔ وہ ایک سادہ واقعہ کو قابل اعتراض واقعہ بنا دیتا ہے۔ کسی کے بارے میں اس قسم کی غلط فہمی بلا شبہ سخت گناہ ہے۔

اس گناہ سے بچنے کا حل یہ ہے کہ چیزوں کو ان کی ظاہری صورت (face value) پر نہ لیا جائے۔ اکثر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات یا کوئی واقعہ اپنی ظاہری صورت میں جیسا معلوم ہوتا ہے، اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے وہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً مذکورہ واقعہ کو سادہ طور پر دیکھ کر ایک شخص یہ سوچ سکتا تھا کہ رسول اللہ رات کے وقت ایک اجنبی خاتون کے ساتھ ہیں۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ آپ اس وقت اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ تھے۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ رائے قائم کرنے میں کبھی جلدی نہ کرے۔ کسی دیکھی یا سنی ہوئی بات کے بارے میں وہ اس وقت تک ہرگز کوئی رائے قائم نہ کرے جب تک تمام متعلقہ پہلوؤں سے وہ اس کی تحقیق نہ کر لے۔ اکثر بری رائے غلط فہمی پر مبنی ہوتی ہے اور اکثر غلط فہمی صرف شیطان کا فریب ہوتی ہے نہ کہ کوئی واقعی حقیقت۔

تصویر کا فتنہ

ایک مسلمان کی تصویر ایک کٹر ہندی اخبار میں چھپی۔ یہ اخبار مسلم دشمنی کے لئے مشہور ہے۔ اس تصویر کو لے کر کچھ مسلم نوجوان ایک مشہور دینی مدرسہ کے علماء کے پاس گئے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تصویر ہمارے نزدیک قابل اعتراض ہے۔ آپ اس کے خلاف سخت فتویٰ دیجئے۔ مذکورہ علماء نے اس قسم کا فتویٰ دینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ فتویٰ کسی ثابت شدہ فعل پر دیا جاتا ہے۔ اور کسی اخبار میں چھپی ہوئی تصویر کسی کے خلاف کوئی ثبوت نہیں۔

علماء کا یہ جواب بلاشبہ شریعت کے عین مطابق تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی ثابت شدہ فعل ہی پر کسی کے خلاف کوئی شرعی حکم لگایا جاسکتا ہے۔ اور تصویر سے یقینی طور پر کسی کے خلاف کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔

موجودہ زمانہ کیمرہ اور اخبار کا زمانہ ہے۔ کیمرہ کے ذریعہ ہر قسم کی تصویر لی جاسکتی ہے۔ مثلاً ایک شہر کا واقعہ ہے۔ کچھ مسلمان ایک جلوس کے ساتھ جارہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک مقامی مسلمان لیڈر بھی تھے۔ سڑک پر ایک جگہ انھیں اپنے جوتے کا فیتہ کسنے کے لئے رکنا پڑا۔ اتفاق سے اس کے قریب ایک چھوٹا سا مندر تھا جہاں ایک بت نصب تھا۔ مذکورہ لیڈر جس وقت جوتے کا فیتہ کسنے کے لئے جھکے ہوئے تھے عین اسی وقت ایک کیمرہ والے نے بت کا اینگل لے کر ان کا فوٹو لے لیا۔ اگلے دن ایک لوکل اخبار میں یہ فوٹو ان الفاظ کے ساتھ چھپا کہ ـــ فلاں مسلمان لیڈر ایک بت کے آگے جھکے ہوئے۔

اس قسم کی تصویر بالکل فرضی طور پر بھی بنائی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شریف خاتون کا واقعہ ہے۔ ایک دادا قسم کا نوجوان ان سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے خاتون کے باپ کے یہاں پیغام بھیجا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد اس نوجوان نے یہ کیا کہ خاتون کے یہاں کام کرنے والے ایک لڑکے کو کچھ پیسہ دیا۔ اس لڑکے نے مذکورہ خاتون کے

شناختی کارڈ سے ان کی تصویر نکالی اور لے جا کر اسے مذکورہ نوجوان کو دے دیا۔ اب مذکورہ نوجوان نے خاتون کی اس تصویر کو اپنی تصویر کے ساتھ ملا کر ایک مشترک فوٹو کھنچوایا اور پھر اس فوٹو کو لے کر مذکورہ خاتون کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔

فوٹو کے ذریعہ جھوٹے پروپیگنڈے کی سیاست موجودہ زمانہ میں بہت عام ہے۔ اخباروں میں اکثر اس طرح کے قصے آتے رہتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں کوئی بھی شخصیت اس قسم کے جھوٹے پروپیگنڈے کی زد سے محفوظ نہیں۔

فوٹو پر مبنی جھوٹا پروپیگنڈہ دو چیزوں کے ذریعہ ممکن ہوا ہے۔ ایک کیمرہ اور دوسرے اخبار۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اگر کیمرہ اور اخبار قدیم زمانہ میں موجود ہوتے تو انتہائی صالح قسم کے لوگ حتی کہ پیغمبر بھی نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ اس مکروہ سیاست سے شاید محفوظ نہ رہ پاتے۔

مثال کے طور پر قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین کے سفر میں ایک بار شام کو ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد ایک بزرگ کے بلانے پر ان کی غیر شادی شدہ صاحبزادی کے ساتھ چل کر وہ مذکورہ بزرگ کے گھر گئے۔ اگر اس وقت کیمرہ موجود ہوتا اور اخبار نکل رہے ہوتے تو ایک کیمرہ والا اس منظر کا فوٹو لے لیتا اور اگلے دن کے اخبار میں ایک تصویر چھپتی جس کے نیچے نعوذ باللہ یہ الفاظ لکھے ہوئے ہوتے۔۔۔ پیغمبر موسیٰ تنہا ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ۔

اسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ تیرہ سال تک مکہ میں تھے۔ وہاں آپ کعبہ میں جا کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس وقت وہاں ۳۶۰ بت تھے۔ یہ بت کسی بند بکس میں رکھے ہوئے نہیں تھے بلکہ بیت اللہ میں ہر طرف نصب تھے۔ رسول اللہ ﷺ وہاں بار بار رکوع یا سجدہ میں ہوتے تھے۔ اس وقت اگر وہاں کیمرہ اور اخبار موجود ہوتا تو ایک کیمرہ والا مخصوص اینگل سے آپ کا ایسا فوٹو لے سکتا تھا جس کے فوکس میں خدانخواستہ ایک بت بھی دکھائی دیتا۔ اس کے بعد اگلے دن کے اخبار

میں ایک تصویر چھپتی جس کے نیچے نعوذ باللہ یہ الفاظ لکھے ہوئے ہوتے کہ ۔۔۔ پیغمبر توحید ایک بت کے آگے جھکے ہوئے۔

جیسا کہ معلوم ہے ایک غزوہ میں رسول اللہ ﷺ کی اہلیہ محترمہ حضرت عائشہؓ بعض اتفاقی اسباب سے قافلہ کے پیچھے رہ گئی تھیں۔ بعد کو وہ ایک مسلم نوجوان کے ساتھ مدینہ آئیں۔ اس وقت اگر کیمرہ اور اخبار موجود ہوتے تو ایک کیمرہ والا اس منظر کا فوٹو لے لیتا اور پھر اگلے دن مدینہ کے اخبار میں ایک تصویر چھپتی جس کے نیچے نعوذ باللہ یہ الفاظ لکھے ہوئے ہوتے ۔۔۔ پیغمبر کی نو عمر بیوی ایک اجنبی نوجوان کے ساتھ۔

اس قسم کے جھوٹے تصویری افسانے کسی بھی شخص کے خلاف بنائے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا اسماعیل شہید قدیم دہلی میں رہتے تھے۔ وہ اپنے وعظ کے لئے مشہور تھے۔ ایک بار دہلی کی طوائفوں کی طرف سے انہیں پیغام ملا کہ آپ ہمارے یہاں تشریف لائیں اور ہم کو وعظ فرمائیں۔ شاہ اسماعیل شہید نے اس دعوت کو قبول فرمالیا۔ وہ وہاں گئے اور سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر کے دروازے پر پہنچے اور وہاں کھڑے ہو کر وعظ فرمایا۔ پھر واپس آگئے۔ اگر اس زمانہ میں کیمرہ ہوتا تو جب وہ وہاں کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے اس وقت کوئی کیمرہ والا اس منظر کا فوٹو لے لیتا اور پھر اگلے دن دہلی کے اخبار میں ایک تصویر چھپتی جس کے نیچے نعوذ باللہ یہ الفاظ لکھے ہوئے ہوتے ۔۔۔ مولانا شاہ اسماعیل صاحب طوائف کے کوٹھے پر چڑھتے ہوئے۔

اس قسم کے تصویری پروپیگنڈے موجودہ زمانہ میں بہت زیادہ عام ہیں۔ اکثر بے بنیاد افواہیں جھوٹی تصویروں کی مدد سے پھیلائی جاتی ہیں۔ ایسی مثالیں ہندستان میں بھی بار بار پیش آئی ہیں اور باہر کے ملکوں میں بھی۔

مجھے خود بھی متعدد بار اس قسم کے تصویری پروپیگنڈے کا تجربہ پیش آیا ہے۔ ایک بار میں نے ایک عرب پرچے میں بیت المقدس (قبۃ الصخرا) کی تصویر دیکھی۔ اس تصویر میں نظر

آرہا تھا کہ اسرائیلی فوجی بندوق کے ساتھ قبۃ الصخرا کے قریب دونوں طرف کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کے پاؤں زمین پر تھے اور سر گنبد کے اوپر تک پہنچے ہوئے تھے۔

بظاہر یہ ایک سچا فوٹو دکھائی دیتا تھا۔ مگر جب میں نے گہرائی کے ساتھ غور کیا تو یہ فوٹو غیر فطری نظر آیا کیونکہ ایسا واقعہ صرف اس وقت ممکن تھا جب کہ ان اسرائیلی فوجیوں کا قد تاڑ کے برابر ہو۔ اصل یہ ہے کہ اسرائیلی فوجیوں کی یہ تصویر کاٹ کر قبۃ الصخرا کی تصویر کے ساتھ چپکائی گئی تھی۔ اور پھر اس مصنوعی تصویر کا فوٹو لے کر اس کو میگزین میں چھاپا گیا تھا۔

اس کے بعد جب میں فلسطین گیا اور مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرا کو دیکھا تو میرے قیاس کی تصدیق ہو گئی۔ وہاں میں نے پایا کہ قبۃ الصخرا کے کمپاؤنڈ میں اندر کوئی اسرائیلی فوجی نہیں رہتا۔ اسرائیلی فوجی صرف گیٹ کے باہر ہوتے ہیں۔ اور باہر کھڑے ہوئے ان اسرائیلی فوجیوں کے قد یقینی طور پر عام انسانی قد کے مانند تھے نہ کہ تاڑ کے درخت کے مانند۔

تصویری پروپیگنڈے کی یہ قسم دوسروں کے لئے صرف ایک جھوٹی سیاست ہے مگر مسلمانوں کے لئے وہ مزید اضافہ کے ساتھ ایک ناقابل معافی گناہ۔

ایک انٹرویو

۷ دسمبر ۱۹۹۸ کو کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں ایک سمینار تھا۔ اس کا انتظام سارک سٹی زن فورم (SAARC Citizens Forum) کی طرف سے کیا گیا تھا۔ یہاں ۷ دسمبر کی شام کو پی ٹی آئی (پریس ٹرسٹ آف انڈیا) کے نمائندہ کے جی سورش نے راقم الحروف سے ملاقات کی اور ایک انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات کا تعلق زیادہ تر وندے ماترم کے اشو سے تھا۔ (Tel- 3718713-3717642) انھوں نے سوال کیا کہ آج کل وندے ماترم کا اشو میڈیا میں بہت زیادہ آرہا ہے۔ کچھ لوگ اس کے موافق ہیں اور کچھ لوگ اس کے مخالف۔ اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ میں پہلی بات یہ ہے کہ غیر خدا کی پرستش اسلام میں جائز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ معاملہ اتنا زیادہ بڑھ گیا۔ اپنے اس عقیدہ کی بنا پر مسلم مائنڈ وندے ماترم کو کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ اس نظم میں بھارت کو معبود کا درجہ دے کر اس کے لئے پرستش کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔

ان کے ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ وطن کی پوجا اور وطن کی محبت دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ وطن کی محبت ایک فطری چیز ہے اور وہ بلا شبہ اسلام کے مطابق ہے۔ ہر انسان کو اپنے وطن سے محبت ہوتی ہے اور اسی طرح مسلمانوں کو بھی اپنے وطن سے محبت ہے۔ مگر جہاں تک وطن کی پوجا کا تعلق ہے، وہ اسلام کے مطابق نہیں۔ میں نے کہا کہ وطن کی پرستش ایک مخصوص مذہبی عقیدہ ہے، حب الوطنی سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ اس قسم کا مذہبی عقیدہ ایک انفرادی معاملہ ہے، وہ پورے ملک کا اجتماعی معاملہ نہیں۔ اس لئے اس عقیدہ کو حب وطن کے معاملہ سے الگ رکھنا چاہیے۔

سوال

میں نے کئی مذہبوں کو پڑھا ہے۔ میرا ماننا یہ ہے کہ سب مذہب ایک ہیں۔ سب مذہب ایک ہی سچائی کی طرف جاتے ہیں۔ آج کل لوگوں میں یہ سوچ آگئی ہے کہ میرا ہی مذہب اچھا اور سچا ہے۔ اس کی وجہ سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ سب مذہب یکساں ہیں تو تمام جھگڑے اپنے آپ مٹ جائیں گے۔ اس بارے میں اپنی رائے دیں (گوپال شرما، نئی دہلی)

جواب

سب مذہب ایک ہیں کا نظریہ ایک غیر علمی اور غیر واقعی نظریہ ہے۔ کیونکہ مذہبوں کے درمیان اختلاف ایک واضح حقیقت ہے۔ مثال کے طور پر اسلام میں خالق اور مخلوق کی علیحدگی کا تصور ہے، جب کہ ہندو دھرم میں دونوں کو ایک مانا جاتا ہے، اسی کا نام ادویت واد ہے۔ اسی طرح اسلام میں پیغمبر کا تصور ہے اور ہندو دھرم میں خدائی اوتار کا تصور۔ اسلام میں موت کے بعد سزا اور جزا کا تصور ہے اور ہندو دھرم میں آواگمن کا تصور، وغیرہ۔ جہاں تک سماجی اتحاد کا معاملہ ہے، اس کا کوئی تعلق مذہبی اتحاد سے نہیں۔ ساری تاریخ بتاتی ہے کہ بار بار ایک مذہب کے لوگ آپس میں لڑتے رہے ہیں مثلاً کورو اور پانڈو دونوں ہندو تھے۔ اس کے باوجود ان میں زبردست جنگ ہوئی۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگ میں عیسائی قومیں ایک دوسرے کے خلاف لڑیں۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کی ۱۹۷۱ کی جنگ یا افغانستان کی موجودہ جنگ میں دونوں فریق مسلمان ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اختلاف ایک فطری چیز ہے، وہ زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ اختلاف انسانوں کے درمیان ہر حال میں باقی رہتا ہے، وہ کسی بھی صورت میں ختم نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں اتحاد اور امن کی حقیقی بنیاد صرف ایک ہے، اور وہ ہے اسپرٹ آف ٹالرینس۔ ہمیں لوگوں کے اندر ٹالرینس اور باہمی احترام کا مزاج پیدا کرنا چاہئے۔ نہ کہ بے فائدہ طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔ انسانوں کے درمیان اتحاد کا تعلق خود انسان کے اپنے مزاج سے ہے نہ کہ کسی قسم کے خارجی نظریہ سے۔

سوال

کہا جاتا ہے کہ ہندستان کے اسلامی مدرسوں میں تشدد اور علیٰحدگی پسندی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس طرح وہ ملک میں منفی رول ادا کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں ان مدرسوں کو باقی رکھنے کا کیا جواز ہے (محمد عمران، راشٹریہ سہارا، دہلی)

جواب

یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ملک میں تشدد پسندی اور علیٰحدگی پسندی کا رجحان ہے مگر وہ زیادہ تر سیاسی لیڈروں کا پیدا کردہ ہے، ان کا مدرسوں سے کوئی تعلق نہیں۔ ان مدرسوں میں دین اور اخلاق کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان مدرسوں میں ایسے لوگ تیار کیے جاتے ہیں جو اصول پسند اور باکردار ہوں۔ اور اسی کے ساتھ وہ سماج میں مارل ٹیچر بن کر رہ سکیں۔ میں خود مدرسہ کے اسی تعلیمی نظام کی پیداوار ہوں۔ اور میں پورے اعتماد کے ساتھ اس قسم کے الزام کی تردید کر سکتا ہوں۔ سیاست اور ٹی وی یہ دو چیزیں لوگوں کے کردار کو بری طرح تباہ کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں مدرسہ کے نظام کو مزید طاقتور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ موجودہ اخلاقی بگاڑ کے سیلاب کو روک سکیں۔

سوال

ھدایہ کا ایک جزئیہ ہے "قتال الکفار واجب وان لم یبدونا" (کفار سے قتال واجب ہے اگرچہ وہ ہم سے قتال کی ابتدا نہ کریں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اسلام اور اہل کفر کے درمیان تعلق کی دائمی نسبت محاربہ کی ہے۔ اور اہل کفر سے اہل ایمان کو جنگ کرنا مطلقاً واجب ہے۔ اسی طرح کی بات امام ابن القیم نے زاد المعاد میں جہاد کے سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے، اور سید قطب شہید نے اپنی مشہور کتاب معالم فی الطریق میں اسی کو بنیاد بنا کر ایک لمبی بحث لکھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ بات علمی اور شرعی طور پر ثابت ہے (غطریف شہباز ندوی، ابوالفضل انکلیو نئی دہلی)

جواب

دائمی محاربہ کا نظریہ نہ قرآن کی کسی براہ راست نص میں ہے اور نہ حدیث میں۔ وہ تمام تر کچھ فقہا اور علماء کے قیاس پر مبنی ہے۔ اور دائمی محاربہ جیسا سنگین مسئلہ صرف نص صریح سے ثابت ہونا چاہئے نہ کہ قیاس سے۔ مثال کے طور پر قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کفار و مشرکین جب تک تم سے سیدھے (پرامن) رہیں تم بھی ان سے سیدھے (پرامن) رہو (التوبہ ۷) قرآن کی یہ آیت واضح طور پر مذکورہ نظریہ سے ٹکراتی ہے۔ اسی طرح ایک متفق علیہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو بلکہ اللہ سے عافیت مانگو (لاتتمنوا لقاء العدو واسالوا اللہ العافیة) یہ حدیث بھی واضح طور پر مذکورہ نظریہ کی تردید ہے۔ مزید یہ کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تم سے آسانی چاہتا ہے (البقرہ ۱۸۵) اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ دین آسان ہے (الدین یسر) مگر مذکورہ نظریہ دین کو نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن بنادیتا ہے۔ اس کی ایک جدید مثال کمیونزم ہے۔ اس کو بھی ابدی محاربہ کے نظریہ پر قائم کیا گیا تھا مگر تقریباً سو سال کے تجربہ کے بعد وہ مکمل طور پر ناکام ہو گیا۔ اگر ابدی محاربہ اسلام کا حکم ہو تو یہ نعوذ باللہ اسلام کو غیر ابدی قرار دینے کے ہم معنی ہوگا۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کے لئے اس دنیا میں صرف دو میں سے ایک کا انتخاب ہے۔۔۔ ہلاکت یا منافقت۔ یعنی یا تو وہ ساری دنیا میں غیر مسلم قوموں سے لڑ کر اپنے کو ہلاک کرتے رہیں یا ابدی محاربہ کا عقیدہ رکھتے ہوئے ظاہری طور پر مصالحت کی روش اختیار کرلیں جس کا دوسرا نام منافقت ہے۔

سوال

آپ نے اپنی متعدد تحریروں میں تقسیم ہند کو ایک غلط فیصلہ قرار دیا ہے۔ آپ کے نزدیک تقسیم ہند کی تحریک نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے بیچ مطلوب دعوتی تعلق کو نقصان پہنچایا ہے۔ دونوں قومیں اسی تحریک کے باعث ایک دوسرے سے نفرت کرتی ہیں۔ ہم یہ بات تسلیم کرسکتے ہیں

لیکن سوال یہ ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے پچاس سال بعد اس بحث کا فائدہ کیا ہے۔ کیا تاریخ کے پہیہ کو الٹا گھمایا جاسکتا ہے (طالب محسن، لاہور)

جواب

پاکستان کے بیشتر لکھنے اور بولنے والے بنگلہ دیش پر اور بنگلہ دیش کی قیادت پر تنقید کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہ نہیں کہ بنگلہ دیش کے معاملہ میں "تاریخ کے پہیے کو الٹا گھمایا جائے۔" اس قسم کی تنقیدوں کا مقصد صرف اس ذہنیت پر تنقید ہوتا ہے جس نے بنگلہ دیش کو بنوایا۔ اسی طرح پاکستان کے بارے میں میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مقصد بھی تقسیم اور تفریق کی ذہنیت پر تنقید ہے نہ کہ تاریخی معنوں میں وجود پاکستان پر تنقید۔ آج یہ صورت حال ہے کہ دنیا کے جس ملک میں بھی مسلمان اس کے کسی خطہ میں اکثریت رکھتے ہیں وہاں وہ مرکزی لیڈر شپ سے ٹکراؤ کر کے اپنا علیٰحدہ مسلم پاکٹ بنانا چاہتے ہیں۔ یہ ذہنیت میرے نزدیک اسلامی روح کے سراسر خلاف ہے۔ اسلام پھیلاؤ کو پسند کرتا ہے نہ کہ سمٹنے کو۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی قوموں کو خدا کے سایۂ رحمت میں لایا جائے نہ کہ ان کو غیر قوم قرار دے کر ان سے جدائی اختیار کر لی جائے۔

سوال

مسلمانوں کے اندر باہمی مسلکی جھگڑے کیا اپنی جہالت کی وجہ سے ہیں یا اس کے لئے غیر قوموں کی طرف سے ہوا دی جاتی ہے۔ یعنی یہ صورت حال مسلمانوں کی کسی داخلی کمزوری کا نتیجہ ہے یا وہ اغیار کی سازش کا نتیجہ ہے (عبد الملک المظاہری، حیدر آباد)

جواب

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ تمہارے اوپر جو مصیبت بھی آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی کا نتیجہ ہوتی ہے (الشوریٰ ۳۰) اس کے مطابق ہمیں ہر مصیبت یا افتاد کا سبب خود اپنی کمزوریوں کو

سمجھنا چاہئے نہ کہ اغیار کی مخالفانہ کارروائیوں کا نتیجہ۔ یہ دنیا مسابقت کی دنیا ہے، اس لئے یہاں مسلمانوں کے خلاف سازشیں بھی ضرور ہوں گی۔ ایسا ہونا بالکل فطری ہے۔ مگر اس کا حل دوسروں سے لڑنا نہیں ہے بلکہ اس کا حل قرآن کے مطابق، یہ ہے کہ خود اپنے اندر تقویٰ اور صبر کی طاقت پیدا کی جائے۔ صبر اور تقویٰ ہر سازش کے خلاف یقینی ڈھال ہے (آل عمران ۱۲۰)

سوال

آپ کی تحریروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے جیسے کہ آپ شعوری یا لاشعوری طور پر تصوف کے نظریہ وحدت شہود کے قائل ہیں۔ کیا آپ غیر مسلموں کو اسلام کے قریب لانے کے لئے اس نظریہ کی وقتی ضرورت اور مصلحت کے تحت قائل ہیں یا یہ کہ با قاعدہ اسے ایک ابدی نظریہ اور حقیقت سمجھتے ہیں۔ (محمد اورنگ زیب صالح، اوکاڑی، پاکستان)

جواب

وحدت وجود اور وحدت شہود دونوں ہی نظریہ کو میں غلط سمجھتا ہوں۔ میں نے کبھی اپنی تحریروں میں ان کی تائید نہیں کی، نہ وقتی اور نہ مستقل۔ یہ دونوں نظریات لفظی فرق کے باوجود حقیقۃً ایک ہیں۔ وحدت وجود کا مطلب سادہ طور پر یہ ہے کہ تمام موجودات خدا کا جزء ہیں، اور وحدت شہود کا مطلب یہ ہے کہ تمام موجودات خدا کا مظہر ہیں۔ ان دونوں میں کوئی حقیقی فرق نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ کائنات کی تمام چیزوں کو خدا نے اپنے حکم سے پیدا کیا ہے۔ خالق الگ ہے اور مخلوق الگ۔ دونوں کے درمیان کوئی وجودی اشتراک نہیں۔

سوال

میں الرسالہ کا قاری ہوں اور آپ جو کام کر رہے ہیں اس کا قدرداں ہوں۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ ہمارے ملک میں زیادہ پڑھے لکھے لوگ نہیں ہیں۔ ایسی حالت میں رسالہ اور کتاب کے ذریعہ ان لوگوں تک دعوت نہیں پہنچائی جاسکتی۔ ہمیں ایسی کوئی ترکیب عمل میں لانا چاہئے کہ

ایسے لوگوں تک بھی دعوت کا پیغام پہنچ سکے۔ (سید عبدالحفیظ، بھڑ گاؤں، جل گاؤں)

جواب

ہر زمانہ کی طرح آج بھی مسلمانوں میں خواص اور عوام دونوں قسم کے لوگ موجود ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس وقت دونوں ہی طبقوں میں اسلامی دعوت کا کام جاری ہے۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے، تبلیغی جماعت ان کے درمیان وسیع اور موثر کام کر رہی ہے۔ اور ماشاءاللہ اس کے مثبت نتائج بھی نکل رہے ہیں۔ ہم نے اصلاً خواص کے طبقہ کو اپنا نشانہ بنایا ہے۔ پچھلے پچیس سال کی کوشش کے نتیجہ میں آج یہ کہا جاسکتا ہے کہ خواص کے طبقہ میں اسلام کا پیغام وسیع پیانہ پر پہنچ رہا ہے۔ اور اس کے مثبت نتائج بھی واضح طور پر نکل رہے ہیں۔ اس تحریک کے نتیجہ میں نہ صرف ہندستان بلکہ دوسرے ملکوں کے ہزاروں لوگوں کو از سر نو اسلام کی صداقت پر یقین حاصل ہوا ہے۔ پچھلے چند برسوں سے ہندستان کے مسلمانوں میں احتجاج اور ٹکراؤ کا مزاج بڑی حد تک ختم ہو گیا ہے۔ اب وہ تعلیم اور تجارت جیسے تعمیری شعبوں میں سرگرم ہو رہے ہیں۔ یہ بھی سب سے زیادہ الرسالہ تحریک کا نتیجہ ہے۔ الرسالہ تحریک اگرچہ براہ راست طور پر تعلیم یافتہ طبقہ تک پہنچتی ہے مگر یہ تعلیم یافتہ لوگ اپنے اپنے حلقہ میں عوام تک بھی اس تعمیری آواز کو پہنچانے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔

سوال

ماہنامہ الرسالہ کا میں ایک ریگولر ریڈر ہوں۔ اور اس کو پسند کرتا ہوں۔ مگر کبھی کبھی آپ نزاعی معاملات میں پڑ جاتے ہیں جو آپ کو نہیں کرنا چاہئے۔ مثلاً بابری مسجد، وندے ماترم جیسے اشو میں پڑ کر آپ نے اپنے کو متنازعہ شخصیت بنالیا۔ یہ آپ کے مثبت مشن کے لئے مفید نہیں (شفیع الدین احمد، دہلی)

جواب

کوئی بھی شخص جو اجتماعی تحریک چلائے، اس کے لئے نزاع سے بچنا ممکن نہیں۔ نزاع آپ کے اندر نہیں ہوتی بلکہ وہ دوسروں کے دماغ میں ہوتی ہے۔ اور وہ اس کو آپ کے ساتھ منسوب کر کے غیر

ضروری طور پر نزاعی بنادیتے ہیں۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی محتاط ہو، وہ ایسے لوگوں کے زبان و قلم سے بچ نہیں سکتا۔ مثال کے طور پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی اعتدال پسندی اور غیر اختلافی روش کے لئے مشہور ہیں۔ مگر ان کے بارے میں بھی متعدد بار اخبار میں اس قسم کی باتیں آتی رہی ہیں۔ اس کی ایک تازہ مثال ہفت روزہ نئی دنیا (دہلی) کے شمارہ ۱-۷ دسمبر ۱۹۹۸ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس میں ایک مسلم رہنما مولانا موصوف کے ایک بیان کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے کیا مطلب نکالا جائے کہ مولانا علی میاں اندر ہی اندر سازش کر رہے ہیں اور ایسے بیانات دے کر بی جے پی کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں..... اور یہ کہ مولانا علی میاں اس سازش کو سمجھنے میں ناکام رہے اور مسلمانوں کو غلط مشورہ دے دیا ہے جس کی میں مکمل طور پر مخالفت کرتا ہوں........ مولانا علی میاں کا بیان بی جے پی کے مقصد کو پورا کردے گا....... میں مولانا علی میاں کی رائے سے بالکل اتفاق نہیں کرتا ہوں کیونکہ اس سے وشوہندو پریشد اور بی جے پی کی مسلمانوں کو تعلیم سے دور کرنے کی سازش کامیاب ہو جائیگی ...... میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ انھوں نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنالی ہے جو مسلمانوں کے لئے بہت زیادہ نقصان دہ ثابت ہوگی (صفحہ ۵) اسی صورت حال کے بارے میں ایک عربی شاعر نے کہا تھا۔

قیل ان الالہ ذوولد　　　قیل ان الرسول قد کہنا

مانجا اللہ والرسول معاً　　　من لسان الوریٰ فکیف انا

جہاں تک متنازعہ شخصیت کا تعلق ہے تو یہ سراسر ایک اضافی بات ہے۔ تاریخ کے تمام بڑے رہنما اپنے زمانہ میں متنازعہ شخصیت تھے اور بعد کے زمانہ میں مسلّمہ شخصیت۔ ابو حنیفہ، فخر الدین الرازی، ابن تیمیہ اپنے معاصرین کی نظر میں متنازعہ شخصیت تھے۔ مگر بعد والوں کی نظر میں وہ امام بن گئے۔ ہندستان میں شاہ ولی اللہ، سرسید، سید حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد اپنے زمانہ میں متنازعہ شخصیت بن گئے تھے۔ معاصرین کی نظر میں متنازعہ شخصیت بننا اس بات کی پیشگی اطلاع ہے کہ مستقبل میں اس کو یقینی طور پر غیر متنازعہ شخصیت کا مقام ملنے والا ہے۔

۱۔ نومبر ۱۹۹۸ کے پہلے اور دوسرے ہفتہ میں دبئی میں کتابوں کی ایک بڑی نمائش ہوئی۔ اس میں اسلامی مرکز کا بک اسٹال لگایا گیا۔ لوگوں نے بڑی تعداد میں کتابیں حاصل کیں اور کہا کہ ایسا مقامی انتظام کیجئے کہ دوبئی میں یہ کتابیں برابر ملنے لگیں۔

۲۔ نئی دہلی کے آئی میگزین (spicmacay sciety) کے نمائندہ مسٹر سنگھتا سنگھ نے یکم نومبر ۱۹۹۸ کو اپنے میگزین کے لئے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اسلام سے تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ اسلام میں کٹرپن کیوں ہے۔ جواب میں کہا گیا کہ اسلام میں کٹرپن نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ اسلام نرمی اور اعتدال کا دین ہے۔ اور یہ کہ اہل اسلام کو دوسروں کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ کوئی شخص اگر اسلام کے نام پر کٹرپن دکھائے تو اس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں ہے۔

۳۔ سری دھنوم جے داس چیریٹبل ٹرسٹ (چترنجن پارک نئی دہلی) کے تحت ۴ نومبر ۱۹۹۸ کو ایک سیمینار ہوا۔ اس کا موضوع اخلاقیات تھا۔ ہر مذہب کے لوگوں نے اپنے مذہب کی روشنی میں اخلاق کی اہمیت بتائی۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور اسلام اور اخلاقیات کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ انھوں نے بتایا کہ اسلام میں اخلاقیات اتنی زیادہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ سب سے اچھا انسان وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو۔ اسی طرح اس موضوع سے متعلق پیغمبر اسلام کی اور بہت سی حدیثیں بیان کیں۔

۴۔ ۷ نومبر ۱۹۹۸ کو اپسرا آرٹ سنٹر (نئی دہلی) میں ایک اجتماع تھا۔ اس کا موضوع اسلام میں جہاد کا تصور تھا۔ اس میں دہلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں نے شرکت کی۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور موضوع پر اظہار خیال کیا۔ ایک سوال کے

جواب میں انھوں نے کہا کہ جہاد دراصل پرامن جدوجہد کا نام ہے نہ کہ تشدد کا۔ آپ کو چاہئے کہ جہاد کے تصور کو قرآن وحدیث سے سمجھیں نہ کہ کسی شخص کے رویہ سے۔

۵۔ دہلی کے انگریزی اخبار راشٹریہ سہارا کے نمائندہ، مسٹر عمران نے ۱۲ نومبر کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستان میں اور خاص طور پر مسلمانوں میں تعلیم کے سوال کے مسئلہ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں میں مدرسہ کا جو نظام ہے وہ ملک کی ترقی میں رکاوٹ نہیں ہے بلکہ وہ اس میں مددگار عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مدرسے ملک کو مارل ٹیچر فراہم کر رہے ہیں جس کی ملک کو شدید ضرورت ہے۔

۶۔ سنسکرت اکیڈمی دہلی کی طرف سے ۱۲ نومبر کو ذاکر حسین کالج (دہلی) میں ایک اجتماع ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام ایک عالمی مذہب ہے۔ وہ زبانوں سے پرہیز نہیں سکھاتا۔ چنانچہ مسلمانوں نے دنیا بھر کی زبانیں سیکھیں اور بڑے بڑے علمی کارنامے انجام دیئے۔ حتی کہ تاریخ کو نئے علمی دور میں داخل کر دیا۔

۷۔ آرٹ سنٹر (نئی دہلی) میں ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۸ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس کا موضوع روحانیت تھا۔ اس کے بنیادی اسپیکر دو تھے ڈاکٹر کرن سنگھ اور صدر اسلامی مرکز۔ صدر اسلامی مرکز نے اپنی تقریر میں اسلام اور روحانیت کے موضوع پر گفتگو کی۔ آخر میں حاضرین کی طرف سے اسلام کے بارے میں کئی سوالات کئے گئے جس کا انھوں نے جواب دیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ اسلام کا مقصد اصلاً فرد کا تعمیر وتزکیہ ہے۔ اسلام میں مدافعانہ جنگ ہے مگر جارحانہ جنگ کی اسلام میں اجازت نہیں۔

۸۔ ہندی ہفتہ وار جن چیتنا (دہلی) کے ایڈیٹر رام گوپال سسودیا نے ۱۲ دسمبر کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق اسلام اور مسلمانوں سے تھا۔ ایک سوال کے

جواب میں کہا گیا کہ اسلام کبھی نفرت کی تعلیم نہیں دے سکتا۔ اسلام کا پیغام ساری انسانیت کے لئے ہے اور جو دین ساری انسانیت کو خطاب کرتا ہو وہ کبھی نفرت کی تعلیم نہیں دے گا کیوں کہ نفرت اس کے مشن کے راستہ میں رکاوٹ ہے۔

۹۔ زی ٹی وی (دہلی) میں ۲۲ دسمبر ۱۹۹۸ کو ایک پینل ڈسکشن تھا۔ مسٹر ٹی این سیشن نے اس کو کنڈکٹ کیا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ موضوع یہ تھا کہ کیا اقلیت اس ملک میں ڈر محسوس کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ انڈیا میں مسلمانوں کے لئے بہت سی قابل شکایت باتیں ہیں مگر یہ کہنا صحیح نہیں کہ مسلمان اس ملک میں ڈر کی نفسیات کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس ایمان کی جو طاقت ہے وہ ان کو ڈر سے بچاتی ہے۔ البتہ ان کو شکایت ضرور ہے۔ مسٹر ونے کٹیہار (فاؤنڈر پریسیڈنٹ بجرنگ دل) نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے اس دیش میں کوئی ڈر کی بات نہیں۔ صدر اسلامی مرکز نے جواب دیا کہ اس کا کریڈٹ آپ کو نہیں جاتا بلکہ مسلمانوں کو جاتا ہے۔ کیونکہ آپ نے توڈرانے کی پوری کوشش کی مگر وہ ڈرے نہیں۔ خود جہاں تک آپ کا تعلق ہے تو آپ نے تو اجودھیا میں گھس کر بابری مسجد کو توڑ دیا جب کہ اس کا کیس عدالت میں تھا۔ مسلمان صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ دستور اور قانون کے مطابق معاملہ کیا جائے۔

۱۰۔ ایک کتاب زیر تیاری ہے۔ اس کا نام ہندو مسلم ڈائیلاگ ہوگا۔ اس کتاب میں ڈائیلاگ کے روپ میں ان تمام عقائد اور اعمال پر بحث ہوگی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان عرصہ سے اختلافی شکل میں چلے آرہے ہیں۔ اس ڈائیلاگ کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے بارے میں غیر مسلموں کے درمیان جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور ہوں اور اسلام کی صداقت دلائل کے اسلوب میں واضح ہو۔

نئی کتابیں

مولانا وحید الدین خاں، صدر اسلامی مرکز نے حال میں تین اہم کتابیں تیار کی ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں ـــــ انسانیت کی تعمیر میں اسلام کا حصہ (۵۰ صفحات) ہندستان کی منزل (۵۰ صفحات) اور تعمیر ہند (۵۰ صفحات) یہ تینوں کتابیں زیر طبع ہیں اور انشاءاللہ جلد ہی شائع ہو جائیں گی۔ ان تینوں کتابوں میں اسلام کے انقلابی پہلو کو واضح کیا گیا ہے اور ہندستانی مسلمانوں کے تخلیقی رول پر گفتگو کی گئی ہے۔ ان میں خالص حقائق و واقعات کی روشنی میں دکھایا گیا ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کے لئے ایک عظیم تاریخی رول مقدر ہے۔ مسلمانوں کے پاس اسلام کی صورت میں ایک صحیح آئیڈیالوجی ہے اور اسی کے ساتھ ایک مکمل تاریخی نمونہ بھی۔ اس طرح وہی اس پوزیشن میں ہیں کہ اس خطۂ ارض میں کوئی بڑا تعمیری رول ادا کریں اور ہندستان کو ایک بہتر مستقبل کی طرف لے جائیں۔ ہندستان کے مسلمان اس ملک کے لئے کوئی بوجھ (liability) نہیں ہیں بلکہ وہ پورے معنی میں ملک کے لئے ایک اثاثہ (asset) ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت انشاءاللہ مسلمانوں کے اندر ایک نیا حوصلہ پیدا کرے گی۔ وہ اپنے آپ کو اس ملک میں اقدامی پوزیشن میں محسوس کریں گے نہ کہ مدافعانہ پوزیشن میں۔ یہ تینوں کتابیں اس حدیث رسول کی تشریح کرتی ہیں جس میں پیشین گوئی کی گئی ہے کہ میری امت کا ایک حصہ ہندستان میں غزوہ (اصلاحی اور تعمیری جدوجہد) کرے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے آگ کے عذاب سے نجات دے دی ہے۔ زیر نظر الرسالہ کا مضمون "توحید۔ انسانیت کی منزل" مذکورہ کتاب ہی کا ایک باب ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, Near DVB Office,
New Delhi-110013
Tel.: 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

مارچ ۱۹۹۹ شمارہ ۲۶۸

فہرست — صفحہ

جنتی انسان

جنت کا معاملہ کوئی گروہی معاملہ نہیں۔ یعنی ایسا نہیں کہ کوئی گروہ بحیثیت گروہ جنتی ہو اور جب وہ لوگ آخرت میں پہنچیں تو ایک طرف سے پورے گروہ کو جنت میں داخلہ مل جائے۔ اسی طرح جنت میں داخلہ کا معاملہ کوئی سفارشی معاملہ بھی نہیں۔ یعنی ایسا نہیں کہ کچھ لوگوں کو خدا کی طرف سے سفارش کے اختیارات دیئے گئے ہوں اور جس کے بارے میں وہ سفارش کریں ان کو جنت میں داخلہ دے دیا جائے۔ اسی طرح ایسا بھی نہیں کہ کچھ خارجی اعمال اپنے اندر پراسرار فضیلت رکھتے ہوں اور جو آدمی اپنے اعضا وجوارح سے ان خارجی اعمال کو دہرادے وہ اپنے آپ جنت کا مستحق بن جائے۔

جنتی انسان کون ہے۔ اس کا جواب قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے: **ذلك جزاء من تزكى** (طٰہٰ: ۷۶) یعنی جنت کی قیمت تزکیہ ہے۔ جنت ان خوش نصیب افراد کو ملے گی جنھوں نے دنیا کی زندگی میں اپنا تزکیہ کیا ہو۔ جو ذہن مطہر اور قلب مصفی لے کر آخرت میں پہنچیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں جنتی نفسیات کے ساتھ رہے۔ جن کی معرفت نے انھیں خدا میں جینے والا بنا دیا تھا۔ جن کو وہ گہرا ایمان حاصل تھا جو قول وعمل کا نور بن کر انسان کی زندگی میں شامل ہو جاتا ہے۔ جو مثبت نفسیات میں نہائے ہوئے تھے اور منفی نفسیات سے یکسر پاک تھے۔

جنت خدا کے پڑوس میں بننے والی لطیف ونفیس کالونی ہے۔ اس میں وہی لوگ بسائے جائیں گے جو خدا کی پسند کو اپنی پسند بنالیں۔ اور خدا کی ناپسند کو اپنی ناپسند، جو مادیات سے اس حد تک اوپر اٹھ جائیں کہ دنیا ہی میں ان کو جنت کی خوشبو محسوس ہونے لگے۔ جن کے لئے جنت اسی آج کی دنیا میں ایک جانی پہچانی چیز بن جائے (يدخلهم الجنة عرفها لهم)

مسجد کی اہمیت

حدیث میں آیا ہے کہ :المساجد بیوت المتقین (مسجدیں متقیوں کا گھر ہیں) یعنی مسجد اہل تقویٰ کی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ مسجد وہ مقام ہے جس کے تحت متقیانہ زندگی کی سرگرمیاں عمل میں آتی ہیں۔

مسجد میں آس پاس کے مسلمان روزانہ پانچ بار اکٹھا ہوتے ہیں۔اس طرح ہر دن ان کی آپس میں ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ یہ ملاقات یا ملنا جلنا انسان کی ایک لازمی ضرورت ہے۔اسی مقصد کے لئے کلب قائم کئے جاتے ہیں۔ مگر دونوں میں یہ فرق ہے کہ کلب میں لوگ دنیوی تفریح کی نسبت سے اکٹھا ہوتے ہیں۔اس کے برعکس مسجد میں لوگ دین کی نسبت سے اکٹھا ہوتے ہیں۔ کلب اور اس طرح کے دوسرے مقامات اگر دنیوی مقاصد کے لئے اجتماع کی جگہ ہیں تو مسجد اخروی مقصد کے لئے اکٹھا ہونے کا مقام ہے۔

مسجد کے عمل کا آغاز اذان سے ہوتا ہے جو ایک خدا کی بڑائی کا اعلان ہے۔ مسجد میں آنے والے سب سے پہلے وضو کرتے ہیں۔ یہ گویا اخلاقی پاکیزگی کا سبق ہے۔پھر وہ مقرر عبادت کی صورت میں خدا کو یاد کرتے ہیں، وہ خدا کے کلام کو پڑھ کر اس کے تقاضوں کو اپنے ذہن میں تازہ کرتے ہیں۔ وہ رکوع اور سجدہ کی صورت میں یہ عزم کرتے ہیں کہ وہ سرکشی کو چھوڑیں گے اور متواضع زندگی گذاریں گے۔ جماعت کی صورت میں نماز ادا کر کے وہ اتحاد و اتفاق کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔وغیرہ

اس طرح مسجد میں روزانہ پانچ وقت کا عبادتی اجتماع ہوتا ہے۔ یہ گویا پابند اوقات زندگی گذارنے کی ایک تربیت ہے۔ یہ مسلمانوں کو ڈسپلن والی زندگی گذارنے کا پیغام ہے۔ مسجد سے اس طرح کے بہت سے فائدے وابستہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسجد کا نظام اگر درست طور پر قائم رہے تو وہ اہل اسلام کے لئے ہر قسم کے فائدوں کا ذریعہ بن جائے۔ وہ ان کی دنیا اور آخرت دونوں کو درست کر دے۔

مائنس کو پلس بنانا

جرمنی کے مشہور اسکالر الفرڈ ایڈلر (وفات ۱۹۳۷) کی ایک کتاب کا نام ہے: فرد کی نفسیات The Individual Psychology) ایڈلر نفسیات کا عالم تھا اس نے اپنی اس کتاب میں لکھا ہے کہ میں نے اپنی ساری عمر انسان کا مطالعہ کیا۔ اپنے اس لمبے مطالعہ کے بعد میں نے پایا کہ انسانوں کے اندر ایک بڑی انوکھی صفت ہوتی ہے اور وہ ان کی یہ طاقت ہے کہ وہ اپنے مائنس کو پلس بنا سکیں۔

Their power to turn a minus into a plus

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان پیدائشی طور پر ایک ہیرو ہوتا ہے۔ ہر انسان اپنے اندر یہ چھپی ہوئی صفت رکھتا ہے کہ وہ اپنے نہیں کو ہے میں تبدیل کر سکے، وہ ایک بار ناکام ہونے کے بعد دوبارہ اپنے آپ کو کامیاب بنالے۔

ایک بار میری ملاقات ایک نوجوان سے ہوئی۔ وہ میٹرک کے امتحان میں دو بار فیل ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنی زندگی سے اتنا مایوس ہو چکا تھا کہ یہ سوچنے لگا تھا کہ مجھ کو خودکشی کر لینا چاہئے۔ میں نے اس کو الفرڈ ایڈلر کی یہ بات بتائی اور کہا کہ ابھی آپ نے اپنے کو کم استعمال کیا تھا اس لئے آپ فیل ہو گئے۔ اب آپ اپنے کو پہلے سے زیادہ استعمال کیجئے، اس کے بعد آپ کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اب اس کے اندر ایک نیا حوصلہ جاگا۔ اس نے پہلے سے زیادہ محنت کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے جب تیسری بار میٹرک کا امتحان دیا تو وہ نہ صرف پاس ہوا بلکہ فرسٹ آیا۔ انسان اپنا تمام کام دماغ کی مدد سے کرتا ہے اور دماغ کے بارے میں تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ اس کے امکانات بے پناہ ہیں۔ انسانی دماغ کی جو غیر معمولی صلاحیت ہے عام انسان اس کا پانچ فیصد حصہ بھی استعمال نہیں کر پاتے اور مر جاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے دماغ کے خزانہ کا عام طور پر جتنا حصہ استعمال کرتا ہے اس کے بعد بھی اس خزانہ کا تقریباً ۹۵ فیصد حصہ استعمال کئے بغیر پڑا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی انسان کے لئے مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ گویا کہ ہر انسان کے فطری بینک میں اتنا زیادہ رقم جمع ہے کہ مسرفانہ حد تک خرچ کرنے کے باوجود اس کا بینک کبھی خالی نہ ہو، وہ ہر حال میں سونے اور چاندی سے بھرا رہے۔

آواز بلند کرنا

اکبر الہ آبادی (۱۹۲۱-۱۸۴۶) اردو زبان کے مشہور شاعر ہیں۔ انھوں نے طنز و مزاح کے انداز میں اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ ان کا ایک شعر یہ ہے:

ظلم سے اکبر بتوں کے چپ نہ رہنا چاہئے   اور کچھ نہ بن پڑے تو شعر کہنا چاہئے

یہ شعر اکثر انسانوں پر صادق آتا ہے۔ جن لوگوں کے بس میں یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مخالف حالات کو بدل سکیں، تو ایسے لوگ لفظی چیخ و پکار میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ جس کو وہ بطور خود "ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا" کہتے ہیں۔

اس قسم کا لفظی شور و غل یقینی طور پر بے معنی ہے۔ وہ سراسر بے فائدہ ہے۔ اس دنیا میں بہتر انسان وہ ہے جو بے فائدہ کاموں سے بچنے والا ہو۔

مزید یہ کہ یہ کام محض بے فائدہ نہیں بلکہ وہ مضر بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ناموافق حالات میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ تعمیر و استحکام کے ذریعہ اپنے آپ کو اتنا طاقتور بنایا جائے کہ مخالفوں کے مخالفانہ منصوبے بے اثر ہو کر رہ جائیں۔ ایسی حالت میں جب بے نتیجہ شور و غل کو کام سمجھ لیا جائے تو اس کے بعد ایسا ہوگا کہ لوگوں کی توجہ اصل کام سے ہٹ جائے گی۔ وہ سمجھیں گے کہ حالات کے مقابلہ میں ہم کو جو کچھ کرنا چاہیے وہ ہم کر رہے ہیں۔ یہ کوتاہی ان کے نقصان میں مزید اضافہ کا سبب بن جائے گی۔ عمل وہی ہے جو نتیجہ خیز ہو۔ جس عمل کا کوئی حقیقی نتیجہ نکلنے والا نہ ہو۔ وہ کوئی عمل بھی نہیں۔ ایسی حالت میں "ظلم کے خلاف چیخ و پکار" مضر بھی ہے اور بے فائدہ بھی۔ وہ ایک نقصان کے بعد اپنے آپ کو دوسرے نقصان میں ڈالنا ہے۔

اس دنیا میں اس سے زیادہ تباہ کن کوئی چیز نہیں کہ نہ کرنے کو کرنا سمجھ لیا جائے۔ یہی وہ حقیقت جس کو قرآن میں لغو سے پرہیز کہا گیا ہے۔

دینی تقاضے

۱۔ دین میں پہلی چیز ایمان ہے۔ ایمان خدا کی معرفت کا نام ہے۔ ایک انسان پر جب یہ حقیقت کھلتی ہے کہ خدا اس کا رب ہے اور وہ اس کا بندہ، اور یہ کہ خدا نے اس کی ہدایت کے لئے محمد بن عبد اللہ کو اپنا رسول بنا کر اس کے پاس بھیجا ہے تو وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ یہی ایمان ہے اور اسی کو کلمۂ اسلام کہا جاتا ہے۔

۲۔ ایمان کی حقیقت سینہ میں اترنے کے فوراً بعد یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے خالق و مالک کے آگے جھک جاتا ہے۔ وہ اپنے تمام بہترین احساسات کو خدا کی طرف موڑتے ہوئے اس کا پرستار بن جاتا ہے۔ اسی کا نام شریعت میں عبادت ہے۔

۳۔ ایسے انسان کا سابقہ جب بندوں سے پڑتا ہے تو وہ اپنے مزاج کے تحت ہر ایک سے تواضع کے ساتھ پیش آتا ہے۔ وہ ہر ایک کا خیر خواہ بن جاتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ ہمیشہ انصاف کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اس سے کسی کو غیر انسانی سلوک کا تجربہ نہیں ہوتا۔ یہی وہ روش ہے جس کا نام اسلامی اخلاق ہے۔ اسلامی اخلاق کے اصول پر قائم رہنے کے لئے صبر انتہائی طور پر ضروری ہے۔ جو آدمی صبر کرنے کے لئے تیار نہ ہو وہ لوگوں کے ساتھ اسلامی اخلاق برتنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

۴۔ جس آدمی کے اندر ایمان کی کیفیت پیدا ہو جائے وہ اپنے قریبی ماحول کے بارہ میں غیر جانبدار بن کر نہیں رہ سکتا۔ اس کا احساس مجبور کرتا ہے کہ وہ برا کرنے والوں کو برائی کرنے سے روکے اور لوگوں کو بھلائی کا طریقہ اختیار کرنے کی ترغیب دے۔ اسی کا نام شریعت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔

۵۔ آخری چیز دعوت الی اللہ ہے۔ یعنی عام انسانوں کو خدا کے تخلیقی نقشہ سے باخبر کرنا۔ انسان کو اس کے رب سے جوڑنا۔ اس کو غیر خدا پرستانہ زندگی سے نکال کر خدا پرستانہ زندگی کی طرف لے آنا۔

ریا، اخلاص

قرآن وحدیث میں بتایا گیا ہے کہ خدا ریأ والے عمل کو کبھی قبول نہیں کرتا۔ وہ صرف اس مخلصانہ عمل کو قبول کرتا ہے جو صرف خدا کی رضا کے لئے کیا گیا ہو۔

سماجی زندگی میں جو اعمال کئے جاتے ہیں ان میں اکثر ریا ٗ والا عمل اور اخلاص والا عمل دونوں ظاہری صورت کے اعتبار سے یکساں ہوتا ہے۔ مثلاً علم دین کی اشاعت، مال خرچ کرنا، اخلاقی سلوک، دوسرں کی اعانت وغیرہ۔ یہ سارے اعمال ریأ کے جذبہ کے تحت بھی ہو سکتے ہیں اور خالص خدائی رضا کے تحت بھی۔

مگر ظاہری مشابہت کے باوجود دونوں میں اتنا بڑا فرق ہے کہ ریأوالے عمل پر سزا ہے اور اخلاص والے عمل پر انعام۔ ایک قسم کا عمل آدمی کو جہنم کی طرف لے جاتا ہے اور دوسری قسم کا عمل جنت کی طرف۔

ایک پروفیشنل آدمی بھی لوگوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے۔ وہ اپنے اصحابِ معاملہ سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ دوسرا انسان وہ ہے جو اللہ کے دین کی خاطر نرم کلامی اختیار کرتا ہے۔ وہ اللہ کے خوف سے لوگوں کے ساتھ اخلاق اور دیانت کا معاملہ کرتا ہے بظاہر دونوں قسم کے آدمیوں کا عمل بالکل یکساں ہے مگر ایک کے لئے آخرت میں کچھ نہیں، اور دوسرے کے لئے آخرت میں وہ سب کچھ ہے جس کو وہ چاہے۔

اسی طرح ایک تاجر ہے جو سماجی اداروں کو مال دیتا ہے مگر اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیوی نیک نامی حاصل کرے۔ وہ سیاسی لیڈروں کو چندہ دیتا ہے تاکہ وہ وقت پر اس کے کام آئیں۔ دوسری طرف وہ خدا ترس تاجر ہے جو خالص آخرت کے جذبہ کے تحت اپنا مال خرچ کرتا ہے جو دین کی راہ میں کوشش کرنے والوں کی مخلصانہ مدد کرتا ہے، صرف اس لئے کہ خدا اس سے راضی ہو۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کے عمل کا انجام بھی ظاہری مشابہت کے باوجود یکساں نہیں۔ ان میں سے ایک خدا کے یہاں ناقابل قبول ہے اور دوسرا خدا کے یہاں پوری طرح قابل قبول۔

پانچ اصول

اصول فقہ کی کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ بیشتر قاعدے پانچ بنیادی اصولوں پر مبنی ہیں۔ ان پانچ اصولوں سے سیکڑوں ضابطے نکلتے ہیں جو بیشتر امور کو اپنے دائرہ میں لے لیتے ہیں۔ یہ سنہری اصول (القواعد الخمس الذهبية) یہ ہیں

۱. الامور بمقاصد ها	معاملات کا انحصار نیت اور قصد پر ہے
۲. اليقين لايزال بالشك	یقین کبھی شک سے زائل نہیں ہو تا
۳. الضرر يزال	نقصان کو دور کیا جائے گا
٤. المشقة تجلب التيسير	مشقت آسانی لے آتی ہے
٥. العادة محكمة	عرف اور رواج قابل لحاظ ہیں

آدمی جب بھی کوئی کام کرے یا کوئی قدم اٹھائے تو سب سے پہلے اس کی نیت دیکھی جائے گی۔ اگر اس کی نیت درست ہے تو اس کا اقدام بھی درست ہے اور اگر نیت درست نہیں تو اس کا اقدام بھی درست نہیں۔

ایک شخص کے عام حالات اگر اس یقین کی طرف لے جا رہے ہوں کہ وہ صحیح آدمی ہے تو محض ایک بے بنیاد شک کی بنا پر اس کو غلط نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اگر ایک شخص تکلیف میں مبتلا ہے یا کوئی نقصان کی صورت پیدا ہو گئی ہے تو ہر حال میں اس کا ازالہ کیا جائے گا۔ خواہ وہ کسی کا بھی معاملہ ہو۔ بعض فیصلے بظاہر کسی شخص یا گروہ کو مشقت میں ڈالنے والے ہوتے ہیں، لیکن اگر فیصلہ صحیح ہے تو باعتبار انجام اس سے آسانی ظاہر ہو گی۔

جو چیزیں لوگوں کے درمیان پسندیدہ رواج کی حیثیت حاصل کر لیں، ان کی حیثیت بھی قانون کی ہے۔ امکانی حد تک ان پر عمل کیا جائے گا۔

منافق کی پہچان

منافق کون ہے۔ قرآن (آل عمران ۱۶۷) میں منافق کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ بناوٹی باتیں کرتا ہے۔ اس کے دل میں کچھ ہوتا ہے اور زبان پر کچھ۔ قرآن کے الفاظ میں، ایسے لوگ اپنے منھ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے **(یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم)**

انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ مخلص اور منافق۔ مخلص انسان جب بولتا ہے تو اس کو یقین ہوتا ہے کہ خدا اس کے ہر لفظ کو سن رہا ہے۔ اس لئے وہ وہی بات کہتا ہے جو از روئے حق اسے کہنا چاہئے۔ اس بنا پر اس کے دل اور اس کی زبان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ایسا انسان دہرا کلام (double talk) سے مکمل طور پر پاک ہوتا ہے مخلص انسان کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اس کی کوئی بات خدا سے چھپی ہوئی نہیں۔ اس بنا پر اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کہے جو اس کے دل میں نہیں ہے۔

اس کے برعکس منافق انسان کا دل خدا کے خوف سے خالی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی نظر خدا پر نہیں ہوتی بلکہ انسان پر ہوتی ہے۔ انسان چونکہ اس کے دل کا حال نہیں جان سکتا اس لئے وہ انسان کو دھوکے میں رکھنے کے لئے اس سے بناوٹی بات بولتا ہے جو لوگوں کو خوش کرنے والی ہو۔ منافق انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل میں خود غرضی ہوتی ہے مگر وہ اپنی زبان سے غرض کی بات کرتا ہے۔ اس کے دل میں نفرت ہوتی ہے مگر اپنے منہ سے وہ محبت کے الفاظ بولتا ہے۔ اس کے دل میں ذاتی انٹرسٹ ہوتا ہے مگر اپنی زبان سے وہ اصول پسندی کی بات کرتا ہے۔ اس کا اصل مقصد اپنی خواہش کو پورا کرنا ہوتا ہے مگر زبان سے وہ دوسروں کی خیر خواہی کے الفاظ بولتا ہے۔

غیر ذمہ دار صحافت

بعض اردو اخبارات میں مراسلات کے کالم میں اکثر میرے خلاف ایسے خطوط اور مضامین چھپتے رہے ہیں جو سراسر الغو اور بے بنیاد ہوتے ہیں۔ میں ان کے بارے میں عام طور پر خاموشی کا رویہ اختیار کرتا ہوں اور مراسلہ نگاروں کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں۔ اس سے پہلے ایک بار اخبار قومی آواز میں میرے خلاف ایک بے بنیاد بات چھپی اس کی تردید میں میں نے ایک مراسلہ بھیجا جو قومی آواز (۵ مارچ ۱۹۹۵) میں چھپا۔ اس کو دیکھ کر تبلیغی جماعت کے معروف بزرگ مولانا اظہار الحسن صاحب مرحوم نے مجھے ایک خط لکھا۔ اس میں مجھے خاموشی کے اصول پر برقرار رہنے کی نصیحت کرتے ہوئے انھوں نے یہ شعر درج کیا تھا:

اشارتاً بھی نہ قصے بیاں کئے ہوتے
سیے تھے ہونٹ تو آنسو بھی پی لئے ہوتے

اس کے بعد میں نے اعراض کے قرآنی اصول پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ مگر حال میں میرے خلاف جو جھوٹا اور شر انگیز پروپیگنڈا کیا گیا ہے اس کی بنا پر میرے بعض دوستوں کا اصرار ہوا کہ میں اس کی کچھ وضاحت کروں۔

قومی آواز مورخہ ۹ جنوری ۱۹۹۹ میں ایک مراسلہ شائع ہوا ہے اس میں میرے خلاف جو باتیں کہی گئی ہیں وہ سب بلا شبہ بے بنیاد اور شر انگیز ہیں۔

اس خط میں جو بے اصل باتیں کہی گئی ہیں ان کا ماخذ ہندی اخبار پانچ جنیہ کا ایک شمارہ ہے۔ پانچ جنیہ اپنی متعصبانہ پالیسی کے لئے مشہور ہے۔ اس کے صفحات میں اکثر مسلمانوں اور مسلم شخصیتوں کے خلاف کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا ہے۔ یہ مراسلہ نگار اور مضمون نگار حضرات جب پانچ جنیہ کی ان رپورٹوں کو دیکھتے ہیں تو وہ فوراً ان کو یہ کہہ کر انھیں رد کر دیتے ہیں کہ یہ سب غلط پروپیگنڈا ہے۔ مگر انھیں لوگوں کو جب اسی اخبار میں میرے خلاف ایک جھوٹا شوشہ ملا تو اس کو عین

درست سمجھ کر وہ اس کو ہندستان کے اندر اور ہندستان کے باہر تیزی سے اس طرح پھیلانے لگے جیسے کہ وہ کوئی آسمانی صداقت ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ حضرات اپنی اس متضاد روش کا کیا جواز پیش کریں گے۔

اخباری رپورٹوں کے بارے میں عام طور پر یہ بات معلوم و معروف ہے کہ ان میں کبھی قصداً اور کبھی بلا قصد باتیں کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی اخبار میں کوئی رپورٹنگ بالکل صحیح اور درست ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ افراد کبھی اخبار کی بنیاد پر کوئی رائے قائم نہیں کرتے۔ مگر ان اخباری مراسلہ نگاروں کی غیر ذمہ داری کا یہ حال ہے کہ وہ ایسی رپورٹوں کے بارے میں نہ اپنے کامن سنس کو استعمال کرتے اور نہ معاملہ کی وہ ضروری تحقیق کرتے جس کا قرآن میں صراحۃً حکم دیا گیا ہے۔(الحجرات:٦)

مثال کے طور پر قومی آواز کے مذکورہ مراسلہ میں میری بابت بتایا گیا ہے کہ میں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ قرآن میں سنسکرت کے الفاظ بڑی تعداد میں ہیں۔ یہ ایک جاہلانا بات ہے کوئی بھی عالم ایسی بات کہہ کر اپنی تضحیک کا سامان نہیں کر سکتا۔ میں نے جو کچھ کہا وہ صرف یہ تھا کہ اسلام کسی زبان سے تعصب نہیں سکھاتا۔ قرآن اگرچہ عربی زبان میں ہے مگر علماء نے لکھا ہے کہ اس میں کئی غیر عربی الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ میں نے ایسا ہرگز نہیں کہا کہ قرآن میں سنسکرت کے الفاظ موجود ہیں۔ یہ بلا شبہ ایک جاہلانا بات ہے جو کبھی میں نہیں کہہ سکتا۔ میری تحریریں گواہ ہیں کہ میں ہمیشہ علم کی زبان میں کلام کرتا ہوں، جہالت کی زبان میں بولنا مجھے نہیں آتا۔

مذکورہ مراسلہ نگار نے اپنے مراسلہ میں مجھ کو "بڑا عالم" لکھا ہے۔ ان کا یہ اعتراف ہی کافی تھا کہ وہ مذکورہ قسم کی باتوں کو لغو پروپیگنڈا کہہ کر اسے رد کر دیں۔ اس لئے کہ کوئی بھی شخص جو قرآن و حدیث کا عالم ہو اس کا علم خود ایسے کسی فعل کے لئے ایک روک بن جائے گا۔ کیونکہ وہ محسوس کرے گا کہ ایک ایسی بات کہنا جو مسلمہ طور پر غیر علمی یا غیر اسلامی ہو، خود اپنی ہی زبان

سے اپنی تردید کرتا ہے۔ کوئی بھی شخص اپنی حیثیت عرفی کو برباد کرنے کا تحمل نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر مراسلہ نگار نے لکھا ہے کہ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ”رسول اللہ چار زبانوں کے عالم تھے جن میں سے ایک سنسکرت زبان ہے“ یہ بات بلاشبہ غیر علمی اور غیر تاریخی ہے۔ یہ اخبار کی خود ساختہ رپورٹ ہے۔ کوئی بھی عالم اس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ اس قسم کی بلا ثبوت بات کہے۔ خدا کے فضل سے میں نے ایسا کبھی نہیں کہا۔ میں نے جو بات کہی تھی وہ یہ تھی کہ رسول اللہ کے کاتب زید ابن ثابت انصاری (نہ کہ خود رسول اللہ) چار زبانیں جانتے تھے۔

ان چار زبانوں میں میں نے ہرگز سنسکرت کو شامل نہیں کیا تھا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ چار زبانیں عربی، فارسی، عبرانی اور سریانی تھیں نہ کہ سنسکرت۔

یہ چند مثالیں یہ اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں کہ حال میں میرے خلاف جو بہتان طرازیاں کی گئی ہیں وہ سراسر بے اصل ہیں۔ اس قسم کی بہتان طرازی کا جواب یہ نہیں ہے کہ ان کا براہ راست جواب دیا جائے۔ بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ لوگوں کے اندر وہ شعور جگایا جائے جس کے بعد وہ خود ایسی باتوں کا تجزیہ کر کے فوراً اسے رد کر دیں۔

مثال کے طور پر ایک شخص اگر کہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو (نعوذ باللہ) مورتی پوجا کرنا چاہئے تو سننے والے کے اندر یہ شعور ہونا چاہئے کہ وہ اس کو سن کر خود اپنے کامن سنس سے اس کو لغو قرار دے دے۔ وہ کہہ دے کہ مولانا امین احسن اصلاحی نے حقیقت توحید اور حقیقت شرک کے نام سے خدا پرستی کی حمایت اور بت پرستی کی مخالفت میں زبردست کتابیں لکھی ہیں، اس لئے وہ ایسا کبھی نہیں کہہ سکتے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص کہے کہ ”مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ لکھا ہے کہ جس طرح کلیلہ و دمنہ پہلے سنسکرت میں لکھی گئی تھی مگر اب اس کا سنسکرت نسخہ معدوم ہے۔ البتہ فارسی سے کیا ہوا ابن مقفع کا عربی ترجمہ کلیلہ و دمنہ کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن بھی

پہلے سنسکرت میں اترا تھا اور پھر اس کا عربی ترجمہ موجودہ قرآن کی صورت میں کیا گیا"۔ کوئی شخص اگر اس قسم کی لغوبات کہے تو سننے والے کے اندر اتنی عقل ہونی چاہئے کہ وہ اس کو سنتے ہی اس کو رد کر دے۔ وہ کہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی جیسا عالم ایسا کبھی نہیں لکھ سکتا کیونکہ یہ سراسر ایک جاہلانا بات ہے اور کوئی عالم اس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ وہ ایسی جاہلانا بات کہہ کر اہل علم کی نظر میں اپنے آپ کو مضحکہ خیز بنالے۔

آخر میں میں اس سلسلہ میں دو باتیں کہوں گا۔ ایک یہ کہ میرے بارے میں کوئی رائے خود میرے ماہنامہ الرسالہ یا میری کتابوں کے ذریعہ قائم کرنا چاہئے۔ دوسرے اخباروں کی بنیاد پر رائے قائم کرنا ہرگز درست نہیں۔ ان اخباروں میں ہر ایک کے بارے میں بے اصل باتیں چھپتی رہتی ہیں۔ کسی شخص کے خیالات کا صحیح ماخذ اس کی اپنی تحریریں ہیں نہ کہ دوسروں کی شائع کردہ اخباری رپورٹیں۔

دوسری بات یہ کہ میں تقریباً چالیس سال سے اسلام کی خدمت کر رہا ہوں۔ اس دوران مضامین اور کتابوں کی صورت میں میرے لاکھوں صفحات چھپ چکے ہیں۔ ان تحریروں میں ہمیشہ اسلام کی صداقت، خدا کی برتری، قرآن کی عظمت اور پیغمبر اسلام کے کارنامے بیان کئے جاتے ہیں۔ میری بیشتر کتابوں کا موضوع توحید کا اثبات اور شرک والحاد کی تردید ہوتا ہے۔ حتی کہ معروف طور پر یہی میرا خاص موضوع ہے۔ میری کتابیں اس کی گواہی دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر مذہب اور جدید چیلنج، اللہ اکبر، عظمت اسلام، دین حق وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ میری چالیس سالہ اسلامی خدمات نے میری حیثیت عرفی یہی بنادی ہے کہ میں اسلام کی صداقت کو ثابت کرنا اور غیر اسلام کو دلائل کے ذریعہ رد کرنا اپنا مشن بنائے ہوئے ہوں۔ میری تمام تحریروں اور تقریروں کا مرکزی موضوع یہی ہے۔ ایسی حالت میں اگر کسی بدنام اخبار میں میرے بارے میں کوئی ایسی بات چھپے جو میری حیثیت عرفی کے خلاف ہو تو عقل اور اسلام دونوں کا تقاضا ہے کہ اس کو پڑھنے والے فوراً ہی یہ کہہ کر اس کو رد کر دیں کہ: **سبحنك هذا بهتان عظيم (النور ١٦)**

بھوپال کا سفر

مہاتما گاندھی ۱۲۵واں جنم ورش سمارودہ سمیتی مدھیہ پردیش کے تحت بھوپال میں آل انڈیا سیمینار ہوا۔ اس کے پروگرام یکم اکتوبر ۱۹۹۸ سے شروع ہو کر ایک ہفتہ تک جاری رہے۔ اس کی دعوت پر راقم الحروف نے اس میں شرکت کی۔ اس موقع پر اظہار خیال کے لئے مجھے حسب ذیل دو عنوان دیئے گئے تھے۔

۱۔ ملٹی کلچر اور یونی کلچر

۲۔ امن کی طاقت اور جنگ کی طاقت

اس سفر میں مذکورہ دونوں موضوع پر خطاب کے علاوہ بھوپال کے بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ مقامی مسلمانوں کے کئی اجتماع میں اظہار خیال کا موقع ملا اور دوسرے مختلف تجربات پیش آئے۔ اس کی مختصر روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

۳۰ ستمبر ۱۹۹۸ کو مجھے دہلی سے روانہ ہو کر بھوپال پہنچنا تھا۔ آج رات کو ایک عجیب خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں کسی مسلم ملک میں ہوں۔ وہاں حکومت سازی کے لئے الکشن کرائے گئے ہیں۔ اس الکشن میں ایک مسلم جماعت کامیابُ ہوئی ہے۔ اس کے بعد اس مسلم جماعت کے لیڈر ایک جگہ اکٹھا ہوئے۔ یہ غالبًا کسی مسجد کا صحن تھا۔ یہاں ان لوگوں نے اس مسئلہ پر بات چیت شروع کی کہ حکومت کس طرح بنائی جائے گی، اس کی پالیسی کیا ہوگی، وزارتی عہدوں کی تقسیم کس طرح کی جائے گی۔ اس بات چیت کے دوران لوگوں میں اختلاف ہوا۔ اس کے بعد وہ لوگ آپس میں لڑنے لگے۔ یہاں تک کہ باقاعدہ ہاتھاپائی کی نوبت آگئی۔ یہ لیڈر جو تقریباً ۲۰ کی تعداد میں تھے، انھوں نے ایک دوسرے کو مار کر فرش پر گرادیا۔ میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو ان کے جسم نیم مردہ حالت میں فرش پر پڑے ہوئے تھے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے سیاسی لیڈر جس طرح آپس میں لڑ رہے ہیں یہ خواب

غالباً اسی کی ایک تعبیر ہے۔

۳۰ ستمبر ۱۹۹۸ کی شام کو فلائٹ نمبر ۴۳۳ کے ذریعہ دہلی سے بھوپال کے لئے روانگی تھی۔ گھر سے ایرپورٹ تک کا سفر معمول کے مطابق ہوا۔ سڑک پر کاروں کی کثرت تھی۔ مغرب کے ترقی یافتہ شہروں میں بھی کاروں کی کثرت ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ وہاں معیاری سڑک بھی موجود ہوتی ہے جس پر یہ کاریں دوڑ سکیں۔ ہر طرف صفائی ہوتی ہے۔ فضا بڑی حد تک کثافت سے پاک ہوتی ہے۔ سڑکوں پر ہر آدمی اپنی لین میں گاڑی چلاتا ہے۔ ہمارے یہاں کار تو آگئی مگر صحیح معنوں میں ہمارے یہاں اس کے مطابق سڑک کا نظام (matching road infrastructure) موجود نہیں۔

یہی دہلی کا قدیم ایرپورٹ ہے جس کو پہلے پالم ایرپورٹ کہا جاتا تھا۔ چند سال پہلے آگ لگنے سے یہ ایرپورٹ جل گیا۔ اس کے بعد یہاں از سر نو نیا ایرپورٹ بنایا گیا ہے۔ نیا ایرپورٹ پہلے ایرپورٹ کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑا ہے۔ وہ قدیم طرز کا تھا یہ بالکل جدید طرز کا ہے۔ اس دنیا میں امکانات اتنے زیادہ ہیں کہ ہر تباہی کے بعد یہاں نیا شاندار تر امکان ابھر آتا ہے۔

۳۰ ستمبر کے اخبار میں دوسری خبروں کے ساتھ ایک خبر یہ تھی کہ روس کی حکومت نے کھلے طور پر یہ اعلان کیا ہے کہ امریکہ کی مخالفت کے باوجود انڈیا کے لئے اس کی فوجی سپلائی (military supplies) جاری رہیں گی۔ یہ خبر اس طرح تھی جیسے کہ روس کی حکومت انڈیا کی بہت ہمدرد ہے اور وہ کسی کی مخالفت کی پرواہ کئے بغیر اس کی فوجی امداد کر رہی ہے۔ حالانکہ یہ مکمل طور پر ایک تجارتی معاملہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ روس کو اپنی تباہ شدہ اقتصادیات کو سنبھالنے کے لئے ڈالر کی شدید ترین ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں ہندستان اس کا زبردست معاون ہے کیوں کہ ہندستان روس سے اس کے غیر معیاری ہتھیاروں کو خریدنے کے لئے ہر سال روس کو دو بلین ڈالر دے رہا ہے۔ ہندستان میں کام کرنے والے روس کے فوجی ماہرین کی بڑی بڑی

تنخواہیں اس کے علاوہ ہیں۔

انڈین ائر لائنز کے کرایہ میں یکم اکتوبر ۱۹۹۸ سے ۱۱ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ دہلی سے بھوپال آتے ہوئے میں سابقہ کرایہ پر یہاں آیا مگر ۳ اکتوبر کو جب میں بھوپال سے دہلی کے لئے واپس ہوا تو میرے میزبانوں کو مزید رقم ادا کر کے اس کو دوبارہ کنفرم کرانا پڑا۔ اس قسم کا اضافہ انڈین ائر لائنز میں برابر ہوتا رہتا ہے۔ پہلی بار جب میں انڈین ائر لائنز کے ذریعہ بھوپال آیا تو اس وقت اس کا کرایہ تقریباً دو ہزار روپیہ تھا۔ اب یہ کرایہ تقریباً سات ہزار روپیہ تک پہنچ گیا ہے۔

حکومت جب بھی انڈین ائر لائنز کے کرایہ میں اضافہ کرتی ہے تو اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ائر لائنز کو گھاٹا ہو رہا ہے۔ یہ بیان غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انڈین ائر لائنز اور ائر انڈیا دونوں گھاٹے کا شکار ہو رہی ہیں مگر اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ ہندستان کی یہ ہوائی کمپنیاں خالص تجارتی اصول پر چلائی جا رہی ہیں پھر بھی یہ خسارہ کیوں ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ انڈین ائر لائنز اور ائر انڈیا میں ہر سطح پر لوٹ جاری ہے۔ اس لوٹ نے ان سرکاری اداروں کو خسارہ میں مبتلا کر رکھا ہے۔

۳۰ ستمبر کے اخبار میں ایک خبر یہ تھی کہ حکومت ہند نے ایک جائزے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ تیرہ سو قوانین کو ختم کر دیا جائے۔ آزادی کے بعد ہندستان میں ویلفیئر اسٹیٹ قائم کرنے کے نام پر بے شمار قوانین بنائے گئے۔ ان کی تعداد تیرہ سو نہیں بلکہ تیرہ ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ یہ قوانین ملک کی ترقی میں صرف رکاوٹ ثابت ہوئے۔ ان قوانین نے سرکاری کارکنوں کے اختیار میں غیر معمولی اضافہ کر دیا جس کا لازمی نتیجہ کرپشن میں اضافہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔

تیرہ سو قوانین کا خاتمہ قانون کے مصنوعی جھاڑ جھنکاڑ کے صرف ایک چھوٹے سے جز کا خاتمہ ہے۔ اگر ملک کو ترقی کی طرف لے جانا ہے تو ان سارے ہی قوانین کو ختم کرنا ہوگا جو ویلفیئر سوسائٹی کے نام پر بنائے گئے ہیں۔ زندگی کا ایک ہی صحیح قانون ہے اور وہ نیچر ہے۔ انسانی قوانین نیچر کے صحیح نظام میں صرف بیجا مداخلت ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ اس قسم کے تمام مصنوعی

قوانین کو ختم کردیا جائے تا کہ انسانیت کا قافلہ فطرت کی شاہراہ پر چلنے لگے۔

۳۰ ستمبر کی شام کو جب جہاز مجھ کو لے کر بھوپال کی طرف اڑا تو اچانک یہ سوچ کر میرے جسم میں تھرتھری پیدا ہو گئی کہ اسی طرح ایک روز موت کا فرشتہ آئے گا اور مجھ کو ایک دنیا سے اٹھا کر ایک اور سواری میں رکھے گا اور دنیا سے آخرت کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ میرا موجودہ سفر ایک گھنٹہ پانچ منٹ کا ہے۔ دوسرا سفر شاید ایک منٹ پانچ سکنڈ کا ہو۔ یہ ایک منٹ اور پانچ سکنڈ اتنے زیادہ قیامت خیز ہوں گے کہ شاید کائنات کی پوری تاریخ اس میں سمٹ جائے۔ یہ مختصر لمحہ شاید میری زندگی کا طویل ترین لمحہ ہو گا۔ مگر مجھے یا کسی کو نہ اس کے آغاز کا علم ہے اور نہ اس کے انجام کا علم۔ دہلی سے بھوپال تک کی پرواز ایک گھنٹہ پانچ منٹ کی تھی۔ یہ جہاز بھوپال ہوتے ہوئے اندور جاتا ہے۔ جہاز کے اندر لوگ بے فکری کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے نظر آئے۔ کچھ لوگ ہنس ہنس کر اپنے الفاظ بکھیر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کی اس بے فکری کی وجہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی پسندیدہ منزل کی طرف جارہے ہیں۔ اگر انھیں معلوم ہو کہ ہر ایک کے لئے اچانک ایک اور منزل آنے والی ہے اور وہ موت کی منزل ہے اور یہ منزل ان پر کسی بھی لمحہ آسکتی ہے۔ اگر لوگوں کو اس حقیقت کا زندہ شعور حاصل ہو تو ان کے قہقہے بند ہو جائیں اور وہ بولنے سے زیادہ چپ رہنا پسند کریں۔

جہاز تقریباً ایک گھنٹہ لیٹ ہو کر بھوپال پہنچا۔ ائرپورٹ پر کانفرنس کی طرف سے مسٹر کنک تیواری اور ان کے ساتھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ حلقۂ الرسالہ کے رفقاء بھی آئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں سے ملنے کے بعد ائرپورٹ سے شہر کے لئے روانگی ہوئی راستہ میں ہر طرف دسہرہ کی دھوم نظر آئی لاؤڈاسپیکر پر گانے کا شور اور بجلی کی روشنیوں کی جگمگاہٹ کے درمیان ہماری گاڑی آگے بڑھتی رہی۔ لوگ اس قسم کی چیزوں کو جشن کا نام دیتے ہیں اور پھر لطف اندوز ہوتے ہیں مگر میرے لئے اس قسم کی چیزیں ایک مصیبت سے کم نہیں۔

پہلے ہم لوگ ڈاکٹر حمید اللہ ندوی (فون نمبر 74981) کے مکان پر پہنچے۔ یہاں حلقۂ الرسالہ کے کئی لوگ موجود تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ ندوی (ریڈر شعبہ عربی بھوپال یونیورسٹی) کے ساتھ ایک مہینہ پہلے سخت حادثہ پیش آیا تھا ایک ٹرک ان کی گاڑی سے ٹکرا گیا جس کے نتیجہ میں انھیں سخت چوٹیں آئیں تاہم اب وہ بڑی حد تک صحت مند ہو چکے ہیں انشاءاللہ دو ہفتہ میں مکمل طور پر صحت یاب ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر حمید اللہ ندوی نے حادثہ کی روداد بتاتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں مصیبت میں بھی رحمت کا پہلو رکھ دیا ہے۔ اس قسم کے ناخوشگوار واقعات آدمی کے لئے ایک روحانی خوراک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آدمی پر اگر مصیبت نہ پڑے تو وہ ذہنی اور روحانی اعتبار سے ترقی نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی اس بات کی تائید میں میں نے یہ شعر انھیں سنایا:

اذا اشتدت بك البلوىٰ ففكر في الم نشرح فعسر بين يسرين اذا فكرته ففرح

یہاں سے روانہ ہو کر ہم لوگ لیک ویو اشوک ہوٹل میں پہنچے یہاں مجھے کمرہ (نمبر ۳۰۸) میں ٹھہرنا تھا۔ میرے ہمراہ یہاں جناب عبد الحمید ندوی بھی تھے۔

۳۰ ستمبر ۱۹۹۸ کی شام کو سورج غروب ہوا تو میں دہلی میں تھا۔ اگلے دن یکم اکتوبر ۹۸ء کی صبح کو نیا سورج نکلا تو میں بھوپال میں تھا۔ اس کو سوچ کر مجھے ایک تاریخی واقعہ یاد آیا۔ عمر بن عبد العزیز اموی اپنی ابتدائی زندگی میں ایک عام آدمی کی مانند تھے۔ وہ شاندار کپڑے پہنتے اور بہت زیادہ خوشبو لگاتے تھے وہ جدھر سے گذرتے ان کی شان و شوکت کی بنا پر لوگ انھیں دیکھنے لگتے۔ یہاں تک کہ ان کی چال کو مشیۃ العمریہ کہا جانے لگا۔ اس کے بعد ایک واقعہ ہوا جس نے ان کی زندگی کو بالکل بدل دیا۔ ایک روز وہ اپنی ایک خادمہ پر غصہ ہو گئے اور اس کو مارنا چاہا، خادمہ کی زبان سے نکلا: **اذكر ليلة صبيحتها يوم القيامة** (اس رات کو یاد کرو جس کی صبح قیامت ہوگی) یہ الفاظ سن کر حضرت عمر بن عبد العزیز کانپ اٹھے اور اس کے بعد ان کی زندگی میں وہ انقلاب آگیا جس کو ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ اسی قسم کے انقلابی تجربوں کو شاعر نے اپنی زبان میں اس طرح

بیان کیا ہے:

صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک جام — نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

بھوپال سے کرانکل نام سے ایک انگریزی اخبار نکلتا ہے اس کے صفحہ اول پر ایک خبر تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ ۱۴ فروری ۹۸ء کو کوئمبٹور میں مسٹر لال کرشن اڈوانی کے جلسہ میں جو بم دھماکہ ہوا تھا اس کے سلسلہ میں پولس نے اسپشل انکوائری کی اور اب ۱۶۶ مسلمانوں پر کیس قائم کیا گیا ہے۔

اس واقعہ کے بعد کوئمبٹور کے مسلم نوجوانوں کی ایک خفیہ تنظیم الامہ کا انکشاف ہوا جس کے بانی کا نام ایس اے پاشا بتایا گیا ہے۔ پر جوش نوجوانوں کی یہ تنظیم بابری مسجد کے حادثہ کے بعد بنائی گئی تھی۔ ان لوگوں نے بڑی تعداد میں بم تیار کئے تھے اور ان کا منصوبہ یہ تھا کہ جگہ جگہ بم دھماکے کر کے بابری مسجد کا انتقام لیں مگر عملاً اس کا نتیجہ الٹا ہوا۔ پولس نے سینکڑوں مسلمانوں کو گرفتار کر لیا۔ ان کی بری طرح مار پیٹ ہوئی۔ کئی لوگ مر گئے۔ وہ سارے بم پکڑ لئے گئے جو گھروں میں چھپائے گئے تھے۔ سینکڑوں مسلمانوں کی زندگیاں تباہ ہو کر رہ گئیں۔ فساد کے نتیجہ میں مسلمانوں کو جو اقتصادی نقصان پہنچا وہ اس کے علاوہ ہے۔ اس واقعہ میں سبق کی بات یہ ہے کہ ۱۴ فروری کے بم دھماکہ کے بعد وہاں کی پولس نے زبردست مظالم کئے مگر کویمبٹور یا تامل ناڈ کے مسلمانوں کی طرف سے کوئی ردّ عمل سامنے نہیں آیا۔ انھوں نے پولس کے مظالم کے خلاف کوئی اخباری دھوم نہیں مچائی۔ اسی طرح تقریباً اسی زمانہ میں مہاراشٹر کے سری کرشنا کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی جس میں بمبئی کے فساد دسمبر ۹۲ء جنوری ۱۹۹۳ کا ذمہ دار یک طرفہ طور پر ہندو لیڈروں اور پولس کو قرار دیا تھا۔ اس رپورٹ کو مہاراشٹر کی بھاجپا، شوسینا حکومت نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ وہ اینٹی ہندو اور پرو مسلم ہے۔ یہ ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ تھا۔ مگر مہاراشٹر کے مسلمانوں نے اس کو کامل خاموشی کے ساتھ گوارہ کر لیا۔

یہ ہندستانی مسلمانوں میں ایک سیاسی تبدیلی کی علامت ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کے آخری زمانہ میں مسلمانوں میں ایک تبدیلی کا مشاہدہ ہوا تھا۔ اس پر مولانا شبلی نے ۱۹۱۲ میں ایک طویل مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ۔ اب ۸۵ سال بعد ہندستان کے مسلمانوں میں اس سے بھی زیادہ بڑی پولیٹیکل تبدیلی آئی ہے۔ یہ تبدیلی حیرت انگیز طور پر عین وہی ہے جس کے لئے الرسالہ کے ذریعہ پچھلے ۲۵ سال سے کوشش کی جارہی تھی۔ یعنی واقعات پر منفی ردّ عمل کے بجائے حقیقت پسندانہ روش اختیار کرنا۔

بھوپال میں میرا قیام جس ہوٹل میں تھا وہ ایک وسیع جھیل کے کنارے واقع ہے۔ ہوٹل کا پشت کا دروازہ کھول کر میں اپنے کمرہ کی بالکنی میں آیا تو سامنے دور تک نہایت پرکشش منظر تھا۔ میں جب بھی اس قسم کے مناظر کو دیکھتا ہوں تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ منظر میرے لئے ایک آئینہ بن جاتا ہے جس میں میں جنت کی جھلک دیکھ سکوں۔ موجودہ دنیا میں تکلیف کے مناظر بھی ہیں اور مسرت کے مناظر بھی۔ تکلیف کے مناظر اس لئے ہیں کہ آدمی ان کو دیکھ کر جہنم کو یاد کرے، اور مسرت کے مناظر اس لئے ہیں تاکہ آدمی جب انہیں دیکھے تو ان میں جنت کی جھلکیاں دکھائی دیں اور پھر اس تجربہ کے بعد جہنم سے ڈرے اور جنت کا حریص بنے۔

بھوپال کے انگریزی روزنامہ "نیشنل میل" کا شمارہ یکم اکتوبر ۹۸ دیکھا اس میں ایک مضمون اسرائیل کے بارے میں تھا اس میں بتایا گیا تھا کہ ہندستان اور اسرائیل دونوں نے ۲۰ ویں صدی کے وسط سے اپنی زندگی کا آغاز کیا مگر آج دونوں میں غیر معمولی فرق پایا جاتا ہے۔ اسرائیل نے زیرو لیول سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا مگر انتہائی چھوٹا ملک ہونے کے باوجود آج وہ ترقی یافتہ ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندستان بہت بڑا ملک ہے اور اس کے پاس ہر قسم کے وسائل ہیں مگر ترقی کے اعتبار سے ممالک کی فہرست میں اس کا شمار ۱۳۸ نمبر پر ہوتا ہے۔ جائزہ نگار نے اس فرق کا کوئی سبب نہیں بتایا تھا۔ میرے نزدیک اس کا سبب صرف ایک ہے اور وہ

یہ کہ اسرائیل کے باشندوں میں اعلیٰ درجہ کی نیشنل اسپرٹ پائی جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندستان میں صرف لوٹ کی اسپرٹ ہے۔ اس کے سوااور کچھ نہیں۔

بھائی الطاف بھوپال کی ایک خاص شخصیت ہیں۔ ان سے ایک گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ میری عمر ہجری کلینڈر کے لحاظ سے اب ۷۸ سال ہو رہی ہے۔ اس مدت میں میں نے بہت کچھ پڑھااور دیکھا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ انسان کا آخری ٹسٹ اس وقت ہوتا ہے جب کہ آپ کے اور اس کے درمیان انا کا ٹکراؤ پیدا ہو۔ اس ٹسٹ سے پہلے کسی انسان کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا ممکن نہیں۔ کسی آدمی کا خوش اخلاق یا مخلص ہونا صرف اس وقت ثابت ہوتا ہے جب کہ وہ اس نازک ٹسٹ پر پورا اترے۔

ڈاکٹر حمید اللہ ندوی بھوپال یونیورسٹی میں شعبہ عربی میں ریڈر ہیں۔ ان سے ایک گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ پیغمبر اسلام کی بہت سی سنتیں ایسی ہیں جن کو شاید ہمارے علماء بھی نہیں جانتے، حتی کے شاید وہ لوگ بھی نہیں جنھوں نے سیرت رسول پر بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک سنت حقیقت پسندی ہے۔

حقیقت پسندی کیا ہے۔ حقیقت پسندی یہ ہے کہ آدمی اپنے خیالات سے باہر کے حالات کو جانے اور اس کی رعایت کرے۔ اس دنیا میں کسی بھی شخص کے لئے حتی کہ پیغمبر کے لئے بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ خارجی پہلوؤں کے علی الرغم اپنے نظریہ کو واقعہ بنا سکے۔ مثال کے طور پر پیغمبر اسلام نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہ اعلان فرمایا کہ ایک انسان اور دوسرے انسان میں کوئی فرق نہیں مگر اس کے ڈھائی مہینہ بعد جب یہ سوال پیدا ہوا کہ خلیفہ کس کو بنایا جائے تو حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے یہ حدیث پیش فرمائی کہ الائمۃ من قریش۔ یعنی خلیفہ صرف قریش میں سے ہوگا۔ یہ دونوں باتیں واضح طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اصولی طور پر وہی بات درست ہے جس کا اعلان حجۃ الوداع میں کیا گیا تھا۔ مگر اجتماعی زندگی میں ہمیشہ عملی حقیقتوں سے سمجھوتا

کرنا پڑتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ نظری معیار دماغ سے نکل کر عالم خارجی میں واقعہ بن جائے۔

مسٹر ایم ہاشم (tel76375) اور مسٹر ایس مسعود حسن (tel 0755-581056) دونوں صاحبان فارسٹ کے محکمہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ قابل بقا سماج (sustainable society) کیسے قائم ہوتا ہے، اور موجودہ زمانہ میں ایسے سماج کے قیام میں سب سے بڑا خطرہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مفید باتیں ہوئیں۔ مثلاً انسانی زندگی کے سلسلہ میں درختوں کا کردار اور جانوروں کا سلوک (animal behavior) وغیرہ۔ ایس مسعود حسن صاحب کا سابقہ باربار جنگلی جانوروں سے پڑا ہے۔ انھوں نے اپنا ایک واقعہ بتایا کہ ایک بار جنگل میں ایک شیرنی نے ایک عورت کا شکار کیا اور اس کو گھسیٹ کر جھاڑی میں لے گئی۔ وہاں اس کے بچے اس کو کھانے لگے۔ جناب حسن صاحب وہاں کے کچھ آدیواسیوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکلے یہاں تک کہ وہ اس جھاڑی کے پاس پہنچ گئے جہاں شیرنی کے بچے شکار کو کھا رہے تھے اور شیرنی وہاں بیٹھی ہوئی ان کی پہرہ داری کر رہی تھی۔ جناب حسن صاحب اور ان کے ساتھی اس وقت صرف پانچ میٹر کے فاصلہ پر تھے۔ شیرنی نے ان لوگوں کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔ جناب حسن صاحب کے دوسرے ساتھیوں نے کہا کہ ہمیں فوراً فائر کرنا چاہئے لیکن جناب حسن صاحب نے سوچا کہ یہ عقل مندی کے خلاف ہوگا۔ کیونکہ اگر ہماری گولی اس کو لگ جائے تب بھی وہ فوراً نہیں مر جائے گی۔ وہ زخمی ہو کر ہمارے اوپر حملہ کرے گی اور اس حملہ میں وہ ہم میں سے کم سے کم دو آدمیوں کو ختم کر دے گی۔

جناب حسن صاحب حیوانات کے سلوک کے بارے میں کافی معلومات رکھتے ہیں۔ چند سیکنڈ کے اندر ان کے ذہن نے یہ فیصلہ کیا کہ اس وقت شیرنی اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے یہاں بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ یہاں سے صرف اس وقت ہٹے گی جب کہ اس کو اپنے بچوں کے بارے میں کوئی خطرہ محسوس نہ ہو ورنہ وہ اپنی جگہ بیٹھی رہے گی۔ یہ سوچ کر جناب حسن صاحب نے اپنے

ساتھیوں سے کہا کہ ہمیں فوراً اپنے آپ کو یہاں سے پیچھے لے جانا چاہئے۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تیزی سے وہاں سے ہٹ کر دور چلے گئے۔ اس کے بعد شیرنی اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ اس نے ان لوگوں پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے کہا کہ یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی اپنے اپنے انٹرسٹ میں مصروف ہے۔ یہاں کسی انسان کے شر سے بچنے کی واحد کامیاب تدبیر یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس سے دور رکھا جائے۔ کوئی انسان خواہ بظاہر شریر ہو یا غیر شریر، اس سے خطرہ صرف اس وقت ہے جب کہ آپ اس سے الجھ کر اس کو یہ احساس دلائیں کہ آپ اس کے انٹرسٹ کے لئے خطرہ ہیں۔ جب تک ایسا نہ ہو کوئی انسان یک طرفہ طور پر آپ کے اوپر حملہ کرنے والا نہیں۔

یکم اکتوبر کو ۱۰ بجے ٹی ٹی نگر کی مسجد میں ایک اجتماع ہوا۔ یہاں اسکول اور کالج کے طلبہ شریک ہوئے، اسی کے ساتھ بڑی عمر کے لوگ بھی موجود تھے۔ میں نے علم کی اہمیت کے موضوع پر خطاب کیا۔ تقریر کے بعد لوگوں نے سوالات کئے جس کا جواب دیا گیا۔

ایک سوال یہ تھا کہ غیر مسلموں میں دعوت کا کام کس طرح کیا جائے۔ میں نے کہا کہ اس کا کوئی لگا بندھا طریقہ نہیں۔ دعوت کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ معتدل فضا میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان انٹرایکشن ہو۔ مثالوں کے ذریعہ بتایا کہ جب دونوں فرقوں میں نفرت کی فضا نہ ہو اور دونوں کے درمیان آزادانہ اختلاط ہو تو دعوت کا عمل اُپنے آپ جاری ہو جاتا ہے۔

ایک سوال یہ تھا کہ ابھی تو مسلمانوں کی اصلاح ہی نہیں ہوئی پھر غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت پہنچانے کا کیا سوال۔ میں نے کہا کہ یہ ایسا ہی ہے کہ ابھی تو مسجد ہی نہیں پھر مدرسہ بنانے کا کیا سوال ہے۔ اگر مدرسہ نہیں ہوگا تو مسجدوں کے لئے امام اور قاری کہاں سے آئیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں بیک وقت کئی کام کرنے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی

اصلاح کی کوشش بہت بڑے پیانے پر ہو رہی ہے۔ ہر مسلم ادارہ اور ہر مسلم جماعت اسی کام میں مصروف ہے۔ لیکن غیر مسلموں میں دعوت کا کام سرے سے نہیں ہو رہا ہے۔ اس لئے میں دعوت پر زور دیتا ہوں۔

مسٹر راہل پردھان نے یہ سوال کیا کہ ہندوؤں میں بھگوان کا آکار مانا جاتا ہے چنانچہ بھگوان کو ہم مورتی کے روپ میں دیکھ لیتے ہیں مگر اسلام میں خدا کا کوئی آکار نہیں ہے اس لئے اسلام میں خدا کو دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔

میں نے کہا کہ جس چیز کو آپ بھگوان کی مورتی کہتے ہیں اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ بھگوان کا آکار ہے۔ کیا وہ مورتی خود بھگوان نے آسمان سے اتاری ہے یا کسی نے بھگوان کو اس کے اصلی روپ میں دیکھا ہے، اور پھر اس نے اس کی نقل مورتی کی صورت میں تیار کی۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی صورت نہیں جس چیز کو آپ بھگوان کی مورتی کہتے ہیں وہ خود آپ کے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی شکلیں ہیں پھر ایسی خود ساختہ مورتی کو دیکھنا خدا کو دیکھنا کیسے ہو جائے گا۔ دنیا میں ہم بہت سی چیزوں کو اس کی مجسم صورت میں نہیں دیکھتے بلکہ تصوراتی طور پر دیکھتے ہیں مثلاً لا آف موشن وغیرہ۔ پھر جس طرح کائنات کی دوسری بہت سی حقیقتوں کو ہم دیکھے بغیر مانتے ہیں اسی طرح ہم خدا کو بھی دیکھے بغیر مان سکتے ہیں۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ ایک پرچہ میں آپ کی تصویر چھپی ہے جس میں آپ آرتی اتارتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔ کیا یہ واقعہ ہے۔

میں نے کہا کہ یہ تو بہت آسان ہے، میں آپ کی بھی ایک ایسی تصویر بنا سکتا ہوں جس میں آپ بھی آرتی اتارتے ہوئے دکھائی دیں، کوئی بھی فوٹوگرافر کسی بھی شخص کو اس قسم کے کسی عمل کے ساتھ دکھا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ آج سے ساٹھ سال پہلے نوجوانی کی عمر میں میں فیض آباد گیا۔ وہاں میرے ایک تعلیمی ساتھی تھے جن کا نام عطاء الرحمٰن تھا۔ وہ مجھ کو ایک فوٹو

گرافر کے یہاں لے گئے جہاں اس نے ہم دونوں کے فوٹو لئے، بعد کو انھوں نے مجھے ایک ایسی تصویر دی جس میں میں ایک ہوائی جہاز کے اندر بیٹھا ہوا تھا، میں نے کہا کہ میں تو آج تک ہوائی جہاز میں بیٹھا ہی نہیں، پھر اس قسم کی تصویر کیسے بن گئی، انھوں نے بتایا کہ یہ تصویر فوٹو گرافر نے تیار کی ہے، اس نے یہ کیا کہ آپ کی ایک تصویر لے کر اس کو ہوائی جہاز کی تصویر کے ساتھ چپکا دیا، پھر دوبارہ اس کی تصویر لے لی۔

اس قسم کی تصویر کشی اس زمانہ میں اتنی عام ہو چکی ہے کہ اب ہر آدمی اس معاملہ کو اچھی طرح جانتا ہے۔

یکم اکتوبر ۹۸ کو دوپہر کا کھانا جناب ایس ایم حسن صاحب کے مکان پر تھا، اس سلسلہ میں یہاں ایک درجن سے زیادہ آدمی اکٹھا ہو گئے۔ ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، جناب ایس ایم حسن صاحب کو اپنی سروس کے تحت بار بار جنگل میں جانا ہوتا ہے وہاں آدی واسی لوگ رہتے ہیں، ایک بار انھوں نے کچھ آدی واسیوں سے پوچھا کہ سرکار اگر آپ کو مدد دینا چاہے تو آپ اس سے کس قسم کی مدد چاہیں گے۔ ایک بوڑھے آدی واسی نے دیر تک سوچا اور کہا کہ نمک۔ پھر انھوں نے دوبارہ سوال کیا کہ اور کیا چیز آپ چاہیں گے۔ آدی واسی نے دوبارہ سوچ کر کہا کہ مٹی کا تیل۔

میں نے سوچا کہ آدی واسی کے فہم کی آخری حد یہی تھی۔ اگر وہ زیادہ باشعور ہوتا تو شاید وہ کہتا کہ سرکار ہمارے بچوں کے لئے تعلیم کا انتظام کرے۔

یکم اکتوبر کو ظہر کی نماز ٹیٹی نگر کی مسجد میں پڑھی۔ نماز کے بعد یہاں ایک اجتماع ہوا جس میں زیادہ تر الرسالہ کے قارئین تھے۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ آج پورا ملک الرسالہ کی پالیسی کو اختیار کئے ہوئے ہے۔ کوئی اعلان کے ساتھ اور کوئی بلا اعلان۔

۱۹۴۷ کے بعد تمام بے ریش وباریش قائدین صرف ایک ہی بات جانتے تھے کہ انڈیا

مسلمانوں کے لئے ایک پرابلم کنٹری ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی پوری سیاست، صحافت وقیادت احتجاج کے رخ پر چل پڑی۔ فرقہ پرست طاقتوں سے لڑنا اور شکایات و مطالبات کا طوفان کھڑا کرنا اسی کا نام مسلم سیاست تھا۱۹۶۴ سے الجمعیۃ ویکلی کے ذریعہ اور۱۹۷۶سے الرسالہ منتھلی کے ذریعہ میں نے یہ پیغام دینا شروع کیا کہ مسائل زندگی کا حصہ ہیں۔ انڈیا ہی نہیں بلکہ پورا ورلڈ پرابلم ورلڈ ہے۔ ہم کو پرابلم کے درمیان جینا سیکھنا چاہئے۔اس کے سوا زندگی کا کوئی اور راستہ نہیں۔

لمبی مدت تک یہ آواز لوگوں کے لئے اجنبی بنی رہی مگر دھیرے دھیرے حالات بدلے اور آج انڈیا کے تمام مسلمان اس الرسالہ پالیسی پر قائم ہیں۔اس معاملہ کو مختلف مثالوں سے واضح کیا۔

جناب محمد عمران صاحب اور جناب بلال الدین صاحب اور مولوی شمس الدین صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ دنیا میں زندگی گذارنے کے تین درجے ہیں ضرورت،راحت اور عیش۔necessity, comfort, luxury

پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی ناگزیر ضرورتوں کے دائرے میں زندگی گذارے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ راحت کے سامان بھی استعمال کرے۔، تیسرا درجہ یہ ہے کہ وہ عیش و تکلف کی زندگی گذارے۔ مثلاً تخت پر سونا آدمی کی ضرورت ہے۔ فوم کا گدا استعمال کرنا راحت ہے اور ائر کنڈیشنڈ کمرہ میں رہنا عیش ہے۔ میں نے کہا کہ میں حرام و حلال کی زبان عام طور پر استعمال نہیں کرتا۔ میں سادہ زبان میں صرف یہ کہوں گا کہ انسان کو چاہئے کہ وہ ضرورت پر قناعت کرے۔ اگر ایسا کرنا مشکل ہو تو رعایت کے درجہ میں راحت والی چیزوں کو بھی استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔ مگر عیش و عشرت والی زندگی میں تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔ محمد عمران صاحب بھوپال کے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں ان کو سائنس کے موضوع سے دلچسپی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے چند باتیں کہیں۔ میں نے کہا کہ سائنسی انداز میں سوچنا بہت اچھی بات ہے مگر سائنسی سوچ کو مفید

بنانے کے لئے ایک حقیقت کا لحاظ کرنا بہت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ سائنس صرف جزئی علم دیتی ہے اس لئے سائنس کے ذریعہ اسلام کا کلی علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے مزید کہا کہ کچھ لوگ یہ کوشش کرتے ہیں کہ تمام سائنسی علوم کو قرآن سے نکالیں۔ یہ ایک طفلانہ بات ہے قرآن معرفت حق کی کتاب ہے نہ کہ سائنس کی کتاب۔ ہمیں صرف یہ کہنے پر اکتفا کرنا چاہئے کہ قرآن چودہ سو سال پہلے اترا جب کہ جدید سائنسی معلومات دریافت نہیں ہوئی تھیں اس کے باوجود قرآن کی کوئی بات سائنسی طور پر غلط ثابت نہیں ہوئی۔ قرآن نے اپنا پیغام دیتے ہوئے مختلف علوم کے حوالے دیئے ہیں مگر قرآن کا کوئی بیان جدید سائنس کی کسی دریافت سے نہیں ٹکراتا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن علیم و خبیر ہستی کی کتاب ہے۔ گویا اصل بات یہ نہیں ہے کہ قرآن میں سائنس کے تمام مضامین موجود ہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ قرآن میں اور جدید سائنس میں کوئی ٹکراؤ نہیں اور ہمارے مقصد کے لئے یہی بات کافی ہے۔

یکم اکتوبر کی شام کو ملا رموزی سنسکرتی بھون کے حال میں گاندھی سمیتی کے تحت پروگرام ہوا جس میں مختلف لوگ شریک تھے۔ اس کا موضوع تھا ملٹی کلچر اینڈ گاندھی۔ میں نے اس موضوع پر تقریباً آدھا گھنٹہ تقریر کی۔ میری تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ملٹی کلچر اور یونی کلچر کا معاملہ ہمارے انتخاب کا معاملہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یونی کلچر صرف ایک خیالی نظریہ ہے، اس دنیا میں وہ قابل عمل ہی نہیں۔ کلچر اپنی عین نوعیت ہی کے لحاظ سے ملٹی کلچر ہے اور ہمارے لئے کامیابی کا راز یہ ہے کہ ہم اس کو کسی بحث کے بغیر قبول کرلیں۔

مسٹر کلدیپ نیر نے اپنی تقریر میں مہاتما گاندھی کے دو قصے بیان کئے جو یہاں قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگست ۱۹۴۷ کے ہنگامہ کے بعد پاکستان سے آنے والا ایک ہندو مہاتما گاندھی سے ملا اس نے کہا کہ میرے بارہ سال کے لڑکے کو مسلمانوں نے مار ڈالا اب مجھ کو آپ

کیا مشورہ دیتے ہیں۔ مہاتما گاندھی نے کہا کہ دیکھو یہ بہت سے مسلمان یتیم بچے ہیں تم ان میں سے بارہ سال کی عمر کے کسی بچہ کو لے لو اور مسلمان کی طرح اس کی پرورش کرو۔ اس آدمی نے ایسا ہی کیا۔

دوسرا واقعہ انھوں نے یہ بتایا کہ دہلی کے برلا مندر میں ہر روز صبح کو مہاتما گاندھی کی پرارتھنا ہوتی تھی جس میں ہر مذہب کی مقدس کتاب کا کچھ حصہ پڑھا جاتا تھا۔ ایک دن مہاتما گاندھی نے مجمع سے پوچھا کہ آپ لوگوں میں سے کسی کو اس پروگرام پر اعتراض تو نہیں۔ ایک ہندو نے کہا کہ مجھے اعتراض ہے میں پاکستان سے بھاگ کر آیا ہوں اور میں نے دیکھا کہ وہاں قرآن کے ماننے والوں نے کتنا ظلم کیا ہے۔ گاندھی جی نے کوئی جواب نہیں دیا صرف اس دن کی پراتھنا بند کر دی۔ اگلے دن دوبارہ انھوں نے یہی سوال کیا اب بھی وہ ہندو وہاں موجود تھا اس نے کہا کہ اب مجھ کو کوئی اعتراض نہیں۔ چنانچہ اس کے بعد قرآن سمیت تمام کتابیں پڑھی گئیں ——— یہ تھا خاموشی کی طاقت کا کرشمہ۔

یکم اکتوبر کی شام کو ایک ہندو مقرر نے بتایا کہ سوامی وویکانند سے ایک شخص نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں بھی وویکانند بن جاؤں۔ جواب میں سوامی وویکانند نے کہا کہ آپ ایک منٹ میں سوامی وویکانند بن سکتے ہیں مگر سوامی وویکانند ہونے کے لئے ایک صدی چاہئے:

محمد ذاکر حسین کے صاحبزادہ محمد زبیر کی عمر ابھی صرف آٹھ سال ہے اور انھوں نے آدھا قرآن حفظ کر لیا ہے۔ میں نے صاحبزادہ سے کہا کہ آپ قرآن کا کچھ حصہ پڑھ کر سنائیں انھوں نے سبحان الذی اسریٰ بعبدہ سے پڑھنا شروع کر دیا۔ ان کے پڑھنے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی پختہ قاری پڑھ رہا ہو۔ ان کو سن کر میں نے کہا کہ یہ بھی قرآن کا ایک زندہ معجزہ ہے کہ ۸ سال کا ایک بچہ ۱۵ پارہ حفظ کر لے اور اس کو ایک پختہ قاری کی طرح پڑھ کر سنائے معلوم ہوا کہ انھوں نے صرف ڈیڑھ سال میں یہ حفظ کیا ہے۔

مذکورہ بچہ کے استاد حافظ عبد الرقیب صاحب ہیں وہ اپنے بزنس کے سلسلہ میں ہر روز بھوپال سے بیر کھیڑی جاتے ہیں۔ ۳۲ کلو میٹر کا یہ فاصلہ بس کے ذریعہ طے ہوتا ہے۔ بس کے الک غیر مسلم ہیں مگر جب انھوں نے جانا کہ یہ بچہ اپنے استاد کے ساتھ حفظ قرآن کے لئے .وزانہ سفر کرتا ہے تو انھوں نے بچہ کا کرایہ لینے سے انکار کردیا۔ چنانچہ یہ بچہ ہر روز ۶۴ کلو میٹر کا یہ سفر بس کے ذریعہ طے کرتا ہے مگر بس کے مالکان اس کا کرایہ نہیں لیتے۔ یہ قصہ سن کر میں نے لہاکہ یہ بھی قرآن کی ایک کرامت ہے۔

یکم اکتوبر کی شام کا کھانا محمد ذاکر صاحب کے مکان پر طے تھا مگر راستہ کی بھیڑ کی وجہ سے وہ کھانا لے کر ہوٹل میں آگئے۔ چنانچہ تقریباً ۲۰ آدمیوں کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھایا گیا۔ میں نے محمد ذاکر صاحب سے کہا کہ یہ تو آپ نے میرے اوپر بہت بڑا ظلم کیا۔ انھوں نے کہا کہ دسہرہ کی وجہ سے آج راستہ میں بہت بھیڑ تھی اور ہوٹل سے میرے گھر تک جانے میں آپ کو زحمت ہوتی۔ میں نے کہا کہ اگر آپ لوگ وہاں سے یہاں آسکتے تھے تو میں بھی یہاں سے وہاں تک پہنچ سکتا تھا۔

مولانا محمد اختر قاسمی نے کہا کہ عمل کا رد عمل تو ایک فطری چیز ہے پھر آپ کیوں کہتے ہیں کہ جب دوسروں کی طرف سے اشتعال انگیزی کی جائے تو مسلمانوں کو مشتعل نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے کہا کہ رد عمل بلا شبہ ایک فطری چیز ہے مگر یہ فطرت برائے اظہار نہیں ہے بلکہ برائے امتحان ہے۔ یعنی انسان کے اندر یہ مزاج اس لئے نہیں رکھا گیا ہے کہ لوگ ہر خلاف مزاج بات پر لڑ جائیں اور انتقامی کارروائیاں کریں بلکہ وہ اس لئے ہے کہ لوگ اس اعلیٰ انسانی صفت کی تربیت حاصل کریں جس کو ضبط و تحمل کہا جاتا ہے غصہ دلانے پر غصہ ہو جانا ایک حیوانی صفت ہے اور غصہ دلانے کے باوجود غصہ نہ ہونا ایک انسانی صفت۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ دنیا میں اس اعلیٰ انسانی صفت کا ثبوت دے تاکہ ان کا شمار اللہ کے یہاں صالحین میں کیا جائے۔

مولانا شمس الدین ندوی نے کہا کہ ایک حدیث یہ بتاتی ہے کہ "من استغضب ولم یغضب فھو حمار "(جس آدمی کو غصہ دلایا جائے مگر وہ غصہ نہ ہو تو وہ گدھا ہے) انھوں نے کہا

کہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کے غصہ دلانے پر غصہ ہونا کوئی بری بات نہیں بلکہ وہ اچھی بات ہے۔

میں نے کہا کہ یہ بات بذات خود صحیح ہے، کیوں کہ غصہ عام طور پر الفاظ پر آتا ہے۔ آپ کسی کو کوئی سخت لفظ بول دیں تو وہ غضبناک ہو جائیگا، اس قسم کا غصہ صرف انسان کو آسکتا ہے کیوں کہ یہ صرف انسان ہی ہے جو الفاظ کی زبان جانتا ہے۔ گدھے کے سامنے آپ سب وشتم کے تمام الفاظ دہرا دیں تب بھی اسے غصہ نہیں آئے گا۔ کیوں کہ اس نے آپ کے الفاظ کا کوئی مطلب سمجھا ہی نہیں۔

میں نے کہا کہ غصہ ہونا بلاشبہ کسی کے حیوان ناطق ہونے کا ثبوت ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسروں کو اپنے غصہ کا شکار بنانا بھی کوئی انسانی فعل ہے۔ اس قول کا مطلب صرف یہ ہے کہ جب تم کو غصہ دلایا جائے تو تم کو غصہ ضرور آئے گا۔ کیوں کہ تم انسان ہو مگر انسان ہونے ہی کا دوسرا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہمارے اندر تحمل کی صفت ہو۔ تم غصہ کے باوجود اس آیت کا مصداق بنو کہ "واذاما غضبوا هم يغفرون"

غصہ آنا ایک چیز ہے اور غصہ کو ظاہر کرنا دوسری چیز۔ غصہ آنا بلاشبہ ایک فطری صفت ہے مگر غصہ کو ظاہر کرنا بلاشبہ ایک غیر انسانی فعل ہے۔ غصہ آنا اگر اس بات کی پہچان ہے کہ آپ ایک انسان ہیں، تو غصہ کو ظاہر کرنا اور فریق ثانی کو اپنے غصہ کا نشانہ بنانا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ خدا کے امتحان میں ناکام ہو گئے۔

یہ سن کر ایک صاحب نے کہا کہ غصہ کو روکنا تو بہت مشکل کام ہے۔ میں نے کہا کہ یہی مشکل تو جنت کی قیمت ہے۔ اور کسی اعلیٰ چیز کی قیمت ہمیشہ مشکل ہی ہوتی ہے۔ اگر غصہ کے وقت آدمی یہ سوچے کہ یہ تو میرے لئے جنت کی قیمت ادا کرنے کا وقت ہے تو حضرت عمر فاروق کے الفاظ میں غصہ کو پی جانا اس کے لئے سب سے زیادہ میٹھا گھونٹ بن جائے۔

۲ اکتوبر کی صبح کو جناب الطاف حسین صدیقی کے مکان پر صبح کے ناشتہ کا پروگرام تھا،

یہاں اور کئی لوگ موجود تھے، مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ بھائی الطاف صاحب معاشیات سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہندستان کی اقتصادیات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہماری ضرورت فارن انوسٹمنٹ ہے۔ ہماری ضرورت فارن لون نہیں۔ ہندستان میں آزادی کے بعد بہت بڑی مقدار میں بیرونی قرضے لئے گئے مگر ان قرضوں کا کوئی مثبت اقتصادی فائدہ اس ملک کو نہ ملا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرض سے پہلے یہ مسئلہ ہے کہ قرض کی رقم کو صحیح طور پر استعمال کرنے کے لئے کیا ہمارے پاس صلاحیت موجود ہے۔ چونکہ یہ صلاحیت موجود نہیں تھی اس لئے ان قرضوں کا حال وہی ہوا کہ کسی کو دودھ دیا جائے مگر اس کو لینے کے لئے اس کے پاس صرف چھلنی موجود ہو، ایسا آدمی دودھ کے عطیہ کے باوجود دودھ سے محروم رہے گا۔

فارن انوسٹمنٹ میں یہ خطرہ نہیں تھا وہ لوگ اپنے مالیاتی انوسٹمنٹ کے ساتھ اپنی صلاحیت بھی لے آتے اور پھر ان کا اقتصادی فائدہ بھی ضرور ملک کو ملتا۔ آزادی کے چالیس سال بعد لبرلائزیشن کے تحت فارن انوسٹمنٹ کا دروازہ کھولا گیا مگر عملاً وہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ ہمارے ملک کی دو بنیادی خرابیاں تھیں جو نہرو کی پالیسیوں کی دین ہیں یہ ہے قانون قاعدوں کی بھرمار اور کرپشن۔ اس دگنا رکاوٹ کی بنا پر بیرونی کمپنیاں اس طرح ہندستان میں نہ آسکیں جس طرح وہ دوسرے ملکوں میں جاکر اپنا کام کر رہی ہیں۔

بیرونی ملکوں میں ہندستان کے جو لاکھوں لوگ ہیں جن کو نان ریزیڈینٹ انڈین کہا جاتا ہے وہ اس معاملہ میں بہت بڑا کردار ادا کر سکتے ہیں جناب محمد مبین انجینر نے بتایا کہ ان ہندستانیوں کے پاس تین سو پچاس بلین ڈالر کا ریزرو ہے۔ اگر یہ رقم انڈیا میں آجائے تو ہمارا سارا اقتصادی مسئلہ حل ہو جائے۔

میں نے اپنے بیرونی سفروں کے درمیان بہت سے ایسے ہندستانیوں سے ملاقات کی ہے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ آپ ہندستان میں اپنا سرمایہ کیوں نہیں لگاتے۔ تقریباً ہر ایک نے

کہا کہ ہم ایسا کرنا چاہتے ہیں مگر ہندستان کا کرپشن اور بڑھتی ہوئی بیوراکریسی کی بنا پر ہماری ہمت نہیں پڑتی۔

موجودہ گورمنٹ نے بیرونی ملک میں آباد ہندستانیوں سے اپیل کی کہ وہ ہندستان میں اپنا پیسہ لگائیں۔ اس سلسلہ میں اسٹیٹ بنک آف انڈیا نے خصوصی رعایتوں کا اعلان کیا۔ اس کے بعد غیر مقیم ہندستانیوں نے چار بلین ڈالر سے زیادہ اسٹیٹ بنک آف انڈیا کو دئے۔ اس سلسلہ میں جناب محمد مبین شاغل (۳۸ سال) نے یہ پر مسرت بات بتائی کہ اس رقم کا 65% حصہ خلیجی ملکوں میں مقیم ہندستانی مسلمانوں کی طرف سے آیا ہے۔ اس کی تفصیلی رپورٹ ٹائمس آف انڈیا میں چھپی ہے۔ یہ بلاشبہ اس الزام کی ایک تردید ہے کہ مسلمان اس ملک کے وفادار نہیں کیوں کہ انسان کے لئے سب سے مشکل چیز "زر" کو دینا ہے جیسا کہ فارسی کے ایک مقولہ میں کہا گیا ہے کہ "زرمی طلبی سخن دریں است" اس نازک اقتصادی موقع پر جب مسلمانوں نے دوسرے فرقوں سے بڑھ کر ملک کے لئے اپنی مالی امداد پیش کردی تو یہ گویا اس بات کا آخری ثبوت ہے کہ وہ اس ملک کے سچے دیش بھکت ہیں بلکہ شاید دوسروں سے زیادہ۔

مولانا اقبال احمد سہیل (وفات   ) نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے اپنے ایک شعر میں کہا تھا کہ

جان جائے پر نہ جائے حرمت شان وطن

میں اس میں معمولی لفظی فرق کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ

مال جائے پر نہ جائے حرمت شان وطن

۲ اکتوبر کو ۱۱ بجے ہم لوگ اس مقام پر پہنچے جہاں ڈاکٹر حمید اللہ ندوی نے ایک پلاٹ لیا ہے اور وہاں وہ اپنا مکان بنانا چاہتے ہیں۔ مجھ کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ میں اس تعمیر ہونے والے مکان کا سنگ بنیاد رکھوں جو انشاءاللہ نہ صرف ڈاکٹر حمید اللہ ندوی کے لئے ایک رہائش گاہ

ہو گا بلکہ وہ اسی کے ساتھ الرسالہ مشن کا ایک خداداد مرکز بھی بنے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔ یہ سنگ بنیاد جناب ذاکر الرحمٰن عرف مہتاب میاں کی موجودگی میں رکھا گیا۔

یہ پلاٹ بھائی الطاف صاحب (پروجکٹ کنسلٹینٹ) کی رہائش گاہ کے قریب ہے اور انھیں کے مشورہ اور کوششوں کے ذریعہ حاصل ہوا ہے۔ بھائی الطاف صاحب نے کہا کہ ایک سال پہلے وہ ڈاکٹر حمید اللہ ندوی کے ساتھ یہاں آئے۔ بھائی الطاف صاحب (پیدائش ۱۹۳۴) تقریباً ۳۴ سال سے ریٹناڈی جنریشن کی وجہ سے دونوں آنکھوں کی روشنی سے محروم ہوگئے ہیں۔ چنانچہ وہ کچھ بھی دیکھ نہیں سکتے۔ جب وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پلاٹ کو دیکھنے کے لئے آئے تو انھوں نے ایک بڑی عجیب بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ مجھے بصارت حاصل نہیں مگر میری بصیرت یہ کہتی ہے کہ یہ مقام انشاءاللہ انتہائی پررونق اور خیر و برکت والا ہے۔ یہ سن کر مجھے ایک شاعر کا شعر یاد آیا۔ وہ دونوں آنکھوں سے نابینا تھے۔ انھوں نے ایک نعتیہ نظم لکھی اس نعتیہ نظم کا ایک شعر یہ تھا:

بصارت کھو گئی تو کیا بصیرت تو سلامت ہے مدینہ ہم نے دیکھا ہے مگر نادیدہ نادیدہ

۲ اکتوبر کی دوپہر کو بھوپال کا ایک رفاہی ادارہ دیکھا۔ اس کا نام شبنم وکلانگ سیوا سمیتی ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۸۰ میں جناب سردار خانصاحب کی صدارت میں قائم ہوا جس کے سرپرست جناب الطاف صدیقی صاحب ہیں۔ میں نے ان بچوں کو دیکھا جن کی تعداد ۶۳ ہے ان میں ہندو اور مسلمان دونوں بچے شامل ہیں۔ میں نے کئی بچوں سے بات کی دو بچوں سے ہونے والی بات کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

سنتوش چورسیہ (عمر ۱۴ سال) ان سے میں نے پوچھا کہ آپ یہاں کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پڑھتے ہیں۔ میں نے پھر پوچھا کہ آپ کیا سوچتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ پڑھ لکھ کر میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوں گا۔ ایک اور بچہ جس نے اپنا نام شنکر شرما (عمر ۱۲ سال) بتلایا۔

وہ بھی اپنے دونوں پیروں سے معذور تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ پڑھنے کے بعد کیا کریں گے ۔اس نے جواب دیا میں پڑھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ یہ بات وہ بچے کہہ رہے تھے جو اپنے دونوں پیروں سے پوری طرح معذور تھے اور جسمانی طور پر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے سوچا کہ علم میں کیسی عجیب طاقت ہے۔ علم آدمی کو اس حد تک باشعور بناتا ہے کہ وہ جسمانی طور پر کمزور ہوتے ہوئے بھی ذہنی طور پر اتنا طاقتور ہو جائے کہ اس کی جسمانی کمزوری ترقی کی راہ میں حائل نہ ہو سکے۔

اس ادارہ میں اس وقت ۶۳ معذور بچے ہیں ان میں مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ ان کو دیکھ کر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ ان کے مقابلہ میں مجھے اپنا وجود حقیر نظر آنے لگا۔ میں نے سوچا کہ میرا معاملہ تو ایک مشتبہ معاملہ ہے مگر یہ بچے یقینی طور پر خدا کی ایک مرضی کو پورا کر رہے ہیں۔ وہ دنیا میں خدا کی طرف سے لوگوں کے لئے نشان راہ (sign post) ہیں۔ وہ زندہ زبان میں لوگوں کو بتا رہے ہیں کہ اے لوگو، اگر خدا نے تم کو ہاتھ اور پاؤں آنکھ اور دماغ سے معذور نہیں بنایا تو اس پر ناز نہ کرو بلکہ خدا کا شکر ادا کرو کیونکہ خدا اگر چاہتا تو وہ تم کو بھی ویسا ہی بنا دیتا جیسا کہ تم ہم کو دیکھ رہے ہو۔ اس ادارہ کا ڈاک کا پتہ یہ ہے۔

Subham Viklang Awam Samaj Sewa Samiti
Near Kausar Masjid, Cheklad Road.
Jehangirabad, Bhopal - 462008
Tel-(0755)511957-770482

۲ اکتوبر ۹۸ کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز بھوپال کی صوفیہ مسجد میں پڑھی یہ مسجد مجھے بہت پسند ہے۔ میں نے کئی بار یہاں نماز پڑھی ہے۔ مسجد اس طرح بنائی گئی ہے جیسے کہ وہ پارک کے اندر ہو۔ قدرتی مناظر کے درمیان عبادت گاہ کا تصور میرے جیسے آدمی کے لئے بہت

پر کشش ثابت ہوتا ہے۔

آج دوپہر کے کھانے کا انتظام اسی مسجد میں کیا گیا تھا۔ تقریباً ۱۰۰ آدمی کھانے پر موجود تھے۔ ان میں مدھیہ پردیش کی مشہور شخصیت مسٹر کنک تیواری بھی تھے۔ مسٹر کنک تیواری اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اسی کے ساتھ وہ گاندھی وادی بھی ہیں۔ انھوں نے گاندھی جی کے کئی قصے سنائے۔ انھوں نے بتایا کہ گاندھی جی مدھیہ پردیش میں دس بار اور بھوپال میں دوبار آئے تھے۔ ان کا پہلا سفر غالباً ۱۹۲۰ میں مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ ہوا تھا جب کہ وہ چھندواڑا گئے تھے۔

بھوپال کے اس سفر میں بہت بڑی تعداد میں مسلمانوں سے ملنے اور ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں میری اول دن سے ایک ہی رائے ہے۔ عام طور پر مسلمانوں کے رہنما خواہ بے ریش ہوں یا باریش سب ایک ہی بات کہتے ہیں وہ یہ کہ ہندستانی مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہاں کے اکثریتی فرقہ کا تعصب ہے۔ میں اس کو بالکل بے معنی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک مسلمانوں کا اصل مسئلہ ان کی بے شعوری ہے۔ یہ مسئلہ انڈیا میں بھی اتنا ہی ہے جتنا کہ پاکستان میں۔

صوفیہ مسجد میں کچھ مسلمانوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آزادی کے بعد ہندستان اور پاکستان دونوں یکساں طور پر مسائل کا شکار بنے ہوئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد دونوں ملکوں میں جو رہنما اٹھے انھوں نے صحیح نقطۂ آغاز سے اپنا کام شروع نہیں کیا۔

پاکستان میں وہاں کے مسلم رہنماؤں نے یہ سمجھا کے یہاں کرنے کا پہلا کام اسلامائزیشن آف اسٹیٹ ہے۔ حالانکہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہاں مسلمانوں کے مختلف طبقات میں وہ شعور پیدا کیا جائے جو انھیں مل کر رہنا سکھائے اور باہمی ٹکراؤ کا خاتمہ کرے۔ اس غلط آغاز کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامائزیشن کے نام پر کوششوں کا طوفان کھڑا کردیا گیا مگر نتیجہ یہ ہوا کہ جو پاکستان ایک قوم کے نام پر بنا تھا وہ کئی قوموں اور فرقوں میں بٹ کر آپس میں تباہ کن لڑائی میں مشغول ہوگیا۔

ہندستان کے مسلم رہنماؤں نے یہ سمجھا کہ یہاں کی مفروضہ مسلم دشمن طاقتوں کے خلاف مفروضہ لڑائی لڑتے رہیں۔ اس نام نہاد لڑائی کا بے نتیجہ ہو جانا یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ معاملہ کے صحیح تشخیص پر قائم نہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلم نقطۂ نظر سے ہندستان کا اصل مسئلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کو نارمل بنانا تھا۔ اسی نارملائزیشن پر مسلمانوں کی تمام ترقیوں کا انحصار تھا، دینی بھی اور دنیوی بھی۔

صوفیہ مسجد میں کچھ مسلمانوں نے فخر کے ساتھ یہ کہا کہ بھوپال میں اور (اسی طرح سارے ہندستان میں) مسجدوں میں زبردست اضافہ ہو رہا ہے اور نمازیوں کی تعداد بھی ہر جگہ بہت بڑھ رہی ہے۔

میں نے کہا کہ میں چیزوں کو ان کے ظاہر کے اعتبار سے نہیں دیکھتا ہوں بلکہ ان کی حقیقت کے اعتبار سے دیکھتا ہوں۔ اس لئے اس مذہب میں میرے لئے کوئی زیادہ خوشی کی بات نہیں ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ نماز یا مسجد کو جانچنے کا اسلامی معیار کیا ہے۔ قرآن وحدیث کے مطابق، وہ تقویٰ ہے۔ مسجدوں میں نمازیوں کا اضافہ اگر مسلمانوں میں اسلامی کیرکٹر پیدا کر رہا ہو تو بلاشبہ یہ خوشی کی بات ہے۔ مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے۔ میرا تجربہ ہے اور آپ بھی یقیناً جانتے ہوں گے کہ نماز کی کثرت کے باوجود مسلمانوں سے وعدہ خلافی ختم نہیں ہوئی۔ پیسے کے لین دین میں وہ مضبوط نہیں بنے۔ مسلمانوں میں یہ مزاج نہیں آیا کہ کسی کے بارے میں کوئی الٹی بات سنے تو تحقیق کے بغیر اس کو نہ مانے۔ قرآن کے الفاظ میں، وہ فحشا منکر سے بچنے والے نہیں بنے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے میں یہاں صرف ایک حدیث پیش کرتا ہوں۔ حدیث میں آیا ہے کہ کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ جو سنے اس کو دہرانے لگے (كفى بالمرء كذباً ان يحدث بكل ما سمع)

میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ موجودہ مسلم سماج میں بہت کم افراد ہوں گے جو اس معیار پر پورے اتریں۔ میں ذاتی طور پر اس معاملہ کا ثبوت ہوں۔ میرے معاملہ میں بہت سی باتیں کچھ لوگوں نے بے بنیاد طور پر کہیں۔ مثلاً یہ کہ میں بی جے پی کا ایجنٹ ہوں، مجھ کو مسلم دشمن طاقتوں سے پیسہ ملتا ہے، میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمان بابری مسجد ہندوؤں کو دے دیں، میرے ماہنامہ رسالہ کا بل ہندو ادا کرتے ہیں، مجھ کو اسلام کے دشمنوں نے ڈپیوٹ کیا ہے کہ میں مسلمانوں کو اندر سے کمزور کروں وغیرہ وغیرہ۔

میرے خلاف اس قسم کی باتیں اردو اخباروں اور رسالوں میں چھپتی ہیں۔ سارے ہندستان کے مسلمان ان باتوں کو دہراتے ہیں۔ مگر آج تک کسی بھی شخص نے مجھ سے ٹیلی فون یا خط یا ملاقات کے ذریعہ یہ نہیں پوچھا کہ آپ کے بارے میں فلاں بات ہم نے سنی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ سے تحقیق کرلوں اس کے بعد اس پر لکھوں یا بولوں۔

اس طرح کے کثیر تجربات کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں مسجدوں میں نمازیوں کی کثرت اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے شاید کوئی اسلامی ظاہرہ (Islamic phenomenon) نہیں بلکہ وہ ایک قسم کی فراریت ہے۔ مسلمان موجودہ زمانہ میں غیر مسلموں کے براہ راست مقابلہ سے ہر میدان میں اپنے آپ کو دفاعی پوزیشن میں پاتے ہیں۔ یہ مسجدیں مسلمانوں کو ایک طرف حفاظت خانہ (safe haven) فراہم کرتی ہیں اور دوسری طرف یہاں کے علیحدہ ماحول میں ان کو یہ موقع ملتا ہے کہ اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف اس قسم کی بددعائیں کرکے اپنے دل کی بھڑاس نکال سکیں "**اللهم اهلكهم ، اللهم دمر ديارهم ، اللهم خذهم اخذ عزيز مقتدر**" ایک صاحب نے کہا کہ اس قسم کی بددعائیں تو ماثور ہیں اور روایات سے ثابت ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بات درست نہیں اس لئے کہ بعض بددعائیں جو روایات میں آئی ہیں وہ صرف وقتی تھیں اور وہ بھی صرف اس وقت کی گئیں جب کہ

فریق ثانی پر اتمام حجت آخری حد تک کیا جا چکا تھا۔اس کے باوجود اس نے ظالمانہ جارحیت کا طریقہ اختیار کیا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان "اہل کفر" کے خلاف ہر روز بددعائیں کرتے ہیں ان میں یہ دونوں شرطیں نہیں پائی جاتیں۔اس لئے یہ بددعائیں یقینی طور پر سنت کے مطابق نہیں ہیں، بلکہ وہ ان احادیث کے مصداق ہیں جن میں کہا گیا کہ تم دعائیں مانگو گے اور تمہاری دعائیں قبول نہ ہوں گی (ولا یستجاب لکم)

بھوپال میں موتی مسجد (سے متصل) کے پاس مکتبہ الرسالہ قائم کیا گیا ہے۔ جناب انور جمال صاحب نے اپنے مکان کا ایک حصہ جو سڑک کی طرف کھلتا ہے اس کے لئے خاص کیا ہے اور بطور عطیہ مکتبہ الرسالہ کو دیا ہے۔ ۲ اکتوبر کو میں نے اس مکتبہ کا افتتاح کیا۔

۲ اکتوبر کی شام کو اچاریہ نریندر دیو لائبریری کے ہال میں ایک پروگرام ہوا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے لوگ شریک ہوئے۔ سب تعلیم یافتہ لوگ تھے اس کا موضوع تھا "اسلام اور آتنکواد" میں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اسلام میں آتنک واد کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ بحیثیت فرد ایک مسلمان کو صبر اور اعراض کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جہاں تک جنگ کا تعلق ہے تو اسلام میں صرف دفاعی جنگ ہے، اقدامی جنگ یا ہجومی لڑائی اسلام میں سرے سے جائز ہی نہیں۔ دوسری بات یہ کہ جنگ اسٹیٹ کا معاملہ ہے نہ کہ غیر حکومتی افراد یا گروہ کا معاملہ۔ موجودہ زمانہ میں مختلف ملکوں میں مسلمانوں کے غیر حکومتی گروہوں نے وہاں کی حکومت کے خلاف جو لڑائیاں چھیڑ رکھی ہیں وہ بلاشبہ اسلام میں ناجائز ہیں۔ایک مسلمان ذاتی فیصلہ کے تحت روزہ نماز کر سکتا ہے مگر غیر حکومتی افراد خود اپنے ارادہ یا فیصلہ کے تحت کسی حکومت کے خلاف متشددانہ جنگ نہیں چھیڑ سکتے۔جو لوگ ایسا کریں وہ یقینی طور پر سخت گناہ گار ہیں۔

جناب کیلاش نارائن سارنگ کے ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ قرآن میں قتال کی جو آیتیں ہیں وہ پیغمبر کے ہم عصر حملہ آوروں سے لڑنے کے لئے ہیں۔ مثلاً قاتل

المشرکین کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا میں جہاں کوئی مشرک ہو اس سے لڑو، بلکہ اس سے مراد مکہ کہ وہ ہم زمانہ مشرکین ہیں جنھوں نے یک طرفہ طور پر پیغمبر کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی تھی اور کسی طرح اس جنگ کو ختم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ ان جارحین کے خلاف دفاعی طور پر جنگ کرنے کا حکم دیا گیا۔ میں نے کہا کہ کرشن جی گیتا میں ارجن سے کہتے ہیں کہ تم یدھ (جنگ) کرو مگر یہ کوئی مطلق یا عمومی بات نہیں تھی۔ یعنی اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ہندو ہر زمانہ میں ہر قوم سے لڑتے رہیں۔ یہ صرف ایک وقتی حکم تھا اسی طرح قرآن میں قتال کا حکم وقتی حکم ہے نہ کہ کوئی مطلق یا عمومی حکم۔

۲ اکتوبر ۹۸ کو ہوٹل نور الصباح میں شام کی چائے کا پروگرام تھا۔ میں کئی لوگوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ یہ ایک نیا ہوٹل ہے جو بھوپال کا پہلا فائیو اسٹار ہوٹل ہے۔ وہ نواب بھوپال کے ایک محل کو از سر نو مزین کر کے بنایا گیا ہے۔ یہاں ہم نے مغرب کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی۔ جس کمرہ میں نماز ادا کی گئی وہ اس ہوٹل کا اعلیٰ ترین سوئٹ تھا جس کا روزانہ کا کرایہ ساڑھے گیارہ ہزار روپیہ ہے۔ اس ہوٹل کے مالک مسلمان ہیں۔

ہوٹل کے مینجر مسٹر انوراگ پاٹھک (۲۶ سال) نے نہایت ذوق وشوق کے ساتھ ہوٹل کے مختلف حصے دکھائے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے باپ ایک مسلمان صوفی سے بہت متاثر ہیں۔ باپ کے اثر سے میں بھی اسلام سے بہت قریب ہوں۔

جناب عبد الوحید خاں صاحب (بھوپال یونیورسٹی) سے میں نے پوچھا کہ آپ اپنی زندگی کا کوئی انوبھو بتائیے۔ انھوں نے ایک ایسی بات کہی جو ہر انسان کے لئے اہمیت رکھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میری عادت ہے کہ جب میں کسی کے خلاف کوئی بری بات سنتا ہوں تو اس کو ماننے سے پہلے اس کی تحقیق کرتا ہوں۔ جب تک تحقیق سے بات ثابت نہ ہو جائے میں اس کو نہیں مانتا اور نہ اس کا چرچا کرتا ہوں۔ بطور مثال انھوں نے کہا کہ الرسالہ مشن کے بارے میں

میں نے بہت سی نامناسب باتیں سنیں مگر میں نے ایسا نہیں کیا کہ میں ان کو فوراً مان لوں بلکہ میں نے اس کی باقاعدہ تحقیق شروع کردی آخر کار تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سب بے بنیاد الزامات تھے۔

۲ اکتوبر کی شام کو ملار موزی سنسکرتی بھون میں آخری اجتماع تھا۔ مدھیہ پردیش کے گورنر ڈاکٹر بھائی مہاویرا اور دوسرے کئی لوگ موجود تھے۔ میں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ امن کی طاقت تشدد کی طاقت سے زیادہ ہے۔ اس معاملہ کو مختلف مثالوں سے واضح کیا۔

۲ اکتوبر کو رات کے کھانے کا انتظام عبدالوحید خاں صاحب کی طرف سے تھا۔ وہ کھانا لے کر ڈاکٹر حمید اللہ ندوی کے مکان پر آگئے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یہیں کھانا کھایا اس کے بعد دیر تک لوگوں سے بات چیت ہوتی رہی۔

ایک خاتون جو الرسالہ کی قاری ہیں انھوں نے کہا کہ مجھے طرح طرح کے اندیشے آتے ہیں جن کی وجہ سے میں پریشان رہتی ہوں۔ میں نے انھیں ایک کاغذ پر یہ جملہ لکھ کر دیا۔ اندیشوں کے سلسلہ میں سب سے زیادہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ بیشتر اندیشے کبھی واقعہ نہیں بنتے۔

۳ اکتوبر ۱۹۹۸ کی صبح کو بھوپال سے واپسی ہوئی۔ ساتھیوں کے ہمراہ ہوٹل سے چل کر بھوپال ائرپورٹ پہنچا۔ یہاں بھی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔

جناب محمد ذاکر صاحب اور جناب محمد مبین صاحب نے مشترک طور پر یہ بات بتائی کہ آج کل ایک نیا کاروبار ہر جگہ زوروں پر ہو رہا ہے۔ پرائیوٹ طور پر مالی ادارے بنائے جاتے ہیں جن کو نان بینکنگ فائننشیل انسٹیٹوٹ کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ بڑے بڑے خوشنما وعدوں پر لوگوں سے رقمیں حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ ہمیں ایک لاکھ روپیہ دیں ہم آپ کو ۳۶ ہزار روپئے سالانہ بطور نفع دیتے رہیں گے وغیرہ۔ اس طرح ان لوگوں کے پاس تھوڑی مدت میں اربوں روپئے جمع ہو جاتے ہیں۔

چند سال یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اس کے بعد کمپنی اچانک مارکیٹ سے اس طرح غائب

ہو جاتی ہے جیسے کوئی ہوائی جہاز حادثہ کا شکار ہو کر ائرپورٹ کنٹرول کی اسکرین سے اچانک غائب ہو جائے۔ اس کے بعد رقمیں جمع کرنے والے لوگ بے یار ومددگار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ ملکی قوانین کے تحت ایسے لوگوں کی کوئی پکڑ نہیں کیوں کہ ان کا نظام ریزرو بینک آف انڈیا سے آزاد رہتا ہے، اس لئے ریزرو بینک ان کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔

اب دوسرا چارۂ کار یہ ہے کہ شکار ہونے والے افراد عدالت میں جائیں مگر اس معاملہ میں موجودہ قانونی صورت حال یہ ہے کہ اس طرح کا مالی فراڈ کرمنل کیس نہیں بنتا۔ وہ صرف سول کیس بنتا ہے۔ چنانچہ عدالتیں یہ نہیں کر پاتیں کہ وہ ایسی کمپنیوں کو رقم کی ادائیگی پر مجبور کریں وہ صرف چند سال کی سزا دے سکتی ہیں اور اربوں روپیہ کمانے والے ان افراد کے لئے اس قسم کی جیل یاترا ایک تفریحی آؤٹنگ سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

جناب عبد الوحید خاں صاحب ایڈوکیٹ اور کچھ دوسرے صاحبان سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ کامیاب منصوبہ بندی نام ہے داخلی خواہشوں اور خارجی عوامل کے درمیان مطابقت دریافت کرنے کا۔ میرا تجربہ ہے کہ بیشتر لوگ صرف اپنی خواہشوں کو جانتے ہیں چنانچہ جو خواہش بھی ان کے دل میں پیدا ہوتی ہے اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں حالانکہ جس دنیا میں انھیں اپنی خواہش کو پورا کرنا ہے اس میں دوسرے بہت سے افراد ہیں اور دوسرے بہت سے عوامل کام کر رہے ہیں ایسی حالت میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص یک طرفہ طور پر اپنی خواہش کو پورا کر سکے۔

یہ گفتگو ۳ اکتوبر کی صبح کو بھوپال ائرپورٹ پر ہوئی، جہاں یہ لوگ اور دوسرے بہت سے افراد مجھے الوداع کہنے کے لئے آئے تھے۔ ائرپورٹ پر بعض احباب نے کہا کہ ہم کچھ گھریلو مسائل میں دوچار ہیں ہمیں کوئی دعا بتایئے میں نے ان کو یہ دعا لکھ کر دی۔ **اللھم اصلح لی شانی کلہ دقہ وجلہ یا خیر الرازقین یا ارحم الراحمین**

اس قیام کے دوران بار بار بھوپال شہر کے مختلف حصوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ نظم اور صفائی وغیرہ کے اعتبار سے بھوپال کی حالت بھی وہی ہے جو ہندستان کے دوسرے شہروں کی ہے۔ سڑکوں پر

بے ترتیب گاڑیوں کا ہجوم، فضا میں کثافت، سڑک کے دونوں طرف غیر صاف فٹ پاتھ، جگہ جگہ لاؤڈ سپیکروں کا شور، غیر قانونی تعمیرات، وغیرہ۔ ۱۹۴۷ کے بعد ملک میں جو حکومتیں بنیں، ان میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرتی رہی کہ وہ ملک کی ترقی کے لئے بڑے بڑے کام کر رہی ہے۔ مگر یہ ترقیاں آج بھی صرف کاغذ پر دکھائی دیتی ہیں، شہروں اور بستیوں میں وہ کہیں نظر نہیں آتیں۔ جہاز میں میرے قریب کی سیٹ پر ایک ہندو تاجر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنا نام چھوٹا لال (۸۲ سال) بتایا۔ وہ گاندھی جی کے وطن پوربندر میں پیدا ہوئے۔ اب بزنس کے تحت کلکتہ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے گاندھی جی کو دیکھا تھا اور ان کی باتیں سنی تھیں۔ انہوں نے سخت لہجہ میں ہندستان کی سیاست پر تنقید کی۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی کہتے تھے کہ دیش کو آزاد کر کے ہم اپنے یہاں رام راجیہ بنائیں گے۔ مگر آج رام راجیہ کہاں ہے۔ یہ تو راون راجیہ ہے۔ یہ دیش اچھے لوگوں کے رہنے کے لئے نہیں۔ یہ چوروں اور لٹیروں کے لئے ہے۔ لوگ صرف گاندھی کا نام لیتے ہیں گاندھی کو مانتا کوئی بھی نہیں۔

مسٹر چھوٹا لال نے دنیا کے اکثر ملکوں کو دیکھا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ جن ملکوں میں گئے ان میں سے کون سا ملک آپ کو زیادہ پسند آیا۔ انھوں نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا، سلازار (۱۹۷۰) (Antoniode Oliveira Salazar) کا ملک پرتگال۔ سلازار پرتگال میں ۳۶ سال تک وزیر اعظم رہا۔ اس کو ایک عامر حکمراں کہا جاتا ہے۔ مگر وہ ایک نہات بااصول آدمی تھا۔ وہ نہایت سادہ زندگی گزارتا تھا۔ وہ پبلیسٹی سے دور رہتا تھا۔ اسٹیج کی تقریر سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ۱۹۳۲ میں جب اس کو پرتگال کا سیاسی اقتدار ملا اس وقت یہ ملک زبردست انتشار کا شکار تھا مگر سلازار کی سیاسی قیادت کے تحت اس کو نئی زندگی مل گئی۔

بھوپال سے دہلی کے لئے انڈین ایرلائنس کی فلائٹ ۴۳۴ کے ذریعہ واپسی ہوئی۔ جہاز تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہو کر ساڑھے بارہ بجے دلی پہنچا۔ ہندستان میں ہوائی جہاز کی سطح پر بھی اوقات کی پابندی موجود نہیں۔ پھر ریلوں اور بسوں کے سفر میں اگر اوقات کی پابندی نہ ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

شیطانی وسوسہ

ایک آدمی کو کچھ مادی کامیابی حاصل ہوئی۔ کامیابی کو پاکر اس کے اندر شکر کا جذبہ ابھرا۔ مگر عین اسی وقت اس کے دل میں ایک اور خیال آگیا۔ اس نے سوچا کہ میرے پڑوسی کو جو ترقی حاصل ہوئی ہے وہ میری ترقی سے بہت زیادہ ہے۔ پہلے وہ خود اپنے ماضی کا اپنے حال سے مقابلہ کر رہا تھا۔ اب وہ اپنے حال کا اپنے پڑوسی کے حال سے مقابلہ کرنے لگا۔ اس فرق نے اس کے احساسات کو بدل دیا۔ جس سینہ میں پہلے شکر کا جذبہ ابھر رہا تھا۔ اب اسی سینہ میں حسد اور شکایت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں شیطانی وسوسہ کہا گیا ہے ۔ (الذی یوسوس فی صدور الناس) شیطان انسان کا دشمن ہے۔ وہ انسان کے دل پر حملہ کرتا ہے۔ وہ انسان کی سوچ کو صحیح رخ سے ہٹا کر غلط رخ کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اس طرح شیطان ہر وقت اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ انسان کو صراط مستقیم سے منحرف کردے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے احسن تقویم کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس کے اندر فطری طور پر تمام شریفانہ جذبات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ کسی شخص کے ساتھ اچھا سلوک کریں تو فوراً اس کے اندر احسان مندی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ مگر عین اسی وقت شیطان اس کے دل میں یہ خیال ڈالے گا کہ اگر تم نے احسان مانا تو تم اپنے کو چھوٹا کر لوگے۔ اکثر انسان اس وسوسہ کا شکار ہو جاتے ہیں اور احسان مندی کے بجائے احسان فراموشی کی روش اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی طرح ایک شخص کو آپ کے بارے میں غلط فہمی ہو گئی۔ آپ نے دلیل کے ساتھ اس کی غلطی کی وضاحت کی۔ اس کے بعد فطری طور پر آدمی کے اندر اعتراف کا جذبہ ابھرے گا۔ مگر عین اسی وقت شیطان اس سے کہے گا کہ اگر تم نے اعتراف کیا تو تم خود ہی اپنا درجہ گھٹا لوگے ۔ اس خیال کے آتے ہی آدمی اپنے فطری احساسات کو دبا دے گا اور اپنی غلطی کو ماننے سے انکار کردے گا۔

اسی طرح شیطانی وسوسہ کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ کسی مسئلہ کو وقار کا مسئلہ بنادے۔ دو آدمیوں کے درمیان کسی معاملہ میں نزاع پیدا ہو تو ابتدائی طور پر وہ ایک سادہ نزاع ہوتی ہے باہمی گفت و شنید کے ذریعہ اس کو حل کیا جاسکتا ہے۔ مگر جب وہ بڑھ کر ساکھ اور وقار کا مسئلہ بن جائے تو اس کے ساتھ ایک ناقابل حل پیچیدگی کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

نزاع پیدا ہونے کی صورت میں ابتدائی طور پر آدمی صرف نفع اور نقصان کو دیکھتا ہے۔ ایسی حالت میں نزاع کو ختم کرنا مشکل نہیں ہوتا مگر نزاع کا معاملہ جب بڑھ کر وقار کا معاملہ بن جائے تو آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اگر میں نے فریق ثانی کی بات مان لی تو میری بے عزتی ہو جائے گی۔ اسی کا نام شیطانی وسوسہ ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ کوئی معاملہ جب اپنی سادہ حالت سے آگے بڑھ کر عزت و وقار کا معاملہ بننے لگے تو وہ چوکنا ہو جائے۔ وہ جان لے کہ اب اس معاملہ میں شیطان وسوسہ اندازی کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کو چاہئے کہ وہ شیطان کے مقابلہ میں خدا کی پناہ مانگے اور لڑکر ایسے خیال کو اپنے دماغ سے نکال دے۔

ہر آدمی اس شیطانی وسوسہ کی زد میں ہے۔ نجات یافتہ وہ ہے جو فطرت کی آواز پر چلے اور شیطانی وسوسہ کو ماننے سے انکار کر دے۔

سوال

آپ کا مضمون "تصویر کا فتنہ" (الرسالہ جنوری ۱۹۹۹) پڑھا گیا۔ بظاہر یہ مضمون ان باتوں کے پس منظر میں لکھا گیا ہے جو آپ کے خلاف ایک ہندی اخبار میں شائع شدہ رپورٹ کی بنیاد پر کہی جارہی تھیں۔ مگر کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کا یہ مضمون اس معاملہ میں آپ کی صفائی کے لئے کافی نہیں۔ یہ مضمون ایک بالواسطہ تردید ہے۔ جب کہ اتنے سنگین معاملہ میں آپ کو براہ راست تردید کرنا چاہئے۔ یعنی غیر مبہم انداز میں اس طرح کہنا چاہئے کہ میں نے فلاں فعل نہیں کیا۔ (شمس پیرزادہ بمبئی)

جواب

میرا یہ وضاحتی مضمون قرآنی اور اسلامی اصول کے عین مطابق ہے۔ جو لوگ اس معاملہ میں براہ راست تردید کا مطالبہ کریں ان کے متعلق یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ یا تو اسلامی تعلیمات سے بے خبر ہیں یا ان کا مقصد صرف مجھ کو مطعون کرنا ہے نہ کہ حقیقی صورت حال کو جاننا۔

حضرت عائشہؓ کا واقعہ اس معاملہ میں اسلامی اصول کو جاننے کے لئے فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ٦ھ میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ ایک ناخوشگوار معاملہ پیش آیا۔ حضرت عائشہ رسول اللہ کے ساتھ ایک سفر میں تھیں۔ ایک اتفاقی حادثہ کے تحت وہ قافلہ سے بچھڑ گئیں۔ بعد کو وہ ایک مسلم نوجوان صفوان بن معطل کے ساتھ مدینہ پہنچیں۔ جب وہ مدینہ میں داخل ہوئیں تو اس طرح انھیں ایک نوجوان کے ساتھ آتے ہوئے دیکھ کر عبد اللہ بن ابی نے کہا: **واللہ مانجت منه ولا نجا منها (تفسير النسفي الجزء الثالث صفحه ١٣٤)** یعنی نہ وہ اس سے بچی ہیں اور نہ وہ ان سے بچا ہے۔ عبد اللہ بن ابی کی یہ بات تیزی سے سارے مدینہ میں پھیل گئی۔ حضرت عائشہ پر نعوذ باللہ وہ بیہودہ الزام لگایا گیا جس کو اسلام کی تاریخ میں واقعۂ افک کہا جاتا ہے۔ کمزور ایمان والے لوگ اس سے اتنا متاثر ہوئے کہ پورے مدینہ میں اس کا چرچا پھیل گیا۔

مگر حضرت عائشہؓ نے اس معاملہ میں کوئی براہ راست "تردیدی بیان" نہیں دیا۔ بلکہ یہ فرمایا کہ میں پیغمبر یعقوب کی سنت کے مطابق اس معاملہ میں صبر جمیل کا طریقہ اختیار کروں گی (۱۶۲)روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ قصہ بہت بڑھا تو رسول اللہ ﷺ ازراہ شفقت حضرت عائشہ کے پاس آئے اور فرمایا کہ اے عائشہ تم کو وہ بات پہنچ چکی ہے جو کہ لوگ کہہ رہے ہیں پس تم اللہ سے ڈرو۔ اگر تم اس برائی میں پڑی ہو جیسا کہ لوگ کہہ رہے ہیں تو اللہ سے توبہ کر ۔ اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت عائشہ بے اختیار رونے لگیں۔ پھر انھوں نے کہا: والله لااتوب الی الله مماذکرت ابدا والله انی لاعلم لئن اقررت بما یقول الناس والله یعلم انی منه بریئة لاقولن مالم یکن ولئن انا انکرت مایقولون لاتصدقوننی(البدایة والنهایة لابن کثیر ، الجزء الرابع ، صفحه ۱۶۲)خدا کی قسم جس چیز کا آپ نے ذکر کیا ہے اس کے بارے میں تو میں کبھی اللہ سے توبہ نہ کروں گی۔ خدا کی قسم میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اگر میں لوگوں کی کہی ہوئی بات کا اقرار کروں گی، اور اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں، تو میں ایسی بات کہوں گی جو واقع نہیں ہوئی۔ اور اگر میں ان کی بات کا انکار کرتی ہوں تو آپ لوگ اس کی تصدیق نہیں کریں گے (ترجمہ)اس سلسلہ میں دوسری اہم تر بات یہ ہے کہ عائشہ صدیقہ کے خلاف یہ بیہودہ الزام ایک مہینہ سے زیادہ مدت تک مدینہ میں گونجتا رہا۔ لوگ اس انتظار میں تھے کہ خدا کی طرف سے کوئی واضح حکم آئے جو اس معاملہ میں تمام شکوک کو مکمل طور پر ختم کردے۔ لمبے انتظار کے بعد آخر کار سورہ النور اتری مگر قابل لحاظ بات یہ ہے کہ خود سورہ النور میں بھی براہ راست تردید کا وہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جس کا مطالبہ الزام لگانے والوں کی طرف سے کیا جارہا تھا۔ اس کے برعکس قرآن میں بالواسطہ تردید کا انداز اختیار کرتے ہوئے صرف یہ الفاظ نازل ہوئے: ان الذین جاؤ ا بالافك عصبة منكم (النور ۱۱) یعنی جو لوگ یہ افک لائے ہیں وہ تمہارے اندر ہی کا ایک

گروہ ہے۔ قرآن کے اس اسلوب سے ایک اہم شرعی مسئلہ معلوم ہوتا ہے جس کی وضاحت بعض مفسرین نے اپنی کتاب میں کی ہے۔ مثال کے طور پر مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر میں اس معاملہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: افک، جھوٹی، من گھڑت، خود تراشیدہ اور خلاف حقیقت بات کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے اشارہ اس فتنہ کی طرف ہے جو غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر منافقین نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو متہم کرنے کے لئے برپا کیا۔ بعض جھوٹ ایسے ہوتے ہیں جن کا ذکر بھی زبان پر لانا گوارا نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کی طرف لفظ افک سے اشارہ کر کے اس کو نظر انداز کر دیا (تدبر قرآن، جلد چہارم صفحہ ۵۱۴) معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ کے معاملہ میں قرآن میں براہ راست تردید کا انداز اختیار نہیں کیا گیا۔ مثلاً قرآن میں اس سلسلہ میں اس طرح کے صریح الفاظ نہیں آئے کہ: ماقارفت عائشہ بلکہ صرف بالواسطہ انداز میں اس کو افک قرار دے کر نظر انداز کر دیا گیا۔ اسی طرح خود حضرت عائشہؓ کے ذوق ایمانی نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ وہ لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے اپنی زبان سے براہ راست تردید کریں۔ مثلاً وہ اپنی زبان سے اس قسم کے الفاظ بولیں کہ: واللہ ماقارفتُ اس معاملہ میں مومنین و صالحین کا ہمیشہ یہی طریقہ رہا ہے۔ علامہ ابن عبد البر نے اپنی کتاب (جامع بیان العلم وفضلہ، جزء ثانی صفحہ ۹۵) میں لکھا ہے کہ طاؤس اور وہب ابن منبہ تابعی (وفات ۱۱۴ھ) دونوں ملے۔ طاؤس نے وہب سے کہا۔ اے ابو عبد اللہ میں نے آپ کے بارے میں ایک سنگین بات سنی ہے۔ انھوں نے پوچھا کیا بات۔ طاؤس نے کہا۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ اللہ ہی تو تھا جس نے قوم لوط کو ایک دوسرے پر سوار کیا۔ وہب نے یہ سن کر کہا۔ اللہ کی پناہ۔ پھر وہ چپ ہو گئے۔ میں نے پوچھا کیا دونوں میں کوئی بحث ہوئی۔ راوی نے کہا نہیں (روینا ان طاؤسا ووھب ابن منبہ التقیافقال طاؤس لوھب یا ابا عبداللہ بلغنی عنك امر عظیم فقال ماھو. قال تقول ان اللہ حمل قوم لوط بعضھم علی بعض . قال اعوذ باللہ . ثم سکتا . قال فقلت ھل اختصما ، قال لا) اس

واضح اور ثابت شدہ شرعی اصول کے باوجود جو لوگ ایک بیہودہ الزام کے بارے میں براہ راست تردید کا مطالبہ کریں وہ خود اپنے بارے میں اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ وہ اسلام کی تعلیمات سے اور اس کی روح سے بالکل بے خبر ہیں۔ وہ اس معاملہ میں اسلام کے ثابت شدہ اصول کو نہیں جانتے۔ وہ یہ کہ بیہودہ قسم کے الزام کے بارے میں جب زیر الزام شخص یہ کہہ دے کہ استغفر اللہ، یہ ایک لغو اور بے بنیاد بات ہے تو اسی پر معاملہ کو ختم ہو جانا چاہئے۔ زیر الزام شخص کی زبان سے ایسا جملہ سننے کے بعد سائلین یا معترضین پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ چپ ہو جائیں نہ کہ نئے نئے شوشے نکال کر اس کے بعد بھی وہ اپنے الزام کو دہراتے رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ وضاحت کے بعد ان پر لازم ہے کہ وہ اپنی غلطی کا کھلا اعتراف کریں۔ اگر بالفرض اب تک وہ مجرم نہ ہوں تو مذکورہ وضاحت کے باوجود ان کا عدم اعتراف یقینی طور پر انھیں مجرم بنا دے گا۔ اس طرح کے معاملہ میں کھلے اعتراف سے کم کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل قبول نہیں۔ مذکورہ قرآنی اصول کے مطابق، زیر الزام شخص کی طرف سے صرف بالواسطہ تردید ہی کافی ہے۔ اس کے بعد ساری ذمہ داری ان لوگوں کی طرف چلی جاتی ہے جنھوں نے بے بنیاد طور پر کسی شخص کے اوپر بیہودہ الزام لگایا تھا۔ یہ لوگ چونکہ براہ راست زبان میں الزام تراشی کے مجرم بنے تھے اس لئے اس کے بعد انھیں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اب براہ راست زبان میں اپنی مجرمانہ غلطی کا اعتراف کریں۔ اگر وہ اس کے بعد بھی کھلا اعتراف نہ کریں تو وہ دہرا مجرم قرار پائیں گے۔ پہلے اگر انھوں نے سادہ طور پر صرف گناہ کا فعل کیا تھا تو اب وہ بے اعترافی کے نتیجہ میں اپنے گناہ پر سرکشی کا اضافہ کریں گے۔ گناہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل معافی ہو سکتا ہے مگر سرکشی یقینی طور پر قابل معافی نہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, Near DVB Office,
New Delhi-110013
Tel.(4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 9

One year Rs. 100. Two years Rs. 195

Three years Rs. 290. Five years Rs. 480

Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY

AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

اپریل 1999 شمارہ 269

خطرناک کھیل

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **لا یرمی رجل رجلا بالفسق ولا یرمیہ بالکفر الا ارتدت علیہ ان لم یکن صاحبہ کذلک (مسند الامام احمد بن حنبل، الجزء الخامس، صفحہ ۱۸۱)** جب بھی ایک آدمی دوسرے آدمی پر کافر یا فاسق ہونے کا الزام لگاتا ہے تو ضرور یہ الزام خود قائل کی طرف لوٹ آتا ہے اگر دوسرا آدمی ویسا نہ ہو۔

ایک واعظ اگر نام کے تعین کے بغیر نصیحت کرے اور یہ کہے کہ لوگوں کا کیا حال ہو گیا ہے کہ وہ کفر اور فسق جیسے اعمال میں مبتلا ہو رہے ہیں، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اس قسم کی عمومی نصیحت کی مثال خود رسول اللہ ﷺ کے یہاں پائی جاتی ہے۔ لیکن نام کے تعین کے ساتھ اگر کسی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ کافر ہے یا فاسق ہے یا مرتد ہے یا بت پرست ہے، تو یہ ایک بے حد خطرناک کھیل ہوگا۔ ایسا قول اگر اللہ کے علم کے مطابق شخص مذکور کے لئے درست نہ قرار پاتا ہو تو وہ فضا میں تحلیل نہیں ہوگا بلکہ وہ لوٹ کر خود قائل کی طرف آجائے گا۔ یعنی قائل نے دوسرے شخص پر جو الزام لگایا ہے وہی الزام خدا کے رجسٹر میں خود قائل کے خانہ میں لکھ دیا جائے گا۔ اور آخرت میں اس کا انجام برعکس طور پر وہی ہوگا جس کا مستحق اس نے دوسرے کو ٹھہرانے کی کوشش کی تھی۔

یہ بلاشبہ ایک بے حد سنگین بات ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی کسی کے بارے میں اس طرح کے سخت الزامی الفاظ بولنے سے آخری حد تک پرہیز کرے۔ اس طرح کے معاملات میں بولنے سے زیادہ بہتر ہے چپ رہنا اور اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے لئے بولنا ضروری ہو گیا ہے تو اس پر فرض کے درجہ میں لازم ہوگا کہ وہ کسی کے بارے میں ایسا سخت حکم لگانے سے پہلے اس کے بارے میں ہزار بار سوچے۔ وہ آخری ممکن حد تک اس کی تحقیق کرے اسی کے ساتھ وہ اس کے بارے میں اہل علم اور اہل تقویٰ سے مشورہ کرے۔ ان سارے تحقیقی

اور احتیاطی مراحل سے گزرنے کے بعد بھی اگر اس کا ضمیر مطمئن ہو کہ اس معاملہ میں اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بولے اور اپنے اس قول کی بنا پر وہ اللہ کے یہاں پکڑا نہیں جائے گا تو اس کے بعد وہ بول سکتا ہے۔ اگرچہ پھر بھی مذکورہ اندیشہ بدستور باقی رہے گا۔ کیونکہ موجودہ دنیا میں مومن کی ذمہ داری نصیحت اور تبلیغ ہے نہ کہ دوسروں کے بارے میں کافر اور فاسق اور مرتد اور بت پرست ہونے کا اعلان کرنا۔

آسٹریلیا کا ایک قدیم ہتھیار ہے جو بومرینگ (boomerang) کہا جاتا ہے۔ اس کی صفت یہ ہے کہ پھینکنے کے بعد اگر وہ نشانہ پر نہ لگے تو وہ خود پھینکنے والے کی طرف لوٹ آئے گا۔ اسی سے بومرینگ افکٹ کی اصطلاح بنی ہے۔ اس سے مراد ایک ایسا عمل ہے جو خود عامل کے اوپر الٹا پڑے۔

اس اصطلاح کو اگر استعمال کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ کسی شخص کو کافر یا فاسق یا مرتد یا بت پرست کہنا ایک بومرینگ کھیل ہے۔ یہ ایک ایسا خطرناک پتھر ہے جو اگر نشانہ پر نہ لگے تو وہ خود پھینکنے والے پر آکر گرے گا۔

عباسی خلافت کے دور میں عقلی بحثوں کا ہنگامہ شروع ہوا۔ اشاعرہ اور معتزلہ اور متکلمین کے درمیان غلو کی حد تک شدید بحثیں جاری ہو گئیں۔ ہر ایک دوسرے کے خلاف سخت ترین الفاظ بولنے لگا۔ مثلاً اہل نقل نے اہل عقل کے خلاف فتویٰ دیا کہ **من تمنطق فقد تزندق** (جس نے علم منطق سیکھا وہ زندیق ہو گیا) دوسری طرف اہل عقل (معتزلہ) نے یہ کہنا شروع کیا کہ جو شخص قرآن کو قدیم مانے وہ کافر ہے۔

تکفیر و تفسیق کا یہ ہنگامہ کئی سو سال تک جاری رہا یہاں تک کہ علماء کے درمیان عقائد کا یہ مسئلہ مسلّمہ طور پر مان لیا گیا کہ: **لا نکفر احداً من اھل القبلة** (اہل قبلہ میں سے کسی کو ہم کافر نہیں کہتے) یعنی جو شخص قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتا ہو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا

ہے کسی بھی حال میں اس کی تکفیر نہ کرو کیونکہ ایسا کوئی مسلمان نہ کبھی ہوا اور نہ کبھی ہو سکتا جو کعبہ کے بجائے کاشی یا ویٹکن کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی کو کافر یا مرتد یا بت پرست کہنا سرے سے کوئی دینی کام ہی نہیں۔ اسلام میں عمل کی بنیاد نیت پر رکھی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کافر یا مرتد یا بت پرست وہ آدمی ہے جو اپنی نیت کے اعتبار سے اس قسم کا برا فعل کرے، اور نیت کا علم چونکہ صرف خدا کو ہے اس لئے کسی اور کا یہ کام ہی نہیں کہ وہ دوسروں پر اس قسم کا الزامی ٹھپہ لگانا شروع کردے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسا الزامی ٹھپہ لگانا سادہ طور پر صرف ایک گناہ نہیں ہے، بلکہ وہ بدترین قسم کی سرکشی ہے۔ وہ خدا کے قلم کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش ہے۔ جو آدمی ایسی کوشش کرے وہ خدا کے قلم کو حاصل کرنے میں تو کامیاب نہیں ہوگا، البتہ وہ خدا کے یہاں سرکشی کا مجرم قرار پائے گا اور جو سزا وہ دوسرے شخص کو دینا چاہتا تھا، اس کو وہ خود زیادہ بری شکل میں بھگتنے پر مجبور ہو جائے گا۔

مومن کا کام تکفیر نہیں ہے بلکہ تبلیغ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کو نظر آئے کہ فلاں شخص کے اندر ایک برائی پیدا ہو گئی ہے تو آپ اس سے ملیں اور خیر خواہی اور نصیحت کے انداز میں اس کو سمجھائیں۔ اس کی اصلاح کے لئے خدا سے دعا کریں۔ حتی کہ اگر وہ آپ کے کہنے پر اصلاح قبول نہ کرے تب بھی آپ کے لئے جائز نہیں کہ آپ اس کے خلاف تکفیر کا فتویٰ جاری کریں۔ مومن کا کام صرف نصیحت کرنا ہے۔ اس کے بعد بقیہ معاملات کا تعلق خدا سے ہے وہی جس کو چاہے گا سزا دے گا اور جس کو چاہے گا بخشش سے سرفراز کرے گا۔

تکفیر و تفسیق کا ہنگامہ صرف وہی شخص جاری کر سکتا ہے جس کا سینہ خدا کے خوف سے خالی ہو۔ جو آدمی خدا کی پکڑ سے ڈرتا ہو اس کا طریقہ ہمیشہ احتساب خویش کا ہوتا ہے نہ کہ احتساب غیر کا۔

جنتی کون

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ اپنے سچے بندوں کو اس جنت میں داخل کرے گا جس کی پہچان اس نے انھیں کرا دی ہے (**یدخلهم الجنة عرفها لهم**) دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ اہل جنت کو جب جنت کے پھل دئے جائیں گے تو وہ کہیں گے۔ یہ تو وہی پھل ہے جو ہمیں دینا میں دئے گئے تھے۔ (**هذا الذی رزقنا من قبل**)(محمد ٦)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنتی کون ہے۔ جنتی انسان وہ ہے جس نے دنیا ہی میں آخرت کا تجربہ کیا۔ جس نے آخرت میں خدا کو براہ راست دیکھنے سے پہلے اسی دنیا میں اس کو بالواسطہ طور پر دیکھا۔ جس نے اس بے پناہ شکر خداوندی کا دنیا ہی میں تجربہ کیا جو کسی آدمی کو اس وقتِ حاصل ہوگا جب کہ وہ اپنے آپ کو جنت کے لطیف و نفیس دنیا کے اندر پائے گا۔ جس کے لئے خدا کی دنیا میں عاید کی جانے والی خدائی ذمہ داریاں اس طرح پر لذت بن گئیں جس طرح کسی کو آخرت میں ملنے والا انعام پر لذت معلوم ہوگا۔ جس نے دنیا ہی میں ان حقیقتوں کو معرفت کے درجہ میں پالیا جن کو پانے والے آخرت میں واقعہ کے درجہ میں پائیں گے۔

جنتی انسان وہ ہے جس نے کائنات کی وسعتوں میں جنت کی وسعتوں کو دیکھا۔ جس نے چڑیوں کے چہچے میں جنت کی نغموں کو سنا۔ پانی کی ٹھنڈک جس کے لئے خدا کی رحمت بن کر اس کی رگوں میں اتر گئی۔ جس کا سینہ ان جذبات رحمت سے معمور ہو گیا جو جنت کے باشندوں کا خاصہ ہوگا۔

جنتی انسان وہ ہے جو دنیا میں اس مچھلی کی طرح رہا جس کو پانی سے نکال کر باہر ڈال دیا گیا ہو۔ جنتی انسان وہ ہے جو آخرت کی یاد میں اتنا زیادہ محو ہوا کہ دنیا کی لذتیں اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ گئیں۔ جنتی انسان وہ ہے جو اس وقت بھی جنت میں تھا جب کہ ابھی وہ جنت سے باہر تھا، اس فرق کے ساتھ کہ پہلے اس نے اپنے تصورات میں جنت کو پایا تھا اور بعد کو وہ اپنے حقیقی تجربہ میں جنت کا ایک خوش نصیب باشندہ ہوگا۔

اختیارانہ عبادت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ انسان کی صورت میں ایک بااختیار مخلوق پیدا کرے اور اس کو زمین پر بسائے۔ اس نے اپنے اس ارادہ کو فرشتوں کے سامنے ظاہر فرمایا۔ فرشتوں نے یہ سن کر کہا کہ ۔۔۔ کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اس میں فساد کریں اور خون بہائیں۔ حالانکہ ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری تقدیس بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے (البقرہ ۳۰)

خدا کو اپنی مخلوقات سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہی حمد و تقدیس ہے۔ یعنی خدا کی خدائی کا کامل اعتراف اور اس کی صفات کمال کا اعلیٰ اظہار۔ فرشتوں کو یہ اشکال ہوا کہ یہ مطلوب حمد و تقدیس تو ہم ہر لمحہ بیان کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں کسی اور مخلوق کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت۔ مزید یہ کہ یہ نئی مخلوق کامل اختیار کی مالک ہوگی' ایسی حالت میں تقریباً یقینی ہے کہ وہ اپنے اختیار کا غلط استعمال کرے اور زمین کو خون اور فساد سے بھر دے۔

اللہ تعالیٰ نے اس اشکال کی کھلی تردید نہیں کی۔ البتہ ذریت آدم کا از اول تا آخر تعارف کرکے بتایا کہ اس میں اگر فساد کرنے والے اور خون بہانے والے لوگ ہوں گے تو اس میں ابو بکر و عمر جیسے صالحین بھی ہوں گے۔ ایسے افراد اگر تھوڑے بھی نکلیں تب بھی وہ اس تخلیقی منصوبہ کی کامیابی کے لیے کافی ہیں۔ حمد و تقدیس فرشتوں سے بھی مطلوب ہے اور انسانوں سے بھی۔ مگر دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ فرشتوں کی حمد و تقدیس اگر مجبورانہ ہے تو انسان کی حمد و تقدیس اختیارانہ۔ اور دونوں میں ویسا ہی فرق ہے جیسا ریکارڈ کی ہوئی تقریر کو ٹیپ ریکارڈ پر بجانا اور ایک زندہ اور باشعور انسان کا اسٹیج پر بولنا۔

حمد و تقدیس کے جذبات سے سرشار ہونا' یہی اصل مطلوب ہے' فرشتوں سے مجبورانہ طور پر اور انسان سے اختیارانہ طور پر۔

نقصان نہیں

اسلام کا ایک مستقل اصول یہ ہے کہ ۔۔۔لاضرر ولا ضرار فی الاسلام (ابن ماجہ، کتاب الاحکام) یعنی اسلام میں نہ نقصان اٹھانا ہے اور نہ نقصان پہنچانا ہے۔اس اصول کا تعلق انفرادی زندگی سے بھی ہے اور اجتماعی زندگی سے بھی۔

مومن اللہ سے ڈرنے والا انسان ہوتا ہے۔وہ کسی حال میں اس کو گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی ذات سے کسی کو تکلیف پہنچے۔مومن وہ ہے جو دوسرے کے درد کی چوٹ اپنے سینہ میں محسوس کرے۔ پھر ایسا انسان کیسے اس کا تحمل کر سکتا ہے کہ وہ کسی کو تکلیف پہنچائے۔یا کسی کو اپنی طاقت کا نشانہ بنائے۔ مومن کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر اس کو کسی کے اوپر قدرت حاصل ہو جائے تب بھی وہ اس کو تکلیف پہنچا کر اپنی انانیت کی تسکین حاصل نہ کرے۔

مگر اسی کے ساتھ مومن اس کو بھی جانتا ہے کہ موجودہ دنیا آزمائش کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو خدا کی طرف سے پوری آزادی ملی ہوئی ہے۔اسی آزادی کے غلط استعمال کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ سرکش بن جاتے ہیں بہت سے لوگ دوسروں کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتے ہیں۔

ایسی حالت میں اس دنیا میں جائز زندگی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی ایسے انسانوں کی طرف سے ہوشیار رہے جو اپنی آزادی کا غلط استعمال کر کے دوسروں کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔وہ دوسروں کو سینگ مار کر اپنی انا کے لئے تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

اس قسم کے نقصان سے بچنے کے لئے مومن کو ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ لوگوں سے معاملہ کرنے میں، لوگوں سے لین دین کرنے میں، لوگوں کے درمیان رہنے میں وہ ہمیشہ چوکنا رہتا ہے تاکہ وہ دوسروں کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے۔

اس مقصد کیلئے مومن کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے گرد قوت کا محسوس ہالہ بنائے رہے۔ تاکہ لوگ اس کی طرف سے ہیبت زدہ رہیں اور اس کے خلاف انھیں کسی شرارت کی ہمت نہ پڑے۔

ترکی کا سبق

بیسویں صدی کے آخر میں یورپ ایک نئی طاقت بن کر ابھرا ہے۔ یوروپین یونین کی صورت میں یہ بر اعظم از سر نو متحد ہو گیا ہے۔ یورو کے نام سے یورپ کی ایک مشترک کرنسی وجود میں آئی ہے جو امریکی ڈالر کے اقتصادی غلبہ کو چیلنج کر رہی ہے وغیرہ۔ مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ترکی یورپ ہی کا ایک جغرافی جزء ہے۔ اس کے باوجود وہ اس یورپی ترقی میں حصہ دار نہ بن سکا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ترقی کے اس معیار پر پورا نہیں اتر تا تھا جو یوروپین یونین کا ممبر بننے کے لئے ضروری ہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں ترکی میں اصلاحی تحریکوں کا زبردست ہنگامہ جاری رہا ہے۔ پھر نصف صدی کی ہنگامہ خیز کوششوں کے باوجود یہ ناکامی کیوں۔ اس کا سبب صرف ایک ہے اور وہ ہے۔ صحیح نقطۂ آغاز سے اپنا سفر شروع نہ کرنا۔

ترکی میں کئی سو سال سے طاقتور مسلم خلافت قائم تھی۔ مگر ہر کمالے را زوال کے اصول پر اس کو تنزل ہوا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر میں پہنچ کر ترکی کی عثمانی خلافت اپنے آخری دور زوال میں پہنچ گئی۔ اس زوال کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ ان مسلمانوں کا دینی طبقہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ جدید دور کی ایک ریاست کی رہنمائی کر سکے۔ یورپ کے سائنسی اور فکری انقلاب نے زندگی کے تمام نقشوں کو بدل دیا تھا جب کہ ترکی کے علماء ابھی تک قدیم روایتی اور تقلیدی ڈھانچہ میں بند پڑے ہوئے تھے۔

اب ایک نیا طریقہ کار دریافت کرنے کی ضرورت تھی۔ وہ طریقہ کار یہ تھا کہ علماء نئے حالات کی نسبت سے اپنی ناکافی استعداد کا اعتراف کرتے ہوئے پیچھے ہٹ جائیں۔ یعنی اقدام کے میدان سے ہٹ کر تیاری کے میدان میں آجائیں۔ وہ قوم کی تعلیم و تربیت کو اپنے ذمہ لے کر بقیہ میدان کو جمہوری عمل (democratic process) کے حوالہ کر دیں۔ جہاں تک مسجد اور

مدرسہ اور اس طرح کے دوسرے تعمیری اداروں کا معاملہ ہے وہ بھرپور طور پر اس کا انتظام سنبھال لیں۔ وہ اپنی ساری کوششوں کو اس ایک کام پر مرتکز کردیں کہ انھیں ترکی کی مسلم قوم کو ازسرنو بیدار کرنا ہے۔ اس کے اندر پھر سے اسلامی اسپرٹ جگانا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں اس مردہ زمین کو پھر سے زندہ کرنا ہے (الحدید ۱۷) تاکہ وہ دوبارہ اسلامی فصل اگانے کے قابل ہو جائے۔ اس کے بعد جہاں تک سیاسی اور حکومتی دائرہ کا تعلق ہے وہ اس کو جمہوری عمل پر چھوڑ دیں یعنی مقررہ مدت پر آزاد اور منصفانہ انتخاب ہو اور پھر اس انتخاب میں جو گروہ جیتے وہ دستور کے تحت مقرر مدت تک حکومت کا نظام چلائے۔

ترکی کے علماء اور رہنما اس عملی تقسیم پر اگر راضی ہو جاتے تو پچاس سال بعد آج ترکی دوبارہ ایک عظیم طاقت بن چکا ہوتا۔

مذکورہ معاملہ ان کے لئے پسپائی کا معاملہ نہ تھا بلکہ صرف وقتی قسم کی ایک عملی تدبیر کا معاملہ تھا۔ یہ گویا تیاری کا ایک وقفہ تھا جو انھیں اس قابل بنا دیتا کہ وہ آئندہ زیادہ موثر اقدام کر کے زندگی کے جدید نقشہ پر ازسرنو اسلام کی برتری قائم کردیں۔ مگر ترکی کے دینی رہنما اس راز کو سمجھ نہ سکے اور ترکی غیر ضروری طور پر ایک تباہ کن داخلی ٹکراؤ کا شکار ہو کر رہ گیا جس کو عام طور پر اسلام ازم اور کمال ازم کا ٹکراؤ کہا جاتا ہے۔

بدقسمتی سے یہی واقعہ دوسرے اکثر مسلم ملکوں میں بھی پیش آیا۔ مثلاً مصر، شام، پاکستان، ایران، افغانستان وغیرہ۔ ان تمام مسلم ملکوں میں اسلامی انقلاب کے نام پر پرشور تحریکیں چلائی گئیں مگر نصف صدی کی خونی کوششوں کے باوجود کہیں بھی کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوسکا۔ قطب ازم، خمینی ازم اور مودودی ازم بھی اپنے نتیجہ کے اعتبار سے اسی طرح تباہ کن ثابت ہوا جس طرح کمال ازم۔ ان تباہیوں کا مشترک سبب صرف ایک ہے اور وہ ہے حقائق پر مبنی طریق کار اختیار کرنے کے بجائے صرف جذبات کے زیر اثر اپنے کام کا نقشہ بنانا۔ نام نہاد اسلامسٹ گروہ نے جو نقصان پہنچایا وہ کمالسٹ گروہ سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ کمالسٹ گروہ نے جو

کچھ کیا وہ سیکولرزم کے نام پر کیا، اس لئے ان کے احمقانہ عمل سے جو بدنامی ہوئی وہ بھی سیکولرازم کے حصہ میں آئی۔ اس کے برعکس اسلامسٹ گروہ نے اپنی ساری تحریک اسلام کے نام پر چلائی اس لئے ان کی تحریک جب نقصان اور تباہی پر منتج ہوئی تو اس کی ساری ذمہ داری اسلام کے اوپر چلی گئی۔ کمالسٹ گروہ نے اگر غیر اسلام کو بدنام کیا تھا تو اسلامسٹ گروہ نے خود اسلام ہی کو سنگین طور پر بدنام کر ڈالا۔

اسلام کے نام پر کوئی تحریک چلانا انتہائی سنگین قسم کی ذمہ داری ہے اس لئے کہ اگر وہ تحریک درست نہ ہو یا وہ مہلک نتائج پیدا کرے تو اس کی ساری ذمہ داری اسلام کے سر پر چلی جائے گی۔ ایسے لوگ اپنے دعویٰ کے مطابق تو اسلام کے لئے اٹھیں گے مگر عملی نتیجہ کے اعتبار سے وہ صرف اسلام کو نقصان پہنچانے کا سبب بنیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ پچھلے زمانہ میں علماء اور صلحاء جو تحریکیں چلاتے تھے وہ اس معاملہ میں سخت احتیاط کرتے تھے۔ یہ صرف موجودہ زمانہ کا ایک مظہر ہے کہ لوگ آئے دن ایک ہنگامہ کھڑا کرتے ہیں اور اس کا نام اسلام رکھ دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج لوگوں کے دل خدا کے خوف سے خالی ہو گئے ہیں۔ خدا سے ڈرنے والے لوگ کبھی اس قسم کے ہنگامے کھڑا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ یہ سب بے خوفی کی مثالیں ہیں نہ کہ خوف خدا کی مثالیں۔

ایک شخص وضو اور طہارت کی شرطوں کو پورا نہ کرے اور کھڑے ہو کر نماز کی ظاہری صورت کو دہرانے لگے تو اس کی نماز نماز نہ ہو گی، ایسی نماز پر کسی کو کوئی ثواب ملنے والا نہیں۔

یہی معاملہ اسلامی تحریک یا اسلامی جہاد کا بھی ہے۔ اس کی بھی کچھ لازمی شرطیں ہیں۔ ان شرطوں کو پورا کئے بغیر اگر کوئی شخص اسلامی تحریک کے نام پر ایک ہنگامہ کھڑا کرے یا اسلامی جہاد کے نام پر توڑ پھوڑ شروع کر دے تو اس کا یہ عمل نہ اسلامی تحریک ہو گا اور نہ اسلامی جہاد۔

اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ ایسے کسی عمل کا وہ مطلوب نتیجہ بر آمد ہو جو اسلامی تحریک یا اسلامی جہاد کے لئے مقدر کیا گیا ہے۔

مثبت فکر

دور اول کے مسلمانوں نے جو بے نظیر کامیابی حاصل کی اس کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ ان میں کا ہر فرد مکمل معنوں میں مثبت سوچ (positive thinking) کا مالک تھا۔ وہ، قرآن کے مطابق عسر میں یسر کا پہلو تلاش کرلیتا تھا۔ وہ بظاہر شکست کے واقعہ میں فتح کا راز دریافت کر لیتا تھا۔ اس کے لئے پوری دنیا اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ مثبت خوراک کا دستر خوان بن گئی تھی۔ مسلمانوں کا یہی مزاج تقریباً ہزار سال تک جاری رہا۔ انیسویں صدی میں جب مسلم سلطنتیں اہل مغرب کے ہاتھوں ٹوٹ گئیں تو اس کے بعد جو مسلم رہنما اٹھے وہ رد عمل کی نفسیات میں مبتلا ہو چکے تھے۔ انہوں نے دور جدید کی مسلم نسلوں کو احتجاجی ذہن میں مبتلا کر دیا۔ ساری دنیا کے مسلمان، خواص اور عوام دونوں احساس محرومی (persecution comp!ex) میں مبتلا ہو گئے۔ اس نازک تاریخی موقع پر مسلم رہنماؤں کی اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا گئے جس کو انگریزی میں پیرانوئیا (paranoia) کہا جاتا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ گمراہی کا راستہ دیکھیں تو وہ اس کو اختیار کرلیں گے اور اگر وہ فلاح کا راستہ دیکھیں تو وہ اس کو اختیار نہ کریں گے (الاعراف. ١٤٦)

اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ لوگ منفی پکار کی طرف تیزی سے دوڑتے ہیں، مگر مثبت پکار کی طرف وہ اس طرح نہیں دوڑتے اس کا سبب یہ ہے کہ منفی کلام حال کی زبان میں ہوتا ہے اور مثبت کلام ہمیشہ مستقبل کی زبان میں، اور تاریخ کا تجربہ یہ ہے کہ مستقبل کی زبان سمجھنے والے ہمیشہ بہت تھوڑے ہوتے ہیں اور حال کی زبان سمجھنے والے ہمیشہ بہت زیادہ۔

اس دنیا میں ہر قسم کی ناکامیوں کا راز منفی طرز فکر ہے اور ہر قسم کی کامیابی کا راز مثبت طرز فکر۔ منفی طرز فکر ہر قسم کی دینی اور اخلاقی برائیوں کا سرچشمہ ہے اور مثبت طرز فکر اس کے مقابلے میں ہر قسم کے دینی اور دنیوی خیر کا سرچشمہ۔

ترقی کاراز

مسٹر محمد حنیف (پیدائش ۱۹۵۱) دہلی میں رہتے ہیں۔ (Tel. 4690593) وہ کسٹم اینڈ
ٹرل اکسائز ڈپارٹمنٹ میں سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ وہ اپنے آفس میں اپنی اسلامی پہچان کو چھپاتے نہیں
ں بلکہ ہر موقع پر قرآن اور اسلام کا تعارف بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کو ۱۹۹۹ کا
مارتی ایوارڈ (Presidential Award) دیا گیا جو ایک اعلی سرکاری اعزاز سمجھا جاتا ہے۔

یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ۱۵ سالہ ریکارڈ کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا
اتا ہے کہ یہ امتیازی ایوارڈ کس کو دیا جائے۔ ہر سال محکمہ کے تین سینئر افسر متعلق شخص کی
رکردگی کا جائزہ لے کر اس کی رپورٹ لکھتے ہیں۔ اس طرح ۱۵ سال کے اندر ۴۵ افسران
پورٹنگ کے اس کام میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک افسر کی رپورٹ بھی اگر غیر
وافق ہو تو وہ شخص اس قومی ایوارڈ کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔ کمیٹی کی طرف سے نامزدگی کے
ند یہ فائل مزید تقریباً نصف درجن سرکاری دفاتر میں کلیرینس کے لئے بھیجی جاتی ہے اور آخر
روہ صدر جمہوریہ ہند کے پاس پہونچتی ہے۔

ہندستان کے ایک مسلمان کو اس غیر معمولی ایوارڈ کا استحقاق کیسے ملا۔ اس کا جواب صرف
یک ہے۔ اور وہ ہے امتیازی کارکردگی اور خوش اخلاقی۔ اس معاملہ میں محمد حنیف صاحب کا ریکارڈ
بر معمولی طور پر ممتاز ہے۔ جہاں تک ان کے حسن اخلاق کا تعلق ہے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے
وتا ہے۔

۱۹۹۶ میں سوپرس کی بھرتی کے دوران ان کے آفس میں ایک اونچی ذات کا ہندو لڑکا
نٹرویو کے لئے آیا۔ حنیف صاحب نے اس سے کہا کہ سوپرس کو نالی کی صفائی اور جھاڑو لگانے
بیسا کام کرنا پڑتا ہے اور آپ کا تعلق ایک اونچی ذات سے ہے تو آپ یہ سارے کام کیسے کریں
گے۔ اس نے جواب دیا کہ پیٹ کی خاطر میں سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ محمد حنیف

صاحب نے اس لڑکے کو وہ سروس دلادی۔ لیکن محمد حنیف صاحب کو اس بات کا کافی احساس تھا لہذا انہوں نے اس کو نالی صاف کرنے اور جھاڑو لگانے کے بجائے دفتر میں ڈسٹنگ کے کام پر لگا دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد محمد حنیف صاحب کا اس دفتر سے تبادلہ ہو گیا اور ان کی جگہ ایک ہندو افسر آگیا۔ اس کے بعد ایک دن اچانک وہ لڑکا محمد حنیف صاحب کے گھر آیا، اس نے بتایا کہ ہم کو دوبارہ نالی کی صفائی اور جھاڑو لگانے کا کام آپ کے جانے کے بعد دے دیا گیا ہے، جس سے آپ نے مجھے مستثنیٰ کر دیا تھا۔ محمد حنیف صاحب کو اس کا ملال ہوا اور انہوں نے مذکورہ ہندو افسر سے ٹیلیفون پر اس لڑکے کے بارے میں بات کی اور کہا کہ میری خواہش ہے کہ آپ اس لڑکے کو نالی کی صفائی اور جھاڑو کے بجائے ڈسٹنگ کے کام پر ہی لگا رہنے دیں۔ محمد حنیف صاحب کے کہنے پر نئے افسر نے اس کو ڈسٹنگ کے کام پر بحال کر دیا۔

محمد حنیف صاحب اپنے دفتر میں ہر ایک کے ساتھ اسی طرح حسن سلوک کا معاملہ کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چھوٹے ملازمین سے لے کر بڑے افسروں تک ہر آدمی ان کی عزت کرتا ہے۔

اسی طرح محمد حنیف صاحب اپنی سرکاری خدمات کو پوری دیانت داری کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ سروس کے تحت ان کو بار بار مزید مالی فائدے حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مگر محمد حنیف صاحب اس قسم کی آمدنی سے مکمل طور پر دور رہتے ہیں۔ وہ اپنی جائز تنخواہ کے دائرہ میں زندگی گزارتے ہیں اور ناجائز آمدنی کو کبھی ہاتھ نہیں لگاتے۔

محمد حنیف صاحب کی اس قسم کی صفات ہی ان کا اصل سرمایہ ہیں۔ یہی وہ صفات ہیں جس نے ان کو مذکورہ قومی امتیاز کا مستحق بنایا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں ایک مسلمان کے لئے ہر قسم کے اعلیٰ مواقع پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ کارکردگی کا طریقہ اپنا لے۔ اس کے بعد اس کو اپنے ماحول سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہ ہوگی۔

مسئلہ یا چیلنج

مسائل زندگی کالازمی حصہ ہیں۔بے مسئلہ زندگی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ایسی حالت میں اصل سوال خود مسئلہ کا نہیں ہے۔بلکہ یہ ہے کہ جب کوئی مسئلہ پیش آیا تو آپ نے اس کا مقابلہ کس طرح کیا۔

ایک مفکر نے کہاہے کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ایک انسان وہ ہے جو راستہ چل رہا ہے پھر اس کے راستہ میں چٹان آگئی۔اب وہ اس کوشش میں لگ گیا کہ وہ اس چٹان کو اپنے راستہ سے ہٹادے تاکہ اس کا سفر آگے کی طرف جاری ہو سکے۔دوسرا آدمی وہ ہے جس کے راستہ میں چٹان آئی تو اس نے یہ کیا کہ وہ چٹان سے ہٹ کر دیکھنے لگا کہ کیا اس کے دائیں یا بائیں کوئی راستہ ہے جس پر چل کر وہ آگے بڑھ جائے اور اس طرح اپنا سفر جاری رکھے۔ان میں سے پہلا شخص ہمیشہ ناکام ہوتا ہے اور دوسرا شخص ہمیشہ کامیاب۔

مسئلہ کو صرف مسئلہ کے طور پر لینا گویا اپنے عمل کو اس میدان میں محدود رکھنا ہے جہاں مسئلہ پیدا ہوا ہے۔دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی مسئلہ کو چیلنج کے روپ میں لے۔ایسا آدمی مسئلہ کو نظر انداز کر کے اپنے عمل کے میدان کو بدل دیتا ہے۔مسئلہ خواہ کتنا ہی سنگین ہو وہ آدمی کے لیے صرف ایک راستہ کو بند کرتا ہے جب کہ عین اسی وقت دوسرے بہت سے راستے اس کے لیے کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔

مسئلہ کو مسئلہ کے طور پر لینا گویا بند راستہ میں بے فائدہ طور پر اپنی کوشش کو ضائع کرنا ہے۔اس کے برعکس مسئلہ کو چیلنج کے طور پر لینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے ایک مقام پر راستہ کو بند دیکھ کر اپنا راستہ نہیں روکا بلکہ اس نے دوسرے کھلے ہوئے راستہ سے اپنی زندگی کا سفر شروع کر دیا۔

آپ طوفان کو روک نہیں سکتے' البتہ اپنا گھر اس طرح بنا سکتے ہیں کہ جب طوفان آئے تو آپ اس کی زد سے محفوظ رہیں۔یہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔آپ مسائل کو دنیا سے ختم نہیں کر سکتے۔آپ کے کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ مسائل کے باوجود زندہ رہنا سیکھیں' آپ مسائل سے بھری ہوئی دنیا میں اپنے لیے کامیابی کا راستہ نکال لیں۔

حسد کا نقصان

ابو الحسن علی سیف الدین آمدی ۵۵۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۳۱ھ میں وفات پائی۔ فقہ و اصول وغیرہ بغداد میں پڑھا۔ معقولات کی تحصیل شام میں کی اور اس میں کمال پیدا کیا۔ شام سے مصر گئے اور یہاں مدرسہ قرافہ میں نائب مدرس مقرر ہوئے۔ ان کے فضل و کمال کی شہرت روز بروز بڑھتی گئی لیکن یہی شہرت ان کے لئے مسئلہ بن گئی۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ ان کی بڑھی ہوئی مقبولیت نے فقہاء وقت کو ان کا دشمن بنادیا یہاں تک کہ فقہاء نے ایک محضر تیار کیا جس میں ان پر بے دینی، الحاد، زندقہ، فلسفہ پرستی کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس محضر پر تمام فقہاء نے دستخط کئے۔ اور پھر اس کو خود علامہ آمدی کے پاس بھیجا کہ آپ بھی اس پر صاد کیجئے۔ علامہ موصوف نے اس پر یہ شعر لکھ دیا:

حسدوا الفتیٰ اذ لم ینالوا اسعیہ   فالقوم اعداءٌ لہ و خصوم

انھوں نے جوان پر حسد کی جب کہ وہ اس کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکے۔ چنانچہ لوگ اس کے دشمن اور مخالف ہو گئے ہیں۔ (علم الکلام از علامہ شبلی نعمانی مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۹۳، صفحہ ۸۰)

اس قسم کی عداوت اور مخالفت ہر بڑے شخص کو اپنے ہم زمانہ لوگوں کی طرف سے پیش آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے شخص کا اعتراف کرنا انھیں اپنے قد کو چھوٹا کرنے کے ہم معنی دکھائی دیتا ہے۔ لوگ اس کی مخالفت کرکے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اس قابل ہی نہیں کہ اس کا اعتراف کیا جائے۔ یہ نفسیات اتنی زیادہ بڑھتی ہے کہ لوگوں کو معاصر شخص میں کوئی خوبی دکھائی نہیں دیتی۔ البتہ جب وہ شخص اس دنیا میں نہیں رہتا تو معاصرت اور رقابت کی نفسیات بھی ختم ہو جاتی ہے پھر دھیرے دھیرے لوگ اس کا اعتراف کر لیتے ہیں۔

اعلیٰ انسان وہ ہے جو ہر قسم کی نفسیاتی پیچیدگی سے پاک ہو۔ ایسا انسان اس قابل ہوتا ہے کہ وہ مجرد سطح پر حقیقت کو دریافت کر سکے۔ جب کہ دوسری قسم کے انسان کسی حقیقت کو صرف

اس وقت دیکھ پاتے ہیں جب کہ وہ اس قدر واضح ہو چکی ہو کہ کسی شخص کے لئے اس کا انکار ممکن ہی نہ رہے۔

اس دنیا کا نظام امتحان کے اصول پر بنایا گیا ہے یہاں کی ہر چیز اسی امتحانی مصلحت کے تابع ہے۔ اس دنیا میں کوئی آدمی آپ سے چھوٹا ہوتا ہے اور کوئی آدمی آپ سے بڑا۔ یہ دونوں قسم کے آدمی آپ کے لئے یکساں طور پر امتحان کا پرچہ ہیں۔ وہ اس لئے ہیں تاکہ وہ آپ کی آزمائش بنیں۔ اگر آپ ان کے مقابلہ میں صحیح رویہ اختیار کریں تو آپ کو انعام دیا جائے اور اگر آپ غلط رویہ اختیار کریں تو آپ سزا کے مستحق قرار پائیں۔

آپ کا امتحان یہ ہے کہ جب آپ کا سابقہ ایسے آدمی سے پڑے جو آپ سے چھوٹا اور کم ہو تو آپ اس کی عزت کریں۔ آپ اس کو وہی انسانی مرتبہ دیں جو آپ اپنے لئے چاہتے ہیں چھوٹے آدمی کو عزت دینا اپنے آپ کو خدا کی نظر میں بڑا بنانا ہے۔

اسی طرح جو آدمی آپ سے بڑا یا زیادہ ہو اس کے مقابلہ میں آپ کا امتحان یہ ہے کہ آپ اس سے حسد نہ کریں آپ اس کے فضل و کمال پر جلن میں مبتلا نہ ہوں۔ بلکہ اس کو جو کچھ ملا ہے اسے خدا کا عطیہ سمجھیں۔ اس کی حیثیت کا دل سے اعتراف کریں اور اگر ضرورت ہو تو اس کا ساتھ دے کر خود بھی نیکی میں شریک ہو جائیں۔

کمتر آدمی کو بے عزت کرنا اور برتر آدمی سے حسد کرنا بظاہر دوسرے کے خلاف ہوتا ہے۔ مگر اس کا نقصان خود اپنے آپ کو پہنچتا ہے۔ ایسا ہر رویہ خود اپنے خلاف ہے نہ کہ کسی دوسرے آدمی کے خلاف۔

مادی پہلو سے کسی کو اپنے سے چھوٹا پا کر اس کو حقیر سمجھنا کوئی سادہ بات نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے پرچہ امتحان میں ناکام ہو گیا۔ اسی طرح جب کوئی شخص کسی کو اپنے سے بڑا پا کر اس سے حسد کرے تو یہ بھی کوئی سادہ بات نہیں۔ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ اس آدمی کو خدا نے جو امتحانی پرچہ دے کر آزمایا تھا اس میں وہ بری طرح ناکام ہو گیا۔

پیغمبر کی شخصیت

ہر انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک نفسیاتی وجود رکھتا ہے، اسی طرح پیغمبر اسلام بھی اپنی ابتدائی حیثیت کے اعتبار سے ایک نفسیاتی وجود تھے۔ آپ انھیں جذبات اور احساسات کے ساتھ پیدا ہوئے جس طرح کوئی انسان پیدا ہوتا ہے۔ پھر آپ نے اپنے اس پیدائشی وجود کو ایک ربانی وجود میں تبدیل کیا۔ اس لحاظ سے پیغمبر اسلام کا نفسیاتی مطالعہ بے حد اہم ہے۔ اس طرح ایک عملی مثال کی صورت میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پیدا ہونے والا انسان اپنی شخصیت کی تعمیر کس طرح اور کس رخ پر کرے، کس طرح وہ عام انسان سے بلند ہو کر اپنے آپ کو ایک ربانی انسان بنائے۔

ہمارا یہ مطالعہ ۶۱۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ مکہ میں آپ پر پہلی بار خدا کی وحی اتری۔ یہ آپ کے لئے ایک انوکھا روحانی تجربہ تھا۔ روایات میں آیا ہے کہ جب آپ کو فرشتہ کے ذریعہ خدا کا کلام ملا تو آپ پر دہشت طاری ہو گئی۔ آپ غار حرا سے نکل کر اپنے گھر واپس آئے۔ اور اپنی اہلیہ خدیجہ سے فرمایا کہ مجھ کو اڑھاؤ، مجھ کو اڑھاؤ۔ اس کے بعد آپ بستر پر لیٹ گئے۔ اور حضرت خدیجہ نے آپ کے اوپر چادر اڑھادی (فتح الباری ۱/۳۰)

پہلی وحی کے بعد پیغمبر اسلام پر یہ کیفیت کیوں طاری ہوئی، اس کے بارے میں ابن حجر العسقلانی نے علماء کے بارہ اقوال نقل کئے ہیں (صفحہ ۳۳) مگر صحیح بات یہ ہے کہ یہ معاملہ احساس ذمہ داری کی بنا پر پیش آیا۔ نبوت کا مطلب یہ تھا کہ آپ اس زمانہ کے مشرک انسانوں کو توحید کا پیغام دیں۔ یہ ایک بے حد مشکل کام تھا۔ اس کی مشکلات کے احساس نے آپ پر دہشت کی کیفیت طاری کر دی۔ آپ اس کام کی عظیم ذمہ داریوں کو سوچتے ہوئے چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔

اس کے بعد قرآن کی سورہ نمبر ۷۳ (المزمل) اتری۔ اس سورہ میں آپ کو بتایا گیا کہ جو قول ثقیل (بھاری ذمہ داری) آپ پر نبوت کے ذریعہ ڈالی جارہی ہے اس سے عہدہ برآں ہونے

کے لئے آپ کو نماز سے مدد لینا چاہئے، نہ صرف عام نماز بلکہ تہجد کی نماز بھی جس کو قرآن میں نافلہ یعنی صلاۃ مزید کہا گیا ہے (الاسرا ۷۹)

یہ روداد اس معاملہ میں آپ کی نفسیاتی حالت کو بتاتی ہے۔ خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے آپ کا نامزد کیا جانا بلاشبہ ایک عظیم ترین عہدہ پر آپ کو فائز کرنا تھا۔ عام انسان اس کو فضیلت کے روپ میں دیکھتے تھے۔ (المومنون ۲۴) لیکن پیغمبر اسلام نے اس نامزدگی کو فضیلت یا فخر کے طور پر نہیں لیا، بلکہ آپ نے اس کو تمام تر ذمہ داری کے معنی میں لیا۔ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں ذمہ داری کا پہلو آپ پر اتنا غالب آیا کہ آپ کو ادنیٰ درجہ میں بھی اس کا احساس نہیں ہوا کہ یہ فضیلت یا اعزاز کا معاملہ ہے۔

پیغمبر اسلام کی نسبت قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آپ ایک بشر تھے۔ آپ کا بشر ہونا آپ کی عظمت کو گھٹاتا نہیں بلکہ اس کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ آپ کی حقیقی عظمت کا راز یہ ہے کہ آپ پیدائش کے اعتبار سے ایک بشر تھے۔ مگر آپ نے اپنے غیر معمولی عمل سے فوق البشر جیسا کارنامہ انجام دیا۔

آپ پر محتاجی اور فراوانی دونوں قسم کے احوال گذرے مگر آپ ہر حال میں اعتدال پر قائم رہے۔ آپ کے خلاف لوگوں نے فوج کشی کی مگر جب وہ شکست کھا کر گرفتار ہوئے تو آپ نے انھیں یک طرفہ طور پر معاف کر دیا۔ آپ کو ایک پورے ملک میں حکمراں کا درجہ ملا۔ مگر آپ نے ایک عام انسان جیسی زندگی گذاری۔ وغیرہ۔

کمال یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص پیدائشی طور پر عظیم پیدا ہو۔ کمال یہ ہے کہ وہ پیدائشی طور پر ایک عام انسانی حیثیت سے پیدا ہو۔ مگر اپنے عمل سے وہ اپنے آپ کو عظمت کے اعلیٰ مقام پر پہنچا دے۔

حیوانی زندگی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ۔۔۔۔بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیا ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔اور جن لوگوں نے انکار کیا وہ برت رہے ہیں اور کھا رہے ہیں جیسے کہ چوپائے کھائیں، اور آگ ان لوگوں کا ٹھکانا ہے۔(محمد ۱۲)

انسان اور جانور حیاتیات کے اعتبار سے بالکل یکساں ہے۔دونوں کے درمیان حیاتیاتی پہلو سے کوئی حقیقی فرق نہیں۔پھر وہ کیا چیز ہے جو حیوان کو حیوان بناتی ہے اور انسان کو انسان کا درجہ عطا کرتی ہے۔یہ صرف ایک فرق ہے، اور وہ یہ کہ انسان کو جو اعلیٰ ذہنی صلاحیت ملی ہوئی ہے وہ حیوان کو حاصل نہیں۔

حیوان صرف اپنی مادی ضروریات کے دائرے میں سوچتا ہے۔کھانا،پانی، تحفظ اور بقائے نسل جیسی سادہ ضرورتیں ہی اس کی توجہ کا مرکز بنی ہوتی ہیں۔اس قسم کی ضرورتوں سے اوپر اٹھ کر سوچنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔

مگر انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔وہ اعلیٰ ذہنی صلاحیت رکھتا ہے۔وہ جبلت (انسٹنکٹ) سے اوپر اٹھ کر سوچتا ہے،وہ مادیات سے اوپر اٹھ کر جینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔جو آدمی اپنی ذہنی صلاحیتوں کو صحیح رخ پر استعمال کرے اور اپنے آپ کو ایک بلند تر مقصد حیات میں لگائے،وہی حقیقی معنوں میں انسان ہے۔اس کے برعکس جو آدمی مادی ضرورتوں کے دائرے میں محدود ہو کر رہ جائے، وہ صرف ایک حیوان کی مانند ہے۔اس میں اور حیوان میں کوئی حقیقی فرق نہیں۔

وہی انسان حقیقی انسان ہے جو اپنی سوچ اور اپنے کردار کے اعتبار سے اعلیٰ انسانی سطح پر زندگی گذارے۔یہی وہ انسان ہے جس نے اپنے بارے میں خالق کے منصوبہ کو پورا کیا۔

کنورزن کا مسئلہ

اسلام اور کنورزن

اسلام کنورزن کی حمایت کرتا ہے۔ مگر اسلام کے نزدیک کنورزن رسمی مفہوم میں محض تبدیلی مذہب (proselytism) کے ہم معنی نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ایسا واقعہ ہے جو ذہنی انقلاب (intellectual revolution) یا روحانی تغیر (spiritual transformation) کے نتیجہ میں ایک شخص کی زندگی میں پیش آتا ہے۔ یہ سادہ طور پر ایک مذہبی ڈھانچہ سے نکل کر دوسرے مذہبی ڈھانچہ میں جانا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی نے اپنی تلاش و تحقیق کے ذریعہ سچائی کو دریافت کیا۔ اور پھر اپنے ذاتی فیصلے کے تحت ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کر لیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے ٦ھ کے آخر میں اس زمانہ کے پڑوسی حکمرانوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کئے تھے۔ ان خطوط میں ان کو اسلام قبول کرنے کی براہ راست طور پر دعوت دی گئی تھی۔ مثال کے طور پر آپ نے بازنطینی حکمراں ہرقل (Heraclius-1) کے نام دعوتی مکتوب روانہ کیا تو اس میں یہ الفاظ لکھے۔ "اسلم تسلم" (اسلام لاؤ تم سلامتی پاؤ گے) اسی طرح مکہ میں جہاں کہیں لوگوں کا مجمع ہوتا وہاں جا کر آپ فرماتے "**ایھاالناس قولوا لا الہ الااللہ تفلحوا**" (اے لوگو! کہو کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، تم فلاح پاؤ گے)

یہ بظاہر لوگوں کو مذہب بدلنے کی دعوت تھی۔ مگر قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حقیقۃً تبدیلیٔ فکر کی دعوت تھی نہ کہ سادہ طور پر محض مذہب بدل لینے کی۔ اسلام کے دور اول میں عرب کے کچھ دیہاتی لوگ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگئے جب کہ ان کے اندر گہرے قسم کی کرداری تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ان کے بارے میں قرآن میں یہ سخت آیت اتری۔ اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، کہو کہ تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اطاعت قبول کی،

اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا (الحجرات ۱۴) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں کنورزن کا مطلب ایک انسان کی پوری زندگی کی تبدیلی ہے نہ کہ معروف معنوں میں صرف مذہب کی تبدیلی۔

اسی طرح قرآن میں یہود و نصاریٰ کے طریقہ پر نقد کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: کہو کہ ہم نے اللہ کا رنگ اختیار کیا۔ اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں (البقرہ ۱۳۸) یہود و نصاری کے یہاں مذہب بدلنے کا ایک رسمی طریقہ رائج تھا جس کو اصطباغ یا بپتسمہ (baptism) کہا جاتا ہے۔ اس رسم میں آدمی کو پانی میں غوطہ دیا جاتا تھا۔ وہ پانی کے رنگ کو پاکی کی علامت سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مذہبی پیشوا کے ذریعہ صاف پانی میں غوطہ دینے سے ایک ناپاک آدمی پاک ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ نئے مذہب میں داخل ہو جاتا ہے۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں کہا گیا کہ جسم کے اوپر ظاہری طور پر پانی ڈالنے سے کوئی شخص پاک نہیں ہوتا۔ پاکی یہ ہے کہ آدمی کی پوری شخصیت بدل جائے، اس کے اندر اللہ کا رنگ داخل ہو جائے، وہ اپنے قول و عمل میں پوری طرح خدائی طریقہ کو اختیار کر لے۔

اس معاملہ میں قرآن یہاں تک جاتا ہے کہ وہ رسمی تبدیلیٔ مذہب کی سرے سے تصدیق ہی نہیں کرتا۔ قدیم مدینہ میں تقریباً تین سو آدمی ایسے تھے جو اسلام کا کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے تھے۔ وہ بظاہر نماز روزہ بھی کرتے تھے مگر یہ سب کچھ انھوں نے اوپری طور پر یا منافقانہ طور پر کیا تھا۔ ان کی اندرونی حالت ان کے ظاہری اقرار کے موافق نہیں تھی۔ وہ زبان سے اسلام کا دعویٰ کرتے تھے مگر قلبی کیفیت کے اعتبار سے ان کے اندر اسلام کی اسپرٹ موجود نہ تھی۔ ایسے لوگوں کے اسلام کو قرآن میں جھوٹا اسلام کہا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ: جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ بیشک تم اس کے رسول ہو، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین جھوٹے ہیں۔ (المنٰفقون۔ ۱)

قرآن کے مطابق تبدیلیٔ مذہب سے مراد کیا ہے۔ اس کا اندازہ چند آیتوں کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں ایک واقعہ کا ذکر ہے جب کہ تقریباً ستر عیسائیوں کے ایک مجمع میں قرآن کی آیتیں پڑھی گئیں۔ اس کو سن کر وہ لوگ تڑپ اٹھے اور اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے: اور جب انھوں نے اس کلام کو سنا جو رسول پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ہیں اس سبب سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے۔ پس تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ اور ہم کیوں نہ ایمان لائیں اللہ پر اور اس حق پر جو ہمیں پہنچا ہے جب کہ ہم یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالح لوگوں کے ساتھ شامل کرے۔ (المائدہ ۸۳۔۸۴)

اسی طرح قرآن میں ایمان لانے والوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: ایمان والے تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے ان کے ربّ کے پاس درجے اور مغفرت ہیں اور ان کے لئے عزت کی روزی ہے۔ (الانفال ۲۔۴)

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے نزدیک تبدیلی مذہب حقیقت میں وہ ہے جو معرفت (realisation) کے نتیجہ میں پیش آئی ہو، جب کہ ایک انسان کی تلاش حق اپنی تلاش کا قابل یقین جواب پالے۔ یہ پانا اس کے لئے اتنا گہرا تجربہ ہو کہ اس کا دل تڑپ اٹھے۔ اس کی آنکھیں آنسو بہانے لگیں۔ اس کا پورا وجود اس سچائی کے رنگ میں ڈھل جائے۔ اس کے بعد وہ ایک نیا اور بالکل مختلف انسان بن جائے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں کنورزن کے ہم معنی کوئی لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ

کنورزن کے معاملہ کو بتانے کے لئے دوسرے زیادہ بامعنی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن جس دعوتی مشن کے تحت اتارا گیا ہے اس کا تذکرہ قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے:

بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور ایک ظاہر کرنے والی کتاب آچکی ہے۔ اس کے ذریعہ سے اللہ ان لوگوں کو سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے جو اس کی رضا کے طالب ہیں اور اپنی توفیق سے ان کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لا رہا ہے اور سیدھی راہ کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ (المائدہ ۱۵۔۱۶)

اسی طرح جو لوگ قرآن کے مطالعہ سے متاثر ہو کر اسلام میں داخل ہوتے ہیں ان کا ذکر قرآن میں اس طرح آیا ہے: جو شخص یہ جانتا ہے کہ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے وہ حق ہے، کیا وہ اس کے مانند ہو سکتا ہے جو اندھا ہے۔ نصیحت تو عقل والے لوگ ہی قبول کرتے ہیں (الرعد ۱۹) اس آیت کے مطابق، حقیقی کنورزن وہ ہے جو علم کی سطح پر واقع ہو، جس میں آدمی یہ محسوس کرتا ہو کہ وہ نہ جاننے کے مرحلہ سے نکل کر جاننے کے مرحلے میں داخل ہوا ہے۔ اسی لئے حدیث میں داخلۂ اسلام سے پہلے کے دور کو "جاہلیت" کہا گیا ہے، یعنی بے خبری کا دور۔

اسی طرح قرآن میں مومن اور غیر مومن کے فرق کو موت کے بعد زندگی پانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ: کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندگی دی اور ہم نے اس کو ایک روشنی دی کہ اس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے، وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہے، اس سے نکلنے والا نہیں۔ (الانعام ۱۲۳)

اس حقیقت کو قرآن میں مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ زمین کی تمثیل کے ذریعہ اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ جب بارش ہوتی ہے تو زرخیز زمین ہری بھری فصل سے لہلہا اٹھتی ہے۔ اسی طرح جن افراد کے دلوں میں استعداد ہے وہ سچائی کو پا کر جاگ اٹھتے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے: اور جو زمین اچھی ہے اس کی پیداوار نکلتی ہے اس کے رب کے

حکم سے اور جو زمین خراب ہے اس کی پیداوار صرف ناقص نکلتی ہے۔ اسی طرح ہم اپنی نشانیاں مختلف پہلوؤں سے دکھاتے ہیں ان کے لئے جو شکر والے ہیں۔ (الاعراف ۵۸)

اس بات کو قرآن میں ایک اور مقام پر اس طرح بیان کیا گیا ہے: کیا تم نے نہیں دیکھا، کس طرح مثال بیان فرمائی اللہ نے کلمہ طیبہ کی۔ وہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے جس کی جڑ زمین میں جمی ہوئی ہے۔ اور جس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ ہر وقت پر اپنا پھل دیتا ہے اپنے رب کے حکم سے اور اللہ لوگوں کے لئے مثال بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ اور کلمۂ خبیثہ کی مثال ایک خراب درخت کی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے۔ اس کو کوئی ثبات نہ ہو۔ اللہ ایمان والوں کو ایک پکی بات سے دنیا اور آخرت میں مضبوط کرتا ہے۔ اور اللہ ظالموں کو بھٹکا دیتا ہے۔ اور اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ (ابراہیم ۲۴۔۲۷)

قرآن کی ان آیتوں میں اس فرق کو بتایا گیا ہے جو سچائی کو پائے ہوئے انسان اور سچائی کو نہ پائے ہوئے انسان کے درمیان ہوتا ہے۔ جو آدمی سچائی کو نہ پائے وہ گویا ایک ایسی جھاڑی کی مانند ہے جو زمین کے اوپر اگ آتی ہو۔ ایسی جھاڑی کچھ دن تک بے فائدہ طور پر زمین کے اوپر رہتی ہے۔ اور اس کے بعد وہ یا تو خود مٹ جاتی ہے یا اکھاڑ کر پھینک دی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ایک مفید اور پھل دار درخت زمین کے اوپر اس طرح اگتا ہے جیسے کہ وہ زمین کے لئے ہے اور زمین اس کے لئے۔ وہ زمین اور فضا سے اپنی خوراک حاصل کرتے ہوئے خوب ترقی کرتا ہے۔ اس سے لوگوں کو ہر قسم کے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ وہ زمین پر ایک مطلوب اور بامعنی وجود کے طور پر کھڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

کنورزن آفاقی اصول

اس معاملہ کا ایک پہلو اور ہے جس کی طرف قرآن میں بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ کنورزن کا معاملہ محدود طور پر صرف مذہب کی تبدیلی کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک آفاقی اصول ہے۔ موجودہ کائنات میں تمام ترقیاں اسی کنورزن کے طریقہ پر ظہور میں آئی ہیں۔

کائنات اپنی ابتدا میں ایک بند مادہ کی صورت میں تھی، پھر اس میں داخلی تغیر ہوا۔ یہ بند مادہ کھل کر پھیلنا شروع ہوا یہاں تک کہ موجودہ وسیع کائنات بن گئی۔ (الانبیاء۔ ۳۰) زمین سوکھی پڑی ہوئی ہوتی ہے پھر بارش کے ذریعہ اس میں تغیرات پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ چٹیل میدان ہری بھری فصلوں اور شاداب درختوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ (الحج ۵)

اسی طرح کچھ بظاہر غیر ذی روح اجزاء ایک مادہ کے بطن میں مخصوص تغیرات کے مراحل سے گزرتے ہیں یہاں تک کہ وہ ایک مکمل قسم کے ذی روح وجود کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس کا نتیجہ چلتے پھرتے انسان اور چلتے پھرتے حیوان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے (الانعام ۹۶) اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک گائے کے پیٹ میں گھاس اور دانا داخل ہوتا ہے۔ وہ اس کے اندر ایک قدرتی نظام کے تحت کچھ تغیراتی مراحل سے گذرتا ہے یہاں تک کہ وہ دودھ کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو انسان کے لئے ایک نہایت قیمتی غذا ہے۔ (النحل ٦٦) وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح کے قدرتی مظاہر کی مثال دے کر قرآن میں یہ حقیقت بتائی گئی ہے کہ یہ دنیا کنورزن کے عالمی اصول پر قائم ہے۔ یہاں ہر قسم کی ترقیاں ہمیشہ تغیراتی عمل (process) سے گذر کر وقوع میں آتی ہیں۔ ایک چیز اپنی ابتدائی حالت میں کچھ ہوتی ہے، اور پھر اس پر تغیر و تبدل کا عمل واقع ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ چیز ایک نئی بہتر چیز بن جاتی ہے .... دو قسم کے بادلوں کے ٹکراؤ سے نائٹروجن کا پیدا ہونا، دو قسم کی گیسوں کے ملنے سے پانی کا وجود میں آنا، خام لوہے کا متغیر ہو کر اسٹیل بن جانا۔ مختلف قسم کے کیمیکل کی آمیزش سے نئی نئی مفید دھاتوں کا بننا، وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب وسیع تر معنوں میں کنورزن کی مثالیں ہیں۔ یہی کنورزن انسانی افکار کی دنیا میں بھی کارفرما ہے۔ اس دنیا میں مسلسل طور پر افکار کے درمیان ٹکراؤ جاری ہے۔ اسی ٹکراؤ کے عمل سے ایک فکر بدل کر دوسرے بہتر فکر کی صورت اختیار کرتا ہے۔ مثال کے طور پر دنیا میں سینکڑوں سال تک شمسی نظام کے بارے میں زمین مرکزی نظریہ (geo-centric theory) کا

غلبہ تھا۔ پھر فکری تصادم کے نتیجہ میں اس میں تغیر شروع ہوا۔ یہاں تک کہ زمین مرکزی نظریہ کو علمی دنیا میں رد کر دیا گیا اور اس کی جگہ آفتاب مرکزی نظریہ (helio-centric theory) کو زیادہ صحیح قرار دے کر اس کو قبول کر لیا گیا وغیرہ۔

افکار کی دنیا میں اسی کنورزن کی ایک مثال وہ ہے جس کو مذہبی کنورزن کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے مذہبی کنورزن فطرت کی وسیع تر اسکیم کا صرف ایک جزء ہے۔ یہ جزء بھی اتنا ہی مطلوب اور ضروری ہے جتنا کہ اس کا کل۔

حقیقت یہ ہے کہ کنورزن فطرت کا قائم کردہ ایک عالم گیر قانون ہے۔ مادی دنیا کی تمام ترقیاں اسی کنورزن کے اصول پر ہو رہی ہیں۔ زندہ اشیاء (انسان اور حیوان) کا جسمانی ارتقاء تمام تر اسی کنورزن کے اصول پر ہوتا ہے۔ اسی طرح افکار کی دنیا میں ہزاروں سال سے جو ترقیاں ہو رہی ہیں وہ سب کی سب اسی کنورزن کے اصول کو اختیار کرنے کی بنا پر ہو رہی ہیں۔ یعنی ایک چیز کو حق پا کر پوری طرح اختیار کر لینا۔ اس دنیا کا کوئی بھی ترقیاتی واقعہ اس کنورزن کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی معاملہ مذہب کا بھی ہے جو کہ روحانی سچائی کا دوسرا نام ہے۔ وہی مذہب کسی انسان کا مذہب بن سکتا ہے جس کو کسی آدمی نے ذاتی تلاش کے نتیجہ میں دریافت کیا ہو۔ مذہب کا نہایت گہرا تعلق یقین سے ہے اور یقین کا تعلق دریافت (discovery) سے۔ دریافت کے بغیر یقین نہیں، اور یقین کے بغیر مذہب نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص پیدائشی طور پر سچے مذہب کے ماحول میں پیدا ہو تب بھی وہ صرف آبائی تعلق کی بنا پر اس مذہب کو نہیں پا سکتا۔ مذہب کو بطور ایک یقینی صداقت کے پانا اس کے لئے صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ وہ خود اپنے مطالعہ اور غور و فکر کے ذریعہ اس کو پائے، وہ ایک معلوم چیز کو دوبارہ دریافت (re-discover) کرے۔

کنورزن کی حقیقت

کنورزن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی کچھ رسمی الفاظ ادا کرے۔ اور اپنا نام بدل کر ایک

کلچرل گروپ کو چھوڑ کر دوسرے کلچرل گروپ میں شامل ہو جائے۔ کنورزن کا مطلب تبدیلی مذہب نہیں بلکہ تبدیلی شخصیت ہے۔ کنورزن یہ ہے کہ ایک آدمی تلاش حقیقت میں سرگرم ہو۔ تحقیق و جستجو کے تمام مراحل سے گزرے اور پھر اس کے نتیجہ میں اس کے اندر ایک نئی شخصیت کا ارتقاء ہو۔ کنورزن اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک نئی شخصیت کے ظہور کا نام ہے۔ ایسی ایک شخصیت کا بننا انسانی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ جب کسی سماج میں بڑی تعداد میں پیدا ہو جائیں تو وہ تاریخ کا عظیم ترین کارنامہ ظہور میں لاتے ہیں۔

کنورزن در حقیقت ڈسکوری (دریافت) کے نتیجہ میں پیش آنے والا واقعہ ہے۔ ایک عظیم ڈسکوری کے بعد آدمی وہی نہیں رہتا جیسا کہ وہ پہلے تھا۔ اب وہ مکمل طور پر ایک نیا انسان ہوتا ہے۔ اسی قسم کی انقلابی تبدیلی کا نام کنورزن ہے۔ یہ تمام تر ذاتی فیصلہ کے تحت ہوتا ہے۔ کسی خارجی لالچ یا دباؤ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

کنورزن کا مطلب یہ ہے کہ ایک نہ پایا ہوا انسان پایا ہوا انسان بن جائے۔ ایک بے خبر انسان باخبری کے دور میں پہنچ جائے۔ ایک سویا ہوا انسان اپنے حواس کے ساتھ جاگ اٹھے۔ ایک شخص جو اندھے پن میں جی رہا تھا وہ بینا بن کر جینے کے قابل ہو جائے۔ ایک شخص جس کو اپنی کوششوں کا مرکز نہیں ملا تھا اس کو اپنی کوششوں کا ایک معلوم مرکز مل جائے۔ ایک شخص جو محدود دنیا میں جی رہا تھا وہ لامحدود دنیا میں داخل ہو کر سانس لینے لگے۔ ایک شخص جو صرف اپنے جسم کے دائرہ میں جی رہا تھا وہ اس سے اوپر اٹھ کر فکر کی اعلیٰ سطح پر جینے کا سامان کرلے۔ ایک شخص جو بے مقصد حالت میں بھٹک رہا تھا اس کو بامقصد زندگی کا راز معلوم ہو جائے۔

کنورزن۔۔۔ایک صحت مند تاریخی عمل

غالباً ۱۹۹۰ میں میں نے ایک ہندستانی رائٹر کی ایک کتاب پڑھی تھی۔ اس کا نام کنورزن کی سیاست (Politics of Conversion) تھا۔ اس کو پڑھنے کے بعد میں نے کہا کہ اس کتاب سے مجھ کو صرف ایک اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ کتاب کا نام (ٹائٹل) درست نہیں۔ اس کا صحیح نام

ہونا چاہئے: کنورزن کو سیاسی بنانا (Politicisation of Conversion) یعنی ایک سادہ فطری حقیقت کو سیاسی رنگ دے کر اس میں غیر ضروری طور پر سنسنی خیزی پیدا کرنا۔

کنورزن کیا ہے۔ عام طور پر کنورزن کو مذہب بدلنے (proslytisation) کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ کنورزن اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کنورزن فطرت کا ایک آفاقی قانون ہے۔ وہ ایک صحت مند تاریخی عمل ہے جو ناگزیر طور پر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ کنورزن کو روکنے کی کوشش کرنا گویا تاریخ کو روکنے کی کوشش کرنا ہے اور کوئی بھی اتنا طاقتور نہیں کہ وہ تاریخ کے عمل کو روک سکے۔ کنورزن اپنی حقیقت کے اعتبار سے دو چیزوں کے ٹکراؤ سے ایک اور چیز کا پیدا ہونا ہے۔ یہ فطرت کا قائم کردہ ایک آفاقی قانون ہے جو خود اپنے زور پر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

انسانی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عمل اس کے اندر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ کارل مارکس نے اس کو غلط طور پر جدلیاتی مادیت (dialectical materialism) سے تعبیر کیا تھا۔ زیادہ صحیح طور پر یہ ڈائیلاگ۔ کنورزن پراسس ہے۔ یعنی جب دو فکری نظام کے درمیان بحث و تبادلہ ہوتا ہے تو اس کے بعد ایک فکری انقلاب بر آمد ہوتا ہے۔

ڈائیلاگ۔ کنورزن پراسس کا یہ عمل ہی تمام انسانی ترقیوں کا واحد زینہ ہے۔ جب بھی دنیا میں کوئی تہذیبی انقلاب آیا ہے یا کسی انسانی گروہ نے اٹھ کر کوئی تخلیقی کارنامہ انجام دیا ہے تو وہ ہمیشہ اسی ڈائیلاگ۔ کنورزن پراسس ہی کے ذریعہ ظہور میں آیا ہے۔

اس عمل کی کوئی ایک صورت نہیں۔ یعنی یہ مذہبی بھی ہو سکتا ہے اور غیر مذہبی بھی۔ پچھلے ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ میں اس کی دو بڑی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ایک مذہبی کنورزن کی صورت میں اور دوسری سیکولر کنورزن کی صورت میں۔

عربوں کی تاریخ مذہبی کنورزن کی مثال ہے۔ چھٹی صدی عیسوی تک عرب ایک مشرکانہ نظام کے تحت محدود قبائلی زندگی گزار رہے تھے۔ اس کے بعد ساتویں صدی کے آغاز

میں اسلام یعنی دین توحید کا ظہور ہوا۔ اس کے بعد دین شرک اور دین توحید کے درمیان زبردست ڈائیلاگ شروع ہوا۔ (بحث و مباحثہ) یہ ڈائیلاگ مزید شدت اختیار کر کے جارحانہ تصادم تک پہنچ گیا۔ اس ڈائیلاگ اور تصادم کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ عربوں کے اندر ایک نئی سوچ ابھری۔ بڑھتے بڑھتے وہ ایک عظیم فکری انقلاب بن گئی۔

اس ذہنی انقلاب یا اس فکر نو کی دریافت کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کے اندر ایک نئی شخصیت ابھری۔ ایک یورپی مورخ کے الفاظ میں، ان میں کا ایک ایک شخص اس طرح انقلابی شخصیت بنا کہ پوری قوم ہیروؤں کی ایک قوم (a nation of heroes) بن گئی۔ ہیروؤں کی اس قوم نے صرف پچاس سال کے اندر وہ تاریخی واقعہ برپا کیا جس کو ایک مورخ نے (miracle of all miracles) معجزات کا معجزہ قرار دیا ہے۔ بریفالٹ نے اس کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے کہ عربوں کے بغیر جدید مغربی تہذیب سرے سے وجود ہی میں نہیں آسکتی تھی۔

But for the Arabs, the western civilization would never have arisen at all.

دوسری مثال یورپ کی مسیحی قوموں کی ہے۔ صلیبی جنگوں (کروسیڈس) کے بعد کئی سو سال کے تاریخی عمل کے دوران یہاں بھی ایک کنورزن ہوا۔ یہ کنورزن مذہبی نہیں تھا بلکہ ایک قسم کا سیکولر کنورزن تھا۔ چرچ اور سائنس کے درمیان زبردست مقابلہ پیش آیا۔ اس مقابلہ کی ایک روداد مندرجہ ذیل کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے:

Conflict between Science and Religion

یہ مقابلہ ڈائیلاگ اور ٹکراؤ کی صورت میں کئی سو سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ یورپی قوموں کے اندر ایک نیا فکری انقلاب آیا جس میں انھوں نے قدیم کو چھوڑا اور جدید کو اختیار کر لیا۔ اس انقلاب کو عام طور پر نشاۃ ثانیہ (renaissanace) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس انقلاب نے یورپی قوموں کو اس قابل بنایا کہ وہ تاریخ کا عظیم ترین کارنامہ انجام دے سکیں۔ وہ تاریخ انسانی کو روایتی دور سے نکال کر سائنسی دور میں پہنچادیں۔ اصل یہ ہے کہ

انسان کا دماغ لامحدود طاقتوں کا ایک قدرتی خزانہ ہے۔ عام حالات میں یہ دماغ سویا ہوا رہتا ہے۔ یہ صرف خارجی جھٹکے ہیں جو اس کو بیدار کرتے ہیں۔ یہ شاک ٹریٹمنٹ کا ایک عمل ہے۔ جتنا بڑا شاک ہو اتنا ہی بڑا ذہنی انقلاب انسان کے اندر پیدا ہوگا۔ یہ شاک ٹریٹمنٹ انسان کے اندر وہ چیز پیدا کرتا ہے جس کو نفسیات کے علماء دماغی طوفان (brain storming) کہتے ہیں۔ یہ دماغی طوفان آدمی کے اندر ایک نئی فکری تبدیلی، ایک نیا کنورزن وجود میں لاتا ہے۔ یہ کنورزن کسی قوم کے افراد کو ایک عام انسان سے اٹھا کر غیر معمولی انسان بنا دیتا ہے اور پھر وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ بڑے بڑے کارنامہ انجام دے سکے۔

مذہبی کنورزن اس پورے عمل کا ایک چھوٹا سا جزء ہے۔ تاہم جب ڈائیلاگ۔ کنورزن پراسس چلتا ہے تو اس کو کسی حد کا پابند کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ لوگ فلاں فلاں قسم کا کنورزن کریں، اور مذہبی کنورزن نہ کریں۔ یہ ایک لامحدود سیلابی عمل ہے۔ اور سیلاب جب آتا ہے تو وہ کسی حد بندی کو قبول نہیں کرتا۔

جہاں تک مذہبی کنورزن کا تعلق ہے وہ صرف غیر مذہب کو قبول کرنے کے ہم معنی نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی کنورزن کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک انٹرفیتھ کنورزن، دوسری انٹرفیتھ کنورزن۔ مثال کے طور پر سوامی وویکانند پہلے ایک ماڈرن قسم کے نریندرناتھ تھے۔ پھر رام کرشنا پرم ہنس سے ان کا ذہنی ٹکراؤ ہوا جس کے بعد وہ سوامی وویکانند بن گئے۔ یہ داخلی کنورزن (انٹرفیتھ کنورزن) کی ایک مثال ہے۔

اس طرح اسی زمانہ کے ایک اور بنگالی ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیائے (وفات تاریخ) کا فکری تصادم مختلف مذاہب سے ہوا۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ انھوں نے پہلے فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک درجن بڑے بڑے مذاہب کا مطالعہ کیا۔ آخر میں وہ ایک فکری دریافت تک پہنچے۔ انھوں نے اپنے آبائی مذہب ہندوازم کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔ اور اپنا نام عزیز الدین رکھا۔ انھوں نے اپنے اس فکری ارتقاء کی داستان ایک کتاب کی صورت میں لکھی ہے

جس کا نام یہ ہے:

Why I have Embraced Islam یہ انٹر فیتھ کنورزن کی ایک مثال ہے۔

یہ کنورزن کوئی یک طرفہ عمل نہیں ہے۔ یہ دو طرفہ بلکہ کئی طرفہ طور پر چلتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں کچھ ہندوؤں نے اپنا مذہب بدل کر مسیحی مذہب کو اختیار کرلیا ہے جب کہ یورپ اور امریکہ میں ہزاروں مسیحی اپنے مذہب کو چھوڑ کر ہندو بن گئے۔ آج دنیا میں انگریزی میں نکلنے والا سب سے بڑا ہندو اخبار امریکہ سے نکلنے والا انڈیا ابراڈ (India Abroad) ہے۔ اور اس کا مالک اور اڈیٹر ایک ہندو کنورٹ ہے۔ انھوں نے مسیحیت کو چھوڑ کر ہندو مذہب اختیار کرلیا اور پھر یہ انٹر نیشنل اخبار نکالا۔

کسی قوم کو دوبارہ اٹھانے کے لئے عام طور پر تحریک احیاء (revivalism) پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ یعنی قوم کے ماضی کو یاد دلا کر اس کو دوبارہ زندہ کرنا۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ اس قسم کی احیائی تحریک کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔ تاریخ میں غالباً کوئی ایک بھی قابل ذکر مثال موجود نہیں جب کہ صرف احیاءِ ماضی کی تحریک کے ذریعہ کوئی قوم دوبارہ نئی طاقت کے ساتھ زندہ ہو کر کھڑی ہو گئی ہو۔ اس کی ایک مثال ہندستان ہے۔ ہندستان میں ہندو قوم کو بیدار کرنے کے لئے پچھلے کئی سو سال سے مسلسل احیائی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اس میں بہت بڑی بڑی شخصیتوں کے نام ہیں۔ راجہ رام موہن رائے، سوامی وویکانند، آروو ندو، مہاتما گاندھی وغیرہ۔ مگر لمبی مدت کی جدوجہد کے باوجود اس رخ پر ایک فی صد بھی کامیابی نہ ہو سکی۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اس کا الٹا نتیجہ بر آمد ہوا۔

آزادی کے دور میں پہنچ کر ہندو سماج میں اخلاقی اقدار کا وہ نظام بھی باقی نہ رہا جو پہلے اس کے اندر پایا جاتا تھا۔ پہلے ایک جھوٹ بولنے پر یدھشٹر کا اڑنے والا رتھ زمین پر گر پڑتا تھا، مگر آج کے یدھشٹر صبح وشام جھوٹ بولتے ہیں اس کے باوجود ان کا رتھ نہایت تیزی کے ساتھ بلند فضاؤں میں اڑ رہا ہے۔ ماضی کے برعکس، آج کا ہندستانی سماج صرف ایک کرپشن (بھرشٹاچار) کا

سماج بن گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کے اندر انقلابی روح کبھی بھی "ماضی کی طرف واپسی" سے نہیں پیدا ہوتی۔ یہ صرف جدید کی دریافت سے پیدا ہوتی ہے۔ انقلابی شخصیت کا ظہور قدیم کی طرف واپسی سے نہیں ہوتا بلکہ جدید کی طرف اقدام سے ہوتا ہے اور احیائی تحریک اپنی آخری تعریف کے مطابق صرف قدیم کی طرف واپسی کے ہم معنی ہے۔ وہ جدید کی دریافت یا جدید کی طرف اقدام کے ہم معنی بلاشبہ نہیں۔

سوامی وویکانند نے کہا تھا کہ ہندو قوم ورلڈ لیڈر بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ مگر یہ انقلابی واقعہ "احیاء ماضی" جیسی کسی تحریک کے ذریعہ ظہور میں نہیں آسکتا جیسا کہ اب تک نہیں ہوا۔ ایسا واقعہ جب بھی پیش آئے گا وہ جدید کی دریافت یا نئے فکری انقلاب کے ذریعہ ہوگا۔ خواہ یہ فکری انقلاب مذہبی کنورزن کی صورت میں ہو یا سیکولر کنورزن کی صورت میں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ کنورزن کا یہ واقعہ صرف انفرادی سطح پر نہ ہو بلکہ عوامی سطح پر ہو۔ اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی قوم کوئی بڑا کارنامہ انجام دے سکے اور تاریخ عالم میں اپنا نام روشن کرے۔

خلاصہ یہ کہ کنورزن محدود طور پر مذہبی تبدیلی کا معاملہ نہیں، یہ دریافت نو کا معاملہ ہے۔ اور نفسیات اور تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کسی فرد یا کسی قوم کو متحرک کرنے کے لئے نیز اس کے اندر اخلاقی انقلاب لانے کے لئے سب سے زیادہ جو چیز موثر ہوتی ہے وہ یہی دریافت (discovery) ہے۔ یہ احساس کہ میں نے ایک ایسی سچائی دریافت کی ہے جو اب تک مجھے معلوم نہ تھی انسان کی تمام سوئی ہوئی طاقتوں کو جگا دیتا ہے۔ وہ ایک عام انسان کی سطح سے اٹھ کر ایک ہیرو انسان بن جاتا ہے۔ اسی قسم کے ہیرو انسان ہیں جو سمندروں میں چھلانگ لگاتے ہیں، جو پہاڑوں کو پھاند جاتے ہیں، جو اپنے ہیروانہ کردار کے ذریعہ تاریخ کو نئے دور میں داخل کر دیتے ہیں۔ آج انسانی تاریخ دوبارہ ایک تعطل (deadlock) سے دوچار ہے۔ تاریخ کو دوبارہ انتظار ہے کہ کوئی قوم دریافت نو کے تجربہ سے گذرے۔ وہ نئی انسانی طاقتوں سے بھرپور ہو کر تاریخ انسانی کو وہ دھکا دے جو اس کو ایک نئے اور بہتر دور میں پہنچادے۔

مراقبہ

مراقبہ کے لفظی معنی ہیں نگرانی کرنا۔ عربی میں کہا جاتا ہے کہ **ھو رقیب نفسہ**، وہ اپنا نگراں آپ ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں مراقبہ کا مطلب ہے دھیان کرنا، تصور کی دنیا میں غرق ہو کر اپنا مراقب بن جانا۔

عام طور پر مراقبہ اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص لوگوں سے الگ ہو کر تنہائی میں بیٹھ جائے اور ذکر و اذکار اور اوراد و وضائف میں مشغول ہو جائے۔ مگر یہ مراقبہ کا صرف ظاہری پہلو ہے، یہی کل مراقبہ نہیں۔ اصل مراقبہ اس سے زیادہ وسیع چیز کا نام ہے۔ اصل مراقبہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو ظاہری چیزوں سے ہٹا کر باطنی حقیقتوں کی طرف لے جایا جائے۔

یہ دنیا جس میں ہم جیتے ہیں وہ دو دنیاؤں کا مجموعہ ہے۔ چیزوں کی دنیا(world of things)اور معانی کی دنیا (world of meanings) ظاہر پسند اور مادہ پرست لوگ چیزوں کی دنیا میں اٹکے ہوئے رہتے ہیں، اس سے آگے کی انھیں کوئی خبر نہیں رہتی۔ لیکن گہری نگاہ والے لوگ اس سے اوپر اٹھ کر معنوی دنیا تک پہنچ جاتے ہیں۔ دونوں کا فرق ایک مثال سے واضح ہوتا ہے ۔

آپ کے سامنے ایک درخت ہے۔ آپ اس کو دیکھتے ہیں۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ آپ کی نظر اس کی ٹہنیوں، پتیوں اور پھولوں اور پھلوں تک محدود رہے۔ یہ ظاہری سوچ ہے۔ یہ مراقبہ والی سوچ نہیں۔ اس کے بجائے اگر پیڑ کو دیکھ کر آپ سوچنے لگیں اور آپ کی سوچ اس حقیقت تک پہنچے کہ پیڑ کے اندر ایک انوکھی صفت ہے کہ وہ آپ کی سانس سے نکلی ہوئی کاربن ڈائی آکسائڈ کو فضا سے لے کر اپنی خوراک بناتا ہے اور اس کے بجائے آکسیجن آپ کی طرف لوٹاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ مضر گیس لے لیتا ہے اور اس کے بدلے میں مفید گیس آپ کی طرف واپس کرتا ہے۔

پہلی سوچ سطحی یا مادی سوچ ہے اور دوسری سوچ روحانی سوچ۔ پہلی سوچ والا درخت کو دیکھ کر صرف اس کے بعض ظاہری پہلوؤں کو پاتا ہے۔ مگر دوسری سوچ والا جب درخت کو دیکھتا

ہے تو اس پر معنوی اسرار کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اسی دوسری سوچ کا نام مراقبہ ہے۔ ایسے آدمی کے لئے درخت کو دیکھنا ایک عظیم روحانی ترقی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس کے اندر یہ مزاج بنتا ہے کہ وہ بھی اس دنیا میں درخت کی طرح جیئے۔ اس کو دوسروں کی طرف سے نفرت ملے تب بھی وہ انھیں محبت کا تحفہ دے۔ دوسرے لوگ اسے ستائیں تب بھی وہ ان کا ہمدرد اور خیر خواہ بنا رہے۔

اسی طرح مثلاً ایک گائے ہے۔ ایک پولیٹکل آدمی اس کو دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ خیال آجاتا ہے کہ گائے کو اشو بنا کر وہ گائے کو مقدس سمجھنے والوں کی سیاسی حمایت حاصل کر سکتا ہے یا گائے کو اپنا انتخابی نشان بنا کر وہ ایک طبقہ کے اندر اپنا ووٹ بینک بنا سکتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں دوسرا آدمی وہ ہے جو گائے کو دیکھے تو اس کے ذہن میں یہ خیال آجائے کہ گائے فطرت کی ایک انڈسٹری ہے۔ وہ گھاس کھاتی ہے اور اس کو دودھ میں کنورٹ کر کے ہماری طرف لوٹاتی ہے۔ پہلے آدمی نے گائے کے صرف ظاہر کو دیکھا تھا لیکن دوسرا آدمی گائے کی اندرونی حقیقت تک پہنچ گیا۔

اسی دوسرے طریقہ کا نام مراقبہ ہے۔ ایسے آدمی کے اندر یہ سوچ ابھرے گی کہ وہ بھی اپنے آپ کو خدا کی ایک انڈسٹری بنائے۔ اگر کوئی آدمی اسے گالی دے تو اس کے جواب میں وہ اس کو دعائیں دے۔ کوئی آدمی اس کے خلاف اشتعال انگیزی کرے تو وہ اس کے خلاف اعراض کا معاملہ کرے۔ کوئی شخص اس کے ساتھ برائی کرے تو وہ اس کو بھلائی کا تحفہ پیش کرے۔ اصلی مراقبہ یہ ہے کہ آدمی دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے اوپر اٹھ جائے۔ وہ چیزوں میں نہ اٹکے بلکہ ان کے اندر چھپی ہوئی معنوی حقیقتوں کو دریافت کرلے۔ اسی کا نام روحانیت ہے۔ اور جن لوگوں کے اندر یہ روحانیت ہو وہی حقیقی معنوں میں اس نعمت کو پاتے ہیں جس کو قلب کا سکون کہا جاتا ہے۔

مراقبہ اپنے آپ میں ڈوبنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ خدا میں ڈوبنے کا نام ہے۔ حقیقی مراقبہ وہ ہے جب کہ ایک شخص اپنی ذات سے اور ساری دنیا سے اوپر اٹھ کر خدا میں غور و فکر کرنے لگے،

وہ مخلوقات میں گم ہونے کے بجائے خدا میں گم ہو جائے۔

اس قسم کا مراقبہ آدمی کو بے خود نہیں کرتا بلکہ وہ اس کو خود شناس اور خدا شناس بناتا ہے۔ مراقبہ اس کوشش کا نام ہے جب کہ انسان چھپے ہوئے روحانی تاروں کے ذریعہ خدا سے متصل ہو جائے۔ جب انائے صغیر انائے کبیر سے حیاتی طور پر مربوط ہو جائے۔

انسان اور خدا کے درمیان یہ حیاتی ربط ہی روحانیت کا اصل مقصود ہے۔ یہ حیاتی ربط اس معنی میں نہیں ہوتا کہ انسان خدا میں مل جاتا ہے۔ یہ اتصال دراصل نفسیات کی سطح پر ہوتا ہے۔ انسان اپنے علیحدہ وجود کو باقی رکھتے ہوئے تصور کی سطح پر خدا سے قربت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ جسمانی اعتبار سے خدا سے دور ہوتے ہوئے بھی وہ روحانی اعتبار سے خدا سے انتہائی حد تک قریب ہو جاتا ہے۔

مراقبہ کے لئے کسی تاریک گوشہ میں بیٹھنا ضروری نہیں۔ مراقبہ کا تجربہ ہر جگہ ہو سکتا ہے، حتی کہ ہجوم کے درمیان بھی۔ جب آدمی کا احساس بڑھا ہوا ہو تو کسی بھی تجربہ کے دوران ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کا ربانی شعور جاگ اٹھتا ہے۔ وہ ظاہر میں باطن کا جلوہ دیکھ لیتا ہے۔ وہ مخلوق کے تجربہ میں خالق کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ جب کسی پر یہ کیفیت گزرے تو گویا وہ مراقبہ کی حالت میں پہنچ گیا۔ اس نے سمندر کے ساحل پر رہتے ہوئے سمندر کی گہرائیوں میں اتر کر معرفت کا موتی حاصل کر لیا۔ مراقبہ دراصل تصور کی دنیا میں اپنے رب سے جڑ جانے کا دوسرا نام ہے۔ آدمی کا شعور جتنا زیادہ بیدار ہو اتنا ہی زیادہ اس کو مراقبہ کا تجربہ ہوگا۔ یہاں تک کہ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص ہر لمحہ مراقبہ کی حالت میں پہنچ جائے (ڈاکٹر فریدہ خانم)

سوال

خدا کے وجود کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر خدا نہ ہوتا تو کائنات کو کون پیدا کرتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر خدا نے کائنات کو پیدا کیا تو خود خدا کو کس نے پیدا کیا (خوشونت سنگھ، دہلی)

جواب

یہ ایک غلط قیاس ہے۔ موجودہ زمانہ میں کائنات کے سائنسی مطالعہ سے یہ ثابت ہوا کہ کائنات خود اپنے آپ کو پیدا نہیں کر سکتی۔ ضرورت ہے کہ کائنات کے باہر اس کا کوئی موجد یا خالق پایا جاتا ہو۔ مثال کے طور پر بگ بینگ کا نظریہ یہی بتاتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق، کائنات ایک خارجی دھماکہ سے وجود میں آئی ہے۔ علمی اور عقلی طور پر دیکھا جائے تو ایسی حالت میں ہمارے لئے انتخاب (choice) باخدا کائنات اور بے خدا کائنات میں نہیں ہے۔ بلکہ باخدا کائنات اور غیر موجود کائنات میں ہے۔ چونکہ ہم مجبور ہیں کہ کائنات کو موجود مانیں، اس لئے ہم مجبور ہیں کہ خدا کے وجود کو بھی مانیں۔ خدا کے وجود کو مان کر ہم کائنات کے وجود کی توجیہ پالیتے ہیں۔ جب کہ خدا کے وجود کو نہ ماننے کی صورت میں خود کائنات بلاتوجیہ رہ جاتی ہے، اور علمی طور پر یہ توجیہ قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

سوال

آپ دعوتی نقطۂ نظر سے ایک کام کر رہے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلم دشمن عناصر کے لئے مواد فراہم کرتے ہیں۔ مثلاً جا بجا مسلمانوں کی خامیوں کا ذکر کرنا وغیرہ۔ اس سے انھیں موقع ملتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو مطعون کر سکیں۔ آپ کو اس سے احتراض کرنا چاہئے۔ (خالد ندوی، دہلی)

جواب

الرسالہ کا مقصد خاص طور پر مسلمانوں کی اصلاح ہے۔ اسی لئے میں الرسالہ کو ایک نصیحت نامہ کہتا ہوں۔ نصیحت کا یا اصلاح کا طریقہ کیا ہے اس کو جاننے کا واحد ذریعہ قرآن ہے۔ نصیحت یا اصلاح کے بارے میں قرآن کا جو اسلوب ہے وہی اسلوب میں نے اختیار کیا ہے۔ اور قرآن کا اسلوب اس معاملہ میں یہی ہے کہ جہاں کوئی داخلی کوتاہی نظر آئے اس کو کھلے طور پر ظاہر کیا جائے۔ اس سلسلہ میں مذکورہ

م کے اندیشے کا لحاظ کرنا قرآنی اسلوب کے سراسر خلاف ہے اور اسی لئے بے فائدہ بھی۔ مثال کے
ر پر غزوہ بدر کے بعد دشمنوں کے ستر آدمی گرفتار ہو کر مدینہ آئے۔ چند صحابہ (حضرت عمر فاروقؓ اور
نرت سعد بن معاذؓ) کی رائے یہ تھی کہ ان کے جنگی جرم کی بنا پر انھیں قتل کر دیا جائے۔ لیکن اکثر
ابہ بشمول حضرت ابو بکرؓ اور خود رسول اللہ ﷺ کی رائے یہ ہوئی کہ فدیہ لے کر انھیں چھوڑ دیا
ئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا عتاب اترا اور فرمایا گیا کہ ـــــ تم دنیا کا مال چاہتے ہو اللہ چاہتا ہے آخرت
نفال ۶۷) یہ آیت بظاہر یہ بتاتی ہے کہ صحابہ کی اکثریت خدانخواستہ حب مال میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اگر
بحث کا مذکورہ معیار درست ہو تو قرآن کو مسلمانوں کی اس کمزوری کا اس طرح اظہار نہیں کرنا چاہئے
کیوں کہ اس طرح اغیار کو یہ کہنے کا موقع مل رہا تھا کہ تم لوگوں کی ساری جدوجہد مال کے لئے ہے۔
ں اندیشہ کے باوجود قرآن میں مذکورہ تنبیہ نازل کی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے مطابق
بحث کے معاملہ میں مذکورہ قسم کا اندیشہ سراسر غیر معتبر ہے۔ اس معاملہ میں حقیقت حال کو جیسا ہے
باہی بیان کیا جائے گا۔ اس معاملہ میں اخفا کا طریقہ اختیار کرنا اگر مطلوب ہوتا تو قرآن میں مذکورہ
بت ہرگز نازل نہ ہوتی (اس طرح کی کئی اور مثالیں قرآن میں موجود ہیں)

سوال

آپ کہتے ہیں کہ اسلام کی پرامن تبلیغ ہونی چاہئے۔ مگر نبیوں کے واقعات بتاتے ہیں کہ ہر نبی
وقت کے اقتدار سے سنگھرش کرنا پڑا۔ ہمیشہ حق کو باطل سے مقابلہ آرائی کرنا پڑا اس لئے پرامن تبلیغ
ں طرح ہو سکتی ہے (شکیل احمد، وردرہ مہاراشٹر)

جواب

ہر نبی نے اقتدار کے خلاف جنگ کی ـــــ یہ خود ساختہ مفروضہ ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں۔
نگ کا تعلق دعوت سے نہیں بلکہ دفاع سے ہے۔ ناگزیر حالات میں حسب استطاعت دفاع کیا جاتا ہے۔
کسی نبی کی تاریخ میں اگر جنگ کا واقعہ پیش آیا تو وہ جارحیت کے خلاف دفاع کے لئے تھا نہ کہ اپنے پیغام
اشاعت کے لئے۔ اس سلسلہ میں دوسری بات یہ ہے کہ پیغمبر کا اپنے ہم عصر لوگوں سے جو ٹکراؤ پیش
یادہ ایک زمانی چیز تھی۔ قدیم زمانہ مذہبی جبر کا زمانہ تھا اس لئے ہر مذہب کو دوسرے مذہب کے مقابلہ

میں تشدد کا تجربہ پیش آتا تھا۔ مگر اب آزادی فکر کا زمانہ ہے۔ اب اظہارِ رائے کی آزادی کو ہر انسان کا لازمی حق سمجھا جاتا ہے اس لئے اب اگر صحیح اسلوب میں دعوت کا کام کیا جائے تو عملاً متشددانہ ردِ عمل پیش آنے کا کوئی امکان نہیں۔

سوال

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: کان حقا علینا نصر المومنین (الروم ۴۷) اس آیت کا ترجمہ حضرت شیخ الہند نے اس طرح کیا ہے: اور حق ہے ہم پر مدد ایمان والوں کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکل اوقات میں خدا ضرور اہل ایمان کی مدد کرتا ہے۔ حتی کہ وہ اس کو اپنے اوپر اہل ایمان کا حق سمجھتا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں پچھلی کئی نسلوں سے مسلمان تقریباً ساری دنیا میں اغیار کی زیادتیوں کا مسلسل شکار ہورہے ہیں مگر ان پر خدا کی وہ مدد نہیں آتی جو زیادتیوں کا یہ سلسلہ ختم کردے اور مسلمانوں کو دوبارہ سربلند کردے اور اس طرح ہمارے اوپر خدا کا وعدہ پورا ہو۔ (عبدالرحیم امدادی، مرشد آباد)

جواب

اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ بلاشبہ برحق ہے۔ مگر اس آیت میں مومنین کے لفظ سے مراد عمومی مفہوم میں مسلم ملت یا مسلم قوم نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جو خدا کے اس مطلوب مشن کو لے کر اٹھیں جس کو رسول اللہ کے زمانہ کے اہل ایمان لے کر اٹھے تھے۔ اور اس میں اپنی جان ومال کی قربانی دی تھی۔ جب اہل ایمان کا کوئی گروہ اس قسم کا ربانی مشن لے کر اٹھے اور کچھ لوگ اس کو چیلنج کریں تو ان کا یہ چیلنج خود خدا کے خلاف چیلنج کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی مخالفانہ کارروائی اپنی حقیقت کے اعتبار سے خدا کے خلاف ہوتی ہے نہ کہ محض اہل ایمان کے خلاف۔ یہی وجہ ہے کہ خدا ایسے اہل ایمان کی مدد پر آجاتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ ان کی ان مقابلہ آرائیوں میں خواہ اسلام کا نام لیا جائے یا نہ لیا جائے، ہر حال میں وہ مسلمانوں کی اپنی قومی یا سیاسی لڑائیاں ہیں۔ خدا کا مذکورہ وعدہ موجودہ قسم کی قومی لڑائیوں پر نہیں ہے بلکہ وہ اصحاب رسول جیسی خالص دینی جدوجہد کے اوپر ہے۔ یہ معاملہ

قرآن کی آیتوں میں بالکل واضح ہے مثال کے طور پر فرمایا کہ " ان تنصرو الله ینصر کم" (محمد۔ ۷) یعنی اگر تم اللہ والا کام کرنے کے لئے اٹھو گے تو اللہ تمہاری مدد کر کے تم کو کامیاب بنائے گا۔ اس سے واضح ہے کہ مدد کا وعدہ اللہ والے کام پر ہے نہ کہ مسلمانوں کے اپنے قومی کاموں پر۔

سوال

کیا آپ اس حقیقت سے انکار کریں گے کہ ہندوؤں ہی کی طرح انگریز بھی ہمارے مدعو تھے۔ آخر ان کو ملک سے نکال باہر کرنے کی تحریک کس دعوتی جذبے کے تحت درست قرار دی جاسکتی ہے۔ غالباً آپ اس پر اس لئے تنقید نہیں کرتے کہ یہ ایک ناگزیر تاریخی عمل تھا۔ میرے نزدیک یہی اصول تحریک پاکستان کے معاملہ میں بھی کارفرما ہے (طالب محسن، لاہور)

جواب

ہندستان میں ملکی آزادی کی جو تحریک چلائی گئی اس میں اگرچہ علما بڑی تعداد میں شریک تھے۔ مگر میں اس کو کوئی اسلامی تحریک نہیں سمجھتا۔ اور نہ اس کے لئے جہادِ آزادی کے لفظ کا استعمال شرعاً درست سمجھتا ہوں۔ یہ بات میں نے بار بار الرسالہ میں اور اپنی کتابوں میں لکھی ہے۔ میرے نزدیک آزادی کی یہ تحریک ایک قومی تحریک تھی۔ اور اسی اعتبار سے اس کا جواز ہے۔ اگر پاکستان کی تحریک کے بارے میں یہ مان لیا جائے کہ وہ ایک قومی تحریک تھی نہ کہ کوئی اسلامی تحریک تو اس کے بارے میں بھی میری رائے مختلف ہو جائیگی۔ میں نے بار بار لکھا ہے کہ جن علما نے انگریزوں کے خلاف سیاسی آزادی کی تحریک چلائی انھیں انگریزوں کے معاملہ میں دعوتی تحریک چلانا چاہئے تھا۔ اسی طرح جن مسلم رہنماؤں نے ہندو مسئلہ کے خلاف علیحدہ پاکستان کی تحریک چلائی، ان کے لئے بھی زیادہ صحیح یہ تھا کہ وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں دعوت کی تحریک چلاتے۔ میری ایک ہی رائے دونوں قسم کے مسلم رہنماؤں کے بارے میں ہے۔

سوال

آپ کہتے ہیں کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ مگر قرآن میں اس کا بالکل الٹا ہے۔ قرآن میں مسلمانوں کو قتال کا حکم دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ مشرکوں کو جہاں پاؤ ان کو مارو۔ قرآن اسلام کی مقدس کتاب ہے۔ پھر اسلام امن کا مذہب کیسے ہو سکتا ہے (بیکنٹھ لال شرما پریم، نئی دہلی)

جواب

قرآن میں جہاں قاتلوالمشرکین کا حکم آیا ہے، وہ عام معنی میں نہیں ہے، بلکہ خاص معنی میں ہے۔ یعنی اس سے مراد ساری دنیا اور ہر زمانہ کے مشرکین نہیں ہیں بلکہ پیغمبر اسلام کے معاصر مشرکین ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو پیغمبر اسلام کے خلاف جارحیت کر رہے تھے۔ جنھوں نے آپ کے خلاف یک طرفہ طور پر جنگ چھیڑ دی تھی۔ ان سے دفاع کے طور پر لڑنے کا حکم دیا گیا۔

اسلام میں صرف ایک ہی جائز جنگ ہے اور وہ دفاع کی جنگ ہے۔ اس کے سوا کوئی اور جنگ اسلام میں جائز نہیں۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "فکر اسلامی")

قرآن میں قتال کے حکم کو آپ گیتا کے تقابلی مقابلہ سے سمجھ سکتے ہیں۔ گیتا ہندوؤں کی ایک مقدس کتاب ہے۔ اس میں کرشن جی ارجن کو لڑنے پر ابھارتے ہیں۔ وہ ارجن سے کہتے ہیں کہ تم یدھ کے لئے آگے بڑھو۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ گیتا اپنے ماننے والوں سے کہتی ہے کہ تم لوگ ہمیشہ اور ہر جگہ دوسری قوموں سے لڑتے رہو۔ تم ہر ایک کے خلاف مار کاٹ کرو۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ گیتا میں کرشن جی کی جنگی تلقین وقتی معنی میں ہے نہ کہ ابدی معنی میں۔ یعنی تمہارے سامنے جو اپنائی لوگ ہیں ان سے لڑو۔ انھیں پر یہ جنگ شروع ہوئی اور انھیں پر ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح قرآن میں جس جنگ کا حکم ہے وہ پیغمبر کے زمانے کے ایک جارح گروہ کے خلاف تھی۔ یہ جنگ انھیں پر شروع ہوئی اور انھیں پر ختم ہو گئی۔ بعد کے زمانہ میں اس کا حکم اگر باقی ہے تو صرف جارحیت کرنے والوں کے مقابلہ میں دفاع کے لئے ہے نہ کہ عمومی طور پر لوگوں سے لڑنے مرنے کے لئے۔

ایک انٹرویو

آسٹریلین براڈکاسٹنگ کارپوریشن کے ساؤتھ ایشیا بیورو کے چیف مسٹر جانیتھن ہارلے (Jonathan Harley) نے ۲۲ فروری ۱۹۹۹ کو راقم الحروف کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ایک سوال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میں دہلی میں تھا۔ پھر میں حال میں لاہور گیا تاکہ وہاں ہندستانی وزیر اعظم اور پاکستانی وزیر اعظم کی "بس ڈپلومیسی" (۲۰۔۲۱ فروری) کور کر سکوں۔ ایک بات میں نے ہندستان اور پاکستان دونوں جگہ کے مسلمانوں میں دیکھی۔ یہاں کے مسلمان یہ مانگ کر رہے ہیں کہ سلمان رشدی (مصنف سیٹنک ورسز) کو ہندستان آنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اسی طرح پاکستان کے مسلمان وہاں یہ مانگ کر رہے تھے کہ اٹل بہاری واجپئی (ہندستانی وزیر اعظم) کو پاکستان آنے سے روکا جائے۔ اور جب گورنمنٹ کے انتظام کے تحت اٹل بہاری واجپئی وہاں پہنچ گئے تو پاکستانی مسلمانوں نے یہ نعرہ لگایا کہ "اٹل بہاری گو بیک"۔ ان مسلمانوں نے ایسا کیوں کیا۔ کیا اس طرح کے معاملہ میں اسلام کی تعلیم یہی ہے۔

میں نے کہا کہ دونوں ملکوں کے مسلمانوں کا یہ مطالبہ محض ان کی جذباتی سیاست کا نتیجہ تھا، نہ کہ اسلامی تعلیمات کا نتیجہ۔ اس معاملہ میں اسلام کی تعلیم مسلمانوں کی اس روش کے بالکل برعکس ہے۔

اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے، اور تبلیغی مذہب کسی غیر مسلم کو مدعو کی نظر سے دیکھتا ہے نہ کہ دشمن یا حریف کی نظر سے، حتی کہ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ دشمن کو بھی امکانی دوست کے روپ میں دیکھو کیونکہ تمہارا احسن عمل اس کو بدل کر تمہارا دوست بنا سکتا ہے (حم السجدہ ۳۴)

مذکورہ قسم کے معاملہ میں اسلام کی تعلیم کیا ہے، وہ قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: **وان احد من المشرکین استجارك فاجرہ حتّٰی یسمع کلٰم اللہ ثم ابلغہ مأمنہ ذالك بانھم قوم لا یعلمون (التوبہ ٦)**

(اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے جوار مانگے تو تم اس کو جوار دے دو تاکہ وہ اللہ کے کلام کو سنے پھر اس کو اس کے مامن میں پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے)

عمومی حکم کے اعتبار سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم یا بظاہر مخالف اسلام گروہ کا کوئی فرد مسلم علاقہ میں آنا چاہے تو تم اس کو وہاں بلا روک ٹوک آنے دو۔ اس طرح اس کو یہ موقع ملے گا کہ وہ اسلام کے پیغام کو جانے اور اسلام کے بارے میں اس کی بے علمی ختم ہو جائے:

If a non Muslim seeks a visit to your place let him come to you so that he may hear the word of God. And then arrange for his safe retrurn to his home.

اس قرآنی تعلیم کا تقاضہ ہے کہ جب بھی کوئی "غیر شخص" مسلمانوں کے علاقہ میں آنا چاہے تو اس کی آمد کو روکنے کی مہم نہ چلائی جائے اس کے بجائے انہیں یہ کرنا چاہئے کہ وہ اسے خدا کے پیغام سے آشنا کرنے پر ساری طاقت خرچ کریں۔ وہ سیٹنگ ورسز کے جواب میں ہولی ورسز (Holy Verses) تیار کر کے شائع کریں۔ وہ ہندو ایجنڈا کے بجائے اسلامی ایجنڈا کی معنویت سے لوگوں کو آگاہ کریں۔

صحیح اسلامی ذہن یہ ہے کہ اس طرح کے مواقع کو ایک امکان(Opportunity) کے روپ میں دیکھا جائے اور اس کو بھرپور طور پر استعمال (avail) کیا جائے۔ موجودہ زمانہ پریس اور میڈیا کا زمانہ ہے۔ پریس اور میڈیا، اپنے مزاج کے مطابق، ایسے موقع پر ہر چیز چھاپنے اور مشتہر کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اس لئے ایسے موقع کو اگر منظم طور پر اسلام کے تعارف کے لئے استعمال کیا جائے تو پریس اور میڈیا کے پورے نظام کو اس مقصد کے لئے اپنا زبردست معاون بنایا جاسکتا ہے۔

اسلام کا طریقہ

مکی دور کے ابتدائی زمانہ میں عمر بن الخطاب اسلام کے سخت مخالف بنے ہوئے تھے۔ حتی کہ ایک روز وہ اپنے گھر سے تلوار لے کر نکلے کہ نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کا خاتمہ کر دیں۔ راستہ میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے جنھوں نے ان کے دل کو نرم کر دیا اور وہ اسلام کی طرف مائل ہو گئے۔ اس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مکہ میں اسلام کی سخت مخالفت ہو رہی تھی اور حالات بے حد شدید ہو گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ صفا پہاڑی کے پاس اپنے کچھ اصحاب کے ساتھ ایک مکان میں مقیم تھے جس کو دار ارقم کہا جاتا تھا۔ ایک صحابی خباب کے ذریعہ عمر بن الخطاب کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ صفا کے قریب ایک گھر میں ہیں۔ وہ صفا کی طرف روانہ ہو گئے۔ حسب معمول ان کے کندھے پر ایک تلوار لٹک رہی تھی۔ وہاں پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ جب ان کی آواز سنی تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب کھڑے ہو گئے۔ اور دروازے کی دراز میں سے انھیں دیکھا کہ تلوار لئے ہوئے باہر کھڑے ہیں۔ وہ گھبرائے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پاس لوٹے۔ یہ عمر بن الخطاب ہیں اور تلوار لئے ہوئے ہیں۔ حمزہ بن عبد المطلب نے کہا: ان کو آنے کی اجازت دیجئے۔ اگر وہ بھلائی کے ارادے سے آئے ہیں تو ہم ان کے ساتھ بھلائی ہی کا سلوک کریں گے۔ اور اگر وہ کسی برائی کے ارادے سے آئے ہیں تو ہم ان کو انہی کی تلوار سے قتل کر دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ائذن لہ۔" انھیں آنے دو۔ اس شخص نے آنے کی اجازت سنائی۔ رسول اللہ ﷺ اٹھ کر ان کی طرف چلے۔ ان کے پاس پہنچ کر ان کی چادر کو پکڑ لیا اور ان سے کہا کہ اے خطاب کے بیٹے، تم کو کیا چیز یہاں لائی ہے؟ خدا کی قسم میں نہیں سمجھتا کہ تم باز آؤ گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کوئی آفت تمہارے اوپر نازل فرمائے۔

عمر نے کہا: اے خدا کے رسول! میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ اللہ، اس کے

رسول اور اس چیز پر ایمان لاؤں جو اللہ کے پاس سے آپ لائے ہیں۔ راوی نے کہا: اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس زور سے تکبیر کہی کہ جو اصحاب گھر میں موجود تھے وہ جان گئے کہ عمر نے اسلام قبول کر لیا (سیرۃ النبی لابن ہشام، الجزء الاول۔ ۳۶۷۔۶۸)

دور اول کا یہ واقعہ ایک رہنما واقعہ ہے۔ اس واقعہ سے کئی نہایت اہم سبق معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سبق مختصر طور پر یہ ہیں۔

پہلی بات یہ کہ کوئی شخص اگر مسلمانوں کے پاس آنا چاہے تو مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کو بے روک ٹوک آنے کی اجازت دیں۔ خواہ آنے والا قلم لے کر آنے والا ہو یا تلوار لے کر۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کی نظر خود اپنے دین کی تسخیری طاقت پر ہونا چاہئے نہ کہ دشمن کی دشمنی پر۔

دوسری بات ہے۔ ان کے بارے میں ہمیشہ پر امید رہنا، خواہ بظاہر وہ اسلام اور اہل اسلام کا مخالف ہی کیوں نہ بنا ہوا ہو۔ عمر بن الخطاب اس وقت اسلام کے بارے میں اتنے شدید تھے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "فواللہ ما اری ان تنتھی حتی ینزل اللہ بك قارعۃً" (۳۶۸) اس کے باوجود اسلام کی فطری صداقت نے عمر کو اس حد تک متاثر کیا کہ وہ اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو گئے۔

تیسری بات حضرت حمزہ کے قول سے معلوم ہوتی ہے۔ یعنی اس کے حربہ سے اسی کو شکست دینا (قتلناہ بسیفہ) اس کا مطلب یہ ہے کہ آنے والا جس طاقت سے مسلح ہو کر آرہا ہے اسی طاقت کو اس کے خلاف استعمال کیا جانا چاہئے۔ موجودہ زمانہ میں قلم نے تلوار کی جگہ لے لی ہے۔ آج کا حریف علم اور قلم کے ذریعہ اسلام پر وار کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ علم اور قلم کے میدان میں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ تیار کریں تاکہ وہ فریق ثانی کے اپنے ہی میدان میں اس کو شکست دے سکیں۔

خبرنامہ اسلامی مرکز۔۱۳۹

۱۔ ۵نومبر ۱۹۹۸کولوک نیتی کے زیر انتظام بھائی ویر سنگھ سدن (گول مارکیٹ نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا جس کا موضوع جمہوریت اور مذہبیت (religiosity and democracy) تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر اظہار خیال کیا۔ ایک مقرر نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسلام میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تبلیغ (preaching) کے راستہ میں جو رکاوٹ ڈالے اس سے جنگ کرو۔ اس سلسلہ میں بتایا گیا کہ یہ اسلام کی تعلیم نہیں ہے۔ تبلیغ مکمل طور پر ایک پرامن عمل ہے۔ تبلیغ اسی دائرہ میں کی جائے گی جس دائرہ میں نظام اس کی اجازت دیتا ہو۔ مثلاً مکہ کے ابتدائی دور میں علانیہ تبلیغ کی صورت میں وقت کے نظام سے ٹکراؤ کا اندیشہ تھا تو پیغمبر اسلام نے خفیہ انداز میں تبلیغ کی۔ اسلام میں جنگ صرف دفاع کے لئے ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں صدر اسلامی مرکز نے کہا کہ مہاتما گاندھی، جے پرکاش نرائن اور آیات اللہ خمینی جو تبدیلی لائے وہ ریولیوشن نہیں تھا۔ بلکہ کو (coupe) تھا۔ اس میں صرف سیاسی ٹیم بدلی۔ اور سماجی حالت میں کوئی حقیقی انقلاب نہیں آیا۔ ایک ہندو جرنلسٹ نے کہا کہ یہ مہاتما گاندھی کے ریولیوشن کو گھٹا کر بتانا ہے۔ مہاتما گاندھی کا ریولیوشن پراسس کی صورت میں سماجی بدلاؤ لارہا ہے۔ کہا گیا کہ یہ اگر پراسس ہے تو وہ الٹے رخ (reverse direction) میں جاری ہے۔ کیونکہ ۱۹۴۷سے پہلے ہمارے ملک میں ایک فیصد کرپشن تھا تو آج ۱۰۰ فیصد کرپشن ہے۔ مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ میرا مشن ہر آنکھ کے آنسو پوچھنا ہے۔ گاندھی ریولیوشن کا یہ رزلٹ ۵۰ سال بعد بھی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

۲۔ بی بی سی (نئی دہلی) کے تحت ۳دسمبر ۱۹۹۸کو ایک پینل ڈسکشن ریکارڈ کیا گیا جو ۵دسمبر کی رات کو نشر کیا گیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں حصہ لیا۔ اس کا موضوع

تھا: نئے ہندستان میں مسلمانوں کے مسائل۔ اس موضوع پر انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ بابری مسجد کا مسئلہ علماء کے ایک بورڈ کے ذریعہ طے کیا جانا چاہئے۔ زور زبردستی کے ذریعہ کوئی بھی مسئلہ حل نہیں کیا جاسکتا۔ زور زبردستی کے ذریعہ جو مسئلہ حل کیا جائے گا وہ نئے نئے مسائل پیدا کر کے معاملہ کو اور زیادہ سنگین بنا دیتا ہے۔

۳۔ لاس اینجلس ٹائمس کے نئی دہلی بیورو چیف مسٹر ڈکسٹر فلکنس (Dexter Filkins) نے ۹ دسمبر ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق بعض اسلامی مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ میوزک کو اسلام میں حرام نہیں کیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ کچھ شرطیں ہیں مثلاً غیر اخلاقی میوزک جائز نہیں۔ البتہ روحانی میوزک جائز کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر صوفیاء کے یہاں قوالی کی صورت میں اس کا رواج رہا ہے۔

۴۔ دور درشن (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۵ دسمبر ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق بابری مسجد جیسے مسائل سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ مسائل صرف ہندستان کی خصوصیت نہیں ہیں بلکہ مسائل ہر جگہ پیدا ہوتے ہیں۔ مسلم ملکوں میں بھی اسی طرح مسائل ہیں جس طرح ہندستان میں مسائل ہیں۔ مسائل کا حل ہمیشہ حکیمانہ تدبیر ہوتا ہے نہ کہ شور وغل۔

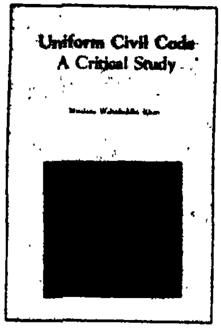
۵۔ ہندی ہفتہ وار جن چیتنا کے ایڈیٹر مسٹر رام گوپال سسوڈیا (دہلی) نے ۱۲ دسمبر ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ملکی مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کے دینی مدارس اور ملک کے سکولر اسکولوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔

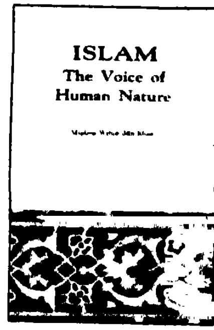
بنگلور کے انگریزی ہفتہ روزہ ایمی ننس (Eminence) کے نمائندہ مسٹر انور علی نے ۲۹ دسمبر ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلم فنڈ مظلوم جیسی کوئی چیز انڈیا میں نہیں۔ بعض مسلم ملکوں میں ضرور فنڈ مطلسٹ گروپ پائے جاتے ہیں مگر جہاں تک انڈیا کا تعلق ہے یہاں کوئی قابل ذکر مسلم فنڈ مطلسٹ گروپ نہیں۔ بعض افراد پائے جاتے ہوں تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

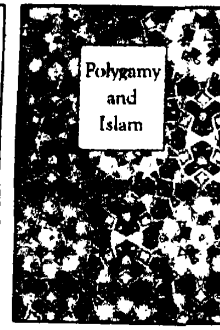
۶۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۸ کو دہلی کے ہندی اخبار جن ستا کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں صدر اسلامی مرکز نے کہا کہ اسلام بلاشبہ حب الوطنی کی تعلیم دیتا ہے۔ البتہ اسلام میں وطن کی پرستش کی تعلیم نہیں۔ وطن کی پرستش کچھ لوگوں کا مذہبی عقیدہ ہو سکتا ہے، مگر یہ حب وطن کی کوئی شرط نہیں۔

۷۔ ۹ دسمبر ۱۹۹۸ کو پروٹسٹنٹ چرچ نئی دہلی میں ایک جلسہ ہوا۔ اس میں مختلف مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے بھی اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ فرق اور اختلاف کے باوجود ہر ایک کا احترام کرو۔ ہر ایک کو اس کے اخلاقی اور انسانی حقوق ادا کرو۔ حدیث رسول کی روشنی میں اس کو واضح کیا گیا۔

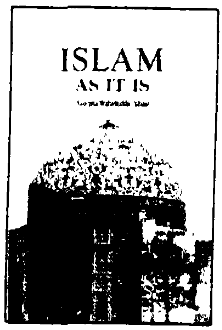
۸ آل انڈیا ریڈیو (نئی دہلی) میں ۲ جنوری ۱۹۹۹ کو ایک پینل ڈسکشن ہوا۔ اس میں پروفیسر مدھو ڈنڈوتی اور دوسرے تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بتایا کہ ہمارے دیش کی پہچان کیریکٹر ہے۔ دوسری بات یہ کہ کیرکٹر کی تعمیر ایجوکیشن کے ذریعہ ہوتی ہے۔ مجبورانہ کیریکٹر حکومت کے زور پر بھی لایا جاسکتا ہے مگر وہ غیر مفید ہے۔ اصل ضرورت سلف ڈسپلن کی ہے اور سلف ڈسپلن صرف ایجوکیشن کے ذریعہ آسکتا ہے۔

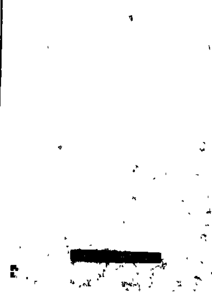

Uniform Civil Code
A Critical Study

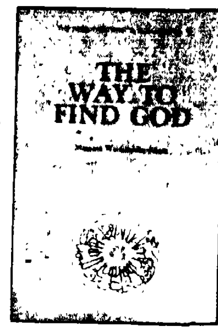

ISLAM
The Voice of
Human Nature

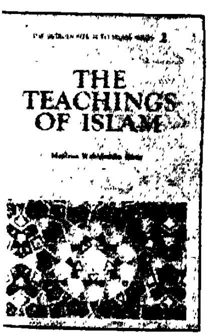

Polygamy
and
Islam

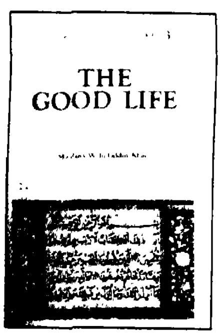

Tabligh
Movement

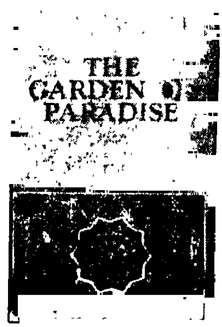

ISLAM
AS IT IS

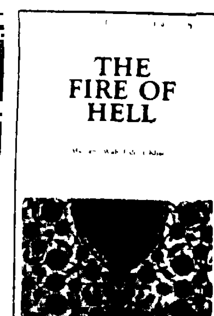


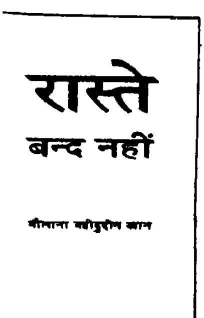

THE
WAY TO
FIND GOD

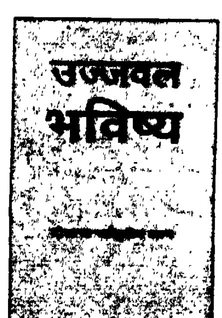

THE
TEACHINGS
OF ISLAM


THE
GOOD LIFE


THE
GARDEN OF
PARADISE


THE
FIRE OF
HELL


रास्ते
बन्द नहीं


उज्जवल
भविष्य

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

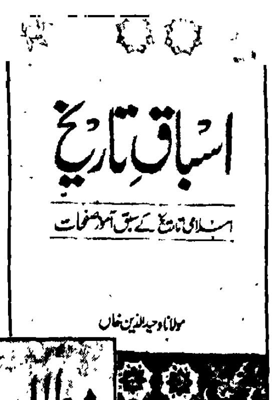
اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

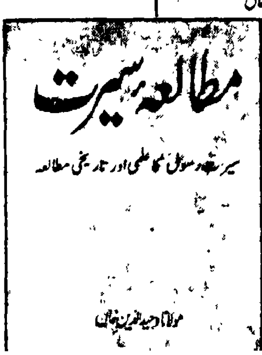
زیر سرپرستی
مولانا وحیدالدین خاں
صدر اسلامی مرکز

مئی 1999 شمارہ 270

فہرست — صفحہ

نئی کتابیں





Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
skhan@vsnl.com
http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi

جنتی کون

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ اپنے سچے بندوں کو اس جنت میں داخل کرے گا جس کی پہچان اس نے انھیں کرادی ہے (یدخلهم الجنة عرفها لهم) دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ اہل جنت کو جب جنت کے پھل دئے جائیں گے تو وہ کہیں گے۔ یہ تو وہی پھل ہے جو ہمیں دنیا میں دئے گئے تھے۔ (هذا الذی رزقنا من قبل) (التوبہ ۲۵)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنتی کون ہے۔ جنتی انسان وہ ہے جس نے دنیا ہی میں آخرت کا تجربہ کیا۔ جس نے آخرت میں خدا کو براہ راست دیکھنے سے پہلے ابھی دنیا میں اس کو بالواسطہ طور پر دیکھا۔ جس نے اس بے پناہ شکر خداوندی کا دنیا ہی میں تجربہ کیا جو کسی آدمی کو اس وقت حاصل ہوگا جب کہ وہ اپنے آپ کو جنت کے لطیف و نفیس دنیا کے اندر پائے گا۔ جس کے لئے خدا کی دنیا میں عاید کی جانے والی خدائی ذمہ داریاں اس طرح پر لذت بن گئیں جس طرح کسی کو آخرت میں ملنے والا انعام پر لذت معلوم ہوگا۔ جس نے دنیا ہی میں ان حقیقتوں کو معرفت کے درجہ میں پالیا جن کو پانے والے آخرت میں واقعہ کے درجہ میں پائیں گے۔

جنتی انسان وہ ہے جس نے کائنات کی وسعتوں میں جنت کی وسعتوں کو دیکھا۔ جس نے چڑیوں کے چہچے میں جنت کے نغموں کو سنا۔ پانی کی ٹھنڈک جس کے لئے خدا کی رحمت بن کر اس کی رگوں میں اتر گئی۔ جس کا سینہ ان کیفیات رحمت سے معمور ہو گیا جو جنت کے باشندوں کا خاصہ ہوگا۔

جنتی انسان وہ ہے جو دنیا میں اس مچھلی کی طرح رہا جس کو پانی سے نکال کر باہر ڈال دیا گیا ہو۔ جنتی انسان وہ ہے جو آخرت کی یاد میں اتنا زیادہ محو ہوا کہ دنیا کی لذتیں اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ گئیں۔ جنتی انسان وہ ہے جو اس وقت بھی جنت میں تھا جب کہ ابھی وہ جنت سے باہر تھا، اس فرق کے ساتھ کہ پہلے اس نے اپنے تصورات میں جنت کو پایا تھا اور بعد کو وہ اپنے حقیقی تجربہ میں جنت کا ایک خوش نصیب باشندہ ہوگا۔

غیر مسنون تحریکیں

مکّہ کے عربی ہفت روزہ **العالم الاسلامی** (۲۹ شوال ۱۴۱۹ھ۔ 31 Feb. 1989) کے ساتھ چوبیس صفحات کا ایک فلسطینی ضمیمہ شامل ہے۔اس ضمیمہ کے آخری صفحے پر بیت المقدس کی ایک بڑی تصویر چھپی ہے۔اس کے اوپر جلی حرفوں میں یہ لکھا ہوا ہے: **متی... تعود القدس** (قدس کب واپس ہوگا)۔

موجودہ مسلمانوں کا لکھنے والا اور بولنے والا طبقہ قدس کے معاملے میں جس طرح سوچتا ہے، یہ اس کا ایک نمونہ ہے۔ان لوگوں کی سوچ یہ ہے کہ قدس (قبلۂ اول) یہودیوں کے قبضہ میں ہے ایسی حالت میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس کو یہودیوں کے سیاسی قبضہ سے نکالا جائے اس کے بغیر وہاں کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

جو لوگ قدس کو قبلۂ اول کا جذباتی نام دے کر اس کی واپسی کی خونی مہم چلارہے ہیں،ان کو معلوم نہیں کہ ہجرت کے بعد جب پیغمبر اسلام نے قدس کو اپنا قبلہ بنایا تھا اس وقت بھی وہ اغیار کے سیاسی قبضہ میں تھا نہ کہ مسلمانوں کے قبضہ میں۔ایسی حالت میں قبلۂ اول کے نام سے جو لوگ یہ تحریک چلارہے ہیں اس کا کوئی تعلق نہ قبلۂ اول سے ہے اور نہ پیغمبر اسلام کی سنت سے۔

پیغمبرؐ اسلام اپنی نبوت کے ابتدائی تیرہ سال تک مکہ میں تھے۔اس وقت کعبہ کی حالت مزید اضافے کے ساتھ عین وہی تھی جو اس وقت قدس کی بتائی جاتی ہے۔اس وقت کعبہ کے اوپر مشرکین کا مکمل قبضہ تھا۔ اس کے باوجود پیغمبر اسلام نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ "**متی تعود الکعبه**" (کعبہ کب واپس ہوگا) بلکہ اس کو اسی حالتپر باقی رکھتے ہوئے آپ روزانہ کعبہ میں جاتے،اور وہاں عبادت کرتے،اور مشرکین سے مل کر انھیں پرامن طور پر توحید کا پیغام دیتے۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اسلام کے نام پر جو تحریکیں چلارہے ہیں وہ کس قدر غیر اسلامی ہیں۔انھوں نے دین کے ساتھ سیاسی اقتدار کو اس طرح

ناقابلِ تقسیم حد تک جوڑ رکھا ہے گویا کہ جب تک سیاسی اقتدار حاصل نہ ہو کوئی دینی کام نہیں کیا جاسکتا۔ یہ فکر پیغمبر اسلام کے طریقہ کے سر اسر خلاف ہے۔ یہی غیر مسنون طریقہ ہے جس نے موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی اسلامی تحریکوں کو ایک بے فائدہ ہنگامہ بنادیا۔ قربانی کی حد تک عمل کرنے کے باوجود ان تحریکوں کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔

پیغمبرؐ اسلام کا طریقہ کیا تھا۔ مکی دور میں کعبہ پر مشرکین کا سیاسی قبضہ قائم تھا، اس کے باوجود آپ نے کعبہ کو مرکز عبادت اور مرکز دعوت کے طور پر استعمال کیا۔ معراج کے وقت بیت المقدس پر غیرمسلموں کا قبضہ تھااس کے باوجود آپ اللہ کے حکم سے وہاں گئے اور تمام نبیوں کے ساتھ اجتماعی نماز ادا کی۔ ہجرت کے بعد بیت المقدس پر عیسائیوں کا سیاسی قبضہ تھا، اس کے باوجود آپ نے تقریباً ڈیڑھ سال تک بیت المقدس کو اپنا قبلۂ عبادت بنایا، وغیرہ

پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ کا طریقہ یہ نہیں تھا کہ بروقت جو سیاسی حالت (political statusquo) قائم ہے اس کو سب سے پہلے توڑیں اور اس کے بعد اپنا دینی فریضہ ادا کریں۔ اس کے برعکس آپ کا طریقہ یہ تھا کہ موجود سیاسی اقتدار کے باقی رہتے ہوئے جو دینی یا دعوتی عمل کیا جاسکتا ہے، اس سے اپنا عمل شروع کردینا۔ سیاسی مسائل کو حالتِ التواء میں رکھ کر موجود مواقع کو اپنے حق میں استعمال کرنا۔ یہی پیغمبر اسلام کی سنت ہے، اور اس دنیا میں کامیابی صرف ان لوگوں کے لئے مقدر ہے جو پیغمبر اسلام کی سنت پر عمل کریں۔

مذکورہ قسم کا سیاسی فکر آدمی کو صرف محرومی اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کرتا ہے، وہ کسی کو مثبت عمل کا حوصلہ نہیں دیتا۔ اس کے برعکس اگر سیاسی اقتدار کو چھیڑے بغیر ممکن دائرے میں اپنا کام شروع کردیا جائے تو آدمی کو فوراً ہی مثبت کام کے لئے کھلا ہوا میدان مل جائے گا۔ اب ہر آدمی امید اور حوصلے کے ساتھ اقدام کی پوزیشن میں ہو جائے گا۔ وہ رکاوٹ کی چٹان سے غیر ضروری ٹکراؤ کئے بغیر اپنے لئے تعمیری عمل کے مواقع پالے گا اب اس کا ہر قدم منزل کی طرف بڑھنے کے ہم معنیٰ ہو گا۔

ہماچل پردیش کا سفر

مفتی عبد العزیز صاحب رائے پوری نے ستمبر ۱۹۷۹ میں مسر والا (ہماچل پردیش) میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنے شیخ مولانا عبد القادر رائپوری کے نام پر اس کا نام مدرسہ قادریہ رکھا۔ اس کے بعد جلد ہی اپنے شاگرد مولانا کبیر الدین فاران مظاہری کو بلا کر اس کا انتظام ان کے حوالے کر دیا۔ ۱۹۸۰ سے مولانا کبیر الدین صاحب اس کے ناظم ہیں۔

پچھلے دس سال سے وہ برابر مجھ کو اپنے مدرسہ میں آنے کی دعوت دے رہے تھے، کبھی براہِ راست اور کبھی ٹیلی فون پر۔ مگر کسی نہ کسی سبب سے وہاں کا سفر نہ ہو سکا۔ ۷ نومبر ۱۹۹۵ کی صبح کو وہ دہلی آئے اور کچھ اس انداز سے اصرار کیا کہ میرے لئے انکار نا ممکن ہو گیا۔ میں نے کہا کہ اچھا، میں ابھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ چنانچہ میں اپنے پھیلے ہوئے کاموں کو چھوڑ کر صبح ۱۰ بجے ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

ہماری گاڑی چلتے ہوئے اس سڑک پر پہنچی جہاں ایک طرف تاریخی جامع مسجد ہے اور دوسری طرف لال قلعہ کی سرخ دیواریں کھڑی ہوئی ہیں۔ لال قلعہ کو دیکھ کر مجھے اردو شاعر کی طویل نظم کا ایک شعر یاد آیا:

اے قلعۂ سرخ اے اثرِ شاہجہانی　　　　برباد شدہ عظمتِ ماضی کی نشانی

یہ شعر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی نفسیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ ماضی کی گزری ہوئی عظمتوں میں اتنا گم ہوئے کہ وہ حال کی حقیقتوں کا صحیح ادراک نہ کر سکے۔ پدرم سلطان بود کی نفسیات نے انہیں مثبت نقطۂ نظر سے محروم کر دیا۔ اس المناک صورت حال کا سبب یہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں جو لوگ مسلمانوں کے رہنما بن کر اٹھے وہ زیادہ تر شاعر اور خطیب اور انشاء پرداز قسم کے لوگ تھے انہوں نے رجز خوانی کی، جب کہ اس وقت اصل ضرورت حقیقت بیانی کی تھی چنانچہ ان لوگوں نے اپنی غیر حقیقی باتوں سے پوری ملت کے مزاج کو بگاڑ دیا۔ موجودہ زمانہ میں

شاید کوئی بھی ایسا رہنما نہیں جس نے معاملات کو گہرائی کے ساتھ سمجھا ہو اور پھر حقیقت پسندانہ انداز میں مسلمانوں کو درست رہنمائی دی ہو۔

لال قلعہ اور قطب مینار کی حیثیت آج صرف آثار قدیمہ کی ہے جو گروہ لال قلعہ اور قطب مینار کی فضاؤں میں جیتا ہو وہ خود بھی آثار قدیمہ کی ایک مثال بن کر رہ جائے گا، وہ دور جدید میں باعزت مقام حاصل کرنے میں ناکام رہے گا۔

دہلی سے نکل کر آگے بڑھے تو سڑک کے دونوں طرف دور تک درخت اور سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ ساری کائنات کے مقابلہ میں زمین اس سے بھی زیادہ چھوٹی ہے جتنا کہ پوری زمین کے مقابلہ میں ایک ذرہ۔ مگر اب تک کی معلومات کے مطابق، زمین ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں پانی اور سبزہ ہے۔ ساری وسیع کائنات میں کہیں بھی پانی اور سبزہ موجود نہیں۔

اسی پانی اور سبزہ نے زمین کو انسان جیسی زندہ مخلوق کے لئے قابل رہائش بنادیا ہے۔ یہاں اس کے لئے نہ صرف رہائش کا سامان ہے بلکہ تمدنی ترقیوں کے لئے تمام ممکن اسباب بھی موجود ہیں۔ یہ اللہ تعالی کی انتہائی عظیم نعمت ہے۔ اس کا شکر صرف یہ ہے کہ آدمی دل سے اس عطیہ کا اعتراف کرے اور اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کی تابعداری میں دے دے۔

یہ سفر مدرسہ کی کار سے ہوا۔ راستہ میں میں نے مولانا کبیر الدین صاحب سے پوچھا کہ ۱۹۴۷ میں جب ملک تقسیم ہوا اس کے بعد ہندوستان میں کتنے ایسے مولوی تھے جن کے پاس کار اور ٹیلی فون تھے۔ انہوں نے کچھ دیر سوچا اور پھر بولے کہ شاید ایک بھی نہیں۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ آج کیا حال ہے انہوں نے کہا کہ آج تو ملک میں ہزاروں مولویوں کے پاس کار اور ٹیلی فون موجود ہیں۔ میں نے کہا کہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ایسے مولوی ہیں جن کو آج براہِ راست یا بالواسطہ طور پر کار اور ٹیلی فون کی سہولت حاصل ہے۔

پھر میں نے کہا کہ مگر کوئی بھی مولوی ایسا نہیں جو تحریر یا تقریر کے ذریعہ یہ اعلان کرتا ہو کہ مسلمان اس ملک میں ترقی کر رہے ہیں، نہ اکابر میں اور نہ غیر اکابر میں، بلکہ یہی لوگ ہیں جو

اپنی تقریروں اور تحریروں میں روزانہ ہندستانی مسلمانوں کی بربادی کا چرچا کرتے ہیں۔ حتی کہ باہر کے ملکوں میں بھی جاکر وہ اسی قسم کی خبریں وہاں کے لوگوں کو سناتے ہیں۔ مثلاً مکہ کے اخبار "العالم الاسلامی" کے تازہ شمارہ ۱۲ نومبر 1995 میں ایک معروف ندوی عالم کا انٹرویو چھپا ہے۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ انڈیا کے مسلمان مخالفانہ مؤامرات کا اور ہندوؤں کی عداوت کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس کا عنوان ہے ـــــ انڈیا کے مسلمان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان (مسلمو الهند بَيْن فكّي الرَّحى)

انٹرویو لینے والا اگر سمجھدار ہوتا تو وہ ان سے پوچھتا کہ جب تمام ہندستانی مسلمان ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں تو تم کس طرح اتنے شاندار طور پر اس سے بچنے میں کامیاب ہوگئے۔ ہم کو تو تم وہی تدبیر بتاؤ تاکہ ہم بشّرو ولا تنفروا کے اسلامی اصول پر ہندستان کے مسلمانوں کو اس کی خوشخبری دے سکیں۔

اپنے ملک کے پڑھے لکھے مسلمانوں کی سوچ کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک ماضی کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے مسلمانوں کے لیڈروں نے سمجھایا کہ ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ اس لئے ہمیں علیحدہ ملک چاہئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے تمام دماغ آج تک ماضی کے اسی بے بنیاد پروپیگنڈے میں گم ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ماضی کے مسلم لیڈروں کی تقسیم کے مطابق، ہم "ہندو انڈیا" میں ہیں، اس لئے ہم ضرور تباہ حال ہوں گے۔ چنانچہ وہ ابھی تک وہی ماضی کی بولی بولے چلے جارہے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آج ہندستان کے مسلمان پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں سے بھی زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔ خود لکھنے اور بولنے والے طبقہ میں ایک ایک شخص اپنی ۱۹۴۷ کی حالت کے مقابلہ میں آج بہت زیادہ ترقی حاصل کئے ہوئے ہے۔ مگر تخلیقی فکر کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے انہیں اپنے قریبی واقعہ تک کا علم نہیں۔

ماضی کے مسلم رہنماؤں کی سوچ قانون فطرت کے خلاف تھی۔ چنانچہ ان مسلم رہنماؤں

کی باتیں فضا میں گم ہو گئیں۔ اور فطرت کا قانون خود اپنی طاقت سے قائم ہو گیا۔ مگر موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ انہیں صرف اپنے اکابر کی باتوں کا علم ہے، انہیں خدا کے مقرر کئے ہوئے فطری قانون کا کوئی علم نہیں۔

دہلی سے مسروالا کا فاصلہ ڈھائی سو کیلو میٹر سے کچھ زیادہ ہے۔ سڑک اچھی ہے۔ راستہ میں سونی پت، پانی پت، کرنال، جمنا نگر وغیرہ پڑتے ہیں۔ ہم لوگ ایک کے بعد ایک ان مقامات سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ میں نے سوچا کہ ان جگہوں کے نام اسی طرح صدیوں سے چلے آرہے ہیں۔ لیکن ان کے قدیم باشندے آج پیدا ہوں تو ان جگہوں کی بدلی ہوئی صورت کی بنا پر شاید وہ انہیں پہچان نہ سکیں۔

سونی پت سے آگے بڑھے تو سڑک کے کنارے دو کاریں الٹی پڑی ہوئی تھیں۔ دونوں بالکل چکنا چور ہو چکی تھیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ رہی تھیں چنانچہ جب دونوں کار کا آمنا سامنا ہوا تو دونوں میں سے کوئی بھی اپنی گاڑی کو کنٹرول نہ کر سکا اور دونوں ہی ٹکرا کر تباہ ہو گئیں۔

میں نے کہا کہ گاڑی خواہ کتنی اچھی ہو، اور ڈرائیور خواہ کتنا ہی ماہر ہو۔ بہر حال اس کو سڑک پر چلتے ہوئے اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہے کہ سڑک کے اوپر دوسری گاڑیاں بھی دوڑ رہی ہیں۔ اگر وہ اس حقیقت کا اعتراف نہ کرے تو کوئی بھی چیز اس کے کام نہیں آئے گی۔ وہ خود بھی تباہ ہو گا اور اسی کے ساتھ اس کی تیز دوڑتی ہوئی گاڑی بھی۔

ڈیڑھ بجے ہم لوگ کرنال پہونچے۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک مسجد ہے جس کے اوپر "مسجد صغرا" لکھا ہوا ہے۔ اس میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ مسجد بظاہر قدیم تھی۔ مگر مزید تعمیر کر کے اس کو اندر سے نیا کر دیا گیا ہے۔ پوری مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔

مجھے قرآن کی آیت یاد آئی کہ جمعہ کی نماز کی اذان ہو تو نماز کے لئے اکھٹا ہو جاؤ اور جب نماز ختم ہو تو خدا کی زمین میں منتشر ہو جاؤ۔ میں نے سوچا کہ مسجد منتشرین کا مقام اجتماع ہے۔

اہل ایمان خدا کی زمین میں پھیلنے والے لوگ ہیں۔ وہ صرف وقتی طور پر مسجد میں ٹھہرتے ہیں تاکہ اس سے نئی توانائی لے کر دوبارہ آگے بڑھ سکیں۔

کرنال میں سڑکوں پر بہت سی مسجدیں دکھائی دیں۔ ایک عمارت پیچھے سے مسجد کی شکل کی تھی۔ لیکن آگے سے اس کو گوردوارہ بنادیا گیا تھا۔

کرنال میں ایک بہت بڑی مسجد ہے۔ اس کو اندر جاکر دیکھا۔ اس کے امام سید انور حسین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ امام صاحب نے چائے کے لئے اصرار کیا مگر ہمارے پاس وقت کم تھا اس لئے معذرت کرنی پڑی۔ مسجد کے باہر ایک کتبہ لگا ہوا ہے۔ اس پر لکھا ہے ـــــــ تعمیر کردہ نواب عظمت علی خاں، رئیس اعظم کرنال۔ وہ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے چچا تھے۔ انہوں نے یہ مسجد ۱۹۲۵ میں بنوائی تھی۔

۱۹۴۷ میں کرنال مکمل طور پر مسلمانوں سے خالی ہو گیا تھا۔ اب دوبارہ مسلمان آکر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ اس وقت کرنال میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔

دوپہر کا کھانا ہم لوگوں نے کرنال میں میور ریستوران میں کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر باہر آئے تو ایک صاحب آگے بڑھ کر مجھ سے ملے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے آپ کو ٹی وی پر دیکھا تھا اس لئے پہچان گیا۔ آپ کی بات مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ ان کا نام ایم آر کپور تھا۔ انہوں نے آٹو گراف کے لئے کہا۔ میں نے انگریزی کا ایک جملہ لکھ کر اس کے نیچے اپنے دستخط کر دیئے۔ اس درمیان میں کئی لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ ایک خاتون نے بھی آٹو گراف لیا۔

عصر کی نماز ہم نے جمنا نگر میں پڑھی۔ وہاں سڑک کے کنارے ایک مسجد تھی۔ اس میں چار پانچ زیادہ عمر کے اور سیدھے سادے مسلمان نظر آئے۔ ان سے پوچھا کہ جمنا نگر میں کتنی مسجدیں ہیں، کسی نے کہا ایک۔ کسی نے کہا تین۔ غرض کافی پوچھ گچھ کے بعد معلوم ہوا کہ وہاں پانچ مسجدیں ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں یہ شکایت کی تھی کہ :

بازار میں ہیں لاکھوں، مسجد میں فقط جمّن

آج اگر چہ کمیت کے اعتبار سے مسجد کے نمازیوں کی آبادی کافی بڑھ گئی ہے مگر جہاں تک کیفیت کا تعلق ہے، اب بھی مسجد کی آبادی میں زیادہ تر "جمتن" قسم کے لوگ ہی دکھائی دیتے ہیں۔

کرنال کے ریستوران سے کھانا کھا کر ہم لوگ نکلے تو مولانا کبیر الدین صاحب پاس کی ایک دکان پر چلے گئے۔ وہاں انہوں نے پان خریدا جس کی قیمت دو روپیہ تھی۔ پان والا ایک نوجوان ہندو تھا۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے پوچھا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ اس نے کہا کہ سہارن پور۔ پھر پان والے نے کہا، کیا آپ کبھی سہارن پور گئے ہیں۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے کہا کہ ہاں، میں نے وہاں تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے بعد اس نے پان کی قیمت نہیں لی۔ اس نوجوان کا نام ارُن تھا۔ وہ دکان سے آکر مجھ سے ملا۔

مذکورہ واقعہ احساس قربت کا کرشمہ تھا۔ سامنے کے آدمی کو اگر کسی طرح آپ قربت کا احساس دلا دیں، خواہ وہ قربت بالکل معمولی نوعیت کی کیوں نہ ہو تو فوراً وہ آپ کا گرویدہ ہو جائے گا۔ دو آدمیوں یا دو گروہوں کے درمیان اجنبیت ہمیشہ نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قرابت اپنے آپ سارے معاملات کو درست کر دیتی ہے۔

ہم لوگ صبح ۱۰ بجے دہلی سے روانہ ہوئے تھے۔ شام کو عشاء کے قریب مسروالا پہنچے، اس سفر میں ہم کبھی آبادی کے درمیان سے گزرے اور کبھی خالی سڑک سے، کبھی ہمارا راستہ کھلے میدان سے طے ہوا اور کبھی ایسے راستہ سے جہاں دونوں طرف جنگل تھا۔

کبھی ہماری گاڑی نشیب پر چلی اور کبھی اس کو انچائی کے اوپر چڑھنا پڑا۔ میں نے سوچا کہ اسی طرح پوری زندگی ایک سفر ہے جو آخرت پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ دنیا میں آدمی مختلف احوال سے گزرتے ہوئے چلا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی موت آتی ہے اور وہ آخری طور پر اگلی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔

نماز عشاء کے بعد مدرسہ کے دفتر میں اساتذہ اکٹھا ہوئے۔ اس موقع پر مختلف باتیں

ہوئیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ کچھ لوگ آپ کے پیغام کے مخالف کیوں ہیں۔

میں نے کہا کہ میں تو سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی شخص میرے پیغام کا مخالف نہیں۔ کیونکہ میرا پیغام وہی ہے جو خود فطرت کا قانون ہے۔ اور فطرت کے قانون کو نظر انداز کرنا کسی کے لئے ممکن ہی نہیں۔

پھر میں نے کہا کہ میری تحریریں ۹۹ فیصد اسلام کے تعارف پر مبنی ہوتی ہیں۔ کوئی بھی شخص ان کا مخالف نہیں۔ کیونکہ کہ اس میں کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔ اس میں میں نے صرف یہ کیا ہے کہ اسلام کی متفقہ تعلیمات کو جدید اسلوب میں پیش کیا ہے۔ اس کا کوئی مخالف نہیں ہو سکتا۔

ایک فیصد وہ ہے جس کا تعلق برادران وطن سے ہے۔ اس سلسلہ میں میرا کہنا ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ برادران وطن کے ساتھ مل جل کر رہیں اور اگر کبھی کسی کی طرف سے اشتعال انگیزی ہو تو اس سے اعراض کریں تاکہ پرامن فضا باقی رہے۔ اس پر بھی تمام کے تمام مسلمان عامل ہیں۔ آپ کسی بھی مسلمان کو لیجئے اور دیکھئے کہ اس کا ذاتی معاملہ جن ہندوؤں سے ہے اس کے ساتھ وہ کس قسم کا سلوک کرتا ہے۔ آپ پائیں گے کہ یہ عین وہی ہے جس کی طرف الرسالہ میں توجہ دلائی جارہی ہے۔ میں نے صرف یہ کیا ہے کہ میں لوگوں کے عمل کا اعلان کررہا ہوں۔

عشاء کی نماز مدرسہ قادریہ کی مسجد میں پڑھی۔ مسجد بالکل جدید طرز کی ہے اور سادگی کے ساتھ خوبصورتی کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس کی خصوصیات کی تصویر کشی لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اس کو آنکھوں سے دیکھ کر ہی سمجھا جاسکتا ہے۔

عشاء کی نماز کے بعد طلبہ نے مصافحہ کیا۔ اکثر ایسے موقع پر لوگ بھیڑ کی صورت میں مصافحہ کرتے ہیں۔ مگر یہاں یہ ہوا کہ طلبہ نے مسجد کی دیوار سے مل کر قطار بنالی اور ایک ایک طالب علم آگے بڑھ کر مصافحہ کرتا رہا۔ اس طرح تقریباً دو سو طلبہ نے مصافحہ کیا۔

مدرسہ کے قریب سے ایک اہم سڑک گزرتی ہے۔ مگر اس سڑک کو مدرسہ سے جوڑنے

کے لئے درمیان میں پختہ راستہ نہیں تھا۔ ۱۹۸۴ میں مدرسہ میں ایک بڑا جلسہ ہو رہا تھا۔ منتظمین نے ریاستی حکومت کے نام ایک درخواست بھیجی کہ ہمارے یہاں ایک بڑا مذہبی جلسہ ہونے والا ہے۔ لوگ دور دور سے اس میں شرکت کے لئے آئیں گے۔ مگر عام سڑک اور مدرسہ کے درمیان اچھا راستہ نہیں ہے۔ اس کے بعد حکومت کی طرف سے مدرسہ تک ایک پختہ سڑک بنادی گئی۔ میں نے چل کر دیکھا تو وہ ۲۸۰ قدم لمبی تھی۔

مدرسہ کے مہمان خانہ میں بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ اتفاق سے میرا ہاتھ ہلا اور چائے میری چادر پر گر گئی۔ مولانا کبیر الدین فاران مظاہری نے فوراً میری چادر لے کر ایک طالب علم کو دیا کہ اسے لے جاکر ابھی دھودو۔ یہ رات کا وقت تھا۔ میں نے سوچا کہ اس وقت تو چادر سوکھے گی نہیں۔ کل اس کو دھوپ میں ڈالنا ہوگا۔ پھر غالباً دوپہر تک وہ سوکھ کر مجھے ملے گی۔ میں اسی خیال میں تھا کہ ۲۰ منٹ کے بعد طالب علم نے صاف چادر لاکر میرے پاس رکھ دی۔ اتنی دیر میں وہ دھوئی گئی، سکھائی گئی اور پریس کر کے تہ کی گئی اور پھر میرے پاس واپس آگئی۔



اس کا راز یہ تھا کہ یہاں مدرسہ میں جدید طرز کی واشنگ مشین موجود ہے جو دھونے کے بعد فوراً سکھانے کا کام بھی کر دیتی ہے۔ یہ ایک علامتی واقعہ ہے جس سے مدرسہ کی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نصاب کے اعتبار سے یہ ایک "قدیم طرز" کا مدرسہ ہے۔ مگر نظام اور تعمیرات کے اعتبار سے وہ بالکل جدید اور اپٹوڈیٹ ہے۔ اس کو دیکھ کر میں نے کہا کہ آپ نے تو اپنے مدرسہ کو ایک ماڈرن مدرسہ بنادیا۔

اسی طرح مدرسہ میں آٹا پیسنے کی مشین ہے۔ مدرسہ کی ضرورت کا آٹا خود اپنی مشین میں پیسا جاتا ہے، وغیرہ۔

ایک بار ایک مسلمان تاجر مدرسہ قادریہ میں آئے۔ انہوں نے طلبہ کو دیکھ کر کہا آپ کے طلبہ کے کپڑے صاف نہیں ہیں۔ پھر یہی تبصرہ انہوں نے تمام مدارس کے بارہ میں کیا۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے کہا کہ آپ لوگ تنقید تو کر رہے ہیں مگر آپ اس کا حل نہیں بتاتے۔ انہوں نے کہا کہ حل کیا ہے۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے کہا کہ حل بہت سادہ ہے۔ آپ پیسہ دیجئے ہم واشنگ مشین منگاتے ہیں۔ اور پھر آپ دیکھیں گے کہ ہمارے مدرسہ کے بچے کتنے صاف ستھرے ہیں۔

مذکورہ تاجر کو یہ بات اثر کر گئی۔ وہ فوراً اس پر راضی ہوگئے۔ چنانچہ دہلی جاکر انہوں نے مدرسہ کے لئے گاڈریج کی واشنگ مشین بھجوادی جو اس وقت سب سے اچھی سمجھی جاتی تھی۔

یہ ایک صحت مند مثال ہے۔ مدرسہ والے باعزت انداز میں تعاون مانگیں اور اصحاب خیر بھی باعزت انداز میں اپنا مالی تعاون دیں تو دینی اداروں کا کام نہایت حسن و خوبی کے ساتھ چلنے لگے گا۔

عشاء کی نماز کے بعد مدرسہ کے دفتر میں نشست ہوئی۔ اساتذہ بھی آگئے۔ دیر تک ملّی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے مولانا کبیر الدین مظاہری سے کہا کہ آپ نے اپنے مدرسہ کو جدید انداز میں بنایا ہے۔ اب یہاں ایک اور روایت قائم کیجئے۔ میں نے کہا کہ باہر سے جب کوئی

شخص کسی مدرسہ میں آتا ہے تو عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ گفتگو یک طرفہ انداز میں ہوتی ہے۔ یعنی آنے والا بولتا ہے، اور مدرسہ کے لوگ صرف سامع بنے ہوئے بیٹھے رہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں تبادلہ خیال کے انداز میں گفتگو ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے یہاں یہ روایت پہلے سے قائم ہے۔ چنانچہ اسی انداز میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

مدرسہ کا دفتر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یہ بالکل جدید طرز کا ایک دفتر تھا۔ ایک خوبصورت میز کے گرد خوبصورت کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میز پر کیلکولیٹر، ٹیلی فون، اور دوسری جدید نوعیت کی دفتری چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ مولانا کبیر الدین مظاہری برابر ٹیلی فون پر رابطہ قائم کر کے لوگوں کو میری آمد کی اطلاع دیتے رہے اور پروگرام مرتب کرتے رہے۔ کیونکہ میں اچانک یہاں آیا تھا، اور اب ٹیلی فون ہی کے ذریعہ پروگرام کو منظم کیا جاسکتا تھا۔

ہماچل پردیش کا علاقہ ۱۹۴۷ میں مکمل طور پر فرقہ پرستی کی زد میں تھا جو ملک کی تقسیم کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھی۔ چنانچہ مدرسہ قادریہ کے ساتھ بھی بار بار یہاں اشتعال انگیزی اور فساد کے مسائل پیدا ہوئے۔ مگر مولانا کبیر الدین صاحب نے حکمت اور تحمل کے ذریعہ ہر موقع پر کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے چنگاری کو ہوا دینے کے بجائے اس کو پہلے مرحلہ ہی میں بجھا دیا۔

یہاں کی کئی چیزیں دوسرے مدارس کے لئے قابل تقلید ہیں۔ مثلاً یہاں کا اصول ہے کہ دو استاد اگر آپس میں جھگڑیں تو دونوں ہی کو باعزت طور پر رخصت کر دیا جاتا ہے۔ اس بنا پر یہاں ایسا ہے کہ دو استادوں کے درمیان اگر نزاع پیدا ہو تو وہ آپ ہی آپ اس کو ختم کر لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مسئلہ نظامت تک پہنچا تو دونوں کو علیحدہ کر دیا جائیگا۔

طلبہ کو یہ اجازت نہیں کہ وہ اساتذہ کی ذاتی خدمت کریں۔ مثلاً کوئی طالب علم کسی استاذ کا سر اور پاؤں نہیں دبا سکتا اور نہ ہی سر میں تیل لگا سکتا ہے۔ اسی قاعدہ کو برقرار رکھنے کے لئے یہاں جوان العمر اساتذہ رکھے گئے ہیں کیونکہ اس قسم کے رواج اکثر انہیں مدارس میں پائے جاتے ہیں جہاں بوڑھے اور زیادہ عمر کے اساتذہ ہوں۔ تاہم اسی کے ساتھ طلبہ کو یہ تاکیدی حکم ہے کہ وہ

ہر گز اپنے استاد کی نافرمانی نہ کریں۔

۱۸ نومبر کی صبح کو سوا پانچ بجے مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ یہ لاؤڈ اسپیکر کے بغیر تھی۔ یہاں چاروں طرف فطرت کا ماحول ہے۔ اس ماحول میں اذان کی دھیمی آواز بہت اثر انگیز تھی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے موذن نے فطرت کے دھیمے لہجہ میں ذکر خداوندی کا نغمہ بکھیر دیا ہو۔

فجر کی نماز میں امام صاحب نے سورہ جمعہ کی تلاوت کی۔ نماز کے بعد میں نے ایک صاحب سے کہا کہ دیکھئے قرآن میں ہے کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں خدا کی تسبیح کر رہی ہیں (**الجمعه ۱**) مگر آپ جانتے ہیں کہ یہ تسبیح سنائی نہیں دیتی۔ گویا فطرت کی زبان خاموشی کی زبان ہے۔ شور کی زبان فطرت کی زبان نہیں۔

مولانا کبیر الدین صاحب نے یہاں کی مسجد میں لاؤڈ اسپیکر نہیں لگایا ہے۔ اس کا علاقہ پر بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ یہاں کے ہندو کہتے ہیں کہ دیکھو، یہ کتنا اچھا مولانا ہے۔ وہ شور والا کام نہیں کرتا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اپنے دھرم کی سیوا کر رہا ہے۔

میں نے مولانا کبیر الدین صاحب سے کہا کہ آپ جو کر رہے ہیں وہ عین اسلامی طریقہ ہے۔ مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال تو مجھے ایک بدعت معلوم ہوتا ہے۔ حدیث میں فتنہ کے زمانہ کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بتائی گئی ہے کہ اس وقت مسجدوں میں آوازیں بلند ہوں گی (**رفعت الاصوات فی المساجد**)۔

فجر کی نماز ختم ہوئی تو ایک بچہ نے کھڑے ہو کر مختلف اوقات کی دعائیں بلند آواز سے بتائیں۔ مثلاً کھانے کے بعد یہ دعا پڑھیں، سونے کے وقت یہ دعا پڑھیں، وغیرہ۔

نماز کے بعد طالب علموں کے اٹھ کر جانے کا انداز بھی نہایت منظم تھا۔ طالب علم اچانک بھیڑ کی صورت میں نہیں اٹھے۔ میں نے دیکھا کہ لمبی صف کے دائیں طرف سے باری باری صرف ایک طالب علم اٹھتا اور خاموشی سے باہر چلا جاتا۔ اس طرح تمام طلبہ قطار بنا کر باہر نکلے۔ مسجد کے گیٹ کے باہر آتے ہی تمام طلبہ نے دوڑ لگانا شروع کی۔ دوڑ ایک استاد کی نگرانی

میں ہوئی۔

میں نے سوچا کہ یہ منظر اگر ٹی وی پر دکھادیا جائے تو لوگوں کو حقیقت معلوم ہو۔ کچھ غیر مسلم حضرات غلط طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ مسجد اور مدرسہ میں ہتھیاروں کی ٹریننگ ہوتی ہے۔ انہیں برعکس طور پر نظر آئے گا کہ مسجد میں آداب حیات سکھائے جاتے ہیں۔ یہاں طلبہ کو جسمانی ورزش کرائی جاتی ہے۔ یہاں ایک ایک طالب علم کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ وہ شہری تقاضوں کو نبھائے۔ وہ ڈسپلن والی زندگی گزار سکے۔ وہ یہاں تربیت پاکر ایک اچھا انسان بن جائے۔

نماز اول وقت میں ہوئی۔ چنانچہ مسجد کے باہر ابھی زیادہ اجالا نہیں ہوا تھا۔ اب پروگرام کے مطابق تمام طلبہ سڑک پر پہنچے اور کچھ دیر تک دوڑ لگاتے رہے۔ یہ یہاں کا روزانہ کا معمول ہے۔ واپس آکر تمام طلبہ تلاوت قرآن میں مشغول ہوگئے۔

یہ مدرسہ ۳۶ بیگھہ زمین میں واقع ہے۔ وسیع رقبہ میں ایک شاندار اسلامی دنیا ابھر رہی ہے۔ مگر ایک صاحب کے الفاظ میں "کبھی کوئی ہندو نہیں بولا۔ کبھی کوئی ہندو ڈنڈا لے کر نہیں آیا۔ اتنا بڑا کام نہایت پرسکون طور پر یہاں انجام پارہا ہے"۔ میں نے کہا کہ یہ سب حکمت کا نتیجہ ہے جس کو آپ لوگوں نے خدا کے فضل سے اختیار کیا ہے۔

ایک استاذ نے کہا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ سیکولر لوگ سیاسی پلیٹ فارم پر آپس میں لڑتے ہیں اور پھر دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ مگر علماء کا یہ حال ہے کہ دو عالم اگر ایک بار کسی بات پر لڑ گئے تو دوبارہ وہ کبھی نہیں ملیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک عالم سے میں نے یہ بات کہی تو انہوں نے جواب دیا کہ سیکولر لوگ مکار ہوتے ہیں۔ اس لئے ایسا کرتے ہیں۔ مگر علماء تو مخلص لوگ ہیں۔ جب میں اپنے کو حق پر سمجھوں تو میں کس طرح دوسرے سے مل سکتا ہوں۔

استاذ نے کہا کہ آپ کا یہ جواب درست نہیں۔ اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے کہ دو مسلمانوں کے درمیان تین دن سے زیادہ ترک کلام اور ترک تعلق شریعت میں جائز نہیں۔ اس کا

مذکورہ عالم کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اپنے مخالف کو غلط ثابت کرنے کے لئے وہ اسلام کے اصولوں کا حوالہ دے رہے تھے، مگر خود اپنے اوپر اسلام کے اصول کو منطبق کرنے پر وہ راضی نہ ہوئے۔

مدرسہ سے ملحق ایک زمین تھی۔ اس پر عملاً مدرسہ کا قبضہ تھا۔ تاہم کاغذی اعتبار سے وہ کچھ ہندوؤں کی تھی۔ چونکہ نئے قانون کے مطابق قابض ہی مالک ہوتا ہے۔ اس لئے وہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ زمین اب ہم کو نہیں ملے گی۔

ایک بار زمین کے مالکان یہاں آئے۔ انہوں نے مولانا کبیر الدین صاحب سے کہا کہ یہ زمین جو آپ کے قبضہ میں ہے، اس کے اصل مالک ہم لوگ ہیں۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے کہا کہ اسلام میں قبضہ کوئی چیز نہیں۔ زمین کا جو مالک ہے وہی اس کا مالک رہے گا۔

مولانا کبیر الدین صاحب کی زبان سے یہ غیر متوقع بات سن کر وہ لوگ بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس زمین کو بیچنا چاہتے ہیں۔ مگر آپ کو خریداری کا پہلا حق ہوگا۔ مزید یہ کہ انہوں نے مارکٹ ریٹ سے بہت کم قیمت میں اس زمین کو مدرسہ کے لئے دینا منظور کر لیا۔ حالانکہ مولانا کبیر الدین صاحب نے ان سے اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہا تھا۔

بہت سے ہندی اخبار والے مدرسہ کو دیکھنے کے لئے آئے۔ انہوں نے اس کے بارہ میں اچھی رپورٹیں شائع کیں۔ ایک ہندی اخبار نے لکھا کہ یہ ہماچل پردیش کا شانتی نکیتن ہے۔

چنڈی گڑھ کے ہندی روزنامہ دینک ٹریبون (۱۳ اگست ۱۹۹۴) میں ایک رپورٹ مسلم مدارس کے بارے میں چھپی۔ اس کی سرخی تھی۔ ”بھارت کے مدرسوں میں ہو رہی ہے کٹر پنتھی کی پڑھائی“ اسی طرح پنجاب کیسری (۷ دسمبر ۱۹۹۴) میں رپورٹ چھپی جس کی سرخی یہ تھی:
”ہماچل میں چلائے جارہے مدرسے شکچھا پرسار کے بجائے آتنک واد کا پرشکشنڑ دے رہے ہیں“
اسی طرح انڈین اکسپریس کی چنڈی گڑھ اشاعت (۲۲ اگست ۱۹۹۴) میں رپورٹ چھپی جس کی سرخی یہ تھی: ISI bid to recruit HP youths via madrasas.

اس قسم کی خبروں کے ذریعہ اس علاقہ میں دینی مدارس کے خلاف پروپیگنڈہ بڑھا۔ اس کا خاص نشانہ مسروالا کا مدرسہ قادریہ تھا۔ مگر یہ پروپیگنڈہ زحمت میں رحمت ثابت ہوا۔ پریس اور انتظامیہ دونوں تحقیق کے لئے متحرک ہوگئے۔ اور آخری رپورٹ عین مدرسہ کے حق میں نکلی۔ اس سلسلہ میں بہت سی موافق باتیں پریس میں آئیں جن سے فضا مزید اضافہ کے ساتھ مدارس کے حق میں ہوگئی۔ مثلاً جن ستا (۱۱جون) میں رپورٹ چھپی۔ اس کا عنوان تھا: بھائی چارہ کا پرتیک ہے مسروالا (کا مدرسہ)۔ حتیٰ کہ ہماچل کے چیف منسٹر راجہ ویربھدر سنگھ نے اسٹیٹ اسمبلی میں اس کی تردید کی۔ دینک ٹریبیون (۲۰دسمبر) میں یہ رپورٹ اس سرخی کے ساتھ چھپی: "مدرسوں میں بھارت ورودھی گتی ودھیاں نہیں"۔

اخبار والوں کی کئی پارٹیاں مدرسہ قادریہ میں آئیں۔ اور ہر چیز کو دیکھنے کے بعد اپنے اخباروں میں یہ رپورٹ چھاپی کہ ہم نے خود جاکر تحقیق کی اور تمام مخالفانہ پروپیگنڈوں کو غلط پایا۔ ان رپورٹوں کو پڑھنے کے بعد میں نے مدرسہ کے ذمہ داروں سے کہا کہ یہ آپ کے حق میں رفع ذکر کا معاملہ تھا۔ اور جب آدمی حق پر ہو تو ہر رفع ذکر عسر میں یسر کا سبب بن جاتا ہے۔

مدرسہ قادریہ مسروالا ہماچل پردیش ایک ایسے علاقہ میں واقع ہے جس کے اطراف میں غیر مسلموں کی بڑی آبادی ہے۔ مدرسہ والوں کے ان حضرات سے گہرے مراسم کی وجہ سے ان حضرات کی برابر یہاں آمد ورفت رہتی ہے، حتیٰ کہ خوشی اور غمی میں بھی وہ مدرسہ والوں کو شریک کرتے ہیں۔ اور اپنے نجی مسائل میں یہاں کے ذمہ داروں سے مشورہ کرتے ہیں۔ نیز یہاں آکر اسلام کی معلومات، اسلامی اخلاق اور مدرسہ کی حب الوطنی اور سیاست سے دوری اور علماء کی سادگی کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ ایسے اسلامی ادارے ملک کے گوشہ گوشہ میں ہونے چاہئیں۔ کیونکہ یہ ادارے امن ومحبت کا پیغام ہوتے ہیں، حتیٰ کہ وہ غیر مسلم جن کو عام طور پر کٹر پنتھی کہا جاتا ہے وہ بھی یہاں کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ ان آنے والوں میں عام سرکاری ملازم سے لے کر وزیر اعلیٰ ہماچل پردیش جیسے افراد بھی شامل ہیں۔

افغانستان کے طالبان میں سے بعض افراد نے ایک انٹرویو کے دوران یہ کہا تھا کہ ہماری تعلیم دیوبند کے مدرسہ میں ہوئی ہے۔اس کو ہندستان کے کچھ ہندی اخباروں میں اس طرح چھاپا گیا کہ طالبان نے جنگ جوئی کا سبق دیوبند کے مدرسہ میں رہ کر حاصل کیا ہے۔اس کو مزید عام کر کے ہندی پریس میں یہ کہا گیا کہ ہندستان کے اسلامی ادارے اُگرواد اور علیحدگی پسندی کی تعلیم دیتے ہیں۔اس لئے ضروری ہے کہ ان مدرسوں کا بھارتیہ کرن کیا جائے۔اس کے بغیر ہمارے ملک میں شانتی اور اتحاد قائم نہیں ہو سکتا۔

یہ بات بلاشبہ بالکل بے بنیاد ہے۔ میں خود مدرسہ ہی کا ایک پروڈکٹ ہوں اور جانتا ہوں کہ ان مدرسوں کا کوئی تعلق اُگرواد یا علیحدگی پسندی سے نہیں۔ یہ مدرسے سادہ طور پر عربی زبان اور دین اسلام کی تعلیم دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ افغانی نوجوانوں نے دیوبند کے مدرسہ میں تعلیم پائی ہے مگر یہ تعلیم سادہ طور پر دین کی تھی نہ کہ جنگ جوئی کی۔

پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے کئی نیشنل لیڈروں کی تعلیم لندن میں ہوئی۔ ہندستان واپس آنے کے بعد وہ انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں شریک ہوگئے۔اب کیا یہ کہنا صحیح ہو گا کہ ان لیڈروں کو لندن کے اسکولوں میں انگریزوں کے خلاف لڑنے کی تعلیم دی گئی تھی۔

۱۹۴۷ سے پہلے جو لوگ آزادی کی تحریک میں شریک ہوئے اور ”انگریزو بھارت چھوڑو“ کا نعرہ لگایا وہ تقریباً سب کے سب ہندوستان کے ان انگریزی اسکولوں کے پڑھے ہوئے تھے جو برٹش دور میں قائم کئے گئے۔ان کی بابت لارڈ میکالے نے کہا تھا کہ ان انگریزی اسکولوں کا مقصد یہ ہے کہ یہاں ایسی نسل پیدا ہو جو پیدائش کے اعتبار سے ہندستانی ہو اور اپنی سوچ کے اعتبار سے انگریز۔ مگر انہیں انگریزی اسکولوں میں پڑھ کر لوگ انگریز کے خلاف جنگ میں شامل ہوگئے۔اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس وقت انگریزی اسکولوں میں انگریزی حکومت کے خلاف لڑائی کی تعلیم دی جاتی تھی۔

یہی معاملہ افغانیوں کا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ افغانی نوجوانوں نے ہندستان کے دینی

مدرسہ میں داخلہ لے کر یہاں تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد اپنے وطن جاکر جب وہ وہاں کی عسکری تحریک میں شامل ہو گئے تو اس کا کوئی تعلق ہندستان کے دینی مدرسہ سے نہ تھا۔ جنگ جوئی کا سبق انہوں نے خود اپنے ملک سے لیا۔اس کا کوئی تعلق ان کی بیرونی تعلیم سے نہیں۔

کچھ عرصہ پہلے یہاں کے مدرسہ میں حیدر آباد کا ایک طالب علم تھا۔ وہ جوڈو کراٹے سیکھے ہوئے تھا۔مدرسہ کے قریب ایک نہر ہے۔وہ اکثر اسی نہر پر جایا کرتا تھا۔ایک روز وہاں ایک ہندو لڑکا تھا۔ وہ مذکورہ طالب علم کے پاس کھڑا ہو کر بار بار نہر میں کودتا تھا۔اس کی وجہ سے طالب علم پر پانی کے چھینٹے آتے تھے۔ طالب علم نے منع کیا،وہ نہیں مانا تو طالب علم نے اس ہندو لڑکے کو مار دیا۔وہ روتا ہوا گھر گیا۔اس کے بعد اس کی ماں آئی اور طالب علم کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگی۔طالب علم نے اس ہندو عورت پر جوڈو کراٹے کا فن استعمال کیا۔

اس سے ہندو آبادی میں اشتعال پیدا ہو گیا۔وہ لوگ مدرسہ پر آئے۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے کہا کہ یہ طالب علم کی غلطی ہے اور سب کے سامنے طالب علم سے معافی منگوائی۔ اس کے بعد معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔

تاہم ایسے سنگین معاملہ میں اتنی آسانی سے ہندوؤں کے ٹھنڈا پڑ جانے کا ایک پس منظر بھی تھا۔اس سے پہلے مدرسہ کے طلبہ نے ہندو آبادی پر اچھا اثر ڈالا تھا۔مدرسہ سے ملے ہوئے ان لوگوں کے کھیت ہیں۔ مگر طلبہ چونکہ مدرسہ کے تحت ڈسپلن میں رہتے ہیں۔انہوں نے کبھی ان ہندو کسانوں کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ایک بار گاؤں میں آگ لگ گئی تو تمام طلبہ دوڑ کر وہاں گئے اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر آگ بجھائی۔ اس پیشگی اخلاقی اثر کی وجہ سے ہندو زیادہ مشتعل نہیں ہوئے۔

ان میں سے کچھ لوگوں نے خود ہی یہ کہنا شروع کر دیا کہ مدرسہ والے غلط لوگ نہیں ہیں۔ اس میں غلطی دونوں کی ہوگی۔

میں نے کہا کہ اس سنگین معاملہ کو فساد تک پہنچنے سے جس چیز نے روکا وہ ”جوڈو کراٹے“ کا

فن نہیں تھا۔ بلکہ اخلاق اور حسن کردار تھا۔ ایک استاد کے الفاظ میں ایسا اس لئے ہوا کہ: ''ہم نے پہلے سے یہ ثابت کرر کھا تھا کہ ہم آپ کے ہمدرد ہیں۔ ہم آپ کے غم میں شریک ہیں''۔

حاجی ڈی خان (۱۹۲۷) مسروالا کے قدیم باشندہ ہیں۔ ۱۸ نومبر کی صبح کو ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ گورنمنٹ سروس کررہے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ آپ نے یہاں ۱۹۴۷ سے پہلے کا زمانہ بھی دیکھا ہے اور ۱۹۴۷ سے بعد کا بھی۔ دونوں زمانوں میں کیا فرق ہے۔ انہوں نے کہا کہ بہت فرق ہے۔ پہلے دونوں فرقوں میں محبت تھی، اب دونوں کے اندر نفرت آگئی ہے۔ میں نے پوچھا کہ پہلے کیوں محبت کا تعلق تھا۔ انہوں نے کہا کہ پہلے آپس میں ملنا جلنا خوب ہوتا تھا۔ شادی بیاہ میں دونوں ایک دوسرے کے یہاں جاتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے تیوہاروں میں شریک ہوتے تھے۔ کام دھندے میں بھی بار بار ملنا ہوتا تھا۔ اب دونوں میں دوری ہوگئی ہے۔

یہ بہت صحیح بات ہے۔ یہ سارا معاملہ اختلاط کا معاملہ ہے۔ دونوں میں دوبارہ خوش گوار تعلقات قائم کرنے کے لئے آج سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ دونوں میں زیادہ سے زیادہ اختلاط کی صورتیں پیدا کی جائیں۔

''ہمارے لوگوں میں قلبی لگاؤ نہیں خدا سے۔ دکھاوا زیادہ ہے، لگن کم ہے'' انہوں نے بڑی سادگی کے ساتھ کہا۔ انہوں نے بتایا کہ مسروالا میں دو مسجدیں تھیں۔ اب ایک اور مسجد بنائی جارہی ہے۔

مولانا کبیر الدین صاحب جب اس علاقہ میں آئے تو پہلے وہ رائے پور میں مقیم ہوئے۔ وہاں آرایس ایس کا ایک آدمی تھا جس کا نام سری نواس بنسل تھا۔ عام مسلمان اس سے نالاں تھے۔ مگر وہ مولانا کبیر الدین صاحب کا معتقد ہوگیا۔ حتی کہ جب وہ مسروالا آگئے تو وہ ان سے ملنے کے لئے یہاں آنے لگا۔ وہ مولانا کے گھر کا کھانا نہیں کھاتا تھا بلکہ گاؤں میں جاکر کسی ہندو کے یہاں کھاتا۔ مگر مولانا کبیر الدین صاحب سے اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔

گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ سری نواس بنسل کو مولانا کبیر الدین صاحب کی سادگی، اصول پسندی، وقت کی پابندی اور کسی سے نفرت نہ کرنے کا مزاج اس کے لئے باعث کشش ثابت ہوا۔

۱۸ نومبر کو ناشتہ کرتے ہوئے میں نے مولانا کبیر الدین صاحب سے پوچھا: ''کوئی ہندو اپنے بچہ کو مدرسہ میں داخل کرنا چاہے تو آپ داخل کریں گے'' انہوں نے فوراً کہا کہ ہاں۔ پھر بولے: مگر دار الاقامہ میں نہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیوں۔ انہوں نے کہا کہ اس کو یہاں تنگی ہوگی۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ اگر وہ تنگی کو برداشت کرے تو، انہوں نے کہا پھر تو کوئی ہرج نہیں۔ ہم اس کو دار الاقامہ میں بھی رکھ لیں گے۔

عام طور پر مدارس کا یہ مزاج نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر مدرسہ میں کوئی ہندو بچہ ہوگا تو وہ مدرسہ کے ماحول کو خراب کرے گا۔ حالانکہ یہ بالکل بے بنیاد اندیشہ ہے۔ یہ قانون فطرت کے خلاف ہے۔ سیکڑوں اور ہزاروں لوگوں کے ماحول میں ایک غیر مسلم بچّہ ہو تو وہ خود متاثر ہوگا نہ یہ کہ وہ دوسروں کو متاثر کر ڈالے۔ اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں اسی ملک میں مسلم مدارس میں ہندو بچّے بھی پڑھتے تھے اور اس کا نتیجہ اسلام کے لئے بہتر صورت میں نکلتا تھا۔

۱۹۹۲ کے آخر میں کچھ فرقہ پرست عناصر نے یہ اعلان کیا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو وہ بڑی تعداد میں اجودھیا میں داخل ہوں گے اور بابری مسجد کو توڑ کر وہاں رام مندر بنائیں گے۔ اس کے بعد ملک میں جگہ جگہ تناؤ پیدا ہو گیا۔ اسی اثناء میں نومبر ۱۹۹۲ میں پونٹا صاحب (ہماچل پردیش) کے پاس ایک گاؤں میں ایک اشتعال انگیز واقعہ ہوا۔ کچھ شرپسندوں نے ایک مسلمان کی زمین پر قبضہ کر کے رات کے وقت وہاں ایک مندر کی تعمیر شروع کر دی۔

دیواریں کھڑی ہو چکی تھیں، ابھی چھت نہیں بنی تھی کہ وہاں مسلمان آگئے اور فرقہ وارانہ نزاع کی صورت پیدا ہو گئی۔ اس کے بعد پولیس کیس بن کر معاملہ عدالت میں پہونچا۔

عدالت نے تحقیقات کے بعد تعمیر کو غیر قانونی قرار دے دیا اور حکم دیا کہ اس کو توڑ کر اس کی سابقہ حالت بحال کر دی جائے۔

اس کے بعد گاؤں میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں پولیس افسر، مقامی ہندو، علاقہ کے ایم ایل اے فتح سنگھ (بی جے پی) وغیرہ شامل تھے۔ مولانا کبیر الدین فاران مظاہری بھی اس میٹنگ میں علاقہ کے عالم کی حیثیت سے موجود تھے۔ لوگ کسی فیصلہ پر نہیں پہونچ رہے تھے۔ کیوں کہ پولیس اگر مندر کو گرادے تب بھی یہ اندیشہ تھا کہ نفرت اور کشید گی بڑھے گی اور نئے مسائل کھڑے ہو جائیں گے جس کو روکنے کے لئے کوئی عدالت یا پولیس یہاں موجود نہ ہوگی۔

اس وقت مولانا کبیر الدین مظاہری نے جرأت مندانہ اخلاق کا ثبوت دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہاں پر ایک شبھ کام اشبھ انداز میں ہوا ہے۔ مگر اب چونکہ یہاں مندر کی ایک صورت کھڑی ہو گئی ہے تو لوگ اس کو مندر کے نام سے جانتے ہیں۔ اور اگر اس کو توڑا جاتا ہے تو عوام میں یہ شور ہو گا کہ گاؤں کا ایک مندر توڑ دیا گیا۔ اس سے دونوں فرقوں میں نفرتیں پیدا ہوں گی اور مسئلہ پھر بھی نئی صورت میں باقی رہے گا۔ اس لئے اب ایسا کیا جائے کہ ہندو لوگ اپنا مندر تو وہیں پورا کرلیں۔ البتہ اس کے بجائے مالک زمین کو ایک اور جگہ اس کے معاوضہ میں دے دی جائے۔

اس پر سب لوگ متفق ہو گئے۔ مسلمان مالک کو دوسری زیادہ بہتر زمین اس کے معاوضہ میں دے دی گئی۔ مندر وہیں قائم رہا۔ مگر اس فیصلہ کا زبردست فائدہ یہ ہوا کہ مذکورہ ہندوؤں کے سر شرم سے جھک گئے۔ اوز مسلمانوں کو مستقل طور پر اخلاقی برتری حاصل ہو گئی۔

میں اپنے سر پر سفید پگڑی باندھتا ہوں۔ اس کے اندر ٹوپی نہیں ہوتی۔ ایک بزرگ نے اس کو دیکھ کر کہا کہ آپ کا عمامہ سنت کے مطابق نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ اس طرح عمامہ باندھتے تھے کہ اس کے اندر ٹوپی ہوتی تھی اور آپ کے عمامہ کے نیچے ٹوپی نہیں۔ میں نے کہا کہ اس طرح کے معاملات میں ہمیشہ سنت اجمالی مطلوب ہوتی ہے نہ کہ سنت کلی۔ اور یہ عین فطرت کا تقاضا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں اگر کامل پیروی کو ضروری قرار دیا جائے تو جو لوگ ٹوپی

کے اوپر عمامہ باندھتے ہیں ان کا عمامہ بھی مسنون عمامہ نہیں رہے گا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے عمامہ کا کپڑا ہاتھ کا بنا ہوا ہوتا تھا، جب کہ آج کل کے لوگوں کی ٹوپی اور عمامہ دونوں مِل کے کپڑے سے تیار کئے جاتے ہیں۔

مدرسہ کے ایک استاذ مولانا انصار الحق مظاہری نے بتایا کہ جب وہ چودہ سال کے طالب علم تھے، مدرسہ کی رسید لے کر وہ چندہ وصول کرنے گئے۔ ایک حکیم صاحب کے یہاں پہونچے جو باقاعدہ عالم بھی تھے۔ انہوں نے بہت سخت انداز اختیار کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں کسی مدرسہ والے کو چندہ نہیں دیتا۔ انصار الحق صاحب نے پوچھا کہ کیوں۔ انہوں نے کہا کہ یہ لوگ کچھ نہیں جانتے۔ انہوں نے دوبارہ پوچھا کہ کیا آپ نے تجربہ کیا ہے یا قیاسی طور پر ایسا کہہ رہے ہیں۔ حکیم صاحب نے اقرار کیا کہ انہوں نے اس سلسلہ میں کوئی ذاتی تجربہ نہیں کیا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے اپنی الماری سے الجاحظ کی کتاب "اَلْحَیْوَان" نکالی۔ یہ غیر معرب تھی۔ انہوں نہ کہا کہ اس کتاب کو آپ نے دیکھا ہے۔ انصار الحق صاحب جو اس وقت کم عمر تھے، انہوں نے کہا کہ آپ نے یہ کیوں کہا کہ دیکھا ہے۔ آپ کو یہ پوچھنا چاہئے کہ کیا اس کو پڑھا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اچھا بتایئے، کیا آپ نے اس کو پڑھا ہے۔ انصار الحق صاحب نے کہا کہ میں نے اس کو پانچ بار پڑھا ہے۔ اور پھر اس غیر معرب نسخہ کو روانی کے ساتھ پڑھ کر سنانے لگے۔

اس طرح کے کتنے ذہین نوجوان ہمارے مدارس سے پڑھ کر نکلتے ہیں۔ مگر دور جدید کی زبان نہ جاننے کی وجہ سے وہ سماج میں کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے پاتے۔ یہ لوگ اگر دینی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان بھی سیکھ لیں تو ان کی صلاحیتیں قوم کے لئے کئی گنا زیادہ مفید بن جائیں گی۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کی ضرورتوں میں سے ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ ہمارے درمیان بڑی تعداد میں ایسے اہل علم ہوں جو بیک وقت عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں اسلام

کی ترجمانی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ مگر ایسے افراد اتنے کم ہیں کہ وہ الشاذ کالمعدوم کے درجہ میں رکھے جانے کے قابل ہیں۔

میں نے مدرسہ قادریہ کے ذمہ داروں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ آپ لوگ اپنے موجودہ نصاب کو چلاتے ہوئے ایک نئے کلاس کا اضافہ کریں۔ اس کو آپ لینگو تیج کلاس یا لینگو تیج کورس کہہ سکتے ہیں۔ اس میں صرف فارغ التحصیل افراد کو لیا جائے۔ عربی مدارس کے فارغین کو انگریزی زبان پڑھائی جائے اور انگریزی ادارہ کے تعلیم یافتہ افراد کو عربی زبان سکھائی جائے۔ فی الحال اس کی تعداد صرف دس ہو۔ پانچ عربی داں اور پانچ انگریزی داں۔ ان کو پڑھانے کے لئے دو معلم مقرر کئے جائیں۔ ایک عربی معلم اور ایک انگریزی معلم۔ مدرسہ کے ذمہ داروں نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ تاہم اس سلسلہ میں کچھ لوگوں کے تعاون کی ضرورت ہوگی۔ مزید تعاون کے بغیر شاید مدرسہ اس کام کو بحسن وخوبی انجام نہ دے سکے۔ اس سلسلہ میں جو لوگ شرکت یا تعاون کرنا چاہتے ہوں وہ ذیل کے پتہ پر خط وکتابت کریں:

Maulana Kabiruddin Faran Mazahiri, Nazim, Madrasa Quadria,

Missarwala, Distt. Sirmour, Pin 173021,

Tel. 01704-55126, Fax : 01704-55286

ایک صاحب نے کہا کہ آخر کیا بات ہے کہ غیر مسلموں میں آپ کی بہت پذیرائی ہو رہی ہے، ہندوؤں اور عیسائیوں کے جلسوں میں خطاب کرنے کے لئے آپ بار بار بلائے جاتے ہیں، دور جدید میں یہ پہلا واقعہ ہے جو کسی مسلمان عالم کے ساتھ پیش آرہا ہے۔ آپ کے سوا کسی اور عالم کے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا۔

میں نے کہا کہ یہ صرف اسلوب کے فرق کا معاملہ ہے، اصل یہ ہے کہ دوسرے عالم اور رہنما اسلام کو دفاعی نقطہ نظر سے پیش کرتے ہیں۔ جب کہ میں اسلام کو دعوتی اعتبار سے پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے دوسری قوموں کو اسلام کا دشمن سمجھ لیا۔ اس بنا پر ان کی تقریروں میں

مناظرانہ اور حریفانہ رنگ آگیا۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ میں کسی کو بھی اسلام کا دشمن نہیں سمجھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلام دین فطرت ہے اس بنا پر اسلام ہر انسان کا اپنا مطلوب دین ہے۔

میری اس سوچ کی بنا پر میری تقریر میں مذمت کے بجائے محبت ہوتی ہے۔ اس میں اظہار فخر نہیں ہوتا۔ اس میں مناظرہ بازی نہیں ہوتی۔ وہ فطرت کو جگاتی ہے اور ان کے سامنے خدا کے دین کا مثبت تعارف پیش کرتی ہے۔ میں ہندو یا عیسائی کے مقابلہ میں مسلمان کا کیس پیش نہیں کرتا۔ بلکہ سب کو خدا کا بندہ مان کر ان کے سامنے خدا کی بات پیش کرتا ہوں۔ اسلوب کا یہی فرق ہے جس نے ان کی نظر میں میری بات کو پسندیدہ بنادیا ہے۔

ہماچل پردیش کے مختلف حصوں کا سفر کرتے ہوئے میں نے پایا کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وہ نفرت اور تعصب نہیں ہے جو دہلی اور یوپی کے لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ دونوں خطوں میں اس اعتبار سے واضح فرق ہے۔ اس پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ دہلی اور یوپی کا علاقہ عرصۂ دراز تک سیاسی لوگوں کا مرکز رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اس طرح اس علاقہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی کا ماحول قائم ہوگیا۔ اس کے برعکس ہماچل پردیش کا علاقہ کبھی بھی اس قسم کی فرقہ وارانہ سیاست کا مرکز نہیں رہا۔ اسی فرق نے دونوں خطوں کے درمیان وہ فرق پیدا کر رکھا ہے جس کو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

انسانی سرگرمیوں کو اگر دو قسم میں بانٹا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ سیاسی سرگرمیاں باہمی نفرت پیدا کرتی ہیں اور تعمیری سرگرمیاں باہمی محبت۔

مدرسہ میں ایک مسلمان بڑھئی کام کر رہے تھے ان کا نام محمد حنیف ہے۔ اس وقت یہاں مسجد میں ماربل لگانے کا کام بھی ہو رہا تھا۔ مذکورہ بڑھئی نے کئی روز ماربل کے مستریوں کو دیکھا۔ انھیں ان کا کام اچھا نہیں لگا۔ اگرچہ خود انھوں نے کبھی ماربل کا کام نہیں کیا تھا اور نہ اس کو کہیں سیکھا تھا۔ تاہم اپنے اندرونی جذبہ کے تحت انہوں نے مدرسہ کے ذمہ داروں سے کہا کہ ماربل لگانے کا کام آپ مجھے دے دیں، میں اس کو کروں گا۔ چنانچہ یہ کام انہیں دے دیا گیا۔ اس کے بعد

انہوں نے ماربل لگانے کا کام شروع کیا اور مستریوں سے کہیں زیادہ اچھا لگایا۔ میں نے بعد میں چاروں طرف دیکھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ کام کسی ماہر کاریگر نے کیا ہے۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ یہ ایک نئے آدمی نے انجام دیا ہے۔

مسلمان آج کل ہر جگہ کاریگری کے کام میں آگئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ تعلیمی پس ماندگی نے ان کے اندر نیا جوش پیدا کیا۔ وہ سرگرمی کے ساتھ کاریگری کے کام میں لگ گئے جس میں تعلیم کی ضرورت نہ تھی۔ یہ قدرت کا نظام ہے۔ آدمی اگر ایک میدان میں ناکام رہے، تو وہ دوسرے میدان میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ پہلے تو لوگ آپ کی چیزیں بہت شوق کے ساتھ پڑھتے تھے۔ مگر جب آپ نے کہا کہ مسلمان بابری مسجد ہندوؤں کے حوالے کر دیں تو لوگ آپ کے خلاف ہو گئے۔ میں نے کہا کہ یہ تو ایک لغو بات ہے۔ میں نے کبھی ایسا نہیں کہا۔ ٦ دسمبر ١٩٩٢ کے بعد میں نے صرف یہ کہا تھا کہ مسلمان اب اس اشو پر عملاً خاموشی اختیار کر لیں۔ اور آپ دیکھئے تو تمام کے تمام مسلمان، خواہ اصاغر ہوں یا اکابر، سب اس اشو پر خاموشی کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں ۔گویا اس معاملہ میں فارسی شعر کا معاملہ ہے کہ :

آنچہ دانا کند کند ناداں　　　　لیک بعد از خرابیٔ بسیار

٦ دسمبر کے بعد مسلم رہنماؤں نے یہ مانگ شروع کر دی کہ "مسجد دوبارہ وہیں بناؤ" جب کسی نے ان کی بات پر دھیان نہیں دیا تو اب وہ خاموش ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک تاجر کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا اس کی جگہ مالک بنا۔ ایک ملازم نے جوش کے انداز میں لڑکے سے کہا کہ "میری تنخواہ بڑھائیے ورنہ... "لڑکے نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور کہا: "ورنہ تم کیا کروگے"۔ اب ملازم دھیمی آواز میں بولا: "اسی تنخواہ پر کام کریں گے"۔

یہی معاملہ ان نام نہاد رہنماؤں کا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسجد وہیں بناؤ ورنہ ...جب ذمہ داروں نے انہیں نظر انداز کر دیا تو اب وہ بزبان حال کہہ رہے ہیں "پھر ہم بھی خاموشی اختیار

کرلیں گے''۔

۱۸نومبر کی سہ پہر کو مسروالا سے ناہن کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ہارٹی کلچر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دیکھا۔ اس کا یہاں بہت بڑا فارم ہے۔ ایک باغ میں کینو کے خوبصورت پھل لگے ہوئے تھے۔ ہری شاخوں کے درمیان لال رنگ کے پھل فطرت کے حسن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

کینو ایک نیا پھل ہے جو موسمی اور سنترے کی قلم تیار کر کے بنایا گیا ہے۔ اس میں رس کی مقدار دونوں ہی سے زیادہ ہوتی ہے۔

اس کے آگے شکتی نگر میں کچھ دیر کے لئے ٹھہرے۔ یہاں ایک افسر مسٹر یعقوب بیگ ہیں۔ ان سے ملنے کے لئے ہم لوگ چند منٹ رکے تو اندر سے مسٹر آر ایس ورمانکل آئے جو بجلی بورڈ میں سپرنٹنڈنگ انجینئر ہیں۔(Tel. 01702-22281) انہوں نے کہا میں اخباروں میں آپ کے آرٹیکل پڑھتا رہا ہوں، اور میرے پاس ان کی کلپنگ بھی ہے۔ مجھے آپ کی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔

راستہ میں مولانا کبیر الدین صاحب نے ایک بڑے کام کی بات کہی، انہوں نے کہا کہ:
''اگر ہمیں دین کا کام کرنا ہے تو ہم کو اسٹیج اور مظاہرہ کا طریقہ چھوڑنا ہوگا''۔

مغرب کی نماز ہم لوگوں نے ناہن میں پڑھی۔ یہاں چار مسجدیں ہیں۔ مسجد کچا تالاب بس اسٹینڈ کے بالکل قریب ہے اور کافی آباد ہے۔ اس مسجد میں نماز مغرب کے بعد جلسہ کا پروگرام رکھا گیا تھا۔

جلسہ سے پہلے کچھ دیر ہم لوگ امام صاحب قاری حسین احمد کے کمرہ میں بیٹھے۔ یہاں صدر انجمن جناب شیخ نثار احمد ایڈوکیٹ بھی آگئے۔ وہ میرے مضامین پڑھتے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہماری پالیسی وہی ہے جو آپ بتاتے ہیں۔ یعنی ٹکراؤ سے نہیں بلکہ پیار سے۔

یہ علاقہ ریاست سرمور میں شامل تھا۔ ۱۹۴۷ میں یہاں کے راجہ راجندر پرکاش تھے۔

تمام مسلمان ان کی تعریف کرتے ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ ۱۹۴۷ میں جب ہر طرف فساد پھیل گیا تو راجہ راجندر پرکاش نے مسلمانوں کی حفاظت کے لئے اپنی فوج لگادی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایک مسلمان بھی یہاں سے چھوڑ کر جائے۔

ڈاکٹر حشمت علی صاحب بھی کمرہ میں آگئے۔ وہ یہاں مسلمانوں کو تعلیم میں آگے بڑھانے کے لئے کافی کام کررہے ہیں۔ انہوں نے ایک بات یہ بتائی کہ ناہن میں دینی کام سب کا سب مقامی چندہ سے ہوتا رہا ہے۔ یہاں کا آدمی کبھی بھی باہر چندہ مانگنے کے لئے نہیں گیا۔

حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا: ''ناہن کے مسلمانوں میں جو اجتماعیت ہے وہ بہت کم کسی شہر میں دکھائی دے گی۔''

۱۸ نومبر کی شام کو مغرب اور عشاء کے درمیان تقریر کا پروگرام تھا۔ یہ پروگرام مسجد کے اندر رکھا گیا تھا۔ زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ لیکن شہر کے معروف ہندو بھی قابل لحاظ تعداد میں موجود تھے۔ مہاراجہ سرمور کی بہو انجنا سنگھ بھی شریک تھیں۔ مسٹر آر ایس ورما (سپرنٹنڈنگ انجینئر) اور دوسرے کئی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو آئے۔ سب نے کہا کہ ہم آپ کے آرٹیکل اخباروں میں پڑھتے تھے۔ اور ہم کو آپ کی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔

R.S. Verma, S.E. (Gen.) Nahan, (H.P.) Pin- 173001

Tel. 2281 (R) 2282 (O), 2437 (O) STD Code- 01702

ناہن سے رات ہی کو ہم لوگ مسروالا کے مدرسہ میں واپس آگئے۔ یہ مدرسہ بستی سے کچھ باہر واقع ہے۔ ۱۹ نومبر کو میں نے مدرسہ کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھی۔ نماز کے فوراً بعد بستی کے ایک صاحب ملے۔ انہوں نے بستی آکر یہاں کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھی تھی۔ انہوں نے کہا کہ بستی میں لوگ منتظر ہیں کہ آپ وہاں چل کر انہیں کچھ دین کی باتیں بتائیں۔ فجر کی نماز مدرسہ میں اول وقت غلس میں ہوتی ہے۔ اور بستی کی مسجد میں دیر کے بعد اسفار میں۔ اس طرح ہم لوگوں کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ مدرسہ میں نماز ادا کرنے کے بعد وقت پر بستی کی نماز میں پہنچ

سکیں۔

نماز کے بعد مستری یوسف صاحب کے اصرار پر ان کے گھر پر صبح کی چائے پی گئی۔ یہاں بستی کے کچھ لوگ جمع ہو گئے۔ ان سے مختصر گفتگو ہوئی۔ واپسی کے بعد صبح ۹ بجے میری قیام گاہ پر مدرسہ کے اساتذہ اور کچھ دوسرے افراد اکھٹا ہوئے۔ ان کے سامنے علم دین کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ اس سلسلہ میں میں نے مختلف علمی واقعات ماضی اور حال کے سنائے۔ جس میں ہر ایک کے لئے سبق تھا۔

مدرسہ قادریہ اور اطراف کی مسجدوں کی تعمیر میں خاص طور پر جناب حاجی موسی بٹلہ صاحب اور جناب ایف ڈی ریاض الدین وغیرہ کا خصوصی حصہ رہا ہے۔ اس علاقہ کی مسجدیں اور مدرسے ایک زندہ علامت کے طور پر بتا رہے ہیں کہ اہل مال کھلے دل کے ساتھ اہل دین کا تعاون کر رہے ہیں۔ اہل مال اور اہل دین کا یہ اشتراک بلاشبہ ملت کا قیمتی سرمایہ ہے۔

مہمان خانہ کے جس کمرہ میں یہاں میں ٹھہرا تھا، اس کے اندر ایک بڑی الماری تھی جس میں بہت سی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ انہیں میں سے ایک کتاب مصنف ابن ابی شیبہ (م ۲۳۵ھ) کا مکمل سٹ تھا جو ۱۹۸۶ میں کراچی سے تصحیح کے بعد شائع کیا گیا ہے۔

اس کے مختلف حصوں کو دیکھا۔ اس میں زیادہ تر احکام ومسائل والی روایات ہیں۔ الجزء العاشر میں فضائل القرآن کے باب میں ایک روایت میں بتایا گیا تھا کہ صحابہ و تابعین کے زمانہ میں یہ کہنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا کہ میں نے پورا قرآن پڑھ لیا (قرأت القرآن کله) حدیث نمبر ۱۰۱۴۱ میں یہ روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہا کہ میں نے پورے قرآن کو پڑھ لیا۔ انھوں نے فرمایا کہ تم نے اس میں سے حاصل کیا کیا (قال رجل قرأت القرآن کله. قال عبدالله بن عمر : وما ادرکت منه)

دور اول میں لوگوں کی توجہ اس پر ہوتی تھی کہ انہوں نے قرآن کے کسی حصہ کو پڑھا تو اس سے کیا حاصل کیا۔ اب ساری توجہ اس پر ہوتی ہے کہ انہوں نے قرآن کو کتنی بار ختم کیا۔

پہلے قرآن کے معنوی پہلو پر زور دیا جاتا تھا، اب اس کے الفاظ ہی کو کافی سمجھ لیا گیا ہے۔ دور اول کے مقابلہ میں موجودہ دور میں جو فرق ہے وہ اصل میں یہی ہے۔

۱۹ نومبر کو فجر کی نماز میں ایک بوڑھے مسلمان حاجی محمد رمضان بھی موجود تھے۔ وہ فتح پور کے رہنے والے تھے جو یہاں سے ڈھائی کیلو میٹر کے فاصلہ پر ہے۔ ان کے یہاں مسجد نہیں تھی۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ سے پہلے یہاں کی فضا خراب ہوئی، اسی زمانہ میں مسلمانوں میں شوق ہوا اور انہوں نے یہاں ایک مسجد کی بنیاد ڈال دی۔

مسجد کی تعمیر شروع ہوئی تو مقامی ہندو رکاوٹ ڈالنے لگے۔ ہندوؤں کی رکاوٹ سے وہاں کشیدگی کا ماحول پیدا ہو گیا، جب حالات زیادہ خراب ہو گئے تو وہاں پولیس افسر اور ایس۔ ڈی ایم سٹی جے۔ سی۔ چوہان (موجودہ اے ڈی ایم شملہ) تھے۔

پولیس آئی تو مسلمان چپ رہے۔ مگر ہندوؤں نے جوش دکھایا۔ گاؤں کے ہندو چودھری کالڑکا بھی وہاں آگیا۔ وہ اس وقت شراب پیئے ہوئے تھا۔ وہ چیخ چیخ کر کہنے لگا کہ یہاں کبھی مسجد نہیں تھی۔ اس لئے یہاں ہم ہرگز مسجد بننے نہیں دیں گے۔ اس کی اس زیادتی پر پولس افسر اور ایس ڈی ایم کو غصہ آگیا۔ اس نے کہا "اس وقت تو میں میٹھی گولی دے رہا ہوں۔ میرے پاس کڑوی گولی بھی ہے" اس نے باقاعدہ مسلمانوں کی حمایت شروع کردی۔ اس نے کہا کہ وہ لوگ اپنی زمین پر اپنے پیسہ سے مسجد بنا رہے ہیں تو تم کو کیا مصیبت پیش آرہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ پولیس مسلمانوں کی حمایت پر کھڑی ہو گئی۔ یہاں تک کہ مسجد مکمل ہو گئی۔ اب وہاں پنج وقتہ نماز قائم ہے۔ حاجی محمد رمضان صاحب (۶۵ سال) اس مسجد کے امام ہیں۔

۱۹ نومبر کو مسروالا سے سہارن پور کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں پونٹا آیا۔ وہاں ہم لوگ کچھ دیر کے لئے مسٹر اشوک کمار شرما کے مکان پر ٹھہرے۔ یہیں پر پنجاب کیسری کے نمائندہ ڈاکٹر برجیندر کمار آگئے۔ انھوں نے اپنے اخبار کے لئے انٹرویو لیا۔ پنجاب کیسری اس وقت پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اخبار ہے۔

انھوں نے ایک سوال یہ کیا کہ مذہب زیادہ بڑا ہے یا انسانیت۔ میں نے کہا کہ اس قسم کا تقابل فٹ اور میٹر میں کیا جاسکتا ہے۔ مگر کئی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن میں اس قسم کا تقابل درست نہیں۔ مثلاً کوئی آپ سے پوچھے کہ آپ کی ماتا زیادہ قابلِ عزت ہیں یا آپ کے پتا۔ تو آپ کہیں گے کہ میرے لئے تو ماتا اور پتا دونوں یکساں طور پر قابلِ عزت ہیں۔

یہی معاملہ مذہب اور انسانیت کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں ہی کی اہمیت ہے۔ اور جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، تو سچے مذہب میں انسانیت اپنے آپ شامل ہوتی ہے۔

مولانا ممتاز احمد قاسمی نے بتایا کہ ۱۹۸۴ میں کشمیر میں نوجوانوں نے مندر جلادیا تھا۔ اس پر شملہ کے ہندو بپھر گئے۔ انہوں نے جلسہ کیا اس میں اس قسم کی تقریریں کیں کہ شملہ کی ایک ایک مسجد کو ہم جلادیں گے۔ کوئی مسجد یہاں دکھائی نہیں دے گی۔

اس وقت شملہ کا ڈپٹی کمشنر آف پولیس مہندر لال تھا۔ وہ ہندوؤں کے یہاں گیا۔ اس نے کہا کہ اگر تم شملہ کی مسجدوں یا یہاں کے مسلمانوں کے گھروں کو جلانا چاہتے ہو تو شوق سے جلاؤ۔ تم جتنا مانگو، تیل اور پٹرول تم کو دینے کے لئے میں تیار ہوں، مگر ایک بات سن لو۔ آگ جب بھڑکے گی تو وہ ہندو اور مسلمان نہیں دیکھے گی۔ وہ مسلمانوں کے گھروں کے ساتھ تمہارے گھروں کو بھی جلائے گی۔ اس وقت تم فائر بریگیڈ مانگو گے تو میں ایک بھی فائر بریگیڈ نہیں دوں گا۔ اس کے بعد وہ ٹھنڈے ہوگئے اور شملہ میں کوئی جوابی فساد نہیں ہوا۔

پونٹا صاحب سے آگے بڑھے تو میلوں تک ہمارا سفر اس علاقہ سے ہوا جس کو دون وادی (Doon Valley) کہا جاتا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف نہایت پر کشش قدرتی مناظر تھے۔ سبز پوش پہاڑوں کی بلندی، رواں دواں نہر، دور تک نشیب و فراز میں پھیلی ہوئی ہریالی، اس کے اوپر نیلا آسمان، قدرتی حسن کے اس ماحول نے ہمارے سفر کو ایک رومانی سفر بنادیا۔

تاہم اسی کے ساتھ ایک تلخ احساس میرا پیچھا کرتا رہا۔ یورپ اور امریکہ میں میں نے اس قسم کے زمینی خطے بار بار دیکھے ہیں۔ وہاں کا حال یہ ہے کہ انسانی منصوبہ بندی نے اس کو ڈیولپ کر

کے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے درمیان جو سڑکیں اور راستے بنائے گئے ہیں وہ نہایت عمدہ ہیں۔ جب کہ یہاں یہ حال تھا کہ ناہموار اور جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی سڑکیں، اسی کے ساتھ حسن کاری کا شدید فقدان۔ انسان کی نسبت سے سہولتوں کی عدم موجودگی، وغیرہ۔

سہارن پور آتے ہوئے ایک بار ایک ٹرک سامنے آگیا۔ ہمارے ڈرائیور نے بار بار ہارن دیا مگر وہ سائڈ نہیں دے رہا تھا۔ آخر کار ہمارے ڈرائیور نے گاڑی کو سڑک سے نیچے اتار کر اس کو آگے بڑھایا۔

میں سمجھا کہ ٹرک ڈرائیور شاید پئے ہوئے تھا یا وہ سرکشی کی بنا پر سائڈ نہیں دے رہا تھا۔ پھر میں نے اپنے ڈرائیور سے پوچھا کہ وہ آخر سائڈ کیوں نہیں دے رہا تھا۔ ڈرائیور نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ اس کا سائلنسر نکلا ہوا تھا۔ اس کا اپنا ٹرک اتنا زیادہ شور کر رہا تھا کہ وہ ہمارے ہارن کی آواز نہ سن سکا۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے کیسے جانا۔ ڈرائیور نے کہا کہ ٹرک کی آواز سے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی کس طرح غلط استنباط کرتا ہے اور کسی کے بارہ میں ایک ایسی رائے قائم کر لیتا ہے جو بالکل بے بنیاد ہوتی ہے۔

مولانا انصار الحق مظاہری یہاں کے ایک لائق استاذ ہیں انہوں نے کہا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے ہمارے اکابر نے یہ فتوی دیا تھا کہ ہندوستان دار الحرب ہو چکا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ یہاں اسلامی شعائر کی بے حرمتی ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ کے بعد جو دور آیا اس میں شعائر کی بے حرمتی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی اور مذہبی آزادی میں پہلے سے زیادہ رخنے ڈالے جانے لگے۔ مگر اب ہمارے علماء اس ملک کے دار لحرب ہونے کا فتوی نہیں دے رہے ہیں۔ آخر یہ تضاد کیوں؟

یہ سوال قابل غور ہے۔ اگر ۱۹۴۷ سے پہلے کانپور کی مسجد کا صرف غسل خانہ توڑے جانے سے ہندستان دار الحرب بن سکتا تھا تو آج وہ شدید تر معنوں میں دار الحرب قرار پائے گا۔

کیوں کہ آج پوری مسجد توڑ کر اس کو مٹادیا گیا ہے۔

اس تضاد کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان کو دار الحرب قرار دینے کا جو فتوی دیا گیا وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک سیاسی فتوی تھا۔ نہ کہ کوئی دینی فتوی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ثنائیت (dichotomy) بجائے خود درست نہیں۔ اس فقہی تقسیم کے مطابق، جو ملک دار الاسلام نہ ہو وہ دار الحرب قرار پاتا ہے۔ حالانکہ " دا ر " کی اور بھی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ دار الدعوۃ اور دار الامن، وغیرہ۔

میرے نزدیک ہندستان نہ ۱۹۴۷ سے پہلے دار الحرب تھا اور نہ وہ ۱۹۴۷ کے بعد دار الحرب ہے۔ اس قسم کی دوگونہ تقسیم قرآن وحدیث میں موجود نہیں۔ وہ عباسی دور کے بعض فقہاء نے زمانی حالات کی بناء پر بنائی تھی۔ اس تقسیم کو شریعت کی طرح ابدی قرار دینا ہرگز درست نہیں۔

شام کو ہم لوگ رائے پور پہنچے۔ یہاں کچھ دیر مدرسہ فیض ہدایت رحیمی میں ٹھہرے۔ عصر کی نماز بھی اسی مدرسہ کی مسجد میں پڑھی گئی۔ مدرسہ کے مہمان خانہ میں اساتذہ جمع ہو گئے۔ ان کے سامنے بعض موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ مدارس کے لئے آپ کا مشورہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ مدارس خدا کے فضل سے بہت اہم کام انجام دے رہے ہیں۔ وہ ملت کے خیمہ کے لئے کھونٹے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آج کل مدارس کے خلاف جو بدگمانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کو دور کرنے کا حل نہ احتجاج ہے اور نہ حکومت کے ذمہ داروں سے مل کر مطالبات کا میمورنڈم پیش کرنا۔ اس کا حل یہ ہے کہ ہم خود کوشش کر کے لوگوں کی غلط فہمیوں کو دور کریں۔ اس کا سب سے طاقتور ذریعہ یہ ہے کہ مدارس قرآن کی آیت **واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض** کا مصداق بنیں۔ اپنے ماحول میں اپنے آپ کو نفع بخش بنائیں اور اس طرح اپنے لئے ایک نئی زندگی کا استحقاق ثابت کریں۔

ظہر کی نماز کسی قدر تاخیر کے ساتھ بادشاہی باغ کی مسجد میں پڑھی گئی۔ میں نے سوچا کہ سڑک کے کنارے مسجدوں کا ہونا کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہاں مسلمان وقفہ وقفہ سے کچھ وقت کے لئے ٹھہرتے ہیں۔ وہ وضو کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ سفر کے دوران بار بار وہ ان مسجدوں میں لمحاتی قیام کر کے خدا کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے سفر دنیا کو سفر آخرت کا ایک حصہ بنا لیتے ہیں۔

اس کے بعد ہماری گاڑی ایک مقام پر مڑی اب وہ رائے پور جا رہی تھی۔ یہ پانچ کیلو میٹر کا راستہ اس طرح طے ہوا کہ سڑک کے کنارے بہتی ہوئی نہر، اور پھر دونوں طرف دور تک سر سبز مناظر۔ اس کو دیکھ کر میرے سینہ میں شکر کا بے پناہ جذبہ ابھر آیا۔ میں نے سوچا کہ اس دنیا میں مومن کی سب سے بڑی کمائی یہ ہے کہ وہ شکر خداوندی کا رزق پا سکے۔ دنیا کے کسی خطۂ ارض میں جب تک مومن کو شکر الٰہی کا رزق مل رہا ہے وہ محروم نہیں ہے۔ وہ عظیم سرمایہ کا مالک ہے۔ اس نعمت کے ملتے ہوئے دوسری چیزوں سے محرومی پر واویلا کرنا ایک قسم کی ناشکری ہے جو مومن کے لئے جائز نہیں۔

سہارن پور میں ریلوے اسٹیشن کے پاس ایک مسجد ہے۔ یہاں مغرب کی نماز پڑھی گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر اٹھا تو میرے ساتھی مسجد میں نظر نہیں آئے۔ میں حیران تھا کہ وہ لوگ کہاں چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد ایک ساتھی آئے۔ ان سے اصل بات معلوم ہوئی۔

سہارن پور سے مجھے شتابدی اکسپریس کے ذریعہ دہلی کے لئے روانہ ہونا تھا۔ میرے ساتھیوں کا خیال تھا کہ اس کا وقت یہاں سے ساڑھے آٹھ بجے ہے۔ مگر مسجد میں کسی نے بتایا کہ سہارنپور سے اس کا وقت ساڑھے چھ بجے ہے۔ چنانچہ میرے ساتھی تیزی سے چل کر اسٹیشن پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کہ سہارن پور سے اس کا رزرویشن کوٹہ نہیں ہے۔ اس لئے اگر سیٹ ہو تو ٹرین پر ہی ٹکٹ مل سکتا ہے۔ یہ ایک غیر یقینی بات تھی۔ چنانچہ وہ لوگ اسٹیشن کے افسر اعلیٰ سے ملے۔ یہ مسٹر جوگندر سنگھ تھے۔

Mr. Joginder Singh, Station Superintendant

Rly. Station, Saharanpur Jn. (Tel. 744853)

مسٹر جوگیندر سنگھ نہایت شریف آدمی ہیں اور علمی ذوق رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہم لوگوں کو اپنے دفتر میں بٹھایا۔ اس کے بعد انہوں نے ٹیلی فون کر کے اسٹیشن کے ایک صاحب کو بلایا اور ان سے کہا کہ "مولانا صاحب کے لئے ایک ٹکٹ کا انتظام کرو" وہ آدمی ہمارے ایک ساتھی کو لے کر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹکٹ مجھے مل چکا تھا۔ مسٹر سنگھ نے مزید یہ کیا کہ وہ اپنے آفس سے اٹھ کر ہم لوگوں کے ساتھ ٹرین تک آئے۔ جب انہیں پورا اطمینان ہو گیا کہ مجھے سیٹ مل چکی ہے، اس کے بعد وہ واپس گئے۔

گفتگو کے دوران مسٹر جوگندر سنگھ نے بہت سی قابل تذکرہ باتیں کیں۔ انہوں نے کہا کہ اب مجھے ریٹائر ہونے میں صرف چھ مہینے باقی ہیں۔ جب میں نے سروس شروع کی تھی تو اس وقت لوگ ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ آج یہ حالت ہے کہ "کسی کو اچھی بات سکھانے کی کوشش کرو تو وہ سیکھنا نہیں چاہتا۔ ہر آدمی سمجھتا ہے کہ جتنا مجھے آتا ہے اتنا کسی کو نہیں آتا۔ چاہے حقیقت میں وہ کچھ نہ جانتا ہو"۔

شتابدی اکسپریس میں ہر چیز بالکل ہوائی جہاز کے انداز پر بنائی گئی ہے۔ وہ ہندستان کی نہایت تیز رفتار ٹرین سمجھی جاتی ہے۔ وہ سوا سو کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے۔ تاہم میں اس کے اندر اس طرح پر سکون طور پر نہیں لکھ سکتا تھا جس طرح میں ہوائی جہاز کے سفر میں ہمیشہ لکھتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مسلسل اتنی زیادہ ہلتی ہے کہ قلم کو کاغذ پر جمانا مشکل ہو جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہندستان میں ہر معاملہ میں ترقی یافتہ ملکوں کی نقل کی جارہی ہے، جب کہ ترقی یافتہ ملکوں والی بیس (base) یہاں موجود نہیں۔ شتابدی اکسپریس اتنی زیادہ اس لئے ہلتی ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں جیسی مظبوط پٹریاں یہاں بچھائی نہیں گئی۔ اسی طرح آزادی ہمارے یہاں

انارکی اس لئے بن گئی کہ اس کے لئے سلف ڈسپلن کی بیس موجود نہ تھی۔ جمہوریت ہمارے یہاں اس لئے ناکام ہے کہ ایجوکیشن میں ہمارا ملک ابھی بہت پیچھے ہے، جب کہ ایجوکیشن ہی جمہوریت کی بنیاد ہے، وغیرہ۔

۱۹ نومبر کو ٹرین ٹھیک وقت پر دہلی پہونچی۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہوا تو ایک صاحب میرے قریب آئے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا آپ "صوفی نور خان" ہیں۔ میں نے کہا نہیں۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد انہوں نے میرا نام پوچھا، میں نے انہیں نام بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کا الرسالہ تو میں پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔

انہوں نے مزید کہا کہ آپ الرسالہ میں حقیقت پسندی کی جو تعلیم دیتے ہیں، اگر میں اس پر چلتا تو میں ایک بڑے نقصان سے بچ جاتا۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے جلد دولت کمانے کے جوش میں اپنی استطاعت سے کہیں زیادہ بڑا ایک صنعتی یونٹ لگا لیا۔ وہ اس کو چلانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اب وہ قرضوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد جب میں اسٹیشن سے گھر کی طرف روانہ ہوا تو شہر کے مختلف مناظر کو دیکھنے کے بعد یہ خیال آیا کہ اس کی ذمہ داری تنہا ایک شخص پر نہیں بلکہ پورے مسلم معاشرہ پر ہے۔ موجودہ مسلم معاشرہ کا حال یہ ہے کہ اس میں نشوونما پانے والا ایک شخص کہیں بھی سنجیدگی اور حقیقت پسندی کی تعلیم حاصل نہیں کرتا۔ وہ اس معاشرہ میں جہاں بھی جاتا ہے اس کو ہر جگہ فخر پسندی اور جذباتیت کا سبق دیا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر کوئی بھی شخص اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ وہ دوسرے کو صحیح اور خیر خواہانہ مشورہ دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر آدمی خودرو پودے کی طرح اگتا ہے۔ صحیح معاشرہ وہ ہے جو افراد کے لئے اس کی زندگی کی تعمیر میں معاون بنے مگر موجودہ مسلم معاشرہ اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر یہ ذمہ داری ادا نہیں کر پاتا۔ اس کا نتیجہ مختلف شکلوں میں ہر ایک کو بھگتنا پڑتا ہے۔

سفر سے واپسی کے بعد نظام الدین کی کالی مسجد میں نماز کے لئے گیا تو یہاں ایک پوری

تاریخ یاد آگئی۔ یہ مسجد جس کو کالی مسجد یا کلاں مسجد کہا جاتا ہے، آج ایک وسیع اور شاندار مسجد دکھائی دیتی ہے۔ مگر ۱۹۴۷ میں یہ ایک کھنڈر کی صورت میں تھی جس پر کچھ لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ میوات کے حافظ عبدالغفور صاحب نے اس کو دوبارہ آباد کرنے کی خاموش کوشش شروع کردی ــــــ لمبی جدوجہد کے بعد یہ مسجد دوبارہ مسلمانوں کو مل گئی۔ اس کے بعد حافظ عبدالغفور صاحب کے بھانجے مولانا محمد ہارون صاحب کی مسلسل کوشش کا مزید نتیجہ یہ ہوا کہ آج یہ مسجد اس علاقہ کی سب سے زیادہ شاندار مسجد کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ حافظ عبدالغفور صاحب ۷۲ سال کی عمر میں دسمبر ۱۹۹۲ میں وفات پاگئے۔

حافظ عبدالغفور صاحب بظاہر ایک غیر معروف شخص تھے مگر انھوں نے معروف شخصیتوں سے زیادہ بڑا کام کیا۔ ان کی شروع سے یہ کوشش رہی کہ غیر آباد مسجدیں آباد ہوں اور مدارس کا قیام زیادہ سے زیادہ عمل میں آئے۔ انھوں نے اپنی لگن اور جدوجہد سے ۲۲ غیر آباد مسجدیں آباد کرائیں۔ ۱۵ مدرسے قائم کئے۔ دہلی میں جو مسجدیں انھوں نے آباد کرائیں ان میں سے چند یہ ہیں: فیروز شاہی جامع مسجد، بستی نظام الدین۔ جامع مسجد ڈیفنس کالونی، جامع مسجد خیر المنازل بالمقابل چڑیا گھر، مسجد پنج پیراں وغیرہ۔ اسی طرح مدرسہ زینت القرآن حوض رانی، مدرسہ اشاعت الاسلام (واقع فیروز شاہی جامع مسجد)، مدرسہ تعلیم القرآن جامع مسجد ڈیفنس کالونی، وغیرہ۔

حافظ صاحب نے جب بھی کوئی مسجد آباد کی یا کوئی مدرسہ قائم کیا تو ان مقامات پر اپنا قبضہ جمانے کے بجائے لائق شخصیات کو وہاں متعین کر کے ان کو ان کے حوالے کر دیا، مثلاً خیر المنازل میں مولانا الیاس امینی کو امام متعین کیا۔ اسی طرح ڈیفنس کالونی کی جامع مسجد میں مولانا محمد عیسیٰ کو امام مقرر کیا۔ وہ مدرسہ تعلیم القرآن کے مہتمم اور ناظم بھی ہیں۔ مولانا عیسیٰ نے اپنی محنت سے اس مسجد اور مدرسہ کو کافی وسیع کر لیا ہے۔ وہاں آج ہزاروں کی تعداد میں مسلمان نماز جمع و عیدین ادا کرتے ہیں۔ کلاں مسجد بستی نظام الدین میں اپنے بھتیجے مولانا محمد ہارون (موجودہ امام و خطیب

) کو مقرر کیا۔ حافظ عبد الغفور صاحب اپنے بھتیجے مولانا محمد ہارون کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے اور اس طرح ان کی تربیت کرتے رہتے۔ ابتداء سے ہی کلاں مسجد بستی نظام الدین کا نظم وضبط مولانا ہارون کے ذمہ رکھا۔ مولانا ہارون صاحب کا کام گویا کہ حافظ صاحب کے خواب کی عملی تعبیر ہے۔ مولانا ہارون آج بھی کلاں مسجد کی تعمیر و توسیع کے سلسلہ کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مسجد کے اندر حافظ صاحب کا قائم کیا ہوا مدرسہ اشاعت الاسلام بھی ترقی کر رہا ہے۔ اس میں بیرونی طلبہ کے قیام و طعام کا معقول انتظام ہے۔ دوسری جگہوں کی نگرانی بھی حافظ صاحب نے انہیں کے سپرد کی۔ تمام مقدمات کی پیروی بھی مولانا ہارون صاحب ہی کرتے رہے۔ مولانا ہارون صاحب کو آخر وقت تک حافظ صاحب کی یہی تاکید تھی کہ مسجد کو کبھی سیاسی اکھاڑہ نہ بننے دینا۔

حافظ صاحب کی عمر کا ایک طویل عرصہ آثار قدیمہ، ڈی ڈی اے، کارپوریشن، تیس ہزاری کورٹ، دہلی وقف بورڈ اور جمعیۃ علماء کے چکر کاٹنے میں گزرا۔ کیوں کہ انہیں پر امن اور قانونی ذرائع سے انھوں نے یہ کامیابی حاصل کی اور ایک تعمیری جدو جہد کی تاریخ چھوڑی۔

۱۹۴۷ کے بعد مسلمانوں میں بہت سے مثبت کام ہوئے ہیں۔ یہ تمام کام زیادہ تر انھیں لوگوں نے کئے ہیں جنھوں نے مسجد اور مدرسہ کو اپنے عمل کا میدان بنایا اور خاموش اور پر امن انداز کو اپنی جدو جہد کے لئے اختیار کیا۔ اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے وہ طریقہ اختیار کیا جس کو عام طور پر سیاسی طریقہ کہا جاتا ہے، ایسے لوگوں نے ملت کو صرف نقصان پہنچایا، وہ ملت کو کوئی بھی مثبت تحفہ نہ دے سکے۔

حافظ عبد الغفور صاحب جیسے بہت سے خاموش دینی خادم ملک میں موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسجد اور مدرسے کی راہ سے کام کرنے کا طریقہ ہی صحیح اور نتیجہ خیز طریقہ ہے، سیاسی ہنگامہ آرائی صرف شخصی لیڈری ہے نہ کہ واقعی معنوں میں کوئی ملّی اور دینی کام۔

سوال

بیسویں صدی میں ساری دنیا میں اسلام کے نام پر بہت سی تحریکیں اٹھیں۔ ان سب کا نشانہ اسلام کا احیاء تھا اور ملت اسلامیہ کو دوبارہ سر فرازی کا مقام دلانا تھا۔ مگر پر شور ہنگاموں اور بے پناہ قربانیوں کے باوجود ان تحریکوں کا کوئی حقیقی نتیجہ بر آمد نہیں ہو سکا۔ اب بیسویں صدی ختم ہو رہی ہے۔ اکیسویں صدی شروع ہونے والی ہے۔ مگر بظاہر ہمارا کوئی روشن مستقبل دکھائی نہیں دیتا۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

غلام نبی شاہین
(سری نگر کشمیر)

جواب

یہ تحریکیں اگرچہ اسلام کے نام پر اٹھیں۔ مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ مثبت اسلامی فکر پر مبنی نہ تھیں بلکہ وہ تقریباً سب کی سب رد عمل کی تحریکیں تھیں۔ کوئی انگریز کے رد عمل میں، کوئی یہودی کے رد عمل میں، کوئی ہندو کے رد عمل میں، کوئی کسی مسلم حکمراں کے رد عمل میں، کوئی کسی اور رد عمل میں۔ رد عمل کی تحریک ہمیشہ ایک منفی تحریک ہوتی ہے اور قانون فطرت کے تحت کسی منفی تحریک سے کوئی مثبت نتیجہ بر آمد ہونا ممکن نہیں۔ منفی تحریک کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جہاں ہے وہیں بھڑک کر وہ اچھل کود شروع کر دے۔ اس کے مقابلہ میں مثبت رد عمل یہ ہے کہ آدمی غیر جذباتی انداز میں سوچے اور پھر ایک منصوبہ کے تحت اپنا عمل وہاں سے شروع کرے جہاں سے باعتبار حقیقت اس کو اپنا سفر حیات شروع کرنا چاہئے۔ وقت گزرنے کے بعد اب امید کی صرف ایک ہی صورت ہے، اور وہ یہ کہ مسلمانوں میں دوبارہ کوئی حقیقی نوعیت کی مثبت تحریک اٹھے۔ مگر جہاں تک مسلمانوں کی موجودہ نسل کا تعلق ہے، وہ اس قسم کی کسی مثبت تحریک کی حامل نہیں بن سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی نئی تحریک کے لئے ہمیشہ نئی سوچ کی ضرورت ہوتی ہے اور مسلمانوں کی موجودہ نسل اس کی اہلیت نہیں رکھتی۔ بیسویں

صدی کے مسلم رہنماؤں مثلاً سید جمال الدین افغانی، علامہ اقبال، سید قطب، سید ابوالاعلیٰ مودودی، آیت اللہ خمینی وغیرہ کے منفی افکار کے نتیجہ میں موجودہ مسلمانوں کی حالت تقریباً وہ ہو چکی ہے۔ جس کو قرآن میں قلوبنا غلف (البقرہ ۸۸) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی دلوں کے اوپر غلاف چڑھ جانا۔ حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں مسلمانوں کے اندر جو لکھنے والے اور بولنے والے لوگ اٹھے، انھوں نے اسلام کی غیر حقیقی تشریح کی جس کو پریس اور پلیٹ فارم کے ذریعے اتنا زیادہ پھیلایا گیا کہ موجودہ مسلمانوں کی بیشتر نسل اس سے متاثر ہو کر رہ گئی۔ اب یہ نسل اسی فکری غلبہ (obsession) میں جی رہی ہے۔ اپنے اس بند ذہن سے باہر آکر سوچنا اس کے لئے ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں اب جو امید ہے وہ مسلمانوں کی اگلی نسل سے ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کے افکار کا تسلسل موجودہ نسل پر ٹوٹ جائے گا اور ہماری اگلی نسل ماضی کی اس فکر سے آزاد ہو کر سوچنے کے قابل ہو جائے گی۔ اس عمل کو فکری علیحدگی کا عمل (De-link-ing Process) کہا جا سکتا ہے۔ یہ عمل جب مکمل ہو گا تو اگلی مسلم نسل نئے ذہن کے تحت سوچنے کے قابل ہو جائے گی۔ بیسویں صدی کے رہنماؤں کے فکر سے آزاد ہو کر براہ راست قرآن و حدیث سے اپنا فکر اخذ کرنے والی یہی نسل اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا مطلوب کام کرے گی۔ یہ عین وہی عمل (Process) ہے جو بنی اسرائیل کے ساتھ صحرائے سینا میں پیش آیا تھا۔ بنی اسرائیل کی مصری نسل جب صحرائے سینا میں ختم ہو گئی اور چالیس سال کے بعد اگلی نسل جوان ہوئی تو اسی نے اسرائیل کو از سر نو زندہ کیا۔ میرے نزدیک موجودہ مسلمان دنیا بھر میں اب اسی صحرائی دور کے آخری مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ اکیسویں صدی کا نصف اول انشاء اللہ وہ دور ہو گا جب کہ نئی مسلم نسل اٹھ کر کوئی بڑا اسلامی کارنامہ انجام دے گی۔

خبر نامہ اسلامی مرکز ۱۴۰

۱۔ راج گھاٹ (نئی دہلی) میں ۵ جنوری ۱۹۹۹ کو ایک جلسہ ہوا۔ اس جلسہ کا انتظام اکھل بھارتیہ رچناتمک سماج کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس کا موضوع مذہبی ہم آہنگی تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر قرآن سے سورۃ فاتحہ کی تلاوت کی اور اس کی روشنی میں ایک تقریر کی جس میں اسلام کی تعلیمات کو بتایا گیا۔

۲۔ راما کرشنا مشن، نئی دہلی میں ۱۰ جنوری ۱۹۹۹ کو ایک سمینار ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس موقع پر اپنی تقریر میں انہوں نے کہا کہ ملک کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں مل کر پیار و محبت کے ساتھ رہنا سیکھیں۔ اتحاد کے بغیر ایک خاندان بھی ترقی نہیں کرتا، پھر پورا ملک کیسے اتحاد کے بغیر ترقی کر سکتا ہے۔ اتحاد کا راز ہے کانٹے کو بھی پھول کے روپ میں دیکھنا۔ ناخوش گواری میں بھی خوشگوار پہلو کو نکال لینا۔

۳۔ ہندی روزنامہ نوجیوتی (اجمیر) کے نمائندہ مسٹر یوسف انصاری نے ۱۱ جنوری ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ہندستان کے موجودہ سیاسی حالات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستان کے لئے بظاہر اکیسویں صدی بھی ویسی ہی ہوگی جیسی کے بیسویں صدی۔ اس لئے کہ یہاں کے حقیقی حالات میں ابھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سب سے اہم چیز ایجوکیشن ہے مگر پچاس سال میں پہلی بار پروفیسر امرتیہ سین نے اس بات کو زوردار طریقہ سے کہا کہ ایجوکیشن کو دستور ہند کے بنیادی حقوق میں شامل کرنا چاہئے۔ یہ نہایت درست بات ہے۔ اگر ۱۹۴۷ ہی میں اس کو اختیار کر لیا گیا ہوتا تو آج ہم ایک نئے ہندستان کی تعمیر کر چکے ہوتے۔

۴۔ ہندی اخبار راشٹریہ سہارا (نئی دہلی) کی نمائندہ ڈالی ودھوا نے ۱۳ جنوری ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی

مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کنورزن کے مسئلہ سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ موجودہ حالات میں کنورزن کے خلاف قانون بنانا ممکن نہیں۔ ایسا قانون دستور ہند اور خود ہندو مذہب کی نفی کے ہم معنی ہوگا۔ اسی کے ساتھ ہندستان نے اقوام متحدہ کے چارٹر پر دستخط کیا ہے جس میں ہر ایک کو مکمل آزادی کا حق دیا گیا ہے۔ ہندستان جب تک اس عہد سے بندھا ہوا ہے وہ اینٹی کنورزن قانون نہیں بنا سکتا۔ اینٹی کنورزن منصوبہ سادہ طور پر صرف کنورزن کے خلاف نہیں بلکہ وہ نیچر کے خلاف ہے اور کون ہے جو نیچر کے خلاف پابندی لگانے میں کامیاب ہو۔

۵۔ نیشنل کونسل فار فلاسفیکل ریسرچ، نئی دہلی کے تحت تغلق آباد میں ۱۴ جنوری ۱۹۹۹ کو ایک سمینار ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس میں مختلف ملکوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک تھے۔ صدر اسلامی مرکز نے یہاں اسلام اینڈ پیس کے موضوع پر انگریزی میں ایک تقریر کی۔

۶۔ اسٹار ٹی وی کی ٹیم نے ۱۵ جنوری ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویور مسٹر راکیش ترپاٹھی تھے۔ ایک سوال سیاسی روزہ افطار کے بارہ میں تھا۔ انھوں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ دنیا مقابلہ کی جگہ ہے۔ یہاں ہر آدمی اپنا فائدہ لینا چاہتا ہے۔ آپ لوگوں کی نیت کو نہ دیکھئے ۔ بلکہ یہ دیکھئے کہ جو لوگ افطار کے نام سے وہاں اکٹھا ہوتے ہیں وہ کہیں اور نہیں ملیں گے۔ لہذا اس موقع کو آپ روزہ کے تعارف کا اسٹیج بنا دیجئے۔ میں نے خود ایسا کئی بار کیا ہے۔

۷۔ زی ٹی وی کی ٹیم نے ۱۷ جنوری ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ان کا ایک سوال یہ تھا کہ آج کل پولیٹکل لوگ افطار کا انتظام کرتے ہیں۔ یہ کھلے طور پر سیاسی افطار ہے۔ کیا اس سے روزہ اور افطار کا تقدس مجروح نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ اس موقع کو آپ روزہ اور اسلام کے تعارف کا ذریعہ بنائیں۔ اسلام کے بارے میں لوگوں کی غلط فہمیوں کو دور کریں۔ لوگوں کو اسلام کی باتیں بتائیں۔ اسلام کے تعارف پر خوبصورت پمفلٹ چھاپ کر تقسیم

کریں۔

۸۔ صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۹ جنوری ۱۹۹۹ کو نشر کی گئی۔ اس کا موضوع عید الفطر تھا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ عید الفطر کا تیوہار عالمی انسانی قدروں کو فروغ دینے کا تیوہار ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اعلیٰ اخلاقی اصولوں پر زندگی گزارنے کی تربیت دی جائے۔

۹۔ آریہ سماج بھون (نئی دہلی) میں ۲۴ جنوری ۱۹۹۹ کو ایک جلسہ ہوا۔ اس میں مختلف مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس کا موضوع سوشل جسٹس تھا۔ انھوں نے اس موضوع پر اسلام کی روشنی میں تقریر کی۔ انھوں نے بتایا کہ اسلام میں دو بنیادی تصور ہے۔ جس پر اسلام کی تمام تعلیمات مبنی ہیں۔ توحید اور عدل۔ اس کو قرآنی آیتوں کی روشنی میں واضح کیا۔ **امر بالمعروف نہی عن المنکر** کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اسلام کے مطابق آدمی کو چاہئے کہ سماج میں جہاں بے انصافی ہو وہاں پہنچ کر اس کو روکنے کی کوشش کرے۔ ایسا نہ کر سکے تو کھلے طور پر اپنی زبان سے اس کی مذمت کرے۔ یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے اس کو غلط سمجھے۔

۱۰۔ ۲۶ جنوری ۱۹۹۹ کو این ٹی وی (نئی دہلی) نے ایک گروپ انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس میں صدر اسلامی مرکز کے علاوہ سوامی اگنی ویش، فادر والسن تھمپو، ڈاکٹر موھندر سنگھ، ڈاکٹر مرچنٹ بھی شریک تھے۔ سوالات کا تعلق ملک میں امن وامان کے سوال سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں صدر اسلامی مرکز نے کہا کہ کسی بھی سماج میں اختلافات کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس لئے خود اختلاف کو مٹایا نہیں جاسکتا۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اختلاف کے موقع پر ہمیشہ ڈائیلاگ اور پر امن حل کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ کسی بھی حال میں تشدد اور توڑ پھوڑ کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔

۱۱۔ اسلام پور (مرشد آباد) کے دینی مدرسہ کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے مرشد آباد

(بنگال) کا دورہ کیا۔ یہاں مدرسہ کے سالانہ اجتماع میں شرکت کی۔ اور مختلف مقامات پر کئی دینی اور دعوتی خطابات کیے۔ یہ سفر ۳۰ جنوری ۱۹۹۹ کو شروع ہوا اور ۲ فروری کو ختم ہوا۔ اس کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں سفر نامہ کے ذیل میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۲۔ نیشنل کونسل آف چرچ (نئی دہلی) کی طرف سے وائی ایم سی اے کانفرنس سنٹر میں ۵ فروری ۱۹۹۹ کو ایک انٹر نیشنل میٹنگ ہوئی۔ اس میں ہندوستان کے علاوہ یورپ کے کئی اسکالر شریک ہوئے۔ اس کا موضوع تھا: انسان کو باہم جوڑنے والی چیز کیا ہے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور حدیث کی روشنی میں انگریزی میں ایک تقریر کی۔

۱۳۔ گلف نیوز کے نمائندہ مسٹر گوپال مشرا نے ۶ فروری ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اسلام میں ہر فرد کو رائے کی آزادی دی گئی ہے۔ اسلام کے مطابق کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے کہے کہ تم فلاں بات بولو اور فلاں بات نہ بولو۔ ایک آدمی کو اگر کسی کی رائے سے اختلاف ہے تو وہ دلیل کے ذریعہ اس کی کاٹ کر سکتا ہے، لیکن اختلاف رائے کی بنیاد پر کسی کے خلاف تشدد کرنا اسلام میں جائز نہیں۔

۱۴۔ ادارۂ الرسالہ کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق دی کہ وہ اسلام کے پیغام توحید اور پیغام انسانیت کو نہ صرف ہندستان بلکہ ساری دنیا میں پھیلائے۔ اس کا ایک نمونہ وہ مضمون ہے جو حال میں انگریزی اخبار پانیر (۷ فروری ۱۹۹۹) میں چھپا ہے۔ یہ مضمون مع ترجمہ الرسالہ کے زیر نظر شمارے میں شامل ہے۔ پانیر میں یہ مضمون مندرجہ ذیل عنوان سے شائع ہوا:

How Islam passed the test of history

اس طرح کے مضامین انگریزی اور ہندی اور دوسری زبانوں کے اخبارات و رسائل میں سالہا سال سے مسلسل شائع کئے جا رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ ملک کے اندر اور ملک کے باہر

مشترک کانفرنسوں میں سال بھر یہ دعوتی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسلام کی دعوت کو پھیلانا اور اسلام کی عظمت کو آج کی دنیا میں قائم کرنا الرسالہ کا نشانہ ہے۔ اور غالباً الرسالہ مشن دور جدید کا واحد مشن ہے جو کامیابی کے ساتھ عالمی اور بین الاقوامی سطح پر یہ کام کر رہا ہے۔ امریکہ کے کچھ لوگوں کے تعاون سے یہ مشن اب انٹرنیٹ اور ویب سائٹ پر بھی آچکا ہے۔

۱۵۔ فروری ۱۹۹۹ کے پہلے ہفتہ میں صدر اسلامی مرکز نے بنگال کا دعوتی سفر کیا۔ اس سلسلہ میں کلکتہ، برہم پور اور مرشد آباد میں مختلف پروگرام ہوئے جن میں اس علاقہ کے ہندو اور مسلمان دونوں بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ بڑے پیمانہ پر انفرادی ملاقاتیں ہوئیں۔ گفتگو اور تقریر کا موضوع زیادہ تر دو تھا۔ اسلامی دعوت اور ملکی تعمیر۔ اس چار روزہ سفر کی روداد انشاءاللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۶۔ کھادی اینڈ ولج انڈسٹریز کمیشن کی طرف سے ۹ فروری ۱۹۹۹ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ایک سیمنار ہوا جس میں اعلی تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس کا موضوع تشدد اور پولیوشن تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اس موضوع پر ایک تقریر کی۔ ایک مقرر کے جواب میں انھوں نے کہا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ ہندستان میں اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ مورخین نے تسلیم کیا ہے کہ اسلام جہاں بھی پھیلا ہے اپنی نظریاتی برتری کے زور پر پھیلا ہے نہ کہ تلوار کے زور پر۔

۱۷۔ دوردرشن (نئی دہلی) نے ۱۹ فروری ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک گھنٹہ کے انٹرویو میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ آپ کو سنگیت سننے کا شوق ہے۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ سنگیت سے دلچسپی تو انسان کی فطرت ہے۔ مگر مجھے پروفیشنل آرٹسٹوں کے سنگیت سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس فطرت کا سنگیت مجھے بہت پسند آتا ہے۔ چڑیوں کے چہچہے، ہواؤں کی سرسراہٹ، دریا کی روانی میں جو موسیقی ہوتی ہے وہ فطرت کی موسیقی ہے، وہ بناوٹی نہیں، ایسی فطری موسیقی مجھے پسند آتی ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

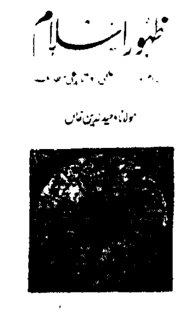
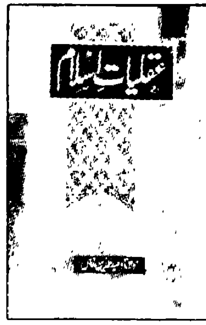
۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۵۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

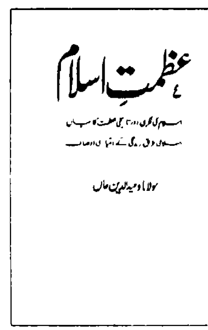
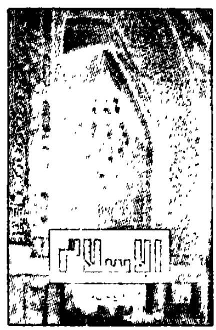
۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

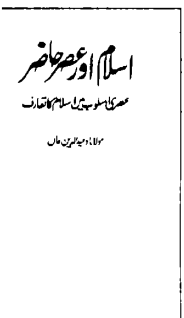
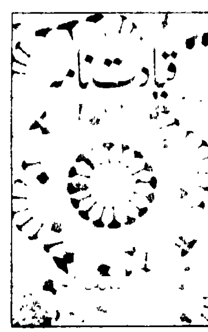
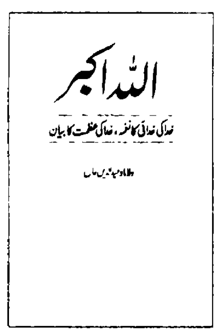
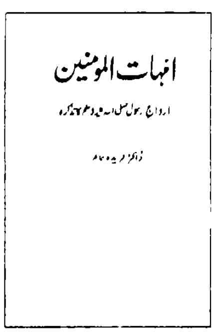
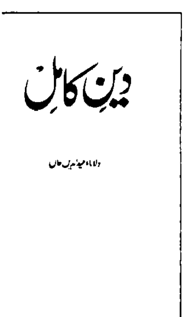
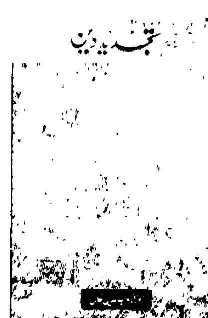
زرِ تعاون الرسالہ

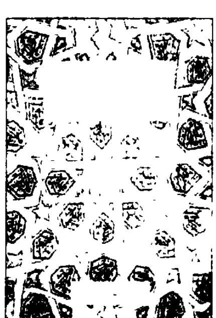
	INLAND		ABROAD	
	Urdu	English	Air-Mail	
	Rs.	Rs.	US$	£
1 Year	100	60	10	6
2 Years	195	120	20	12
3 Years	290	175	30	18
5 Years	480	280	50	30


ظہور اسلام
مولانا وحیدالدین خاں

عقلیات اسلام

دین انسانیت
اسلام کا فکری اور عملی اور تاریخی مطالعہ

مذہب اور جدید چیلنج

عظمتِ اسلام
مولانا وحیدالدین خاں



اسلام اور عصر حاضر
عصری اسلوب میں اسلام کا تعارف
مولانا وحیدالدین خاں

قیادت نامہ

اللہ اکبر
مولانا وحیدالدین خاں

امہات المومنین

دینِ کامل
مولانا وحیدالدین خاں

تجدید دین

خاتون اسلام


اسلامی زندگی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
skhan@vsnl.com
http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi

جون 1999، شمارہ 271

فہرست — صفحہ

امت وسط

قرآن میں امت محمدی کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: **وکذلك جعلنٰکم امة وسطا لتکونوا شهداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شهیداً** (البقرہ ۱۴۳) یعنی اس طرح ہم نے تم کو امتِ وسط بنادیا تاکہ تم ہو شاھد (بتانے والے) لوگوں کے اوپر اور رسول ہو تم پر شاہد (بتانے والا)۔

وسط کے معنی بیچ کے ہیں ـــــ امت وسط کا مطلب ہے بیچ کی امت۔ جیسا کہ آیت کے الفاظ سے واضح ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ امت محمدی کو خدائی پیغام رسانی کے عمل میں بیچ کی کڑی کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے ایک طرف پیغمبر اسلام ہیں اور اس کے دوسری طرف اقوام عالم۔ امت محمدی کو نسل در نسل یہ کام کرنا ہے کہ وہ پیغمبر آخر الزماں ﷺ سے خدا کے دین کو لے، اور پھر اس کو ٹھیک ویسا ہی ہر دور کے انسانوں تک پہنچاتی رہے۔

مفسر الطبری نے حضرت ابن زید کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: **رسول الله ﷺ شاهد علی امته، وهم شهداء علی الامم** (تفسیر الطبری ۱۱/۲) یعنی رسول اللہ ﷺ اپنی امت کے اوپر شاہد ہیں اور امت دوسری قوموں کے اوپر شاہد ہے۔

اس آیت کی تشریح میں حضرت ابن زید کا اسی مفہوم کا ایک اور قول نقل ہوا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: **هم وسط بین النبی ﷺ وبین الأمم** (صفحہ ۸) یعنی یہ امت رسول اللہ ﷺ اور اقوام عالم کے درمیان ہے۔

اس آیت میں دراصل امت محمدی کی مخصوص ذمہ داری بتائی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی پیغمبر آنے والا نہیں۔ مگر خدا کے دین کی پیغام رسانی کا کام بدستور باقی ہے۔ اب یہ کام پیغمبر اسلام ﷺ کی نیابت میں آپ کی امت کو انجام دینا ہے۔ یہ درمیانی ذمہ داری اس امت کو نسل در نسل انجام دینا ہے یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

مشکل نہیں

میری زندگی کا ایک بہت بڑا سبق وہ ہے جو مجھ کو قرآن سے ملا۔ اسلام کے شروع کے زمانہ میں جب مسلمان بہت تھوڑے تھے اور ان کے مخالفین ان کو بہت زیادہ ستاتے تھے۔ اس وقت ان کے ذہن میں یہ سوال تھا کہ مشکلات کے اس طوفان میں اپنا کام کس طرح کیا جائے۔

اس وقت قرآن میں ایک آیت اتری جس میں انھیں اس معاملہ میں رہنمائی دی گئی۔ وہ آیت یہ تھی: ان مع العسر یسرا یعنی مشکل سے نہ گھبراؤ، کیونکہ مشکل کے ساتھ ہی اس دنیا میں آسانی بھی موجود ہے۔ قرآن کی اس آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ مشکل کے بعد آسانی ہے بلکہ یہ فرمایا کہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ یعنی جہاں مشکل ہے وہیں اور عین اسی وقت آسانی بھی موجود ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کو بنانے والے نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں پرابلم کے ساتھ اس کا حل بھی موجود ہو۔ جہاں پرابلم یا کٹھنائی ہو وہیں ایسے مواقع (opportunities) بھی موجود ہوں جن کو استعمال کر کے آدمی آگے بڑھ سکے۔ اس دنیا میں پرابلم اور حل دو ایسے جوڑواں بھائی ہیں جو کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔

میں اپنی زندگی میں کئی بار نقصان یا ناکامی سے دوچار ہوا ہوں مگر میں نے ہر بار اسی اصول کو استعمال کیا۔ چنانچہ جب بھی میں نے غور کیا تو میں نے پایا کہ جہاں پرابلم پیدا ہوا وہیں اس کا حل بھی موجود تھا۔ مثلاً یہ کہ جہاں اوسط درجہ کی محنت سے کام نہ بن رہا ہو وہاں آدمی زیادہ محنت کر کے اپنا کام بنا لے۔

میں نے ایک بار ایک منظر دیکھا۔ اسکول کے بچے تقریباً ایک سو کی تعداد میں اسکول سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ وہ فٹ پاتھ پر چلنا چاہتے تھے مگر تنگ فٹ پاتھ پر وہ بھیڑ کی صورت میں نہیں چل سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے استاد کی ہدایت پر یہ کیا کہ دو دو کی صورت میں لمبی قطار بنالی

اس طرح وہ آسانی کے ساتھ فٹ پاتھ سے گذر گئے۔ ایسا نہیں ہوا کہ وہ پوری سڑک پر پھیل کر ٹریفک کے لئے مسئلہ پیدا کریں۔

ان طالب علموں کے لئے دائیں اور بائیں پھیلنے کا موقع نہیں تھا۔ انھوں نے آگے اور پیچھے پھیل کر اپنا راستہ طے کر لیا۔ اس واقعہ کو دیکھ کر میں نے یہ سمجھا کہ مشکل میں آسانی ہونے کا مطلب کیا ہے۔ یہ ایک مثال ہے جو اس معاملہ کو بہت خوبی کے ساتھ بتا رہی ہے۔ سڑک کے سفر کا یہ واقعہ زندگی کے دوسرے تمام معاملات میں رہنمائی دے رہا ہے۔

مشکل میں آسانی کا یہ معاملہ نیچر کا ایک اٹل قانون ہے۔ اس کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ نیچر کا یہ طریقہ ہے کہ جب بھی کہیں ایک مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو وہ خود ہی اپنے آپ اس کے حل کی طرف دوڑ پڑتی ہے۔ وہ ایک خود کار نظام کی طرح مشکل کے ساتھ آسانی لاتی ہے۔

مثلاً ایک شخص جب کسی مشکل صورت حال سے دوچار ہوتا ہے تو نیچر کے پراسس کے تحت اپنے آپ اس کے دماغ کے ذرّات اور زیادہ متحرک ہو جاتے ہیں۔ اس کی ذہنی دنیا میں ایک نئی بیداری آ جاتی ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ سوچنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ زیادہ بڑھی ہوئی سوچ اور زیادہ بڑھی ہوئی طاقت سے آئی ہوئی مشکل کو حل کر سکے۔

آپ کے راستہ میں چٹان حائل ہو تو اس کے کنارے سے اپنا راستہ نکال لیجئے۔ ٹکراؤ کے ذریعہ جو مسئلہ حل نہ ہو رہا ہو اس کا حل صابرانہ تدبیر میں دریافت کیجئے۔ جہاں بولنا بظاہر کار آمد نہ ہو وہاں خاموشی کا اسلوب اختیار کیجئے۔ جو کام جسمانی طاقت کے ذریعہ بنتا ہوا نظر نہ آئے وہاں عقل و دانش کی طاقت کو استعمال کیجئے۔

یہی موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی کی تعمیر کا واحد اصول ہے۔ اس دنیا میں کامیاب وہ ہے جو اس اصول کو دریافت کر کے اسے اپنے حق میں استعمال کرے اور ناکام وہ ہے جو فطرت کے اس اصول کو دریافت نہ کر سکے اور نتیجۃً اپنے عمل کی درست منصوبہ بندی میں ناکام رہے۔

اللہ کا ذکر

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ وہ کون لوگ ہیں جن کا درجہ اللہ کے نزدیک قیامت کے دن سب سے افضل ہوگا۔ فرمایا کہ اللہ کا بہت زیادہ ذکر کرنے والے (ان رسول اللہ ﷺ سئل ای العباد افضل درجة عند اللہ یوم القیامة قال الذاکرین اللہ کثیراً) الترمذی، کتاب الدعوات۔

ذکر کا مطلب کسی قسم کا لفظی ورد نہیں ہے۔ اس کا مطلب اللہ کی یاد ہے۔ اللہ کی یاد پورے دین کا خلاصہ ہے۔ بندہ جب اپنے رب کو اس کی عظمت و جلال کے ساتھ دریافت کرتا ہے تو یہ دریافت اس کی پوری شخصیت کے اندر ایک ہلچل پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے دل میں خدا کی یاد کا طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ اس کی یہ اندرونی کیفیت بار بار تکبیر و تحمید کے الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔

اسی بے تابانہ یاد کا نام ذکر ہے۔ اس ذکر کا کوئی وقت نہیں، وہ ہر حال میں آدمی کی زبان پر جاری رہتا ہے، خواہ گھر کے اندر ہو یا مسجد میں ہو یا میدان جہاد میں۔ یہ ذکر بلاشبہہ تمام اعمال میں سب سے افضل عمل ہے۔ الترمذی کی ایک اور روایت میں ہے کہ جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو وہاں خوب چر لو۔ پوچھا گیا کہ جنت کے باغ کیا ہیں۔ فرمایا کہ ذکر کے حلقے (اذا مررتم بریاض الجنة فارتعوا۔ قالوا وما ریاض الجنة ۔ قال حلق الذکر)

الطبرانی نے یہ روایت کسی قدر لفظی فرق کے ساتھ نقل کی ہے۔ اس سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ اس میں ہے کہ جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو خوب چر لو۔ پوچھا گیا کہ جنت کے باغ کیا ہیں۔ فرمایا کہ علم کی مجلسیں (اذا مررتم بریاض الجنةفارتعوا ۔ قالوا وما ریاض الجنة ۔ قال مجالس العلم) مجلس ذکر اور مجلس علم دونوں ایک ہیں۔ انفرادی ذکر جب اجتماعی ذکر کی صورت میں ہو تو اسی کا نام مجلس ذکر یا مجلس علم ہے۔

داخلی کیفیت

قال رسول الله ﷺ ان الله لاینظر الی صورکم واموالکم و لکن ینظر الی قلوبکم و اعمالکم (مشکوٰۃ ۳۔ ۱۴۶۲)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تمہاری صورتوں کو اور تمہارے مال کو نہیں دیکھتا۔ بلکہ وہ تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔

عمل کے دو پہلو ہیں، خارجی اور داخلی۔ اللہ کے یہاں کسی عمل کی قیمت اس کی صورت خارجی کے اعتبار سے متعین نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی کیفیت داخلی کے اعتبار سے متعین ہوتی ہے۔ داخلی احساس اور اندرونی محرک کے اعتبار سے اگر آدمی اللہ کی رضا کے لئے متحرک ہوا ہے تو اس کا عمل قابل انعام ٹھہرے گا۔ اور اگر آدمی کے داخلی وجود اور اس کی اندرونی شخصیت میں اللہ کی رضا طلبی کے سوا کوئی اور جذبہ بسا ہوا تھا تو ایسے آدمی کا عمل رد کر دیا جائے گا۔ وہ اللہ کے یہاں کسی انعام کا مستحق نہیں قرار پائے گا۔

ایک شخص دینی سرگرمی دکھاتا ہے۔ اس کی دینی سرگرمی اگر خالص اللہ کے لئے ہو تو وہ آخرت کی میزان میں قابل قدر ہے، اور اگر اس کی سرگرمی کا محرک لوگوں کے درمیان عزت حاصل کرنا ہو تو ایسی دینی سرگرمی کی اللہ کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ ایک شخص اللہ کے نام پر مال خرچ کرتا ہے۔ اگر یہ کام اس نے رضائے الٰہی کی طلب میں کیا ہے تو وہ آخرت میں اس کا انعام پائے گا۔ لیکن اگر اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگوں کے درمیان نمایاں ہو تو اس کا مالی انفاق آخرت میں اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔

کوئی کام خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی قدر و قیمت کا تعین اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے پیچھے کام کرنے والے جذبہ سے ہوتا ہے نہ کہ محض اس اعتبار سے کہ وہ ظاہری طور پر لوگوں کو کیسا دکھائی دیتا ہے۔ جو شخص دنیا کے لئے کام کرے، اس نے دنیا ہی میں اپنے عمل کا بدلہ پالیا۔ جو شخص آخرت کے لئے کام کرے تو اس کا عمل آخرت کے دفتر میں محفوظ ہے۔ وہ اپنی آخرت کی زندگی میں اس کا بہترین اجر پائے گا۔ اور بلاشبہ سب سے اچھا اجر آخرت کا اجر ہے۔

حقیقی کامیابی

کسی آدمی کی سب سے بڑی محرومی کیا ہے۔اس کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ وہ نہ ملنے والی چیز کی خاطر ملنے والی چیز سے اپنے آپ کو محروم کر لے۔ دنیا میں آدمی کو مختلف قسم کی لذتیں دکھائی دیتی ہیں۔ خوشیوں کے قہقہے اس کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ وہ ان خوشیوں اور لذتوں کی طرف دوڑتا ہے۔ ہر قسم کی کوشش کے بعد آخر کار وہ انہیں حاصل کر لیتا ہے۔ یہ خوشیاں اور لذتیں کسی کو کم مقدار میں ملتی ہیں اور کسی کو زیادہ مقدار میں۔ مگر یہ صرف ایک ظاہری فرق ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے ہر ایک محروم ہوتا ہے۔ ہر ایک اس احساس میں مبتلا رہتا ہے کہ جس خوشی اور لذّت کو وہ حاصل کرنا چاہتا تھا، بظاہر پانے کے باوجود وہ اس کو نہ پا سکا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لذتیں اور خوشیاں ہمیشہ انسان کی اصل طلب سے بہت کم ہوتی ہیں۔ انسان کی اصل طلب یہ ہے کہ اس کو معیاری خوشی اور معیاری لذت ملے۔ مگر دنیا کی ہر لذت انسان کے ذہنی معیار سے بہت کم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں محل والا بھی اپنی حاصل کردہ خوشی سے اتنا ہی غیر مطمئن ہوتا ہے جتنا کہ جھونپڑی والا۔

آخرت کی خوشی کے لئے دوڑنا ایک حقیقی خوشی کی طرف دوڑنا ہے اور دنیا کی خوشی کے لئے دوڑنا ایک بے حقیقت خوشی کی طرف دوڑنا ہے۔ ایسی حالت میں جو شخص آخرت کو بھول کر دنیا کی خوشی کی طرف دوڑے اس نے گویا نہ پانے والی چیز کی طلب میں اپنے آپ کو پانے والی چیز سے محروم کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ معیاری لذت اور معیاری خوشی صرف آخرت میں ہے۔ خوش نصیب وہ ہے جس کو آخرت کی معیاری لذت اور خوشی حاصل ہو۔ اس دنیا میں واحد کامیاب انسان وہ ہے جو نہ ملنے والی چیز سے نظریں ہٹا کر ملنے والی چیز کے لئے عمل کرے، جو دنیا کی فرضی جنت کو چھوڑ کر آخرت کی حقیقی جنت کو اپنے لئے یقینی بنانے کی کوشش کرے۔

معیار نجات

قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ لوگ اگر اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو انھوں نے ہدایت پائی۔ (البقرہ ۱۳۷)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ہدایت کا معیار کیا ہے جو آدمی کو نجات تک پہنچانے والا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی اس معرفت ایمان کا ثبوت دے جس کا ثبوت پیغمبر کے معاصر مؤمنین نے دیا تھا۔ اس معرفت سے کم تر درجہ کا ایمان خدا کے یہاں مقبول اور مطلوب نہیں۔ قرآن کی روشنی میں انسان کے معاملہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نجات یا جنت کا حصول انھیں انسانوں کے لئے ہے جو دوبارہ اس معیار پر پورے اتریں جس پر پیغمبر کے معاصر مؤمنین پورے اترے۔ پیغمبر کے معاصر اہل ایمان نے جس معرفت کا ثبوت دے کر پیغمبر کو پہچانا اور ایمانی زندگی اختیار کی، بعد کے زمانہ میں بھی معرفت کا وہی درجہ مقبولیت کی شرط ہے۔ اسی معرفت کا ثبوت دے کر پیغمبر کے معاصر مؤمنین اپنے زمانہ کے پیغمبر کے ساتھی بنے تھے۔ پیغمبر کے معاصر مؤمنین نے پیغمبر کو اس کی مجرد صورت میں پہچانا۔ وہ پیغمبر کی تاریخی عظمتوں کو دیکھے بغیر اس پر ایمان لائے۔ انھوں نے اس وقت پیغمبر کا ساتھ دیا جب کہ پیغمبر کے ساتھ مادی یا دنیوی عظمتیں شامل نہیں ہوئی تھیں، جب کہ پیغمبر لوگوں کے درمیان ایک متنازعہ شخصیت بنا ہوا تھا نہ کہ آج کی طرح ایک مسلمہ شخصیت۔

یہی اللہ کے نزدیک ہدایت کا معیار ہے۔ جو لوگ اس خدائی معیار پر پورے اتریں وہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔ اصحابِ رسول تمام مسلمانوں کے لئے معیار ہیں۔ صرف اس معنیٰ میں نہیں کہ انہوں نے شکلاً جس طرح نماز پڑھی اسی طرح ہم بھی نماز پڑھیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اصحاب رسول جس طرح ایمان لائے ہم بھی اسی طرح ایمان لائیں۔

فراست مومن

قرآن میں تاریخ کے بعض واقعات کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے: انّ فی ذلك لآیات للمتوسمین(الحجر ۷۵) اس آیت میں متوسم کی تشریح متفرس سے کی گئی ہے۔ یعنی ان تاریخی واقعات میں نشانی ہے اہل فراست کے لئے (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱۰/۴۲)

اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی آئی ہے جو اس کی مزید وضاحت کرتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق، اس حدیث رسول کے الفاظ یہ ہیں:

احذروا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله وينطق بتوفيق الله (جامع البيان عن تاويل آى القرآن للطبرى ٤٧/١٤)	مؤمن کی فراست سے بچو کیوں کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے اور وہ اللہ کی توفیق سے کلام کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی پر ایمان آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرتا ہے کہ وہ چیزوں کو ربانی نظر سے دیکھے اور معاملات کے اوپر اس اعلیٰ اسلوب میں کلام کرنے لگے جو خدا کی خصوصی توفیق سے کسی کو حاصل ہوتا ہے۔

مومن اور غیر مومن کا فرق یہ ہے کہ غیر مومن چیزوں کے ظاہر کو دیکھ کر اپنی رائے قائم کرتا ہے۔ جب کہ مومن چیزوں کے ظاہر سے گزر کر اس کے باطن تک پہونچ جاتا ہے۔ وہ اندرونی حقائق کے اعتبار سے اپنی رائے قائم کرتا ہے۔ یہی وہ خاص صفت ہے جس کی وجہ سے دونوں کی رایوں میں یہ فرق پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک کی رائے بے پناہ حد تک طاقتور ہوتی ہے۔ اور دوسرے کی رائے بے وزن اور بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔

مثلاً ایک شخص ہے جس کو اللہ سے تعلق نہیں۔ وہ بس اپنی ذات میں جیتا ہے اور اپنی عقل

سے رہنمائی لیتا ہے۔ ایسے شخص کو ایک آدمی گالی دیتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ زیادتی کرتا ہے۔ اب یا ہو گا۔ اب یہ ہو گا کہ اس شخص کی انا بھڑک اٹھے گی۔ اس کی عقل اس کو بتائے گی کہ اس آدمی کو سبق سکھانا ہے۔ اگر میں نے اس کو سبق نہیں سکھایا تو وہ مجھ کو بزدل سمجھ لے گا اور آئندہ میرے خلاف زیادتیوں کے لئے وہ اور بھی جری ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ مذکورہ آدمی سے لڑ جائے گا۔ خواہ اس کے نتیجہ میں اس کو مزید تباہی کے سوا کچھ اور ملنے والا نہ ہو۔

اس کے برعکس جس آدمی کے خوف خدا نے اس کو متواضع بنا رکھا ہو۔ جس کو خدا کی بڑائی کی معرفت اس طرح حاصل ہو جائے کہ اس کے اندر سے اپنی بڑائی کا احساس نکل جائے۔ ایسے آدمی کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے خلاف اشتعال انگیز بات کرے تو اس کی تواضع کی نفسیات اس کو اس انجام سے بچائے گی کہ وہ اشتعال انگیزی پر بھڑک اٹھے۔ اس کا خوف خدا اس بات کا ضامن بن جائے گا کہ بھڑکانے والی بات کے باوجود وہ معتدل بنا رہے۔

اشتعال انگیزی پر بھڑک اٹھنے والا آدمی اگر اپنی عقل کو کھو بیٹھتا ہے تو اشتعال انگیزی پر نہ بھڑکنے والے آدمی کو یہ خصوصیت حاصل ہو گی کہ اس کے جذبات پوری طرح اس کے قابو میں ہوں اور اس کی عقل معاملے کو ٹھیک ٹھیک سمجھے اور وہ درست طور پر اپنی جوابی کاروائی کا منصوبہ بنائے۔

مومن کی یہی صفت ہے جو اس کو صاحب فراست بناتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ بے پناہ حد تک ناقابل تسخیر ہو جاتا ہے۔

مومنانہ عمل، دوسرے لفظوں میں، ایک صابرانہ عمل ہے۔ اور غیر مومنانہ عمل اس کے مقابلے میں ایک عاجلانہ عمل۔ صابرانہ کاروائی منصوبہ بند کاروائی کا نام ہے اور عاجلانہ کاروائی غیر منصوبہ بند کاروائی کا نام۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ عاجلانہ کاروائی ہمیشہ ناکام ہوتی ہے، اور صابرانہ کاروائی ہمیشہ کامیاب۔ تاریخ کے تمام تجربات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مسلمہ ہے جس میں کوئی بھی استثناء نہیں۔

قساوتِ قلب

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ۔۔۔ کیا ایمان والوں کے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں۔ اور اس حق کے آگے جو نازل ہو چکا ہے۔ اور وہ ان لوگ کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی توان کے دل سخ ہو گئے۔ اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں (الحدید ١٦)

اس آیت میں قساوت سے مراد دل کا سخت ہو جانا یا بے حس ہو جانا ہے۔ یہ کیفیت ہم ان قوموں کے ساتھ پیش آتی ہے جن کو خدا کی کتاب دی گئی اور پھر ان پر لمبی مدت گزر گ دوسرے لفظوں میں یہ کہ حامل کتاب گروہ کی ابتدائی نسل میں ایمانی حساسیت زندہ رہتی ہے۔ بعد کی نسلوں میں یہ کیفیت باقی نہیں رہتی۔ اس کے بجائے لوگوں میں بے حسی آجاتی ہے۔ د کا ظاہری ڈھانچہ اگرچہ ابھی باقی رہتا ہے مگر دین کی اسپرٹ ختم ہو جاتی ہے۔ اسی حالت کا دو نام قساوت ہے۔ قساوت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ لوگوں میں فرق کا احساس باقی نہ رہتا۔ اپنی بے حسی کی بنا پر لوگ ایک چیز کو دوسری چیز سے بہت زیادہ الگ نہیں کر پاتے۔ اس۔ نتیجہ میں پورا معاشرہ اخلاقی ابتری کا شکار ہو جاتا ہے۔

بے حس لوگ علمی تنقید اور الزام تراشی کے فرق کے بارے میں زیادہ شدید نہ ہوتے۔ اس لئے وہ لوگوں کے خلاف الزام کی زبان بھی اسی اطمینان کے ساتھ بولتے ہیں ج طرح حقیقت کا اظہار کرتے وقت انھیں مطمئن ہونا چاہئے۔ وہ ایک جھوٹ بات بھی اسی آس سے کہہ دیں گے جس طرح ایک سچ بات کہی جاتی ہے۔ وہ خیانت کا معاملہ کرنے میں بھی اتنا جری ہوتے ہیں جتنا کہ امانت کا معاملہ کرنے میں۔

حساسیت اس بات کی ضامن ہے کہ آدمی حق اور ناحق کے فرق کو شدت کے سا محسوس کرے۔ اس کے برعکس جن لوگوں میں یہ شدت احساس موجود نہ ہو وہ دونوں کے فرق

ہیں سمجھیں گے۔ وہ ایک ناجائز فعل کو بھی اسی طرح کھلے دل کے ساتھ کریں گے جس طرح ئی شخص ایک جائز فعل کو کرتا ہے۔

اس شدت احساس کا تعلق زندگی کے ہر پہلو سے ہے۔ کوئی آدمی اگر دوسرے کی غلطی پکڑنے میں شدت احساس کا مظاہرہ کرے تو اس کے اندر یہی شدت خود اپنی غلطی کو محسوس رنے کے بارے میں بھی ہونی چاہئے۔ یہ قساوت قلب کی علامت ہے کہ آدمی دوسرے کی ملطی کے معاملے میں شدید ہو اور اپنی غلطی کے معاملے میں وہ غیر شدید ہو جائے۔

اگر آپ دوسرے آدمی کی ایک غلطی کو لے کر اس کا زور و شور کے ساتھ اعلان کریں تو سی کے ساتھ آپ کے اندر یہ مادہ بھی ہونا چاہئے کہ جب یہ معلوم ہو کہ جس چیز کو آپ نے غلطی سمجھا تھا وہ غلطی تھی ہی نہیں تو آپ کو اسی شدت کے ساتھ خود اپنی غلطی کا اعتراف کرنا چاہئے۔ اس دنیا میں اعلان حق کا کریڈٹ صرف اس شخص کو ملتا ہے جو اسی طاقت کے ساتھ اعتراف حق کا ثبوت بھی دے سکے۔ اعلان حق وہی معتبر ہے جس کے ساتھ اعتراف حق کا جذبہ بھی آدمی کے اندر پوری طرح پایا جاتا ہو۔ اعتراف حق کا تعلق اپنی ذات سے ہے اور اعلان حق کا تعلق دوسرے کی ذات سے۔ اور خدا کا یہ قانون ہے کہ جو آدمی اپنی ذات کو حذف کر کے صرف دوسروں کے بارے میں سوچے اس کو کبھی اعلان حق یا اقامت حق کا کریڈٹ نہیں دیا جاتا۔

بے حس انسان اور حساس انسان میں وہی فرق ہے جو ایک جانور میں اور ایک حقیقی انسان میں ہوتا ہے۔ جانور حق و باطل کے احساس سے خالی ہے۔ ایک جانور اگر کسی کو سینگ مارے تو اس کا ضمیر اس کو ملامت نہیں کرے گا یا اگر وہ کسی غیر کے کھیت میں گھس کر اس کی فصل کھالے تو اس کو یہ احساس نہیں ستائے گا کے اس نے ایک ناحق کام کیا ہے۔ مگر انسان فطری طور پر اپنے اندر حق و باطل کی تمیز رکھتا ہے۔ یہ فطری تمیز جب تک اس کے اندر زندہ ہو اس وقت تک وہ انسان کے درجہ میں رہتا ہے اور جب اس کی یہ داخلی تمیز کند ہو جائے تو اس کے بعد وہ انسانیت کے درجہ سے گر کر حیوان کے درجہ میں پہنچ جاتا ہے۔

خاتمۂ حیات

ایک ایسے انسان کو لیجئے جو ۵۰ سال سے زیادہ عمر پا کر مرا ہو۔ وہ اس وقت اپنی زندگی کے تکمیلی مرحلہ میں ہوتا ہے۔ علم، تجربہ، اور تیاری کے مختلف مراحل سے گزر کر اس وقت وہ ایک پختہ انسان بن چکا ہوتا ہے۔ عین اس وقت موت کا فرشتہ آتا ہے اور اس کو اس طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے جیسے کہ وہ باغ حیات کا ایک غیر مطلوب درخت تھا جس کو بے رحمانہ طور پر کاٹ دیا گیا۔

یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کہ انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ زیادہ پختہ دماغ سے سوچے۔ وہ زیادہ معنویت کے ساتھ کائنات کے نغموں کو سنے، وہ زیادہ لطافت کے ساتھ دنیا کے ذائقوں کو چکھے۔ اس وقت وہ اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ زیادہ کامیاب کلام کرے۔ زیادہ اعلیٰ نوعیت کی تحریریں تخلیق کر سکے۔ وہ ان تمام کاموں کو زیادہ معیاری سطح پر انجام دے جن کو اپنی ناپختگی کی بنا پر اب تک وہ صرف غیر معیاری انداز میں انجام دے رہا تھا۔

یہی اس دنیا میں ہر انسان کی کہانی ہے۔ یہاں ہر انسان صرف اپنے مرحلۂ نشو نما تک زندہ رہتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ اپنی زندگی کے آخری تکمیلی مرحلہ میں پہنچتا ہے تو وہ انتہائی بے بسی کے ساتھ اپنی زندگی کی کہانی کا یہ المناک منظر دیکھتا ہے کہ اس کو اچانک اسٹیج سے ہٹا دیا گیا۔

تاہم زندگی کا یہ انجام صرف اس وقت ایک المیہ ہے جب کہ موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھ جائے۔ مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ وہ ایک نئے دور حیات کا آغاز ہے۔ اس تصور کے مطابق زندگی کا موجودہ مرحلہ گویا کہ تربیتی مرحلہ ہے اور موت کے بعد کا مرحلہ تربیت یافتہ صلاحیتوں کے استعمال کا مرحلہ۔ جو لوگ اس حقیقت کو پالیں ان کے لئے موجودہ تربیتی مرحلہ بھی بامعنی ہے اور بعد کا مرحلہ بھی بامعنی۔ جب کہ وہ تربیت یافتہ انسان کی حیثیت سے آخرت کے اعلیٰ مواقع کو استعمال کر کے اپنے لئے ایک پر مسرت زندگی کی تعمیر کر سکیں گے۔

تقوی اور علم

قرآن (البقرہ ۲۸۲) میں آیا ہے کہ اور تم اللہ کا تقوی اختیار کرو اور اللہ تم کو سکھاتا ہے ور اللہ ہر چیز پر قادر ہے (واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ واللہ بکل شئ علیم) القرطبی نے اس یت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

وعد من اللہ تعالی بأن من اتقاہ علّمہ ۔ ای یجعل فی قلبہ نورا یفہم بہ ما یلقی لیہ ۔وقد یجعل اللہ فی قلبہ ابتداء فرقانا ای فصلا یفصل بہ بین الحق والباطل۔ومنہ قولہ عالی: یاایہا الذین آمنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا (الجامع لاحکام القرآن ۴۰۶/۳)

یہ اللہ تعالی کا وعدہ ہے کہ جو شخص اللہ سے ڈرے اللہ اس کو علم دیتا ہے۔ یعنی اس کے دل یں ایسا نور پیدا کر دیتا ہے جس کے ذریعہ وہ باتوں کو سمجھتا ہے۔ کبھی اللہ تعالی ابتداء ہی میں اس کے دل کے اندر فرقان یعنی حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت پیدا فرما دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: اے ایمان والو، اگر تم اللہ سے ڈرو تو وہ تمہارے لئے فرقان بنا دے گا۔

تقویٰ کس طرح علم اور فہم کا ذریعہ بنتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تقویٰ آدمی کے اندر سنجیدگی پیدا کرتا ہے۔ وہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ غیر ذمہ دارانہ رائے قائم کرنے سے بچے، وہ اپنی سوچ کو منصفانہ سوچ بنائے۔ اس کی سوچ عین مطابق واقعہ سوچ بن جائے۔

علم صحیح کے لئے صرف معلومات یا درس و مطالعہ کافی نہیں۔ اس کے ساتھ لازمی طور پر ضروری ہے کہ آدمی کے اندر شدید احساس ذمہ داری ہو تاکہ وہ معلومات سے غلط نتیجہ اخذ نہ کرے، تاکہ وہ اپنے ذہن کو حقیقت کے تابع بنائے نہ کہ خود حقیقت کو اپنے ذہن کے تابع بنانے لگے۔ ذمہ داری کا احساس معلومات سے غلط نتیجہ نکالنے میں روک بنتا ہے۔ یہ ذہنی روک اگر آدمی کے اندر موجود نہ ہو تو وہ معلومات کے انبار کے باوجود صحیح رائے قائم کرنے میں ناکام رہے گا۔

عمل زراعت

قرآن میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ـــــ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔ جان لو کہ اللہ زمین کو زندگی دیتا ہے اس کی موت کے بعد، ہم نے تمہارے لئے نشانیاں بیان کر دی ہیں تاکہ تم سمجھو (الحدید ۱۷)

ملت کے ابتدائی افراد ذہنی تبدیلی اور شعوری انقلاب کے ذریعہ جاہلیت سے نکل کر خدا کے دین کی طرف آتے ہیں۔ ان کا ایمان زندہ ایمان ہوتا ہے۔ مگر بعد کی نسلوں میں یہ شعور گھٹنا شروع ہوتا ہے۔ کئی نسلیں گزرنے کے بعد لوگ جمود کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اب ضرورت ہوتی ہے کہ ملت کی بعد کی نسلوں میں بھی وہی ایمانی شعور پیدا کیا جائے جو اس کی ابتدائی نسل میں پایا جاتا تھا۔

یہ مقصد کس طرح حاصل کیا جائے۔ اس کے لئے خدا نے زمین کی صورت میں ایک عملی مثال قائم کر دی ہے۔ زمین میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک فصل دینے کے بعد وہ خشک ہو جاتی ہے اور بظاہر بنجر زمین کی طرح دکھائی دینے لگتی ہے۔ اس وقت کسان دوبارہ وہی عمل شروع کرتا ہے جو زمین پر ابتدائی مرحلہ میں کیا گیا تھا۔ یعنی کھیت کو جوتنا، اس میں کھاد اور پانی دینا، اس میں بیج بونا مسلسل نگرانی کرتے ہوئے اس کو ہر قسم کی آفات سے بچانا۔ اس طرح کا ایک لمبا اور مسلسل عمل ہوتا ہے جو ہر صبح و شام جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے جب کہ سوکھی زمین دوبارہ ایک لہلہاتی ہوئی فصل کی صورت میں دکھائی دینے لگتی ہے۔ مردہ زمین کو جس طرح عملِ زراعت کے ذریعہ دوبارہ زندہ کیا جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح ملت کے معاملہ میں بھی ایک عملِ زراعت مطلوب ہے، یہاں بھی یہی کرنا ہے کہ اگلی نسلوں میں جب زوال اور انحطاط کا دور آجائے تو دوبارہ کسان جیسا عمل کر کے ملت کی بعد کی نسلوں کو اسی طرح اٹھایا جائے جس طرح اس کی ابتدائی نسل اٹھی تھی۔

ایک دعا

حدیث کی کتابوں میں پیغمبر اسلام کی بہت سی دعائیں نقل کی گئی ہیں۔ یہ دعائیں پیغمبر سلام کی اندرونی شخصیت کو بتاتی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کے سینہ میں کس تم کے احساسات کا طوفان برپا رہتا تھا۔ ان کے اندر کی دنیا کس قسم کے جذبات وخیالات سے میشہ آباد رہتی تھی۔ ان میں سے ایک دعا وہ ہے جو ان الفاظ میں آپ کی زبان سے نکلتی تھی:

للهم ارنا الحق حقاو ارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلاو ارزقنا اجتنابه وارنا الاشياء كما هي (اے اللہ ہمیں حق کو حق کی صورت میں دکھااور ہمیں اس کی پیروی کی توفیق دے اور اے اللہ ہمیں باطل کو باطل کے روپ میں دکھااور ہمیں اس سے بچنے کی توفیق دے۔ اور اے اللہ ہمیں چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں۔

موجودہ دنیا میں حقیقتوں کے اوپر اشتباہ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔. جو شخص صرف چیزوں کے ظاہر کو جانے وہ ان کو ان کی حقیقت کے اعتبار سے سمجھ نہیں سکتا۔ پیغمبر کو یہ احساس تڑپاتا ہے۔ وہ بیتابانہ اللہ کو پکار کر یہ کہنے لگتا ہے کہ اے اللہ مجھ کو حقیقت بینی کی نعمت عطا فرما تا کہ میں چیزوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھوں، میں ہر چیز کے بارے میں وہی درست رائے قائم کروں جو حقیقت واقعہ کے اعتبار سے ہونا چاہئے۔ صحیح فکر کے بغیر سچی معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ اسی طرح صحیح فکر کے بغیر صحیح عمل کا ظہور بھی ممکن نہیں۔ یہی احساس تھا جو شدت اختیار کر کے مذکورہ قسم کی دعا میں ڈھل گیا تھا۔ یہ دعا ایک مومنانہ قلب کی تصویر ہے جو پیغمبر کے سینہ میں اعلیٰ ترین درجہ میں موجود ہوتی ہے۔

اس دنیا کا سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ آدمی کو حق باطل کے روپ میں دکھائی دے اور باطل اس کو حق کے روپ میں دکھائی دینے لگے۔ اس سے بچنا اسی آدمی کے لئے ممکن ہے جو اللہ کی توفیق سے اتنا باشعور ہو جائے کہ ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو وہ گہرائی کے ساتھ دیکھنے لگے۔

خبر کی تحقیق

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ کوئی فاسق اگر تمہارے پاس کوئی سنگین خبر لائے تو تم اچھی طرح اس کی تحقیق کرلو (الحجرات ٦) صحیح مسلم کی ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع (مشکاۃ المصابیح ١/٥٥)** یعنی کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے (اور پڑھے) اس کو وہ بلا تحقیق بیان کرنے لگے۔ اس معاملہ کی ایک مثال یہاں درج کی جاتی ہے۔

عربی زبان کا ایک لغت "المنجد" کے نام سے ہے۔ اس کو ایک مسیحی پادری لوئیس معلوف نے تیار کیا ہے۔ وہ لبنان میں ١٨٦٧ میں پیدا ہوا اور ١٩٤٦ میں اس کی وفات ہوئی۔ ہمارے سامنے اس کتاب المنجد کا ٢٦ واں ایڈیشن ہے جو بیروت سے ١٩٧٣ میں چھپا ہے۔

عربی زبان کی اس مشہور اور متداول لغت میں الطلقاء کا مفہوم ان الفاظ میں دیا گیا ہے:
الذین ادخلوا فی الاسلام کرھا (صفحہ ١٧٠) یعنی طلقاء سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو اسلام میں جبراً داخل کیا گیا۔

اگر کوئی شخص مذکورہ کتاب کے اس بیان کو لے اور مزید تحقیق کے بغیر اس کو پھیلانے اور نقل کرنے لگے تو قرآن کی مذکورہ تعلیم کے مطابق، یہ سخت گناہ کی بات ہوگی کیوں کہ کسی بات کا ایک کتاب میں چھپ جانا اس کا ثبوت نہیں کہ وہ کوئی درست بات ہے۔ عین ممکن ہے کہ چھپنے کے باوجود وہ ایک بے بنیاد بات ہو۔ اخبار یا میگزین میں چھپنا تو درکنار، حوالہ کی کتاب (ریفرنس بک) میں شاندار طور پر چھپنا بھی اس کی صحت کا کوئی ثبوت نہیں۔

اب اگر تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک سراسر لغو اور بے بنیاد بات ہے۔ طلقاء عربی لفظ طلیق کی جمع ہے۔ اس کے معنی آزاد کے ہوتے ہیں۔ طلقاء کے معنی ہیں آزاد لوگ۔ طلقاء کا یہ لفظی مفہوم مذکورہ بیان کی کھلی تردید ہے۔ کیوں کہ جن لوگوں کو جبراً مسلمان بنایا گیا ہو

ان کا نام طلقاء (آزاد) رکھنا سراسر نا قابل فہم بات ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حقیقی واقعات مذکورہ بیان کی قطعی تردید کرتے ہیں۔ اسلام کی تاریخ میں الطلقاء کن لوگوں کو کہا گیا تھا، یہ ایک معلوم اور مشہور واقعہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ نبوت کے بیس سال بعد مکہ فتح ہوا۔ اس وقت یہاں کے تمام سردار آپ کے پاس لائے گئے۔ یہ لوگ مسلمہ طور پر جنگی مجرم کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے ان کے خلاف کوئی انتقامی کاروائی نہیں کی۔ اور نہ ان کے ساتھ تشدد کا کوئی معاملہ کیا۔ اس کے بجائے آپ نے ان لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اذھبوا فأنتم الطلقاء (البداية والنهاية لإبن كثير، الجزء الرابع صفحہ ۳۰۱) یعنی جاؤ، پس تم لوگ آزاد ہو۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ المنجد میں چھپی ہوئی بات اصل واقعہ کے سراسر خلاف ہے۔ مگر اس کا غلط اور بے بنیاد ہونا صرف اس وقت معلوم ہوگا جب کہ علمی اصول کے مطابق اس کی تحقیق کی جائے۔ اس بیان کا غلط ہونا المنجد کے صفحات میں نہیں ملے گا بلکہ اس خارجی مواد میں ملے گا جو اس بیان سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، الطلقاء کی لغوی اور تاریخی تحقیق سے نہ کہ صرف المنجد کے مذکورہ صفحہ کے پڑھنے سے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی کوئی آدمی ایک سنگین بات کو سنے یا پڑھے تو اس کو ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ اس کو سن کر یا پڑھ کر مان لے اور اس کو لوگوں کے درمیان پھیلانے لگے۔ اگر آدمی کے اندر اللہ کا ڈر ہے تو اس کو اللہ کی پکڑ کے اندیشے سے ایسے فعل سے بچنا چاہئے۔

قرآن وحدیث کے مطابق یہ ایک مجرمانہ فعل ہے۔ کوئی آدمی اگر سنی یا پڑھی ہوئی خبر کی تحقیق نہ کرنا چاہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ چپ رہے نہ کہ وہ بلا تحقیق بولنے لگے۔ ایسی حالت میں چپ رہنا تو آدمی کے لئے قابل معافی ہو سکتا ہے مگر بولنا ہرگز اس کے لئے قابل معافی نہیں۔

بری خبر کی تحقیق کرنا فرض ہے، اور بری خبر کو تحقیق کے بغیر بیان کرنا حرام ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو شریعت اسلامی کے اس اہم مسئلہ کو جانتے ہوں۔

ایک خط

برادر محترم مولانا جمیل احمد صاحب   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۹۹ ملا، جو ۱۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ آپ جماعت کے ایک سینئر رکن اور اس کے ایک ذمہ دار فرد ہیں۔ اس لئے میں نے آپ کے اس خط کو خصوصی اہمیت دی اور اس کو کئی بار پڑھا۔ تاہم آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے میری تشفی نہ ہو سکی۔ آپ نے اپنے خط میں جو کچھ فرمایا ہے وہ علمی اور دینی دونوں اعتبار سے میرے نزدیک بے وزن ہیں۔ اس سلسلہ میں اپنے احساسات زیر نظر خط کی صورت میں آپ کو روانہ کر رہا ہوں۔

۱۔ آپ نے میرے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ "آپ کے فکر وخیال کے خلاف کوئی بات کہی جائے تو آپ طیش میں آجاتے ہیں اور چراغ پا ہو جاتے ہیں"۔ میں کہوں گا کہ یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے۔ اصل حقیقت برعکس طور پر یہ ہے کہ میں اپنے خلاف تنقید کو بے حد پسند کرتا ہوں۔ میں اکثر حضرت عمر فاروق کے اس قول کو دہراتا ہوں کہ رحم الله امرأ اهدى الى عيوبى۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ میرے ایک قریبی رفیق مولانا انیس لقمان ندوی میرے ساتھ تقریباً ۸ سال تک تھے۔ ۲ سال پہلے وہ عرب امارات چلے گئے۔ پہلی بار جب وہ وہاں گئے تو ایک عرب شیخ نے ان سے پوچھا کہ تم ہندستان میں کیا کرتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا: أنا ناقد اكبر ناقد فى الهند۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ تنقید میرے لئے ایک محمود چیز ہے نہ کہ کوئی مبغوض چیز۔

۲۔ آپ نے نام لئے بغیر بمبئی کے کسی صاحب کا میرے بارے میں یہ ریمارک نقل کیا ہے کہ انھوں نے الرسالہ کے کچھ شمارے پڑھ کر یہ کہا کہ اس کی ترتیب دینے والے کا ایگو (ego) بہت پھولا ہوا ہے۔ میں کہوں گا کہ اس معاملہ میں انصاف کی بات یہ تھی کہ

آپ: ھاتو برھانکم ان کنتم صادقین (البقرہ ۱۱۱) کے قرآنی اصول پر مذکورہ صاحب سے پوچھتے کہ الرسالہ سے اس کی کوئی مثال بتایئے تاکہ اس پر غور کیا جاسکے۔ مثال کے بغیر اس طرح کا مخالفانہ ریمارک (adverse remark) دینا بھی غیر اسلامی ہے اور اس کو نقل کرنا بھی غیر اسلامی۔ البخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں یہ روایت آئی ہے کہ :البینة علی المدعی۔ اس کے مطابق، آپ کے یا بمبئی والے صاحب کے اوپر یہ لازمی ذمہ داری ہے کہ واضح مثال کے ذریعہ اپنے اس دعویٰ کو ثابت (establish) کریں۔ اس کے بغیر آپ کا یا کسی کا ایسا کہنا صرف ایک الزام ہے۔ اور بے دلیل الزام کو اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے۔

مزید یہ کہ ایگو (ego) خود ایک اضافی لفظ (relative term) ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص شدت تاثر یا یقین (conviction) کے تحت ایک بات کہتا ہے اور سننے والا اس کو برے مفہوم میں ego کا مظہر قرار دے دیتا ہے۔

ایسی حالت میں کسی کے لئے اس قسم کا الزام لگانا ہی درست نہیں۔ یہ نیت سے تعلق رکھنے والی ایک بات ہے۔ اور نیت کا علم صرف خدا کو ہے۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جب عرب میں ارتداد کا فتنہ پھیلا تو خلیفہ اول ابو بکر صدیق نے فرمایا: اینقص الدین و انا حي۔ اگر صرف ظاہر الفاظ کے تحت دیکھا جائے تو اس جملہ کے بارے میں بھی خدانخواستہ عین وہی بات کہی جاسکتی ہے جو بمبئی والے صاحب نے مرتب الرسالہ کے بارے میں فرمائی۔ اصل یہ ہے کہ اس قسم کے کلمات حمایت حق کے شدید جذبہ کے تحت نکلتے ہیں نہ کہ ذاتی بڑائی کے احساس کے تحت۔ جو لوگ اس فرق کو نہیں جانتے وہی اس معاملہ میں شبہات میں پڑ سکتے ہیں۔

۳۔ آپ کے لئے زیادہ صحیح طریقہ یہ تھا کہ میری چھپی ہوئی تحریروں اور وضاحتوں کو بنیاد بنا کر اظہار رائے فرمائیں مگر عجیب بات ہے کہ آپ نے زیادہ تر زبانی گفتگوؤں کو اپنے دعووں کی بنیاد بنایا ہے حتی کہ پانچ سال اور دس سال پہلے کی گفتگو تک کو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ زبانی گفتگو کبھی بھی کوئی معتبر بنیاد نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہمیشہ ایسا

ہوتا ہے کہ کہنے والا کچھ کہتا ہے اور نقل کرنے والا اس کو کسی اور شکل میں نقل کرتا ہے۔ معاف کیجئے گا آپ بھی اس معاملہ میں استثناء نہیں ہیں جس کا ایک ثبوت خود آپ کا زیر نظر خط ہے۔ مثلاً الرسالہ فروری ۱۹۹۹ (صفحہ ۳۴) میں ایک حدیث کا ترجمہ شائع کیا گیا تھا۔ آپ نے اپنے خط میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ اگر آپ اپنے خط کو الرسالہ کے مذکورہ صفحہ سے ملا کر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ نے نقل کرنے میں اس کو کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔ مثلاً آپ نے اپنے خط میں رسولؐ اللہ کے ایک قول کو اس طرح نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "شبہات سے بچنا اور بچانا چاہئے"۔

الرسالہ کے مذکورہ مضمون میں رسولؐ اللہ کے قول کا ترجمہ ان الفاظ میں دیا گیا تھا "شیطان آدمی کے اندر خون کی گردش کی طرح دوڑتا ہے" (صفحہ ۳۴)۔ مگر آپ نے اپنے خط میں (غالباً حافظے سے) اس کے بجائے یہ الفاظ لکھ دئے کہ آپ ﷺ نے کہا کہ "شبہات سے بچنا اور بچانا چاہئے"۔ آپ جب ایک پڑھی ہوئی بات کو نقل کرنے میں اتنی بڑی بھول کر سکتے ہیں تو ایک سنی ہوئی بات کو نقل کرنے میں یقیناً آپ اس سے کہیں زیادہ بڑی غلطی کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کے پاس اگر صرف زبانی گفتگو یا سنی ہوئی بات کی دلیل ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ چپ رہے نہ کہ ایسی کمزور دلیل پر اپنے دعویٰ کی بنیاد کھڑی کرنے کی کوشش کرے۔

۴۔ "تصویری فتنہ" کے بارے میں الرسالہ میں کئی مضامین چھپ چکے ہیں۔ ان مضامین کو پڑھ کر بیشتر قارئین نے اس معاملہ میں مکمل اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ آپ نے الرسالہ میں شائع شدہ دلائل کا کوئی علمی تجزیہ کئے بغیر ان کو بلا ثبوت ناکافی قرار دیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ "میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو واضح انداز میں تردید کرنا ضروری تھا"۔ آپ کی اس بات کا جواب میں نے ۷ اپریل کی ملاقات میں دیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ قرآن کے حکم اور حضرت عائشہ کی نظیر کے مطابق، میری مذکورہ تردید ہی اس معاملہ میں میری کامل براءت کے لئے کافی ہے۔ آپ یا آپ جیسے لوگ جو اس معاملہ میں براہ راست تردید کا مطالبہ کر رہے ہیں ان سے میں ایک

سوال کروں گا۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے الرسالہ مارچ ۱۹۹۹ میں حوالوں کے ساتھ لکھ چکا ہوں۔ آپ کے معیار کے مطابق اس معاملہ کی براہ راست اور عریاں تردید نہ حضرت عائشہ صدیقہ نے کی اور نہ خود اللہ تعالیٰ نے۔ قرآن میں اس کی بابت صرف یہ کہا گیا کہ الذین جائوا بالافك (النور ۱۱) اور اسی پر بات ختم ہو گئی۔ ایسی حالت میں فرمائیں کہ آپ لوگوں کا حضرت عائشہ صدیقہ کی براءت کے بارے میں کیا خیال ہے؟

آپ لوگوں کا یہ کہنا کہ میری تردید کے باوجود یہ مسئلہ ابھی باقی ہے، سراسر ایک غیر اسلامی اور غیر دینی بات ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ کا واقعہ اس معاملہ میں ایک مستقل اسلامی نظیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نظیر کے مطابق میں اپنے بارے میں کہتا ہوں کہ یہ سراسر افک ہے۔ پھر آپ لوگ اس سے مطمئن ہو کر کیوں نہیں یہ اعلان کرتے کہ اس معاملہ میں خود آپ حضرات غلطی پر تھے نہ کہ میں۔ گویا کہ یہاں اصل مسئلہ اعتراف تردید کا ہے نہ کہ خود تردید کا۔ ایسی حالت میں برعکس طور پر خود آپ حضرات مسئول قرار پا رہے ہیں۔

۵۔ آپ نے میری طرف یہ قول منسوب کیا ہے کہ میں نے کہا کہ "ایک بدنام اخبار میں میرے بارے میں چھپی ہوئی ایک رپورٹ کو آپ لوگوں نے پھیلانا شروع کر دیا۔ وہی اخبار آپ کی جماعت کے بارے میں لکھے کہ وہ پاکستان کی ایجنٹ ہے اور مسلم مدرسے ISI کا اڈّا ہیں تو کیا آپ لوگ اس کو بھی اسی طرح شائع کریں گے"۔ آپ نے میری یہ بات نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہاں، ہم نے اسے پہلے بھی شائع کیا ہے اور آئندہ بھی کریں گے، اس کی تردید کریں گے۔

معاف کیجئے، آپ نے میری بات کو صحیح طور پر نقل نہیں فرمایا۔ میں نے یہ کہا تھا کہ مذکورہ ہندی اخبار میں میرے خلاف ایک بات چھپی تو آپ نے اس کو درست سمجھ کر بلا تردید اس کو خوب پھیلانا شروع کر دیا۔ اسی طرح اس اخبار میں آپ کی جماعت کے خلاف الٹی باتیں چھپتی رہتی ہیں تو کیا ان باتوں کو بھی آپ درست مان لیں گے اور ان کو بلا تردید ہر طرف پھیلانا شروع کر دیں گے۔ مخالفانہ بات کو تردید کے طور پر تو ہر ایک چھاپتا ہے۔ اصل مسئلہ اس کو

تصدیق کے طور پر چھاپنا ہے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اپنے خلاف بات ہو تو آپ اس کو تردید کے طور پر چھاپیں گے۔ اور میرے خلاف بات تھی تو اس کو آپ نے تصدیق کے طور پر پھیلانا شروع کر دیا۔

آپ کی یہ بات سخت مغالطہ انگیز ہے۔ ظاہر ہے کہ میرا مدعا ان باتوں کو تردیدی طور پر شائع کرنے سے نہیں تھا بلکہ تصدیقی طور پر شائع کرنے سے تھا، جیسا کہ آپ حضرات نے میرے ساتھ کیا۔ یعنی جو کچھ ہندی اخبار نے لکھ دیا اس کو مان کر ایک واقعہ کے طور پر اس کو چھاپنا اور دنیا کو یہ بتانا کہ دیکھو ہم ویسے ہی ہیں جیسا کہ ہندی اخبار نے ہمارے بارے میں چھاپا ہے۔ آپ کی یہ سادگی ناقابل فہم حد تک حیرت انگیز ہے کہ آپ نے تردیدی اشاعت اور تصدیقی اشاعت کے فرق کو نہیں سمجھا اور میری طرف مذکورہ قسم کی لغو بات منسوب کر دی جس کی لغویت کو سمجھنے کے لئے کامن سنس کا استعمال ہی کافی ہے۔

۶۔ میں نے کہا تھا کہ فوٹو گریفی کے اس زمانہ میں کسی بھی شخص کی تصویر کسی بھی انداز سے چھاپی جا سکتی ہے۔ خود آپ کی جماعت کی شخصیتوں کی تصویریں بھی اسی طرح اخباروں میں چھپ سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ عدالتوں میں تصویر کو شہادت(evidence) کے طور پر قبول نہیں کیا جاتا۔ تصویر کسی بات کو ثابت کرنے کے لئے کوئی معتبر ذریعہ نہیں۔ (تصویری فتنہ کے معاملے کو سمجھنے کے لئے ملاحظہ ہو، سفر نامہ اسپین و فلسطین صفحہ ۱۷۲۔ الرسالہ، فروری ۱۹۹۹، صفحہ ۳۷۔۳۸)۔

اس پر آپ نے لکھا ہے کہ ''ہمیں یہ چیلنج قبول ہے۔ اور اگر ہماری شخصیتوں کے بارے میں ایسی کوئی چیز چھپتی ہے تو ہم اس کو اپنے اخباروں میں چھاپیں گے اور اس کی تردید کریں گے''۔

یہاں بھی آپ نے میری بات غلط طور پر نقل فرمائی ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے میرے بارے میں ایک بدنام اخبار میں چھپی ہوئی تصویر کو درست سمجھ کر اس کو بلا تردید اپنے اخباروں میں چھاپنا شروع کر دیا تا کہ مجھ کو بدنام کریں۔ جب کہ یہ اخبارات آپ کی جماعت

کی شخصیتوں کے خلاف ایسی تصویر شائع کریں تو آپ اس کو تردید کے ساتھ چھاپیں گے۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ایک چیز کو تصدیق کے طور پر چھاپنا اور اس کو تردید کے طور پر چھاپنا دونوں الگ الگ باتیں ہیں۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

۷۔ قرآن کی زبان میں ایک شئ (الجاثیہ ۹) کو لے کر بدنامی کی مہم چلانا ہر ایک کے خلاف ممکن ہے۔ مگر میں نے ہمیشہ اس سے پرہیز کیا۔ اگر میں چاہتا تو آپ کی جماعت کے لوگوں کی طرح میں بھی یہ کام کر سکتا تھا۔ مثال کے طور پر آپ کی جماعت کے اخبار دعوت (۲۵ جنوری ۱۹۹۷) میں ایک معروف شخصیت کا انٹرویو بقول اخبار "افادۂ عام کی غرض سے" شائع کیا گیا۔ اس میں ہندستان اور یہاں کے اکثریتی فرقہ کے بارے میں یہ الفاظ درج تھے "میں تو پورے یقین و اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر مسلمان نہ ہوتے تو یہ ملک عذاب الٰہی کا نشانہ بن جاتا اور اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا ہوتا" (صفحہ ۶)۔ میرے لئے یہ ممکن تھا کہ میں جماعت کے اخبار میں چھپے ہوئے اس بیان کو لے کر اس کو ہندوؤں میں خوب پھیلاؤں اور ہندوؤں سے کہوں کہ دیکھو تمہارے بارے میں جماعت کے لوگ کیسی بری باتیں چھاپتے ہیں، مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔

اسی طرح دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۲۵ جنوری ۱۹۹۹) میں آپ کی جماعت کے بانی کے صاحبزادہ جناب حیدر فاروق مودودی کا ایک انٹرویو چھپا۔ اس میں انھوں نے یہ انکشاف کیا کہ ان کے والد کا رویہ منشیات کے تاجر (drug peddler) جیسا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو اس چیز کے قریب بھی نہیں آنے دیتے تھے جس کی وہ مسلمانوں میں عمومی اشاعت کر رہے تھے۔ (صفحہ ۱۴) میرے لئے یہ ممکن تھا کہ بانیٔ جماعت کے صاحبزادہ کے اس انٹرویو کو لے کر مسلمانوں میں خوب پھیلاؤں اور اس کو جماعت کی بدنامی کے لئے استعمال کروں۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں اس قسم کے کام کو نہ صرف غیر اسلامی سمجھتا ہوں بلکہ وہ میرے نزدیک انسانی شرافت کے بھی خلاف ہیں۔

۸۔ آپ نے میرے بارے میں لکھا ہے کہ میں نے ایک گفتگو کے دوران یہ کہا تھا کہ

”توحید کو ثابت کرنے اور ترک کو باطل قرار دینے پر میں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اتنا مولانا علی میاں نے بھی نہیں لکھا، مولانا مودودی نے بھی نہیں لکھا“۔

میں عرض کروں گا کہ آپ کا یہ بیان بلا شبہ مغالطہ آمیز ہے۔ اول یہ کہ میں نے یہ بات مطلق طور پر نہیں کہی تھی بلکہ اپنے دفاع میں کہی تھی۔ آپ کی جماعت کے لوگوں نے انتہائی شرمناک جسارت کے طور پر نعوذ باللہ میرے اوپر شرک کا الزام لگایا جس کا میں خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتا۔ میں نے اس کے جواب میں ۷ اپریل کی ملاقات میں آپ کو خود آپ کی جماعت کے ماہنامہ زندگی (رمضان ۱۳۷۸ھ) میں چھپا ہوا اپنا ایک مضمون دکھایا تھا جو شرک کے خلاف تھا۔ میں نے کہا تھا کہ مطبوعہ ریکارڈ کے مطابق تقریباً ۴۵ سال سے میں شرک کی تردید اور توحید کے اثبات پر کام کر تا رہا ہوں۔ یہی میرا مشن ہے اور یہی میری حیثیت عرفی ہے۔ پھر آپ کی جماعت کے لوگوں کو کیسے یہ جسارت ہوئی کہ ایسے ایک آدمی کے خلاف ایک جھوٹے شوشہ کو لے کر اتنا بڑا بہتان کھڑا کریں۔

دوسرے یہ کہ میں نے یہ بات مقدار (quantity) کے اعتبار سے نہیں کہی تھی بلکہ اس اعتبار سے کہی تھی کہ موجودہ زمانہ میں ہر نظریہ یا فکر کو سائنٹفک دلائل سے جانچا جاتا ہے۔ اس زمانی رجحان کی بنا پر میں نے طویل محنت کے ذریعہ علوم جدیدہ کا مطالعہ کیا اور پھر جدید دلائل و حقائق کے ذریعہ توحید کو خالص علمی بنیاد پر ایک ثابت شدہ حقیقت بنانے کی کوشش کی۔ اسی طرح شرک والحاد کو جدید دلائل وحقائق کی روشنی میں خالص علمی طور پر ایک بے اصل اور تباہ کن نظریہ قرار دیا۔ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس موضوع پر عصری اسلوب میں راقم الحروف نے جتنا کام کیا ہے آپ کی جماعت کے کسی بھی عالم یا مفکر نے نہیں کیا۔ ایسی حالت میں آپ کی جماعت کے لوگوں کا میرے اوپر مذکورہ قسم کا بے ہودہ الزام لگانا شریعت اسلامی کے خلاف بھی ہے اور علم و عقل کے خلاف بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ کی جماعت کے لوگ قرآن کی اس تعلیم کو اپنے سامنے رکھتے

کہ : لا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ الا تعدلوا اعدلوا هو اقرب للتقوی (مائدہ ۸)تو ان کے لئے درست رویہ یہ تھا کہ وہ حضرت ابوایوب انصاری کے فارمولے پر عمل کرتے۔

قدیم مدینہ میں جب حضرت عائشہ صدیقہ پر ایک مکروہ الزام لگایا گیا تو حضرت ابوایوب انصاری اپنے گھر آئے۔ ان کی بیوی نے کہا کہ آپ نے سنا کہ عائشہ کے بارے میں کیا باتیں کہی جارہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہاں میں نے سنا، مگر وہ جھوٹ ہے۔ پھر انہوں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ کیا تم ایسا کروگی۔ بیوی نے جواب دیا کہ نہیں۔ اس کے بعد حضرت ابوایوب انصاری نے کہا: فعائشة والله خير منكِ (سیرۃ ابن ہشام، ۳/۷ ۳۴)

آپ کی جماعت کے لوگ اگر واقعۃً سنجیدہ ہوتے تو وہ یہ کرتے کہ اپنے آپ پر قیاس کرتے ہوئے وہ پہلے ہی مرحلہ میں اس کو رد کردیتے، کجا کہ وہ اس افک کی اشاعت اور تشہیر میں مددگار بن جائیں۔

۹۔ مجھے اس پر اعتراض نہیں ہے کہ کوئی شخص میرے اوپر علمی تنقید کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ علمی تنقید کسی سماج کا سب سے زیادہ صحت مند عمل ہے مگر بدقسمتی سے آپ کی جماعت کے بانی نے ایک غلط روایت قائم کی۔ وہی روایت آج تک آپ کی جماعت میں چلی جارہی ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ ۶۳۔۱۹۶۲ میں تقریباً دوسال تک آپ کی جماعت کے بانی سے میری خط وکتابت ہوئی۔ میں نے یہ چاہا کہ وہ اپنے سلسلے میں میرے تنقیدی افکار کا علمی جواب دیں۔ مگر میرے اصرار کے باوجود انھوں نے علمی تنقید کے بجائے شخصی تعییب (عیب زنی) کی روش اختیار کی۔ حالانکہ قرآن میں تعییب کو اہل باطل کا شیوہ بتایا گیا ہے (حم السجدہ ۲۶) آپ کی جماعت کے بانی نے کس طرح میری تعییب کی اس کو آپ راقم الحروف کی کتاب تعبیر کی غلطی میں "ضمیمہ" کے تحت دیکھ سکتے ہیں۔

بدقسمتی سے آپ کی جماعت اپنے بانی کی اسی روایت پر چل پڑی۔ ان کے لئے موقع تھا کہ وہ میری تنقید کا علمی جواب دیں۔ مگر علمی جواب کا راستہ چھوڑ کر انہوں نے عیب جوئی اور

الزام تراشی کا طریقہ اختیار کیا۔اس کی تازہ ترین کڑی تصویر کا حالیہ فتنہ تھا۔

۱۰۔ آپ نے میری ۷ اپریل کی گفتگو کو اپنے خط میں جس طرح نقل کیا ہے، اس طرح تو وہ درست نہیں۔ مگر یہ صحیح ہے کہ میں نے آپ کی جماعت کی موجودہ روش پر اظہار خیال کرتے ہوئے غالباً بعض سخت الفاظ استعمال کئے تھے۔ مگر آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اسی وقت یہ بھی کہا تھا کہ آپ لوگوں نے میرے اوپر ظلم کیا ہے۔اور قرآن کے مطابق مظلوم کو جہر بالسوء کا حق دیا گیا ہے۔ یہ بات قرآن کے چھٹے پارہ کی پہلی آیت میں آئی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: اللہ کو پسند نہیں کسی کی بری بات کا ظاہر کرنا مگر جس پر ظلم ہوا ہو۔اور اللہ ہے سننے والا اور جاننے والا۔ (ترجمہ شیخ الہند)

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ علمی تنقید اور بدنامی کی مہم میں نمایاں فرق ہے۔ میں نے آپ کی جماعت کے معلوم افکار پر علمی تنقید کی۔اس تنقید کو آپ ظلم نہیں کہہ سکتے۔ مگر آپ کی جماعت کے لوگوں نے ایک جھوٹے شوشہ کو لے کر میری بدنامی کی مہم چلائی۔ یہ بلاشبہ میرے دین اور میری عزت پر ناروا حملہ تھا۔ اس لئے اس معاملہ میں آپ لوگ بلاشبہ ظالم ہیں اور میں بلاشبہ مظلوم۔ ایسی حالت میں اگر میں آپ کی جماعت کے لوگوں کے بارے میں کبھی سخت لہجہ اختیار کروں تو قرآن کے مطابق، وہ میرے لئے جائز ہوگا۔اگرچہ اپنے مزاج کی بنا پر میں عام طور پر ایسا نہیں کرتا۔ میں ہمیشہ یہ کوشش کرتا ہوں کہ اپنی بات کو علمی دلائل کے ذریعہ کہوں۔اور دوسرے کے نقطۂ نظر سے اگر مجھے اختلاف ہے تو اس کو خالص علمی بنیاد پر رد کروں۔

۱۱۔ آدمی اپنی غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کس طرح حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے، اس کا ایک نمونہ آپ کا یہ خط بھی ہے۔ آپ نے اپنے اس خط میں الرسالہ کی ایک عبارت نقل فرمائی ہے اور اپنے غلط موقف کو درست ثابت کرنے کے لئے اس کو کچھ کا کچھ کر دیا ہے حتی کہ خود رسول اللہ ﷺ کے قول کو غلط شکل میں نقل فرمایا ہے۔ آپ کے خط کی عبارت اور الرسالہ میں چھپے ہوئے مضمون کا متعلقہ حصہ دونوں یہاں آمنے سامنے کالم کے روپ میں

نقل کئے جارہے ہیں:

الرسالہ کی مطبوعہ عبارت	آپ کے خط کی عبارت
روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ قصہ بہت بڑھا تو رسول اللہ ﷺ ازراہ شفقت حضرت عائشہ کے پاس آئے اور فرمایا کہ اے عائشہ تم کو وہ بات پہنچ چکی ہے جو کہ لوگ کہہ رہے ہیں پس تم اللہ سے ڈرو۔ اگر تم اس برائی میں پڑی ہو جیسا کہ لوگ کہہ رہے ہیں تو اللہ سے توبہ کرو۔ اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت عائشہ بے اختیار رونے لگیں۔ (الرسالہ مارچ ۱۹۹۹ صفحہ ۴۸)	آپ نے الرسالہ مارچ ۱۹۹۹ کے شمارے میں لکھا کہ حضرت عائشہ سے حضور نے ازراہ شفقت و ہمدردی پوچھا کہ واقعہ کیا ہے؟ اگر تم ملوث ہوئی ہو تو اللہ سے توبہ کرو ورنہ واقعہ کی تردید کرو۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ اللہ کے نبی نہ دین کے تقاضوں سے بے خبر تھے نہ بدنام کرنا مقصود تھا بلکہ خود آپ کے الفاظ میں حضور کا یہ عمل ازراہ شفقت تھا۔ (صفحہ ۶)

ان دونوں عبارتوں کو تقابلی طور پر پڑھئے۔ آپ پائیں گے کہ آپ نے اپنے غلط موقف کو درست ثابت کرنے کے لئے شعوری یا غیر شعوری طور پر، ایک مجرمانہ جسارت کی ہے۔ آپ نے اپنی خود ساختہ بات کو حدیث نبوی میں شامل کر دیا۔ آپ نے خلاف واقعہ طور پر رسول اللہ ﷺ کی طرف یہ قول منسوب کر دیا کہ آپ نے حضرت عائشہ سے یہ فرمایا کہ "ورنہ تم واقعہ کی تردید کرو۔" حالانکہ اصل میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ سے صرف یہ فرمایا تھا کہ "تو تم اللہ سے توبہ کرو"۔ آپ نے ناقابل فہم جسارت کے ساتھ اپنی طرف سے اس میں یہ الفاظ شامل کر دئے کہ "تم واقعہ کی تردید کرو"۔

دوسری بات یہ ہے کہ الرسالہ کے مضمون میں آگے یہ درج تھا کہ: لمبے انتظار کے بعد آخر کار سورہ النور اتری مگر قابل لحاظ بات یہ ہے کہ خود سورہ النور میں بھی براہ راست تردید کا وہ

طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جس کا مطالبہ الزام لگانے والوں کی طرف سے کیا جارہا تھا (صفحہ ۴۸)

معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ صدیقہ سے "تردید" کا مطالبہ خدانخواستہ رسول اللہ ﷺ نے نہیں فرمایا تھا بلکہ یہ مطالبہ اگر کیا جارہا تھا تو ان منافقین کی طرف سے کیا جارہا تھا جو نعوذ باللہ حضرت عائشہ کو بدنام کرنے کی مہم میں پیش پیش تھے۔ آپ کی یہ جسارت میرے لئے ناقابل فہم ہے کہ الرسالہ مارچ ۱۹۹۹ میں جو بات الزام لگانے والے منافقین کے بارے میں کہی گئی تھی اس کو آپ نے نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کردیا، صرف اس لئے تاکہ آپ اپنی جماعت کے لوگوں کی کھلی سرکشی کے حق میں ایک جھوٹا جواز فراہم کرسکیں۔

۱۲۔ آپ نے لکھا ہے کہ جب کوئی شبہہ پیدا ہو جائے تو اس کی تردید کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ تردید کا جو مطلوب شرعی طریقہ ہے اس کے مطابق، میں مکمل طور پر اس کی تردید کرچکا ہوں۔ اب معاملہ تردید کا نہیں ہے بلکہ تردید کو قبول کرنے کا ہے۔ اگر مطالبہ کرنے والے کے اندر قبولیت کا مزاج نہ ہو تو تردید کے باوجود وہ اپنے الزام کو دہراتا رہے گا اور یہ دعویٰ کرے گا کہ ابھی تک اس کی تردید نہیں ہوئی۔ مثال کے طور پر آپ نے اپنے خط میں M..N. Roy کی کتاب ہسٹاریکل رول آف اسلام کا ذکر کیا ہے۔ نزول قرآن کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے یہ کہا کہ قرآن خود محمدؐ کا اپنا کلام ہے۔ قرآن میں اس کی تردید کی گئی اور بتایا گیا کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ اس کے باوجود M. N. Roy (اور دوسرے بہت سے لوگ) بدستور یہ کہے چلے جارہے ہیں کہ قرآن محمدؐ کا کلام ہے۔

یہی معاملہ آپ کی جماعت کے لوگوں کا ہے۔ مذکورہ معاملہ میں میں نے قرآن کے اسلوب اور حضرت عائشہ صدیقہ کی سنت کے مطابق مکمل طور پر اس کی تردید کردی۔ یہ تردید ان ہزاروں لوگوں کے لئے کافی ہوگئی جن کو مجھے بدنام کرنے سے دلچسپی نہیں تھی۔ مگر آپ کی جماعت کے لوگ جو دلیل کے میدان میں ہار چکے ہیں اور اپنی اس ہاری ہوئی بازی کو الزام تراشی کے میدان میں جیتنا چاہتے ہیں، انھوں نے یہ کہہ دیا کہ یہ تردید ناکافی ہے۔ شاید صرف اس لئے

تاکہ وہ شبہات ڈالنے اور الزام لگانے کی اپنی مکروہ مہم کو بدستور جاری رکھ سکیں، اور اس طرح وہ اپنی غلطی کے اعتراف سے بچے رہیں۔

آپ نے اپنی جماعت کے اخباروں کی صفائی پیش کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ بغیر تبصرہ کے ویسی کی ویسی ہی شائع کی۔ اس سلسلہ میں مجھے دو باتیں عرض کرنا ہے۔ ایک یہ کہ اس قسم کی شر انگیز بات کو ویسا ہی نقل کرنا بھی بلاشبہہ ایک گناہ کا فعل ہے۔ یہ اس حدیث کا مصداق ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع۔

مزید یہ کہ آپ کا یہ کہنا بالکل خلاف واقعہ ہے کہ آپ کے اخباروں نے مذکورہ تصویر کو "بلا تبصرہ" شائع کیا تھا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ انگریزی ریڈینس (۶۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۹۸) نے ایک مختصر لیکن گمراہ کن کیپشن کے ساتھ اس کو شائع کیا۔ ہندی کانتی (۱۳۔۱۹ دسمبر ۱۹۹۸) نے سخت شرارت آمیز الفاظ کے ساتھ اس کو شائع کیا۔ جہاں تک سہ روزہ دعوت کا تعلق ہے، اس نے اپنے شمارہ ۲۸ دسمبر ۱۹۹۸ میں میرا ایک مضمون تصویری پروپیگنڈا شائع کیا۔ یہ مضمون مختلف اخباروں میں چھپ چکا ہے اور تمام غیر جانب دار لوگوں کے لئے وہ مکمل طور پر اطمینان بخش ثابت ہوا ہے۔ مگر اس مضمون کے آخر میں "دعوت" کی طرف سے ۱۱ سطر کا ایک نوٹ شامل کیا گیا۔ یہ نوٹ بلا شبہ ایک شر انگیز نوٹ تھا۔ کیوں کہ ان کے الفاظ میں راقم الحروف نے اس میں "نفس مسئلہ کو نہیں چھوا"۔

یہ نوٹ پڑھ کر میں نے سوچا کہ قدیم مدینہ میں جن لوگوں نے حضرت عائشہ صدیقہ کے ایک قصہ کو لے کر ان کو نعوذ باللہ بدنام کرنے کی کوشش کی وہ موجودہ زمانہ کے لوگوں کے مقابلہ میں کم شریر تھے۔ قرآن میں حضرت عائشہ صدیقہ کے معاملہ کی بابت صرف اتنا کہا گیا کہ وہ افک (بیہودہ) بات ہے۔ اس پر وہ لوگ خاموش ہو گئے۔ حالانکہ اگر وہ ہمارے موجودہ کرم فرماؤں کی طرح ہوتے تو وہ بھی انھیں کی طرح کہہ دیتے کہ نعوذ باللہ "قرآن نے نفس مسئلہ کو نہیں چھوا"۔

۱۳۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ کی جماعت کے اخبارات نے ایک گمراہ کن تصویر کو چھاپ کر مجھے بدنام کرنے کی جو کوشش کی اس پر آپ نے اور جماعت کے بعض دوسرے اصحاب نے ان جماعتی اخباروں کے کارکنوں کی "سرزنش" کی۔ میں عرض کروں گا کہ اس معاملہ میں اس قسم کی ذاتی سرزنش سراسر ناکافی ہے۔ شرعی اصول کے مطابق، آپ کو اپنی سرزنش ان اخبارات کے کالموں میں باقاعدہ چھپوانا چاہئے جنہوں نے اس برائی کو چھاپ کر ہر طرف پھیلایا۔ جو برائی چھاپ کر کی گئی ہو اس کے خلاف سرزنش بھی چھاپ کر ہی کی جاسکتی ہے، خاموش طور پر نہیں۔

آپ نے اور آپ کی جماعت کے جن لوگوں نے اس معاملے میں جماعت کے اخبار والوں کی انفرادی سرزنش کی، ان کے مجرمانہ فعل کے مقابلہ میں اس قسم کی سرزنش کی کوئی اہمیت نہیں۔ غیر اشاعتی جرم کی سرزنش غیر اشاعتی طور پر کی جاتی ہے اور اشاعتی جرم کی سرزنش اشاعتی طور پر۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایسے ناصحین، قرآن کے الفاظ میں، یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا (آل عمران ۱۸۸) کے مصداق ہیں۔

۱۴۔ آپ نے میرے بارہ میں غضب (غصہ) کی شکایت کی ہے اور یہ اشارہ فرمایا ہے کہ آپ اپنی تحریروں میں سکینت اور روحانیت کا اظہار کرتے ہیں مگر آپ کے اندر میں نے غضب کا جذبہ پایا ہے اور غضب اور روحانیت کا ایک ساتھ جمع ہونا ممکن نہیں۔ میں عرض کروں گا کہ آپ کی یہ بات درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روحانی آدمی کے اندر غضب نہ ہونے کا تصور ایک غیر اسلامی تصور ہے، وہ کوئی اسلامی تصور نہیں۔ اس معاملہ میں صحیح اسلامی تصور یہ ہے کہ آدمی کا غضب صرف حق کے لئے ہو، وہ اپنی ذات کے لئے نہ ہو۔ اس کی تائید میں یہاں میں چند حوالے نقل کرتا ہوں۔

حضرت موسیٰؑ خدا کے پیغمبر تھے مگر قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر غضب کی حالت طاری ہوئی (الاعراف ۱۵۰) اسی طرح اگر آپ حدیث کی کتابوں کو دیکھیں تو اس میں کثرت سے رسول اور اصحاب رسول کے غضب کا ذکر ملے گا۔ اس سلسلہ میں بطور نمونہ صرف

چند مثالیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

فغضب رسول الله حتى عرف الغضب في وجهه (صحیح مسلم، کتاب الفضائل)

فغضب رسول الله غضبا شديدا (صحیح البخاری، کتاب الاذان)

فغضب ابو بكر (صحیح البخاری، کتاب الادب)

فغضب عمر (صحیح البخاری، کتاب التفسیر)

فغضب علي حتى احمرّ وجهه (النسائی، کتاب الضحایا)

فقالت عائشة وغضبت (مسند احمد)

ان حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر جیسے مؤمن کامل میں بھی غضب کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ اب آپ ان پیغمبروں اور ان صالحین کے بارہ میں کیا فرمائیں گے۔ آپ کے خیال کے مطابق، ان کے اندر روحانیت تھی یا نہیں؟

۱۵۔ آپ نے لکھا ہے کہ یہ خط میں الدین النصیحۃ کے جذبہ کے تحت لکھ رہا ہوں۔ آپ نے مجھ کو انانیت کا شکار بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس ۱۰/ ۱۲سالوں میں آپ کی تحریرات میں یہ کیفیت بڑھتی ہی جارہی ہے۔ خدا کے لئے اس کی فکر اور اصلاح کی کوشش کیجئے۔" عرض ہے کہ آپ کا یہ ارشاد کوئی نصیحت نہیں بلکہ وہ صرف ایک الزام ہے۔ آپ نے میری تحریروں سے میری انانیت کی کوئی مثال نہیں دی۔ ایسی حالت میں آخر میں کس چیز کی اصلاح کروں یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص سے کہا جائے کہ تم مجرم ہو اور تم خود ہی اپنا جرم ثابت کرو۔

نصیحت وہ ہے جس میں غلطی کی واضح اور مدلل نشاندہی کی گئی ہو۔ یہ نصیحت کی لازمی شرط ہے۔ اس کے بغیر جو نصیحت کی جائے اس کو نصیحت کرنا نہیں کہا جائے گا بلکہ ملزم گردانا کہا جائے گا جو برعکس طور پر خود ناصح کو غلط کار ثابت کرتا ہے۔

۱۶۔ آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ "تصویری فتنہ" کے معاملہ میں آپ نے اگر فوری طور پر تردید کردی ہوتی تو یہ معاملہ جماعت کے اخباروں میں نہ آتا۔ چونکہ ہندی اخبار میں اس کی

اشاعت کے بعد فوراً آپ نے اس کی تردید نہیں کی اس لئے یہ معاملہ جماعت کے اخباروں میں آگیا۔ میں عرض کروں گا کہ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ عین وہی چیز ہے جس کو قرآن میں اشاعت فاحشہ (النور ۱۹) کہا گیا ہے۔

عرض ہے کہ میں دہلی میں ۱۹۶۷ سے ہوں۔ اس مدت میں میرے بارے میں ہزاروں بار الرسالہ میں یا ملکی پریس میں "اچھی خبریں" چھپی ہیں مگر آپ کی جماعت کے اخبارات نے کبھی ان کو اپنے صفحات میں شائع کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی، وہ مسلسل ان کا بلیک آوٹ کرتے رہے۔ اس ۳۰ سالہ مدت میں انہیں ایک بدنام ہندی اخبار میں میرے بارے میں اتفاق سے ایک "بری خبر" مل گئی۔ اس کے بعد آپ کی جماعت کے اخباروں نے ضروری تحقیق کے بغیر اور گمراہ کن نوٹ کے ساتھ اس کو اپنے صفحات میں چھاپ کر پھیلانا شروع کر دیا۔

ماہنامہ الرسالہ کے خبر نامہ میں بار بار ایسی خبریں چھپتی ہیں جو بتاتی ہیں کہ راقم الحروف نے ملک کے اندر اور ملک کے باہر غیر مسلموں کے بڑے بڑے اجتماعات میں اسلام کی نمائندگی کی مگر اس قسم کی دعوتی خبریں آپ کی جماعت کے اخبارات کے نزدیک قابل اشاعت نہ تھیں۔ ملک کے انگریزی اخبارات میں مسلسل میرے ایسے مضامین چھپ رہے ہیں جن میں اسلام کا صحیح تعارف پیش کیا جاتا ہے اور اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں کا جواب دیا جاتا ہے۔ مگر یہ خبریں بھی آپ کی جماعت کے اخبارات میں قابل ذکر نہیں قرار پاتیں۔

ملکی پریس اور T.V. میں بار بار میں ایسا کر رہا ہوں کہ اکثریتی فرقہ کے سامنے مسلمانوں کی روشن تصویر پیش کروں اور یہ بتاؤں کہ مسلمان اس ملک کے لئے اثاثہ (asset) کی حیثیت رکھتے ہیں نہ کہ کوئی بوجھ (liability)، اور یہ کہ اس ملک کے مسلمان عملاً یہاں کی نیشنل مین اسٹریم میں ہیں، وہ اس سے الگ نہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اس طرح کی بہت سی مثبت باتیں میں مسلسل طور پر ملک کے پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا میں پیش کرتا رہا ہوں اور اب بھی پیش کر رہا ہوں۔ مگر آپ کی

جماعت کے اخبارات نے ہمیشہ اس کے بارے میں بلیک آوٹ کا معاملہ کیا۔ اس مدت میں میرے بارے میں ہزاروں اچھی خبریں آتی رہیں مگر انہوں نے اس قسم کی کثیر خبروں کو اپنے صفحات میں جگہ نہیں دی۔ البتہ ایک بدنام ہندی اخبار میں میرے بارے میں اتفاق سے ان کو ایک "بری خبر" ہاتھ آگئی تو وہ اس کو اس طرح پھیلانے لگے جیسے کہ وہ کوئی بڑا کارنامہ انجام دے رہے ہوں۔ یہ سادہ طور پر اشاعتِ خبر نہیں، بلکہ یہ عین وہی چیز ہے جس کو قرآن میں اشاعت فاحشہ (النور ۱۹) کہا گیا ہے۔

۱۷۔ آپ نے لکھا ہے کہ ــــ "ایک فرد کے تعلق سے یہ بات ہے تو ایک جماعت کے تعلق سے تحقیق کے بغیر باتیں کہنا اور زیادہ شدید تر گناہ ہے"۔ یعنی آپ کے نزدیک فرد کے خلاف کوئی سنگین الزام لگانا چھوٹا گناہ ہے اور "جماعت" کے خلاف الزام لگانا زیادہ بڑا گناہ۔

میرے نزدیک یہ تقسیم درست نہیں۔ قرآن وحدیث میں مجھے کوئی ایسا حکم نہیں ملا جس سے یہ تفریق ثابت ہوتی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا اور رسول کے نزدیک ایک انسان کی عزت اتنی ہی اہم ہے جتنی سارے انسانوں کی عزت اہم ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ : جس نے ایک انسان کو ناحق قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا (المائدہ ۳۲)

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

كل المسلم على المسلم حرام عرضه وماله (الترمذی، کتاب البر، ۱۸) اسی طرح روایت میں آیا ہے کہ ایک صحابی مکہ میں کعبہ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کعبہ کی طرف دیکھا اور اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ما أعظمك وأعظم حرمتك والمؤمن اعظم حرمة عند الله منك۔ (ابن ماجہ، کتاب الفتن)۔

آپ حضرات نے جو جماعت بندی کی ہے وہ امت کے اندر ایک اور امت بنانا ہے۔ یہ خود ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ کجا کہ اس کی بنیاد پر جماعت کو خصوصی اعزاز کا مستحق سمجھا جائے۔

۱۸۔ آپ نے مجھ کو خدا پرست کے بجائے خود پسند ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو آدمی

خدا پرست ہو وہ صرف خدا کی کبریائی کا قائل ہو گا۔ اللہ نے اگر دین کی خدمت کے مواقع نصیب کیے ہیں تو اس کی شکر گزاری میں زبان تر رہنی چاہئے نہ کہ اپنی بڑائی کے بیان کرنے میں۔

آپ کا یہ ریمارک آخری حد تک خلاف واقعہ ہے۔ میری تحریروں کو پڑھنے والے عام طور پر اس کا اقرار کرتے ہیں کہ میری تحریروں میں سب سے زیادہ جس چیز کا ذکر ہوتا ہے وہ اللہ کی بڑائی اور آخرت کی فکر ہے۔ آپ میری کسی بھی تحریر کو دیکھیں تو اس میں یہ پہلو نمایاں طور پر نظر آئے گا۔ حتی کہ اس موضوع پر ۲۲۸ صفحات پر مشتمل میری ایک مستقل کتاب "اللہ اکبر" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ پھر آخر آپ کے پاس وہ کون سے شواہد ہیں جن کی بنیاد پر آپ نے میرے خلاف اتنا بڑا ریمارک دیا ہے کہ میں اپنی ذاتی بڑائی میں گم رہتا ہوں۔

میں نے اپنی تحریروں میں بار بار یہ لکھا ہے کہ خدا پر ایمان کوئی لفظی تکرار کی بات نہیں، یہ سب سے زیادہ عظیم حقیقت کی ڈسکوری ہے۔ یہ خدا کی کبریائی کے مقابلہ میں اپنے صغیر ہونے کو دریافت کرنا ہے، یہ خدا کے ہے کے مقابلہ میں اپنے نہیں کو جان لینا ہے۔ مومن وہ ہے جو اس حقیقت کو پالے کہ خدا قادر مطلق ہے اور میں عاجز مطلق۔ جو آدمی اس حقیقت سے آگاہ ہو جائے وہ انسانِ اصلی (man cut to size) بن جاتا ہے جس کا دوسرا نام تواضع اور فروتنی ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہو گا کہ یہ جو بات آپ نے میرے بارے میں فرمائی ہے وہ سراسر بے بنیاد ہے۔ میرے مضامین جو خلق کے علم میں ہیں اور میرے صبح و شام جو خدا کے علم میں ہیں، دونوں آخری حد تک اس کی تردید کرتے ہیں۔

۱۹۔ آپ اور آپ کی جماعت کے دوسرے لوگ معصومانہ طور پر مجھ سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ میں اس واقعہ کی برہنہ تردید کروں۔ مگر میں کہوں گا کہ یہ برہنہ تردید کا معاملہ نہیں بلکہ برہنہ اعتراف کا معاملہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ حضرات کا یہ مطالبہ خود آپ حضرات کی اسلامیت کو مشتبہ کر رہا ہے۔ اس طرح کے بے ہودہ الزام کے بارے میں اسلام کی جو صحیح تعلیم ہے اس کا رخ آپ لوگوں کی طرف ہے نہ کہ میری طرف۔

قدیم مدینہ میں جب ایک شوشہ کو لے کر حضرت عائشہ صدیقہ پر ایک بے ہودہ الزام لگایا گیا تو اس کے بعد قرآن کی جو آیتیں اتریں اس میں جو تعلیم دی گئی وہ یہ نہیں تھی کہ اس قسم کا بے ہودہ الزام کسی پر لگایا جائے تو لوگوں کو چاہئے کہ وہ زیر الزام شخص سے مطالبہ کریں کہ تم کھلے لفظوں میں اس کی تردید کرو۔ اور زیر الزام شخص اس وقت تک بری الذمہ نہ سمجھا جائے جب تک کہ وہ کھلے لفظوں میں اس کی تردید نہ کردے۔ اس کے بالکل برعکس قرآن (النور ۱۵۔۱۷) میں جو کچھ کہا گیا وہ یہ تھا:

جب کہ تم اس کو اپنی زبانوں سے نقل در نقل کر رہے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جس کی تم کو (کسی دلیل سے) مطلق خبر نہیں اور تم اس کو ہلکی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بھاری بات ہے اور تم نے جب اس کو سنا تو یوں کیوں نہ کہا کہ ہم کو زیبا نہیں کہ ہم ایسی بات منہ سے بھی نکالیں۔ معاذ اللہ یہ تو بڑا بہتان ہے۔ اللہ تعالیٰ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ پھر ایسا کام کبھی نہ کرنا اگر تم ایمان والے ہو۔ (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی)

قرآن کی ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے لغو پروپیگنڈے کے معاملہ میں قرآن نے یہ اصول دیا ہے کہ اس کو سنتے ہی بلا بحث اسے رد کر دیا جائے۔ یعنی اس کے بارے میں وہی سلوک کیا جائے جس کو انگریزی میں اس طرح کہا گیا ہے:

Prima facie it stands rejected.

مذکورہ آیت میں يعظكم الله ان تعودوا لمثله ابداً (النور ۱۷) کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اس حکم کا تعلق صرف حضرت عائشہ سے نہ تھا بلکہ اس کا تعلق تمام مسلمانوں سے اور ہمیشہ کے لئے تھا۔ اس شدید حکم کے باوجود آپ کی جماعت کے لوگوں نے اس مذموم فعل کو میرے ساتھ دہرایا اور اس کے خلاف آپ کی جماعت میں کوئی آواز بلند نہیں کی گئی۔ اس طرح آپ کی جماعت کے تمام لوگ براہ راست یا بالواسطہ طور پر علی الاعلان اس ممنوع فعل کے مرتکب ہو چکے ہیں۔ اس جرم سے آپ حضرات اس وقت تک بری الذمہ نہیں ہو سکتے جب تک اعلان و

اشاعت کے ساتھ آپ لوگ اس سے توبہ اور رجوع نہ کریں۔ مذکورہ خط جیسی تحریر صرف آپ حضرات کی سرکشی میں اضافہ کرتی ہے، وہ ہرگز آپ کے جرم میں کوئی کمی کرنے والی نہیں۔

۲۰۔ ایک اور پہلو سے دیکھئے تو آپ کی جماعت کے لوگوں نے مجھ کو اس معاملہ میں جس طرح شرمناک طور پر بدنام کرنے کی کوشش کی وہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک بدترین جرم نظر آئے گا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں غیر منقسم ہندستان میں ہر روز سیکڑوں آدمی اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ ۱۹۴۷ کے بعد یہ عمل رک گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نارمل تعلقات تھے۔ نفرت اور کشیدگی کا ماحول نہیں تھا۔ اس نارمل فضا میں روزمرہ کی ملاقاتوں کے دوران دعوت کا عمل فطری طور پر جاری تھا۔ ملکی تقسیم کی تحریک اور پاکستان کے قیام کے نتیجہ میں طرفین کے درمیان جو تلخی پیدا ہوئی اس نے اس دعوتی عمل (process) کو روک دیا۔

پچھلے تقریباً ۳۰ سال سے میں خاموشی کے ساتھ یہ کوشش کرتا رہا ہوں کہ دونوں گروہوں کے درمیان تلخی اور کشیدگی کا ماحول ختم ہو تاکہ دونوں کے درمیان دوبارہ اوپن ڈائیلاگ ہونے لگے۔ اور دعوت کا فطری عمل دوبارہ جاری ہو جائے۔ میرا یقین ہے کہ دونوں گروہوں کے درمیان نارمل فضا قائم ہوتے ہی عین وہی فائدہ یہاں حاصل ہو گا جو صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کے دور اول میں حاصل ہوا تھا۔ اور خود اس ملک میں ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں عملاً موجود تھا۔

اس دعوتی ماحول کو قائم کرنے کے لئے میں نے غیر معمولی قربانیاں دیں۔ طرح طرح کے نقصانات اٹھائے۔ مثال کے طور پر ملک کے دوسرے مسلم رہنما کچھ نو پرابلم ہندوؤں کے ساتھ خوشگوار ملاقات کر لینے کو کافی سمجھے ہوئے تھے۔ میں نے تجربہ کے بعد دریافت کیا کہ اصل مسئلہ پرابلم ہندوؤں کو نارمل بنانے کا ہے۔ چنانچہ میں نے ہر قسم کی مصیبت اٹھا کر پرابلم ہندوؤں کے درمیان انٹرایکشن بڑھلیا جو کہ بلاشبہ ایک سخت دشوار کام تھا۔ اللہ کی تائید سے میری

اس کوشش کے غیر معمولی نتائج بر آمد ہونے لگے۔ ۱۹۹۲ کے بعد ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کا رک جانا میری انہی کوششوں کا ایک براہ راست نتیجہ ہے۔

مگر عین اس وقت آپ کی جماعت کے لوگوں نے میرے خلاف اندھی دشمنی کے نتیجہ میں تصویر کے جھوٹے شوشہ کو لے کر ایک ایسا عمومی ہنگامہ کھڑا کیا جو عملی طور پر میرے پورے دعوتی منصوبہ کو تہہ وبالا کر دینے کے ہم معنی تھا۔ آپ کی جماعت کے لوگوں نے ملک کے اندر اور ملک کے باہر بہت بڑے پیمانہ پر مجھ کو اس طرح بدنام کرنے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کی نظر میں میری تصویر اس طرح بگڑ جائے کہ وہ میرے پروگراموں میں شرکت یا تعاون سے توحش کرنے لگیں۔

آپ کی جماعت کے لوگ میرے خلاف دشمنی میں اتنے اندھے ہو گئے کہ انہیں یاد نہ رہا کہ وہ اپنی اس مہم سے صرف ایک شخص کو بدنام نہیں کر رہے ہیں بلکہ موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے ایک اہم اور دور رس منصوبہ کو معطل کرنے کی کوشش کے مجرم بن رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی جماعت کی یہ مذموم کوشش یقیناً بے اثر ہو کر رہ جائے گی۔ اور اللہ کی مدد سے یہ دعوتی عمل بدستور جاری رہے گا۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ میں آپ کی جماعت کے لوگوں نے اس گناہ عظیم کا ارتکاب کیا ہے جس کو قرآن میں صدّ عن سبیل اللہ (الاعراف ۴۵) کہا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی پوری جماعت براہ راست یا بالواسطہ طور پر اس سنگین جرم کی مجرم بن چکی ہے، الا یہ کہ یہ لوگ اپنے اس جرم کا اسی طرح کھلے طور پر اعتراف کریں جس طرح انہوں نے کھلے طور پر اس جرم کا ارتکاب کیا تھا۔

دعا گو   وحید الدین

۲۳ اپریل ۱۹۹۹

M. A. Jameel Ahmad.
Islamic Foundation Trust
78, Perambur High Road, Madras-600 012
Tel. 6424401, 6421101, (Fax-4835120)

سوال

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اخلاص میں برکت ہے۔ جو کام اخلاص کے بغیر کیا جائے اس میں کوئی برکت نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب کیا ہے۔ براہ کرم اس کی وضاحت فرمائیں (شاہ فیصل، دہلی)

جواب

یہ کوئی پراسرار بات نہیں۔ یہ ایک سادہ حقیقت ہے۔ اس کو مذہب کی زبان میں کہنا ہو تو یہ کہیں گے کہ اخلاص میں برکت ہوتی ہے۔ اور فطرت کی زبان میں کہنا ہو تو یہ کہا جائے گا کہ تاثیر صرف اس کام میں ہے جس کو انسانی درد کے ساتھ کیا گیا ہو۔ پروفیشنل طور پر کئے گئے کام میں کوئی تاثیر نہیں ہو سکتی۔ برکت یا تاثیر کا تعلق صرف بات سے نہیں ہے بلکہ اس سے ہے کہ بات کو کس طرح کہا گیا ہے۔ ایک پیشہ ور گیت کار مترنم لہجہ میں اخلاق اور محبت کا گیت گائے تو سننے والے اس سے وقتی لطف لے سکتے ہیں مگر اس کا یہ نتیجہ نہیں ہو سکتا کہ سننے والے اپنی عملی زندگیوں میں غیر اخلاقی روش کو چھوڑ دیں اور اخلاقی قدروں کو اپنی زندگی میں اختیار کر لیں۔ کیوں کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر پہلے ہی سے جانتے ہیں کہ یہ آدمی ذاتی مفاد کے لئے ایسا کر رہا ہے نہ کہ حقیقۃً اصلاح انسانیت کے لئے۔ اس کے برعکس بامقصد اور درمند آدمی کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ صبح و شام اس لئے تڑپ رہا ہوتا ہے کہ لوگ بے اخلاقی کا طریقہ چھوڑ دیں اور بااخلاق زندگی اختیار کریں۔ وہ اپنی تنہائیوں میں لوگوں کی اصلاح کے لئے دعائیں کرتا ہے۔ وہ رات دن سوچتا ہے کہ بات کو کس طرح زیادہ بہتر انداز میں کہے جو لوگوں کے لئے موثر ہو سکے۔ اخلاق اور روحانیت اس کے لئے صرف کہنے کی بات نہیں ہوتی بلکہ وہ عملاً کرنے کی بات ہوتی ہے۔ وہ اس کو جنت اور جہنم کا مسئلہ سمجھتا ہے، اس لئے دوسروں کو سنانے سے پہلے وہ خود اس کا عملی پیکر بن جاتا ہے۔ وہ کہنے سے پہلے کرنے والا بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس کا کہنا صرف کہنا نہیں ہوتا بلکہ اپنے دل کے درد کو انڈیلنا ہوتا ہے۔ اس کا لکھنا اور بولنا صرف لکھنا اور بولنا نہیں ہوتا بلکہ اس میں اس کا پورا وجود شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے قلم کی سیاہی بازار کی سیاہی نہیں ہوتی بلکہ وہ آنسوؤں سے بنی ہوئی سیاہی

ہوتی ہے۔ اس کی آواز ہوا کی لہروں پر سفر نہیں کرتی بلکہ وہ دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ایک روح سے نکل کر دوسری روح تک پہنچتی ہے۔ اسی کا نام اخلاص ہے، اور جو بات اس اخلاص کے ساتھ نکلے وہ از دل خیزد بر دل ریزد کی مصداق ہوتی ہے، الایہ کہ سننے والا ایک ایسا انسان ہو جس کے سینہ میں بد قسمتی سے دل ہی نہ ہو، ایسا آدمی پتھر کا ایک مجسمہ ہوگا نہ کہ حقیقۃً کوئی زندہ انسان۔

سوال

میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اکثر آپ کے خلاف بولتے رہتے ہیں۔ مگر وہ ہمیشہ عیب جوئی اور الزام تراشی کی زبان میں بولتے ہیں۔ وہ شوشے نکال کر آپ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ لوگ دلیل کی زبان میں آپ کی کاٹ کریں یا قرآن وحدیث کے حوالوں سے آپ کی بات رد کریں۔ آخر اس روش کے پیچھے نفسیات کیا ہے۔ یہ لوگ کیوں ایسا کرتے ہیں جب کہ مجھے یقین ہے کہ اس قسم کی باتوں سے نہ آپ کی تردید ہوتی ہے اور نہ کوئی ان سے متاثر ہو سکتا ہے۔ (ڈاکٹر انوار الحق، اعظم گڈھ)

جواب

اس کا جواب بالکل سادہ ہے۔ آپ کے پاس اپنے حریف کے لئے اگر بم ہو تو آپ اس کے اوپر بم ماریں گے، آپ اس کی طرف کنکری نہیں پھینکیں گے۔ البتہ اگر آپ محسوس کریں کہ میرے پاس اپنے حریف کے خلاف کوئی طاقت ور ہتھیار نہیں تو دل کا بخار نکالنے کے لئے آپ اس کو گالیاں دیں گے۔ کنکری پھینک کر یہ تسکین حاصل کریں گے کہ آپ نے اس کو اپنی زد میں لے لیا ہے۔ جو لوگ میرے خلاف عیب زنی اور الزام تراشی کی مہم چلا رہے ہیں وہ صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ دلائل کے اعتبار سے وہ بالکل بے بس ہیں۔ یہ الرسالہ کا ہر قاری جانتا ہے کہ میں جو کچھ لکھتا ہوں ہمیشہ قرآن وحدیث کے حوالوں کی روشنی میں لکھتا ہوں۔ ایسی حالت میں جو لوگ میرے خلاف عیب جوئی اور الزام تراشی کا طریقہ اختیار کریں انھوں نے صرف مجھ کو نشانہ نہیں بنایا۔ انھوں نے قرآنی دعوت کو رد کیا۔ انھوں نے اپنی زبان حال سے یہ کہا کہ ہم کو قرآن

وحدیث سے کوئی مطلب نہیں، ہم کو صرف اپنے تعصبات سے مطلب ہے۔ بظاہر اگرچہ وہ مجھ کو برا بھلا کہتے ہیں مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ قرآن وحدیث کے مقابلہ میں سرکشی کررہے ہیں۔ وہ نعوذ باللہ خدا ورسول کی ناقدری کرنے کے مجرم بن رہے ہیں۔ ان حضرات کی یہ روش اپنی حقیقت کے اعتبار سے قرآن کے اس ارشاد کی مصداق ہے "یہ لوگ تم کو نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کررہے ہیں۔ (الانعام ۳۳)

سوال

کچھ مسلمانوں کو آپ سے جو شکایت ہے، وہ اس وقت شروع ہوئی جب آپ آر ایس ایس اور کٹر ہندوؤں کے جلسوں میں جانے لگے۔ مسلمان عام طور پر ان عناصر کو مسلم دشمن سمجھتے ہیں۔ اس لئے جب آپ ان کے جلسوں میں جانے لگے تو کچھ لوگوں کو آپ کے بارے میں یہ شبہ ہوا کہ آپ خدانخواستہ ان کے آلہ کار بن گئے ہیں۔ یہ سوال ان مسلمانوں کے ذہن میں بھی ہے جو اسلام کے بارے میں آپ کی تحریروں کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ براہ کرم اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔ (عمران احمد اصلاحی، دہلی)

جواب

اس معاملہ میں لوگوں کا شبہہ بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ تو میں ایک بھولی ہوئی سنت کو زندہ کر رہا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کافروں اور مشرکوں کی مجلسوں میں اور ان کے میلوں اور بازاروں میں جاتے تھے تاکہ انھیں اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ یہ لوگ خود اپنے اجتماعات ہی میں بڑی تعداد میں مل سکتے ہیں، کسی اور جگہ ہم ان کو نہیں پاسکتے۔ اس لئے ان کو عمومی طور اسلام سے متعارف کرنے کی واحد صورت یہی ہے کہ خود ان کے اجتماعات میں شرکت کی جائے۔ آر ایس ایس کے لوگ میرے اس مقصد کو بخوبی جانتے ہیں۔ چنانچہ آر ایس ایس کے انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر (دہلی) نے میرے بارے میں دو قسطوں میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا: ایک مبلغ مولانا (A Missinary Maulana) آر ایس ایس کے ایک لیڈر ڈاکٹر مہیش چندر شرما نے ہندی

اخبار راجستھان پتریکا میں میرے بارہ میں ایک مضمون شائع کیا جس میں انھوں نے لکھا کہ دوسرے مسلمانوں کا طریقہ عداوت کا ہے اور مولانا وحید الدین کا طریقہ دعوت کا۔ دہلی کے فکّی آڈیٹوریم میں ایک جلسہ ہوا۔ یہ جلسہ دہلی کے آر ایس ایس حلقہ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس میں صرف دو مقرر تھے۔ ایک میں اور دوسرے جناب اٹل بہاری واجپیئی۔ میں نے اپنی تقریر کا موضوع وما ارسلناك الا رحمة للعالمين بنایا۔ اور تقریباً آدھ گھنٹہ کی پوری تقریر اسلام کے تعارف پر کی۔ اس کے بعد جناب اٹل بہاری واجپیئی اسٹیج پر آئے۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں تقریر کی اور شروع ہی میں مجھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: مولانا صاحب، یہ وچار منچ ہے، یہ پرچار منچ نہیں ہے۔ اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ میں "کٹر ہندوؤں" کے جلسوں میں جاتا ہوں تو وہاں میں اپنی تقریر میں کیا بات کہتا ہوں۔ جو لوگ پابندی کے ساتھ ماہنامہ الرسالہ پڑھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ میری زندگی کا واحد مشن دعوت ہے۔ اسلام کے پیغام رحمت کو تمام قوموں تک پہنچانا۔ اسی کو میں نے اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہے۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر ہر جگہ میں مسلسل یہی کام کر رہا ہوں۔ آر ایس ایس کے جلسوں میں جانا بھی اسی سلسلۂ تعارف کی ایک کڑی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ بعد کے زمانہ میں اسلام اجنبی ہو جائے گا۔ موجودہ زمانہ میں چونکہ غیر مسلموں میں جا کر انھیں اسلام کا پیغام پہونچانے کا کام تقریباً ختم ہو گیا ہے اسلئے کچھ لوگ اس کو اجنبیت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مگر مجھے یہ یقین ہے کہ میرا یہ عمل ایک عبادت ہے۔ میں اللہ سے یہ امید رکھتا ہوں کہ میرا یہ کام انشاءاللہ اس مخصوص دینی عمل میں شمار کیا جائے گا جس کو حدیث میں مردہ سنت کو زندہ کرنے کا نام دیا گیا ہے۔ رواجی دین پر عمل کرنے والا فوراً لوگوں کی نظر میں مقبول بن جاتا ہے۔ لیکن متروک دین پر عمل کرنے کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ دین کے متروک جزء پر عمل کرنا ہمیشہ نہایت مشکل کام ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا ثواب بھی بہت زیادہ ہے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ ـــــ انّ عظم الجزاء مع عظم البلاء (الترمذی، کتاب الزہد)

۱۔ ہندی روزنامہ راشٹریہ سہارا (دہلی) کے نمائندہ مسٹر اکھلیش سمن نے ۱۰ فروری ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو اسلام کے بعض مسائل پر تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اسلام میں اظہار رائے کی مکمل آزادی ہے۔ البتہ تشدد کی آزادی کسی کو نہیں۔ اگر کسی کو ایک شخص کی رائے غلط یا غیر اسلامی معلوم ہوتی ہے تو وہ اس کے خلاف تشدد نہیں کر سکتا۔ اس کو عقلی اور نقلی دلائل کی روشنی میں اس کی تردید کرنا چاہئے۔ سماجی جرائم پر اسلام میں سخت سزائیں ہیں۔ مگر کسی سزا کے نفاذ کا حق صرف جائز طور پر قائم شدہ عدالت کو ہے نہ کہ افراد کو۔

۲۔ فرنچ نیوز ایجنسی کے نمائندہ مسٹر نارائن سوامی نے ۱۲ فروری ۱۹۹۹ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ اسلام میں آزادیٔ رائے کا کیا درجہ ہے۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام میں آدمی کو مکمل آزادیٔ رائے حاصل ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ تشدد نہ کرے۔ کسی کو اگر کسی کی رائے سے اختلاف ہو تو وہ دلیل سے اس کا توڑ کر سکتا ہے مگر تشدد کی اجازت کسی کو بھی نہیں۔

۳۔ اکھل بھارتی ودیارتھی پریشد کی طرف سے جواہر لال نہرو یونیورسٹی (نئی دہلی) میں ۲۰ فروری ۱۹۹۹ کو یونیورسٹی کے طلبہ کا ایک جلسہ ہوا۔ صدر اسلامی مرکز کو اس میں خطاب کی دعوت دی گئی۔ انھوں نے اس موقع پر علم اور تعلیم کی اہمیت پر ایک تقریر کی۔ مزید یہ کہ ہمارے ملک کی قومی پہچان صرف ایک ہے، اور وہ کیرکٹر ہے۔ اس کے سوا کسی اور چیز کو ملک کی پہچان بنانا صرف ملک کو تباہ کر سکتا ہے، وہ ملک کو ترقی کی طرف نہیں لے جا سکتا۔

۴۔ دکن ہیرالڈ کے نمائندہ مسٹر بھاشم کستوری نے ۲۵ فروری ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ اسلام میں فکری آزادی ہے یا نہیں۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام میں مکمل فکری آزادی ہے البتہ تشدد کی آزادی اسلام میں نہیں۔

۵۔ ہندی ہفت روزہ مایا کے لئے اس کے نمائندہ مسٹر بی ڈی ایس گوتم نے ۲۳ جنوری ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کنورزن سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ موجودہ حالات میں جو لوگ اینٹی کنورزن قانون کی بات کرتے ہیں وہ ایک غیر قانونی اور غیر دستوری بات کر رہے ہیں۔ ہندوازم کا یہ نظریہ ہے کہ سچائی ایک ہے اور مختلف مذاہب کے وہاں تک پہنچنے کے مختلف راستے ہیں۔ ایسی حالت میں اینٹی کنورزن قانون کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں پر یہ پابندی لگائی جائے کہ وہ سچائی کی منزل تک پہنچنے کے لئے راستہ نمبر ایک سے جاسکتے ہیں لیکن راستہ نمبر دو، تین سے نہیں جاسکتے۔ اسی طرح اینٹی کنورزن قانون ہندستانی دستور کے خلاف ہے۔ اور اقوام متحدہ میں ہمارے کئے ہوئے عہد کے خلاف ہے۔ ایسی حالت میں جو لوگ اینٹی کنورزن کی بات کرتے ہیں انھیں اس سے پہلے ہندوازم کے تصور مذہب کو بدلنا ہوگا، انھیں دستور ہند سے مذہبی آزادی کی دفعہ کو نکالنا ہوگا اور اسی طرح اقوام متحدہ سے اپنا دستخط واپس لینا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب ممکن نہیں۔ اس لئے اینٹی کنورزن قانون بھی جائز طور پر ممکن نہیں۔ اور اگر ان سب کے باوجود اینٹی کنورزن قانون بنایا جائے تو وہ دہرا معیار کو اپنانا ہوگا۔ جو تمام برائیوں سے زیادہ بڑی برائی ہے۔

۶۔ ایک صاحب اپنے تفصیلی خط مورخہ چار اپریل میں لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو صبر اپنے اور پرائے کی مخالفت کے باوجود دیا ہے وہ اس کو برقرار رکھے۔ (آمین) پچھلے چند ماہ سے جو فتنۂ تصویر آپ کے خلاف اٹھایا گیا ہے اس کی تردید میں نے خود اسی طرح کی جیسے آپ نے ماہ جنوری، فروری اور مارچ 99 کے الرسالہ کے ذریعہ کی ہے۔ اس فتنہ میں جو شریک تھے اللہ تعالیٰ ان کو اپنی غلطی کے اعتراف کی توفیق دے۔ مولانا شمس پیرزادہ کے سوال کا جواب پڑھ کر، قرآن کو صحیح سمجھنے کا موقع ملا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ آپ کی

علمی قابلیت کو اور زیادہ بڑھایا۔ جس طرح حضرت عائشہؓ افک کے واقعہ سے بری ہوئیں اور مخالف ناکام ہوئے۔ اسی طرح تصویری فتنہ کے بعد آپ کی عزت بڑھی اور سازش کرنے والوں کی بے عزتی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو خاص علم دیا ہے اس کی وجہ سے جو لوگ کسی کی شخصیت پرستی میں ہیں ان کو اچھا نہیں معلوم ہو رہا ہے۔ اب رہے غیر تو ان میں سے بہت سے لوگ آپ کی تحریروں کو پڑھ کر اسلام قبول کر رہے ہیں اور بہت سارے اسلام کے قریب آرہے ہیں۔ یہ بات کچھ لوگوں کو پسند نہیں اس وجہ سے وہ کچھ نہ کچھ فتنہ کھڑا کر رہے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ ہر فتنہ کی جڑ فوری کاٹ رہے ہیں۔ اسکی وجہ سے اسلام کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اگر ہمارے علماء کرام اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کریں تو یہ فتنہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ اگر انھوں نے یہ فریضہ انجام نہیں دیا تو وہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے علمائے کرام کو نیک توفیق دے تاکہ اسلام کی اشاعت میں رکاوٹ نہ ہو سکے اور اسلام ترقی کرے۔ (جمال الدین صدیقی، ناندیڑ)

۷۔ ہندی روزنامہ دینک بھاسکر کے نمائندہ مسٹر ایم جے انصاری نے ۱۰ مارچ ۱۹۹۹ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال یہ تھا کہ مسلمانوں کے لئے حقوق کے تحفظ اور ریزرویشن کی جو تحریک چل رہی ہے اس کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہیں۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ مسلمان یا غیر مسلم کوئی بھی تحفظات کے بل پر ترقی نہیں کر سکتا۔ ترقی کا واحد فارمولہ محنت ہے۔ اس دنیا کے لئے خدا کا اٹل قانون یہ ہے کہ — جتنی محنت اتنی ترقی۔ جو لوگ تحفظات کے ذریعہ مسلمانوں کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں وہ گویا فطرت کے قانون سے لڑ رہے ہیں۔ تحفظ اولا ملنے والا نہیں اور اگر بالفرض مل جائے تب بھی وہ بے فائدہ ہے۔

۸۔ ٹریسی سیمینار سیریز (Traci Seminar Series) کی طرف سے ۳۰ مارچ ۱۹۹۹ کو کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں ایک سیمینار ہوا۔ اس کا موضوع یہ تھا ریلیجن اینڈ

نیشن بلڈنگ (Religion and Nation Building)۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور وہاں ایک تقریر کی۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کا سب سے موثر طریقہ پرامن طریقہ ہے۔ اس موقع پر انھوں نے قرآن کی آیت فاذا الذی بینک وبینه عداوة کانه ولی حمیم (حم السجدہ ۳۵) کی تشریح کی۔

۹۔ انوورت مہا سمیتی کی طرف سے انوورت بھون (نئی دہلی) میں ۲۷ مارچ ۱۹۹۹ کو ایک آل انڈیا سیمینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا: قومی ترقی میں روحانیت کا رول۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور اس موضوع پر اظہار خیال کیا۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ صرف سسٹم بدلنے سے کوئی سماجی انقلاب نہیں آتا۔ حقیقی سماجی انقلاب کے لئے افراد کے اندر روحانی انقلاب لانا ضروری ہے۔

۱۰۔ دوردرشن نئی دہلی کی ٹیم نے ۱۸ مارچ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا سوالات کا تعلق زیادہ تر کشمیر کے مسئلہ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ کشمیر کا مسئلہ اتنی لمبی مدت تک حل نہ ہونے کا واحد سبب یہ ہے کہ دونوں میں سے کوئی بھی پوری طرح سنجیدہ نہیں ۔ دونوں فریقوں نے اب تک مشترک طور پر تین معاہدے کئے ـــــ تاشقند ڈیکلریشن ۱۹۶۶، شملہ ڈیکلریشن ۱۹۷۲، لاہور ڈیکلریشن ۱۹۹۹ ـــــ مگر کسی بھی معاہدے پر درست طور پر عمل نہیں کیا گیا۔ اگر دونوں فریق خود اپنے کئے ہوئے معاہدہ پر دیانت دارانہ عمل کریں تو یہ مسئلہ چند دنوں میں ختم ہو جائے۔

۱۱۔ بی بی سی ورلڈ سروس اور پبلک ریڈیو انٹر نیشنل کی فارن کرسپانڈنٹ مقیم بوسٹن (Tel. 03561 24083) مسز ٹنکو رے (Tinku Ray) نے مارچ ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی کا ایک انٹرویو انگریزی میں ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر سلمان رشدی اور ان کی کتاب سیٹنک ورسز سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ سلمان رشدی کو اگر انڈیا

آنے کا ویزا دیا جاتا ہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ میں اپنے آفس میں ان سے ملاقات کرنے کے لئے تیار ہوں۔ وہ یہاں آئیں اور اپنی کتاب اور اسلام کے بارے میں اپنے خیالات پر مجھ سے بات کریں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے دلائل کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ اگر ان کے اندر علمی سنجیدگی ہے تو وہ یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ انھوں نے جو باتیں اپنی کتاب میں لکھی ہیں وہ سراسر بے بنیاد ہیں۔ وہ حقیقت یا تاریخ پر مبنی نہیں۔

۱۲۔ ۲۱ اپریل ۱۹۹۹ کو انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں ایک سیمینار ہوا۔ اس کو منسٹری آف فارسٹ اور ڈبلیو ایف نے مشترکہ طور پر آرگنائز کیا تھا۔ اس کا موضوع تھا: مذہب اور تحفظ فطرت Religion and Conservation اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور قرآن کی روشنی میں اس موضوع پر ایک تقریر کی۔ یہ تقریر انشاء اللہ مرتب کر کے مضمون کی صورت میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۳۔ کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں ۱۱ مارچ ۱۹۹۹ کو ایک اجتماع ہوا۔ یہ وبھاجن اَسویکار نامی کتاب کو ریلیز کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اصل مسئلہ وبھاجن کو اَسویکار کرنے کا نہیں ہے بلکہ نفرت کو اَسویکار کرنے کا ہے۔ نفرت ہی تمام مسائل کی جڑ ہے۔ نفرت کو ملک کے اندر بھی ختم کرنا ہے اور ملک کے باہر بھی۔ تمام مسائل نفرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور پیار و محبت سے انہیں ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر مہیش چندر شرما نے مرتب کی۔

۱۴۔ مارچ ۱۹۹۹ کے پہلے ہفتہ میں صدر اسلامی مرکز نے کیرالا اور بمبئی کا سفر کیا۔ دونوں جگہ مختلف قسم کے پروگراموں میں شرکت کی۔ کیرالا میں شانتی گری آشرم (ٹریونڈرم) کی کانفرنس میں شرکت کی۔ مذکورہ آشرم میں کثیر تعداد میں غیر مسلموں سے ملاقات ہوئی اور اسلام کے تعارف کا موقع ملا۔ اس سفر کی رپورٹ انشاء اللہ سفر نامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضہ ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو اور انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فیصد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں گے، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

	INLAND		ABROAD	
	Urdu	English	Air-Mail	
	Rs.	Rs.	US $	£
1 Year	100	60	10	6
2 Years	195	120	20	12
3 Years	290	175	30	18
5 Years	480	280	50	30

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

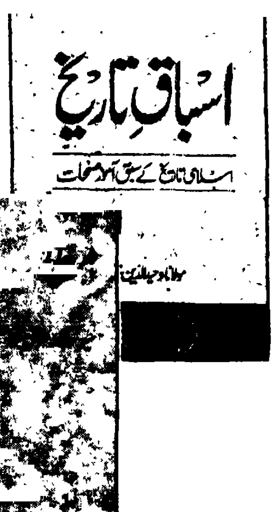
مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

خصوصی شمارہ: تعمیر ہند

فہرست

نئی کتابیں



Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
skhan@vsnl.com
http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY

AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

فہرست

Tamir-e-Hind by Maulana Wahiduddin Khan

First Published 1999

Al-Risala 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013

Tel. 4625454, 4611128 Fax 4697333, 4647980

E-mail: skhan@vsnl.com   http://www.alrisala.org

تاریخ کو انتظار ہے

ہندوؤں کا ایک طبقہ ہندستانی مسلمانوں کو ملک کے لئے اثاثہ (asset) کے روپ میں نہیں دیکھ پاتا۔ اس کے بجائے وہ ان کو ایک بوجھ (liability) کے روپ میں دیکھتا ہے۔ یہ نظریہ قانون فطرت کے خلاف ہے۔ یہ کسی اقلیت کے اس فطری کردار کی نفی ہے جو اس کے لئے فطرت کے اٹل قانون کے تحت مقدر ہے۔

انگریز مؤرخ آرنلڈ ٹوائن بی نے اپنی مشہور کتاب اسٹڈی آف ہسٹری میں تاریخی شواہد کے ساتھ بتایا ہے کہ یہ اقلیتیں ہی ہیں جو ہمیشہ کسی ملک میں کوئی انقلابی کردار ادا کرتی ہیں۔ اور ہندستان کی مسلم اقلیت بلاشبہ اس معاملہ میں کوئی استثنا نہیں۔

امام النسائی کی روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی ایک پیشین گوئی میں فرمایا کہ میری امت کے دو گروہ ایسے ہیں جن کو اللہ نے آگ کے عذاب سے محفوظ کر دیا ہے۔ ایک گروہ وہ جو ہند میں غزوہ کرے گا۔ اور دوسرا گروہ وہ جو عیسیٰ بن مریم کے ساتھ ہوگا (**عصابتان من امتی احرزهما الله من النار: عصابة تغزو الهند وعصابة تكون مع عيسىٰ ابن مريم) جامع الاصول في احاديث الرسول ، الجزء التاسع ، ٢٠٢۔**

میرے نزدیک اس حدیث میں یہ پیشین گوئی کی گئی ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ ہندستان کے مسلمان اس ملک میں ایک اہم تعمیری کردار ادا کریں گے۔ وہ اس ملک کو حقیقی عظمت اور ترقی کا مقام دلانے کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ وقت اب آخری طور پر آگیا ہے۔

اس پیغمبرانہ پیشین گوئی کی تکمیل کے لئے ہندستانی مسلمانوں کو کیا کرنا ہے۔ انھیں صرف یہ کرنا ہے کہ وہ اس ملک میں احتجاجی گروہ کے طور پر رہنے کا انداز چھوڑیں اور تخلیقی گروہ

(creative group) بن کر رہنا سیکھیں۔ وہ لینے والے گروہ نہ رہیں بلکہ وہ اس ملک میں دینے
الے گروہ بن جائیں۔ اور یہی اسلام کا تقاضا ہے۔ اس کے بعد ملک میں ایک نیا دور آ جائے گا۔
ب کہ ہندستان ایک ترقی یافتہ ملک کے روپ میں ابھرے گا اور دنیا کے نقشہ میں اپنا وہ مقام
اصل کرلے گا جو اس کے لئے مقدر ہے۔

سوامی وویکا نند نے ۱۸۹۸ میں کہا تھا کہ مستقبل کا ہندستان ایک پر عظمت ہندستان (glorious India) ہوگا اور اس پرعظمت ہندستان کی تعمیر ہندو اور مسلمان دونوں مل کر کریں گے۔ یہ بات بلاشبہ درست ہے مگر ہندو اور مسلمان دونوں کو یہ تاریخی کردار ادا کرنے کے لئے پنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرنا ہوگا۔ ضروری اہلیت کے بغیر دونوں میں سے کسی کے لئے بھی س تاریخی کردار کو انجام دینا ممکن نہیں۔

ہندوؤں میں سے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ملک ان کے نام الاٹ کر دیا گیا ہے۔ یہ یک خطرناک قسم کی غلط فہمی ہے۔ اس ذہن کے ساتھ ان کے لئے اپنا مطلوب کردار ادا کرنا ممکن نہیں۔ ہندو بلاشبہ اس ملک میں اکثریتی فرقہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر ہر اکثریت آخر کار فطرت کے اٹل قانون کے تحت ہے نہ کہ اس سے آزاد۔ اس دنیا میں ہر اکثریت اسی طرح فطرت کے قانون کے تابع ہے جس طرح کوئی اقلیت۔

ہندوؤں کو یہ کرنا ہوگا کہ مسلمانوں کو وہ سادہ طور پر محض عددی تناسب کے نقطۂ نظر سے نہ دیکھیں بلکہ وہ انھیں اپنا فطری شریک کار سمجھیں۔ وہ مسلمانوں کو ہندستانی گاڑی کے دوسرے پہیہ کی حیثیت سے قبول کریں۔ اس کے بغیر ملک میں کوئی حقیقی ترقیاتی عمل شروع نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھیں کہ مذکورہ حدیث رسول کے مطابق، اس ملک میں انھیں جو تعمیری رول ادا کرنا ہے اس کی لازمی شرط بھی یہی اہلیت ہے۔

مسلمان اس اہم کردار کی ادائیگی کے اہل صرف اس وقت بن سکتے ہیں جب کہ وہ اپنے آپ میں وہ ضروری لیاقت پیدا کریں جس کو تخلیقیت (creativity) کہا جاتا ہے۔

تخلیقی گروہ وہ ہے جو منفی طرز فکر سے پاک ہو اور معاملات کو صرف مثبت انداز سے دیکھے۔ جو دوسروں کے ساتھ تعلقات میں بلند نظری کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ تنگ نظری کا طریقہ۔ جو اپنے حقوق سے زیادہ اپنی ڈیوٹی پر نظر رکھتا ہو۔ جو اپنے جذبات سے زیادہ دوسروں کے جذبات کا احترام کرنا جانتا ہو، جو اشو اور نان اشو میں فرق کرے اور صرف ان چیزوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے جو تعمیر و ترقی کے عمل کے لئے حقیقی اشو کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تخلیقی گروہ وہ ہے جو گروہی ذہنیت سے پاک ہو اور معاملات کو انسانیت کے نقطۂ نظر سے دیکھے۔ جس کے دل میں دوسروں کے لئے خیر خواہی ہو نہ کہ نفرت و حقارت۔ جس کا تحمل کا مزاج اس کو اتنا اوپر اٹھادے کہ وہ اشتعال انگیز چیزوں پر بھی مشتعل نہ ہو۔ جو اعلیٰ مقصد کے لئے جینے والا ہو نہ کہ محض ذاتی مفاد کے لئے جینے والا۔

تخلیقی گروہ وہ ہے جو اپنی اعلیٰ صفات کی بنا پر اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ مسلسل طور پر ذہنی اور فکری ترقی کرتا رہے۔ وہ اس قابل ہو کہ مسائل کا نیا اور برتر حل دریافت کرلے۔ وہ زندگی کے ہر بند دروازہ کو کھولتا ہوا آخری منزل تک پہنچ جائے۔ کوئی بھی چیز اس کے سفر کو روکنے والی ثابت نہ ہو۔

یہی وہ صفات ہیں جن کو قرآن میں خلق عظیم (القلم۔ ۴) کہا گیا ہے۔ یعنی بلند نظری اور بلند کرداری۔ بلند نظر اور بلند کردار لوگ ہی اس دنیا میں کوئی بڑا کام کرتے ہیں۔ اس دنیا کے لئے فطرت کا قانون یہ ہے کہ چھوٹے کردار کے لوگ چھوٹا کام انجام دیں اور بڑے کردار کے لوگ بڑا کام۔

اہل اسلام کو دین کی صورت میں جو نعمت ملی ہے وہ کسی ایک گروہ کی وراثت نہیں۔ وہ ساری انسانیت کا مشترک سرمایہ ہے۔ دوسرے انسانوں تک اس سرمایہ کو پہنچانا ایک خدائی امانت

ی ادائیگی کا معاملہ ہے۔ اور صرف اسی جذبہ کے تحت اس کو صحیح طور پر انجام دیا جا سکتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم زمانہ کا انسان ہزاروں سال تک کوئی بھی علمی یا تہذیبی یا تمدنی ترقی نہ کر سکا۔ تمام قابل ذکر ترقیاں اسلام کے ظہور کے بعد شروع ہوئیں۔

اس وقت کی دنیا مخلوقات کی پرستش میں پھنسی ہوئی تھی، اہل اسلام نے اس کو مخلوقات کی پرستش سے اوپر اٹھا کر خالق کی پرستش کا راستہ دکھایا۔ لوگ فطرت کے مظاہر کو مقدس مان کر اس کے سامنے صرف اظہار عقیدت کرنا جانتے تھے، اہل اسلام نے اس کے بجائے ان کے اوپر فطرت کی تسخیر کا دروازہ کھولا۔ لوگ دولت اور اقتدار کو معبود کا درجہ دے کر اسی کو اپنا سب کچھ سمجھے ہوئے تھے۔ اہل اسلام نے دولت اور اقتدار کو ضرورت اور خدمت کے خانے میں ڈال کر انسان کو عظمت کا درجہ عطا کیا۔ لوگ اپنے مفروضہ عقائد کی بنا پر طرح طرح کے توہمات (superstitions) میں مبتلا تھے، اہل اسلام نے ان کو مفروضات اور توہمات سے نکال کر حقائق کی سطح پر سوچنے والا بنایا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب "اسلام دور جدید کا خالق")

فکر انسانی میں یہ انقلاب پہلی بار اہل اسلام یا اہل توحید کے ذریعہ وقوع میں آیا۔ اس فکری انقلاب نے انسانیت کے اوپر تعمیر و ترقی کا وہ دروازہ کھول دیا جو ہزاروں سال سے اس کے اوپر بند پڑا ہوا تھا۔

قدیم زمانہ کا انسان مشرکانہ افکار میں جیتا تھا۔ زندگی کا ہر شعبہ شرک کے ماتحت ہو گیا تھا۔ شرک اپنی حقیقت کے اعتبار سے توہم پرستی کا نام ہے۔ اور توہم پرستانہ مزاج، بالفاظ دیگر غیر سائنٹفک مزاج، کے ساتھ کبھی کوئی حقیقی ترقی نہیں ہو سکتی۔ اہل اسلام کی صورت میں دنیا کو پہلی بار ایک ایسا انسانی گروہ ملا جس کا فکر خالص توحید پر مبنی تھا، وہ شرک اور توہم پرستی سے پوری طرح آزاد تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کے ذریعہ دنیا کو پہلی بار حقیقت پسندی کا سبق ملا۔ لوگوں کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ توہمات سے آزاد ہو کر فطری قوانین کی بنیاد پر اپنی زندگی کی تشکیل کریں۔ اسلام

کا یہی وہ خاص عطیہ ہے جس نے انسانیت کی تاریخ کو ترقی کے نئے دور میں داخل کر دیا۔

ہندستان کی جدید تاریخ بھی اہل اسلام کے اسی توحیدی رول کا انتظار کر رہی ہے۔ اس ملک کی ترقی ٹھیک اسی مقام پر رکی ہوئی ہے جہاں بقیہ دنیا کی ترقی ماضی میں رکی ہوئی تھی۔ اس ملک میں ترقی کا نیا عمل عین اسی مقام سے شروع ہوگا جہاں سے وہ بقیہ دنیا میں پچھلے ہزاروں سال کے دوران شروع ہوا تھا۔ ہندستان میں بھی بقیہ دنیا کی تاریخ کا اعادہ ہونا ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسری چیز اس ملک کو حقیقی ترقی کی طرف لے جانے والی نہیں۔

ہندو مسلم اتحاد

ہندستان کی قومی جدو جہد کے دو دور ہیں۔ پہلا دور ۱۹۴۷ سے پہلے کا ہے اور دوسرا دور ۱۹۴۷ کے بعد کا۔ پہلے دور میں سیاسی آزادی کا نشانہ تھا جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو پورا ہوا۔ دوسرے دور میں ملک کی تعمیر نو کا نشانہ تھا جس کو سیاسی آزادی کے بعد انجام پانا تھا۔ عجیب بات ہے کہ پہلے دور کا نشانہ مکمل طور پر پورا ہوا لیکن دوسرے دور کا نشانہ اتنا زیادہ ناکام رہا کہ ۵۰ سال گزرنے کے بعد بھی اس کی منزل دکھائی نہیں دیتی۔

پہلے دور کا نشانہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جدو جہد کے ذریعہ پورا ہوا تھا۔ اسی طرح دوسرے دور کے نشانہ کی تکمیل کے لئے بھی ضروری تھا کہ ہندو اور مسلمان مل کر اس کے لئے جدو جہد کریں۔ اس معاملہ کی اہمیت کو مہاتما گاندھی پوری طرح سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی رات کو تمام لیڈر دہلی میں اکٹھا ہو کر یہ انتظار کر رہے تھے کہ کب گھڑی کی سوئی ۱۲ پر پہنچے کیونکہ ۱۲ بج کر ایک منٹ پر انگریز وائسرائے آل انڈیا ریڈیو پر ہندستان کی آزادی کا اعلان کرنے والا تھا۔ لیکن گاندھی واحد لیڈر تھے جو اس وقت دہلی میں موجود نہ تھے، وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے گاؤں گاؤں کا دورہ کر رہے تھے۔ گاندھی کی نظر مستقبل پر تھی، اور بقیہ لیڈروں کی نظر صرف آج پر۔

مہاتما گاندھی اس فرقہ وارانہ اتحاد کو اتنا زیادہ اہمیت دیتے تھے کہ لوئی فشر کے بیان کے مطابق، انھوں نے اعلان کیا کہ ـــ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو یہ سیکھنا ہوگا کہ وہ کس طرح امن اور میل ملاپ کے ساتھ رہیں۔ ورنہ میں اسی کوشش میں اپنی جان دے دوں گا:

> Hindus and Musalmans should learn to live together in peace and amity otherwise I should die in the attempt(p449)

مہاتما گاندھی کا یہ مشن ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ آزادی کے بعد بہت جلد انھیں گولی مار

کر ہلاک کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو ہوا۔ اس وقت میں اعظم گڑھ میں تھا۔ ہمارے گھ
کے سامنے مسٹر سکلدیپ سنگھ (پرنسپل ڈی اے وی کالج) رہتے تھے۔ اگلی صبح کو وہ ہمارے یہاں
آئے اور کہا کہ آج میں نے بہت سے اخباروں میں مہاتما گاندھی کے قتل کی رپورٹ پڑھی۔ اس
واقعہ کی سب سے بہتر سرخی وہ ہے جو امرت بازار پتریکا (الہ باد) نے لگائی ہے۔ اس کی سرخی یہ
تھی۔ گاندھی مذہبی جنون کے ہاتھوں ہلاک:

Gandhi sacrificed by fanaticism

جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہی واقعہ ہندستانی تاریخ کے دونوں دوروں کے درمیان حد فاصل بن گیا۔

۱۹۴۷ سے پہلے ملکی آزادی کی جدوجہد کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ کوشش نے کامیاب بنایا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں ایک طرف مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو جیسے بہت سے ہندو لیڈر ہیں جو آزادی کی تحریک میں بھرپور طور پر شامل ہیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کی بڑی بڑی شخصیتیں بھی اس تحریک کی اگلی صف میں شریک ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، خان عبد الغفار خاں، وغیرہ۔ آزادی کی پوری جدوجہد میں ہندو مسلمان دونوں اسی طرح مل کر قربانیاں دیتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ جدوجہد اپنی تکمیل تک پہنچ گئی۔

مگر آزادی (۱۹۴۷) کے بعد اچانک ایک بالکل مختلف منظر دکھائی دیتا ہے۔ اب ملک کے سامنے قومی تعمیر کے لئے جدوجہد کرنے کا مسئلہ تھا۔ مگر اس دوسرے مرحلہ میں مسلمان اچانک الگ تھلگ دکھائی دیتے ہیں۔ آزادی کے بعد ملکی تعمیر کے لئے دوبارہ ایک لمبی اور متحدہ کوشش درکار تھی مگر یہ متحدہ کوشش وجود میں نہ آسکی۔ آزادی سے پہلے جو ہندو اور مسلمان باہم مل کر کام کررہے تھے۔ وہ آزادی کے بعد نہ صرف الگ ہوئے بلکہ ان کے درمیان وہ تباہ کن سلسلہ شروع ہو گیا جس کو فرقہ وارانہ فساد کہا جاتا ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ہماری قومی جدوجہد کے دوسرے مرحلہ کا ناکام رہنا سب
ے زیادہ اسی بنا پر ہوا ہے۔ نئے دور کی تعمیری جدوجہد کے لئے دوبارہ متحدہ کوشش درکار تھی۔
نکہ اس دوسرے مرحلہ میں متحدہ کوشش وجود میں نہ آسکی اس لئے قدرتی طور پر وہ ناکام
ی رہی۔

یہ المیہ کیوں پیش آیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے جو
شترک جدوجہد جاری ہوئی اس میں ہندوؤں کی طرف سے زیادہ تر سیکولر لوگ شریک تھے۔ یہ
رد اپنے مزاج کی بنا پر اپنے مذہب یا اپنے مخصوص مذہبی رسوم کو اجتماعی معاملات میں داخل
یں کرتے تھے۔ اس بنا پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی اجنبیت حائل نہیں ہوتی تھی۔
نوں کھلے دل کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتے تھے اور کسی توحش کے بغیر مل کر کام کرتے
ھے۔ یہ ''سیکولر کلچر'' بنیادی طور پر دونوں فرقوں کے درمیان اتحاد کی طاقتور کڑی بنا رہا۔

آزادی کے بعد جب مہاتما گاندھی کو قتل کر دیا گیا تو اس کے بعد ہندوؤں کا وہ طبقہ ابھرنا
روع ہو گیا جو سیکولرزم کے بجائے ہندوتو میں یقین رکھتا تھا۔ یہ لوگ ابتدا میں اتنے محدود تھے کہ
زادی کے بعد جب پہلی پارلیمنٹ بنی تو اس میں ان کے صرف دو ممبر شامل ہو سکے جو جن سنگھ
ے ٹکٹ پر کامیاب ہو کر آئے تھے۔ یہ تعداد دھیرے دھیرے بڑھتی رہی یہاں تک کہ ۱۹۹۸ میں
ہ اس پوزیشن میں ہو گئے کہ نئی دہلی کی مرکزی حکومت پر قبضہ حاصل کرلیں۔ ابتدا میں یہ لوگ
رف محدود دائرہ میں اپنا اثر رکھتے تھے مگر دھیرے دھیرے ان کے اثرات ہندو سماج کے بڑے
بقہ تک پھیل گئے۔

۱۹۴۷ سے پہلے جب ہندو اور مسلمان اجتماعی مواقع پر ملتے تھے تو دونوں سیکولر آداب
کے تحت ملتے تھے۔ اس بنا پر دونوں کے درمیان کوئی کشیدگی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اب دوسرے
در میں یہ ہوا کہ مسلمان اگر کسی اجتماعی پروگرام میں جاتے تو وہاں ان کو ملاقات کے وقت

مصافحہ کرنے کے بجائے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے کا ماحول ملتا تھا۔ پروگرام کا آغاز وندے ماترم کے گیت یا سرسوتی دیوی کی وندنا سے ہوتا تھا۔ اسی طرح پروگرام کے شروع میں ہندو رسم کے مطابق دیا جلا کر اس کا شبھ آرمبھ کیا جاتا تھا یا سنسکرت اشلوک پڑھے جاتے تھے۔ اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں جو نئے دور کے اجتماعی مواقع پر بھارتیہ سنسکرتی کے نام پر شامل کر دی گئیں۔

اس قسم کی تمام چیزیں خواہ دھرم کے نام پر کی جائیں یا سنسکرتی کے نام پر، ہر حال میں وہ مسلمانوں کے لئے صرف دوری کا سبب بن سکتی تھیں، اور واقعہ میں ایسا ہی ہوا۔ اس قسم کے تمام رسوم یا اس طرح کے تمام کلمات قدیم مشرکانہ عقائد پر مبنی ہیں۔ خواہ ان کا کوئی بھی خوبصورت نام دیا جائے مگر ان کے مبنی بر شرک ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمان چونکہ ایک خدا کو مانتے ہیں، اس لئے ان کا موحدانہ مزاج اس قسم کے پروگراموں میں شرکت کے لئے ایک مستقل روک بن گیا۔ ان کے لئے ناممکن ہو گیا کہ وہ ایسے اجتماعی مواقع پر کھلے دل سے شریک ہو سکیں جس میں بھارتیہ سنسکرتی کے نام پر ان مشرکانہ رسوم کو ادا کیا جا رہا ہو۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی سے پہلے قومی جدوجہد کی جو گاڑی اپنے دو پہیوں (ہندو اور مسلمان) کے ذریعہ چل رہی تھی، وہ اب بڑی حد تک صرف ایک پہیہ (ہندو) کے ذریعہ چلنے لگی۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، کوئی گاڑی جس کے دو پہیوں میں سے ایک پہیہ نکال دیا جائے وہ کھڑی تو ہو سکتی ہے مگر اپنے راستہ پر تیز رفتاری کے ساتھ چل نہیں سکتی۔ چنانچہ قانون فطرت کے تحت ہماری قومی تعمیر کی گاڑی بھی چلتے چلتے اچانک ٹھہر گئی۔ قومی تعمیر کا سارا منصوبہ ناکام ہو کر رہ گیا۔

اب بیسویں صدی کے خاتمہ پر آخری طور پر وہ وقت آگیا ہے جب کہ ہندو لیڈر شپ یہ جان لے کہ دونوں فرقوں کی متحدہ کوشش کے بغیر ملک کی حقیقی تعمیر ممکن نہیں۔ ملکی

تعمیر کے معاملہ میں ان حضرات کے سامنے جن دو کے درمیان انتخاب (option) ہے وہ یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ جدوجہد یا مسلمانوں کے بغیر جدوجہد۔ بلکہ ان کے لئے اصل انتخاب دوسری دو صورتوں کے درمیان ہے، اور وہ ہے ۔۔۔ مسلمان کے ساتھ جدوجہد یا سرے سے جدوجہد ہی نہیں۔

اس پیچیدہ مسئلہ کا حل کیا ہے۔ وہ حل یہ ہے کہ برادران وطن کی ہند تو لیڈر شپ بھی اسی طریقہ کو اختیار کرے جس کو اس سے پہلے ان کی سیکولر لیڈر شپ نے اختیار کیا تھا۔ یعنی وہ چیز جس کو وہ بھارتیہ سنسکرتی کہتے ہیں، اس کو مکمل طور پر اجتماعی پروگراموں اور سرگرمیوں سے الگ کر دیا جائے۔ اگر وہ چاہیں تو اپنے ذاتی دائرہ میں اس کو اختیار کر سکتے ہیں مگر اجتماعی دائرہ کے تمام مواقع سے مکمل طور پر اس کو حذف کر دیا جائے۔ یہی واحد تدبیر ہے جس کے ذریعہ دوبارہ اس ہندو مسلم مشترک جدوجہد کو زندہ کیا جا سکتا ہے ۔۔ جس نے پہلے مرحلہ میں ہماری قومی جدوجہد کو کامیاب کیا تھا اور جو دوسرے مرحلہ میں بھی ہماری قومی جدوجہد کی کامیابی کی واحد ضمانت ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی سماج میں اتحاد ہی تمام ترقیوں کا واحد ضامن ہے۔ جب سماج کے تمام طبقات مل کر کام کرتے ہیں اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ ان کے درمیان وہ متحدہ کوشش وجود میں آئے جو کسی بھی بڑے کام کے لئے ضروری ہے۔

یہ فطرت کا قانون ہے، یہ تاریخ کا فیصلہ ہے۔ اور ہم جتنی جلد اس حقیقت کو جان لیں اتنا ہی اچھا ہے۔ اس حقیقت سے بے خبری یا اس کا عدم اعتراف ایک ایسی تباہ کن غلطی ہوگی جس کو ہماری اگلی نسلیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔

اس بات کی وضاحت کے لئے یہاں میں ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔ دہلی میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو ہیں۔ وہ لمبی مدت تک ایک بڑی کمپنی میں بزنس منیجر کے طور پر کام کرتے

رہے۔ اپنے پچیس سالہ تجربہ اور مطالعہ کی بنیاد پر انھوں نے بزنس مینجمینٹ کے موضوع پر ایک کتاب (۳۱۶ صفحات) انگریزی میں لکھی جس کا نام انتظامی افکار (Management Thoughts) تھا۔ میں نے یہ کتاب دیکھی ہے وہ بلا شبہ ایک کامیاب کتاب ہے اور ہر قسم کے لوگوں کے لئے بہترین تجارتی گائڈ ہے، خواہ وہ کسی بھی مذہب یا فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۹۱ میں چھپی۔ مصنف نے اس کو دھلی کی بک فیئر میں رکھا مگر وہاں وہ بہت کم تعداد میں فروخت ہو سکی۔ اتنی کامیاب اور قابل مطالعہ کتاب بک فیئر میں ناکام کیوں رہی، اس کی وجہ صرف ایک تھی۔ وہ یہ کہ انھوں نے ٹائٹل پر کتاب کے نام کے نیچے ہندو دیوتا گنیش کی رنگین تصویر بنائی۔ یہ تصویر ٹائٹل کے تقریباً تین چوتھائی حصہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو شخص بھی ان کے اسٹال پر آتا وہ کتاب کا ٹائٹل دیکھ کر آگے بڑھ جاتا۔ گنیش جی کی تصویر کو دیکھ کر وہ یہ سمجھتا کہ یہ شاید ہندو مائتھالوجی سے متعلق کوئی کتاب ہے۔ اس بنا پر چند مذہبی ہندو ہی اس کتاب سے دلچسپی لے سکے، بقیہ لوگ اس کے ظاہر کو دیکھ کر ہی اس سے بے رغبت ہو گئے اور اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔

اس واقعہ کا علم مذکورہ ہندو کے ایک مسلمان دوست کو ہوا۔ مسلمان نے اس مسئلہ پر غور کیا اور مذکورہ ہندو مصنف کو یہ مشورہ دیا کہ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں کتاب کے اس ٹائٹل (گرد پوش) کو بدل دوں۔ ہندو مصنف نے اجازت دے دی۔ اس کے بعد مذکورہ مسلمان پبلیشر نے صرف یہ کیا کہ اس مجلد کتاب کے لئے ایک نیا گرد پوش چھپوایا۔ اس نئے گرد پوش پر صرف کتاب کا نام (Management Thoughts) جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے حسب قائدہ مصنف کا نام تھا۔ گرد پوش کے بقیہ حصہ پر انھوں نے کچھ تجارتی اقوال لکھ دیئے جو اسی کتاب سے لئے گئے تھے۔ مثال کے طور پر:

Our attitude determines our altitude

اگلے سال یہ کتاب دوبارہ دہلی کی بک فیئر میں رکھی گئی۔ کتاب وہی تھی، صرف اس کا ٹائٹل بدل دیا گیا تھا۔ اس تبدیلی کا نتیجہ نہایت شاندار نکلا۔ لوگ آتے اور کتاب کو ہاتھ میں لے کر اس کو الٹتے پلٹتے اور پھر شوق کے ساتھ اس کو خرید لیتے۔ یہ بک فیئر ایک بین اقوامی نمائش تھی چنانچہ دوسرے ملکوں کے لوگ بھی یہاں آئے ہوئے تھے۔ مصنف نے بتایا کہ اب نہ صرف ہندستانیوں نے اس کتاب کو خریدا بلکہ پاکستان اور عرب اور دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے لوگوں نے بھی نہایت شوق کے ساتھ اس کو حاصل کیا۔ بک فیئر کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی کتاب کا پورا اسٹاک ختم ہو چکا تھا۔

اب مذکورہ ہندو اور مسلمان دونوں نے مزید کتابیں چھاپی ہیں اور وہ مل کر یہ کام کر رہے ہیں۔ ان کا یہ کتابی بزنس پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ وہ نہ صرف ملکی مارکیٹ میں کامیاب ہیں بلکہ وہ بیرونی ملکوں میں بھی اپنی کتابوں کو بڑی تعداد میں اکسپورٹ کر رہے ہیں۔

اس واقعہ پر غور کیجئے تو یہ اہم نکتہ معلوم ہوگا کہ اتحاد کس طرح ترقی کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مصنف کے پاس تجارتی معلومات کا ذخیرہ تھا مگر اپنے مخصوص مذہبی ذہن کی بنا پر وہ ایک محدودیت کا شکار ہوگئے۔ وہ اس راز کو سمجھ نہ سکے کہ وہ اپنے مخصوص ذہن کی بنا پر تو گنیش جی کو خود تو مشکل کشائی کا دیوتا سمجھتے ہیں مگر دوسری قوموں اور دنیا کے بیشتر لوگوں کے نزدیک گنیش جی صرف ایک دیومالائی شخصیت ہیں، نہ کہ کوئی حقیقی شخصیت۔

مذکورہ مسلمان اپنی اسلامی تربیت کی بنا پر اس نفسیاتی پیچیدگی سے خالی تھا۔ اس کے نزدیک مشکل کشائی یا تجارتی کامیابی کا تعلق کسی دیوی یا دیوتا سے نہ تھا۔ اس بنا پر وہ اس پوزیشن میں تھا کہ معاملہ پر کھلے ذہن کے ساتھ سوچے، وہ اس کے بارے میں حقیقت پسندانہ رائے قائم

کر سکے۔ چنانچہ اس نے ہندو مصنف کو ایک ایسا مشورہ دیا جو مکمل طور پر حقیقت پر مبنی تھا۔ اور اس دنیا کے لئے فطرت کا قانون یہ ہے کہ حقیقت پر مبنی منصوبہ کامیاب ہو اور تخیلات پر مبنی منصوبہ ناکام ہو کر رہ جائے۔

ضرورت ہے کہ اس انفرادی مثال کو پورے ملک میں قومی سطح پر دہرا یا جائے۔ یہاں کے ہر پروگرام اور ہر اجتماعی سرگرمی کو سیکولر بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ خواہ تعلیمی ادارے ہوں یا تجارتی ادارے، کوئی جلسہ ہو یا تقریب، کوئی سرکاری معاملہ ہو یا غیر سرکاری معاملہ ہر جگہ سیکولرزم کے اصول کو اختیار کیا جائے۔ ہندتو یا بھارتیہ سنسکرتی کو صرف ذاتی دائرہ میں محدود کر دیا جائے۔ اجتماعی عمل کے مواقع سے اس کو مکمل طور پر دور رکھا جائے۔

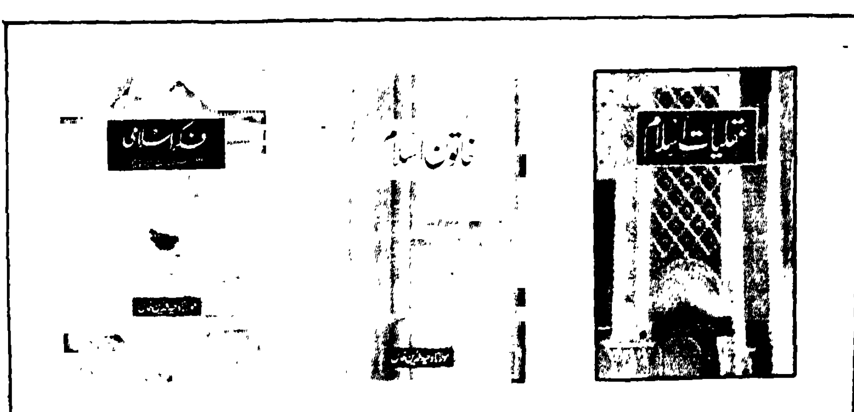
موجودہ دنیا میں جس ملک نے بھی کوئی بڑی ترقی کی ہے، اس نے اسی سیکولر اصول کو اختیار کر کے ترقی کی ہے۔ ہندستان کے لئے بھی کامیابی کا یہی واحد راستہ ہے۔ یہ معاملہ اتنا زیادہ حتمی ہے کہ اگر ہماری موجودہ نسل نے اس کو خوشی کے ساتھ قبول نہ کیا تو ہماری اگلی نسل بغاوت کر کے اس کو اختیار کرے گی۔ جو مذہب یا سنسکرتی ترقی کے عمل میں عقب لشکر (rear-guard) کا کام انجام دے اس کو ماڈرن انسان کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ اس سنگین حقیقت کو جس قدر جلد سمجھ لیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

ہندتو لیڈر شپ نے پہلے بھارتیہ سنسکرتی کو آداب و رسوم کی سطح پر ملکی زندگی میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے دیکھا کہ لوگ ان چیزوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے ہیں حتی کہ خود جدید تعلیم یافتہ ہندو بھی اس قسم کی رسوماتی چیزوں سے بیزار رہے۔ اس کے بعد ہندتو لیڈر شپ نے ایک اور فیصلہ کیا جو پہلے سے بھی زیادہ تباہ کن تھا۔ وہ یہ کہ ——— لوگ اگر بھارتیہ سنسکرتی سے دلچسپی نہیں لے رہے ہیں تو لوگوں کے ذہن کو بدل کر انھیں ایسا بنایا جائے جو ان حضرات کی پسند کے مطابق ہو۔ یعنی جو انھیں کی طرح بھارتیہ سنسکرتی کو پسند کرنے لگے۔

اس مقصد کے لئے انھوں نے ایک طویل ایجنڈا بنایا ہے۔ بزعم خود وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایجنڈا ملک کو ترقی کی طرف لے جانے والا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ وقوع میں آجائے تو وہ ملک کو پیچھے دھکیلنے کے سوا کوئی کارنامہ انجام دینے والا نہیں۔

یہ ہندتوا ایجنڈا اب کھل کر سامنے آچکا ہے۔۔۔وہ ہے ملک کے تعلیمی نظام کو بھارتیہ سنسکرتی کے مطابق تشکیل دینا، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ اس سنسکرتی کا پرچار کرنا، دستور اور قانون کو بھارتیہ سنسکرتی پر ڈھالنا، ملک کی تاریخ کو دوبارہ اپنی مرضی کے مطابق لکھنا، ملک سے ان تمام آثار کو مٹانا جو بھارتیہ سنسکرتی کی یاد نہ دلاتے ہوں، غرض پورے ملک پر اس عمل کو انجام دینا جس کو عام طور پر بھارتیہ کرن کہا جاتا ہے۔

جو صاحبان اس قسم کا خواب دیکھ رہے ہیں انھیں جاننا چاہئے کہ وہ تاریخ کے پہیہ کو الٹا گھمانا چاہتے ہیں۔ وہ فطرت کے قانون سے لڑ رہے ہیں۔ وہ گلوبل نیشنلزم کے زمانہ میں محدود نیشنلزم کا جزیرہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی کسی کوشش کے لئے پیشگی طور پر یہ مقدر ہے کہ وہ سرے سے وقوع ہی میں نہ آئے۔ اس قسم کا منصوبہ بلاشبہ حقائق عالم کے خلاف ہے، اور حقائق عالم کی چٹان سے سر ٹکرا کر کوئی شخص اپنے سر کو توڑ تو سکتا ہے مگر وہ حقائق عالم کے رخ کو بدل نہیں سکتا۔



تباہ کن ذہنیت

پندرہ سال پہلے ہندستانی ٹی وی پر رامائن اور مہا بھارت کے سیریل تفصیل سے دکھائے گئے تھے۔ اس زمانہ میں ایک ہندو تاجر نے مجھ سے کہا کہ یہ سیریل جو دکھائے جارہے ہیں وہ کوئی معمولی چیز نہیں۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ہندستانی سماج میں ایک نیا تہذیبی انقلاب آگیا ہے۔

مگر نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ رامائن اور مہا بھارت کے سیریل ختم ہونے کے بعد ہی عملی طور پر ایک بالکل مختلف منظر سامنے تھا۔ ملک کے قدیم کلچر کی طرف دعوت دینے والی اس رنگین فلم کو بظاہر لوگوں نے دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ مگر اس کے بعد پورے ملک نے نہایت اطمینان کے ساتھ مغرب سے آنے والے جدید کلچر کو اختیار کر لیا۔۔۔ ہندی زبان کے بجائے انگریزی زبان لوگوں کے ذہنوں پر چھا گئی۔ نئی نسل نمستے اور نمسکار کے بجائے ہائے اور ہیلو کہنے لگی۔ جل جیرہ کو چھوڑ کر لوگ کوکا کولا پر ٹوٹ پڑے۔ دور درشن سے زیادہ کیبل ٹی وی دیکھا جانے لگا۔ ہر نوجوان یہ خواب دیکھنے لگا کہ وہ کسی نہ کسی طرح امریکہ اور یورپ کے ملکوں میں پہنچ جائے، مغربی کمپنیوں کے لئے ملک کے دروازے کھول دئے گئے۔ بھارت کی روایتی تہذیب کی اہمیت لوگوں کی نظر میں گھٹ گئی۔ اس کے بجائے وہ جدید مغربی تہذیب کو زیادہ بڑی چیز سمجھنے لگے، وغیرہ وغیرہ۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ خود میرے ساتھ پیش آنے والے ایک واقعہ سے معلوم ہوتی ہے۔ جس زمانہ میں رامائن سیریل دکھائے جارہے تھے میرے ایک پڑوسی ہندو نے مجھے اس کو دیکھنے کی ترغیب دی۔ میں نے کہا کہ میرے پاس ٹی وی نہیں ہے۔ انھوں نے دعوت دی کہ میں ان کے گھر پر آؤں اور کم از کم اس کا ایک سیریل دیکھوں۔

اس کے مطابق میں ایک روز شام کو ان کے گھر پہنچا۔ ٹی وی کھولا گیا اور ہم دونوں اس کے سامنے بیٹھ کر اس دن آنے والا سیریل دیکھنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ اس میں عجیب وغریب

قسم کے خارق عادت مناظر دکھائے جارہے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کو کھڑا کر کے اس کی کمر کے پاس تلوار ماری جاتی ہے۔ تلوار اس کے جسم کو کاٹتی ہوئی دوسری طرف نکل جاتی ہے مگر اس کا جسم دوبارہ جڑ جاتا ہے اور وہ شخص بدستور زندہ کھڑا رہتا ہے۔

میرے ہندو میزبان جو ایک مغربی ملک سے اعلیٰ سائنسی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے انھوں نے ان عجیب وغریب مناظر کی وضاحت کرتے ہوئے کسی قدر معذرت خواہانہ انداز میں کہا: مولانا صاحب، یہ مائتھالوجی ہے۔ یہ کوئی واقعی تاریخ نہیں۔

کسی سماج کی ذہن سازی یا کردار سازی حقیقی کیریکٹر کے ذریعہ ہوتی ہے نہ کہ افسانوی کیریکٹر کے ذریعہ۔ لوگ کسی افسانوی کہانی کو دلچسپی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں یا اسکرین پر دیکھ کر اس سے وقتی طور پر محظوظ ہو سکتے ہیں۔ مگر اس کا یہ اثر نہیں ہو سکتا کہ اس سے ان کی سوچ بدل جائے یا ان کے عمل میں انقلاب آجائے۔ افسانوی کیریکٹر ایک خیالی کیریکٹر ہوتا ہے اور ایک خیالی کیریکٹر کسی کے لئے عملی سبق کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

رامائن اور مہابھارت کے سیریل محض مائتھالوجی پر مبنی تھے۔ اس کے برعکس مغرب سے آنے والا کلچر ایک حقیقی واقعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ لوگوں کے اوپر مائتھالوجی پر مبنی فلمی کہانی کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ حقیقت پر مبنی مغربی کلچر کی طرف ٹوٹ پڑے۔

ہندستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں میں سائنسی مزاج (scientific tempre) نہیں۔ پنڈت نہرو نے اپنے اس قول میں شاید انہیں لوگوں کی طرف اشارہ کیا تھا جو سائنسی دور میں مائتھالوجی کی بنیاد پر ملک کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ پنڈت نہرو نے درست طور پر یہ سمجھا تھا کہ اس قسم کی کوشش ہمارے ملک کو صرف پیچھے کی طرف لے جائے گی وہ آگے کی طرف لے جانے والی نہیں۔ اس قسم کی کوشش گویا ایک خلاف زمانہ حرکت (anachronism) ہے۔ اور خلاف زمانہ حرکت کبھی کسی کو فائدہ نہیں دے سکتی۔ ہمارے ملک میں ایک طبقہ ہے جس کو یہ اصرار ہے کہ تمام اسکولوں میں سرسوتی دیوی کی تصویریں لگائی جائیں

اور سر سوتی کی وندنا کی جائے۔ ان کا خیال ہے کہ سر سوتی کو چونکہ علم کی دیوی مانا جاتا ہے اس لئے ایسا کرنے سے اسکولوں اور کالجوں میں علم کو فروغ حاصل ہو گا۔ مگر یہ سراسر خوش فہمی ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۵۰ سال سے بھی زیادہ مدت سے سر سوتی دیوی کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے مگر ابھی تک ملک میں علمی ذوق یا سائنسی ذہن پیدا نہ ہو سکا۔ کوئی حقیقی ذوق صرف حقیقی کردار کے ذریعہ پیدا ہو سکتا ہے نہ کہ افسانوی کردار کے ذریعہ۔

اسی طرح اس طبقہ کے ہندوؤں نے سوچا کہ اگر اجودھیا میں بابری مسجد کو ڈھا کر وہاں رام مندر بنادیا جائے تو ملک میں ایک انقلاب آجائے گا۔ ملک کی تاریخ صحیح رخ پر سفر کرنے لگے گی۔ مگر یہ بھی محض ایک خوش فہمی ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

اجودھیا میں بابری مسجد کا بننا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ ثابت شدہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ مغل بادشاہ بابر (وفات ۱۵۳۰) کے گورنر میر باقی نے ۱۵۲۸ میں اجودھیا کی یہ مسجد تعمیر کی۔ چونکہ وہ بابر کے زمانہ میں بنی تھی اس لئے وہ بابری مسجد کے نام سے مشہور ہو گئی۔ اس کے مقابلہ میں رام مسلمہ طور پر ایک افسانوی شخصیت ہیں۔ وہ کوئی تاریخی شخص (historical figure) نہیں۔ جب رام خود کوئی تاریخی شخصیت نہیں تو ان کی جنم بھومی بھی یقینی طور پر ایک غیر تاریخی قصہ ہے۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو یہ واقعہ ہوا کہ مذکورہ ذہن رکھنے والے لوگوں نے بابری مسجد کو ڈھا کر وہاں رام مندر کے نام پر ایک مندر بنادیا۔ خالص علمی طور پر دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہو گا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو ہندستان کی تاریخ کا وہ بدقسمت دن تھا جب کہ ایک افسانوی دلیل کے ذریعہ ایک تاریخی حقیقت کو رد کر دیا گیا۔

جن لوگوں نے ایسا کیا وہ اس کو تاریخ کی تصحیح کا نام دیتے ہیں مگر زیادہ درست طور پر وہ تاریخ کا قتل تھا۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بظاہر پتھر کا ایک ڈھانچہ ڈھایا گیا مگر حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو اس دن تاریخی مزاج اور سائنسی ذہن کو ڈھادیا گیا۔ اور کسی ملک کے لئے یقینی طور پر اس سے زیادہ تباہ کن بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کے عوام کے اندر سے تاریخی ذوق کا خاتمہ کر دیا جائے۔

اس معاملہ کا ایک اور پہلو ہے۔ یہ دوسرا پہلو مذکورہ پہلو سے کم اہم نہیں بلکہ اپنے نتائج کے اعتبار سے وہ غالباً مذکورہ پہلو سے بھی زیادہ سنگین ہے۔

ہندستان کا دستور مکمل طور پر ایک سیکولر دستور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کی نیشنل لائف کو مذہب سے الگ رکھا جائے گا۔ نیشنل سرگرمیوں کو سیکولر بنیادوں پر قائم کیا جائے گا۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو مذہب کے معاملہ میں ہر شخص یا گروہ کو آزادی ہوگی کہ وہ اپنے نجی دائرہ میں جس مذہب پر چاہے عمل کرے۔ ملک کے ابتدائی معماروں کا یہ فیصلہ نہایت درست تھا کہ ملک کے اجتماعی نظام کو سیکولر بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ موجودہ حالات میں ہندستان کے لئے سیکولر نظام سے بہتر کوئی نظام نہیں ہو سکتا۔

مگر یہ دستور ہند کی اسپرٹ کے سراسر خلاف ہوگا کہ اقلیتوں کے مذہب کو تو ملک کی اجتماعی زندگی سے خارج کر دیا جائے لیکن اکثریتی فرقہ کے مذہب کو کسی ایک یا دوسرے نام پر اجتماعی زندگی میں شامل رکھا جائے۔ اس قسم کی دہری روش ملک میں منافقانہ فضا پیدا کرے گی اور قانون کے احترام کا مزاج یکسر ختم کر دے گی۔ قومی زندگی کو صالح بنیاد پر قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دستور اور قانون میں جو طے کیا جائے اس پر جیسا ہے ویسا (as it is) عمل کیا جائے۔

ایک طرف سیکولرزم اور مساویانہ حقوق کا نام لینا اور دوسری طرف کسی ایک فرقہ کے مذہب کو نیا نام دے کر اس کو دوسرے فرقوں پر مسلط کرنا دو عملی کی روش ہے اور اس قسم کی روش پورے ملک میں لاقانونیت (lawlessness) کی ذہنیت پیدا کر دے گی۔ ایسے حالات میں یہ ناممکن ہو جائے گا کہ ملک میں کوئی تعمیری معاشرہ قائم کیا جا سکے۔

ملک کے تمام سنجیدہ لوگ یہ مانتے ہیں کہ اس وقت ہماری سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ یہاں اقدار پر مبنی سماج (value based society) قائم ہو۔ اس قسم کے سماج کو بنانے کی پہلی شرط یہ ہے کہ ملک کے بااختیار لوگوں میں امانت داری (honesty) پائی جاتی ہو۔ دستور میں لفظی طور پر ایک بات لکھنا اور عملی زندگی میں بلا اعلان کسی اور بات کو رائج کرنا ایک کھلی ہوئی بددیانتی (dishonesty) ہے۔ جس سماج کے بااختیار طبقے میں بددیانتی کا مزاج ہو وہاں کبھی بھی اقدار پر مبنی سماج قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اور جو سماج اخلاقی اقدار (moral values) سے خالی ہو وہ یقینی طور پر ہر دوسری بھلائی سے بھی خالی ہوگا۔

سفر بے منزل

یکم جنوری ۲۰۰۰ کو دنیا کے تمام ملک اکیسویں صدی میں داخل ہو جائیں گے۔ تاہم یہ داخلہ ہر ملک کے لئے یکساں نہ ہوگا۔ کچھ ملکوں کے لئے اکیسویں صدی میں داخلہ ترقیاتی دور میں داخلہ کے ہم معنی ہوگا۔ اور کچھ ملک وہ ہوں گے جن کے لئے یہ داخلہ صرف کیلنڈر بدلنے کے ہم معنی ہوگا۔ کاغذی اعتبار سے وہ اپنے یہاں اکیسویں صدی کی گنتی لکھیں گے مگر حقیقت کے اعتبار سے ابھی وہ صرف بیسویں صدی میں ہوں گے یا اس سے بھی پیچھے۔

بدقسمتی سے ہندستان ان ملکوں میں شامل ہوگا جو صرف کیلنڈر کے معنوں میں اکیسویں صدی میں داخل ہوں گے۔ ترقیاتی معیار کے اعتبار سے وہ اکیسویں صدی کے معیار سے بہت پیچھے ہوں گے۔ ۵۰ سال پہلے ہندستان میں جو بڑے بڑے لیڈر ابھرے انھوں نے کہا تھا کہ ہماری جدوجہد کا نشانہ ہر ہندستانی کی آنکھ کے آنسو پوچھنا ہے۔ مگر پر شور ہنگاموں کے باوجود آج ہم دیکھتے ہیں کہ نتیجہ بالکل برعکس نکلا، رونے والی آنکھوں میں اتنا زیادہ اضافہ ہو گیا ہے کہ اب ایسی آنکھ کو ڈھونڈنا مشکل ہے جو رونے سے بچی ہوئی ہو۔

اس بھیانک ناکامی کا راز کیا ہے۔ اس کا راز ایک لفظ میں صحیح سمت میں سفر نہ کرنا ہے۔ پچھلے طویل دور میں ہمارے لیڈر تعمیر وترقی کے نام پر پُر شور ہنگامے کرتے رہے۔ مگر شاید وہ حرکت (motion) اور سمت (direction) کا فرق نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے خوبصورت ناموں سے کچھ سرگرمیاں جاری کرکے یہ سمجھ لیا کہ وہ اپنی منزل مقصود کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ حالانکہ منزل کی طرف سفر صرف وہ ہے جو منزل کی سمت میں ہو۔ صحیح رخ کے بغیر حرکت وقت اور طاقت کا ضائع کرنا ہے نہ کہ منزل کی طرف سفر کرنا۔

اب آخری وقت آگیا ہے کہ عمل کی صحیح سمت کا تعین کرکے صحیح رخ پر اپنی کوششوں کو

جاری کیا جائے۔ اس کے بغیر کوئی کوشش نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔

ہندستان کا سفر

ایک مسافر دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر ہے۔ اس کو کلکتہ جانا ہے۔ وہ پلیٹ فارم پر ایک گاڑی دیکھتا ہے اور وہ بلا تحقیق اس پر بیٹھ جاتا ہے۔ ٹرین روانہ ہوتی ہے۔ مسافر خوش ہے کہ وہ اپنی منزل کی طرف جا رہا ہے۔ مگر جب ٹرین اپنے آخری اسٹیشن پر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ امرتسر کی طرف جانے والی ٹرین تھی نہ کہ کلکتہ کی طرف جانے والی ٹرین۔ اب مسافر پھر یہی کرتا ہے کہ وہ ضروری تحقیق کے بغیر ایک اور ٹرین پر بیٹھ جاتا ہے۔ مگر دوبارہ یہی ہوتا ہے کہ وہ ایک اور غیر مطلوب منزل پر پہنچ جاتا ہے کیوں کہ یہ ٹرین بمبئی کی طرف جا رہی تھی نہ کہ کلکتہ کی طرف۔

اس قسم کا سفر بظاہر سفر دکھائی دیتا ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ سفر بے منزل ہوتا ہے۔ جو مسافر اس طرح سفر کرے وہ کبھی اپنی منزل پر نہیں پہنچے گا، خواہ وہ اپنی ساری عمر ٹرینوں میں گزارتا رہے۔

بد قسمتی سے ہندستان میں یہی صورت پیش آئی ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہندستان آزاد ہوا۔ اب ہم اس پوزیشن میں ہو گئے کہ ہم خود اپنے فیصلہ کے تحت ہندستان کی اعلیٰ تعمیر کر سکیں۔ مگر بد قسمتی سے ہمارے لیڈر قوم کو غلط ٹرینوں پر بٹھاتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچاس سال سے زیادہ مدت تک سفر کرنے کے باوجود ہندستان اپنی مطلوب منزل تک نہ پہنچ سکا۔

آزادی کے بعد ہمارے لیڈروں نے قوم کو جس ٹرین پر بٹھایا اس کو ایک لفظ میں سوشلسٹ اکسپریس کہا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے ملک کے پورے اقتصادی اور سماجی ڈھانچہ کو بدل دیا گیا۔ ملک کی تمام سرگرمیاں حکومتی عہدہ داروں کے کنٹرول میں دے دی گئیں۔

انگریزوں نے اپنی دو سو سالہ حکومت کے درمیان صرف پانچ سو قانون بنائے تھے۔ مگر

ملکی حکمرانوں نے چالیس سال کے اندر پانچ ہزار سے زیادہ قانون بناڈالے۔ اس کے نتیجہ میں ملک میں وہ چیز قائم ہو گئی جس کو راج گوپال آچاری نے لائسنس پرمٹ راج کہا تھا۔

اس نئے نظام کے تحت ہماری آزادی ایک نئی اور شدید تر پابندی میں تبدیل ہو گئی۔ کسی کو ایک کارخانہ لگانا ہے تو ضروری ہو گیا کہ وہ پچاس سرکاری کھڑکیوں پر کھڑا ہو اور کلیرنس کے لئے برسوں اس دفتر سے اس دفتر تک دوڑتا رہے۔ نام نہاد لیبر قوانین کا نتیجہ یہ ہوا کہ، جے آر ڈی ٹاٹا کے الفاظ میں، ایک صنعت کار اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے مگر وہ اپنے ایک ورکر کو نکال نہیں سکتا۔

اس نام نہاد سوشلسٹ نظام کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی اقتصادی سرگرمیوں سے کامپٹیشن ختم ہو گیا۔ ملک کے بازار غیر معیاری سامانوں سے بھر گئے۔ سرکاری اہل کاروں کے بڑھے ہوئے اختیارات کی بنا پر کرپشن اتنا بڑھا کہ کوئی بھی چھوٹا یا بڑا کام رشوت کے بغیر انجام پانا ناممکن ہو گیا۔ نام نہاد نیشنلائزیشن کے نتیجہ میں سرکاری ملازموں کی ایک عظیم فوج تیار ہو گئی جس کو یہ یقین تھا کہ وہ کام کرے یا نہ کرے مہینہ کے آخر میں بہر حال اس کو تنخواہ مل جائے گی۔ اس مصنوعی نظام نے، ایک سینئر صحافی کے الفاظ میں، پوری ہندستانی قوم کو کاہل (lethargic) بنادیا، وغیرہ وغیرہ۔

آزادی کے بعد ہمارے لیڈروں نے قوم کو سوشلسٹ اکسپریس پر سوار کیا تھا۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ملک تیزی سے اعلیٰ ترقی کی طرف جارہا ہے۔ مگر چالیس سال کے بعد جب اس سفر کی منزل آئی تو یہ حالت ہوئی کہ ملک انگریزی دور سے بھی زیادہ برے حال میں مبتلا ہو چکا تھا۔ ہندستان اپنی آبادی اور اپنے رقبہ کے اعتبار سے دنیا کا تیسرا ملک ہے۔ مگر ترقی کے جدید معیار کے مطابق آج وہ دنیا کا ۱۳۸واں ملک شمار کیا جاتا ہے۔ جب کہ اسی مدت میں سنگاپور اور جنوبی کوریا جیسے چھوٹے چھوٹے ملک ہم سے بہت زیادہ آگے جاچکے ہیں۔

سوشلسٹ اکسپریس پر سفر کرنے کے بعد ہمارے لیڈروں کو محسوس ہوا کہ وہ غلط ٹرین پر بیٹھ گئے تھے۔ اب ملک میں ایک نئی لیڈر شپ زور پکڑنے لگی ہے۔ عرف عام کے مطابق اس نئی لیڈر شپ کو ہندتو لیڈر شپ کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے زور وشور کے ساتھ یہ کہنا شروع کیا کہ

آزادی کے بعد جن لیڈروں کے ہاتھ میں ملک کی قسمت آئی انھوں نے قوم کو غلط ٹرین پر بٹھادیا ۔ ہم کو ووٹ دو تا کہ ہم صحیح ٹرین کے ذریعہ تمہارے ترقیاتی سفر کو جاری کر سکیں۔ ان کے رتھ اندولن سے بہت سے لوگ متاثر ہو گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۸ کے آغاز میں انھیں یہ موقع ملا کہ وہ ملک کی سیاسی قیادت پر قبضہ کر لیں۔

ان نئے لیڈروں نے ہندستان کو جس نئی ٹرین پر سوار کیا اس کو ایک لفظ میں ہندتو اکسپریس کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے بڑے بڑے دعوؤں کے ساتھ قوم کو ہندتو اکسپریس پر بٹھایا اور اس کو فل اسپیڈ کے ساتھ چلادیا۔ مگر صرف ایک سال کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ ہندتو اکسپریس کا سفر اس سے بھی زیادہ تباہ کن ہے جتنا کہ سوشلسٹ اکسپرس کا سفر ثابت ہوا تھا۔ سوشلسٹ اکسپریس کے سفر نے ملک کو اقتصادی اعتبار سے تباہ کیا تھا۔ ہندتو اکسپریس کے سفر میں مزید نقصان یہ ہوا کہ اعلیٰ انسانی قدریں (human values) بھی تباہ ہو کر رہ گئیں۔

یہ ہندتو لیڈر شپ راہ رو پشت بہ منزل کی ایک مثال ہے۔ وہ آگے کی طرف سفر کے نام پر قوم کو پیچھے کی طرف دوڑانا چاہتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اقبال احمد سہیل مرحوم نے کہا تھا:

آگے ہے قدم پیچھے ہے نظر جانا ہے کہاں جاتے ہیں کدھر
مبہم ہے یہاں خود سمت سفر نیر نگ زمانہ کیا کہیے

ہندتو لیڈر شپ کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ وہ اس کمزوری کی شکار ہے جس کو انگریزی میں کنڈیشنڈ تھنکنگ کہا جاتا ہے، یعنی لگے بندھے ذہن کے تحت سوچنا۔ تقریباً سو سال پہلے شری گرو گول والکر اور ڈاکٹر ہیڈ گواڑ جیسے ماضی پرست لوگوں نے اپنے محدود ذہن کے تحت انھیں جو سبق دیا تھا وہی ان کو معلوم ہے۔ ان کی سوچ بس اسی کے دائرہ میں چلتی ہے۔ ایسے لوگ صرف یہی کر سکتے ہیں کہ ترقی کے نام پر وہ ملک کو پیچھے دھکیل دیں۔ بدقسمتی سے انھوں نے اپنے محدود اقتدار کے زمانہ میں یہی کارنامہ انجام دیا ہے۔

نام نہاد ہند توایجنڈا کیا ہے، وہ ملک کو ماضی کے اندھیرے میں دھکیلنے کا دوسرا نام ہے۔ وہ مفروضات یا توہمات کے ذریعہ ملک کے ان مسائل کو حل کرنا ہے جن کے لئے سائنٹفک سوچ اور حقیقت پسندانہ جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر یہ ہند تو لیڈر شپ عجیب وغریب طور پر یہ سمجھتی ہے کہ اسکول کے بچے اگر وندے ماترم جیسے گیت روزانہ صبح کو گائیں یا ریڈیو اور ٹی وی پر ایک پیشہ ور گلوکار اس کو گا کر سنائے تو ملک میں نیشنل اسپرٹ پیدا ہو جائے گی۔ حالانکہ یہ تصور خوش فہمی کی حد تک بے بنیاد ہے ۔ صرف یہ حقیقت اس مفروضہ کی تردید کے لئے کافی ہے کہ پچھلی نصف صدی سے یہ گانے اتنی زیادہ بار گائے گئے ہیں کہ شاید ملک کا کوئی بھی شخص نہیں جس کے کانوں تک یہ آواز نہ پہنچی ہو۔ اس کے باوجود نیشنل اسپرٹ کے اعتبار سے ہماری قوم دیوالیہ پن کی حد تک خالی ہو چکی ہے۔ وندے ماترم گانے والوں سے لے کر اس گیت کو سننے والوں تک تقریباً ہر ایک کی آج یہ حالت ہے کہ ذاتی مفاد اور ملک کے مفاد میں ٹکراؤ ہو تو وہ بلا تکلف ذاتی مفاد کی خاطر ملک کے مفاد کو نظر انداز کر دے گا۔ دیش بھکتی کے ان گیتوں نے عملاً قوم کو صرف خویش بھکت بنایا ہے۔ نہ کہ دیش بھکت۔

حقیقت یہ ہے کہ گیتوں اور بھاشڑوں کے ذریعہ کبھی کسی قوم میں دیش بھکتی یا نیشنل اسپرٹ پیدا نہیں ہوتی۔ اس معاملہ میں عربی کا یہ مثل صادق آتا ہے کہ: **الناس علی دین ملوکهم**۔ یعنی لیڈر لوگ جو روش اپناتے ہیں اسی روش کو عوام بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ ہمارے تقریباً تمام لیڈر کرپشن کلچر کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ ناممکن ہے کہ عوام محض گیتوں کی بنیاد پر اس کے علاوہ کسی اور کلچر کو اپنائیں۔ اس معاملہ میں سب سے پہلے خود مسٹر لیڈر کو حقیقی معنوں میں مسٹر کلین بننا پڑے گا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ملک میں صحت مند روایات قائم ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ صاف ستھرا ایڈمنسٹریشن ہی صاف ستھرا سماج بناتا ہے۔ جو لیڈر خود بھرشٹاچار میں ڈوبے ہوئے ہوں وہ بھرشٹاچار سے آزاد سماج کبھی نہیں بنا سکتے۔

اسی طرح ہند تو لیڈر شپ کے ایجنڈے میں اور جو چیزیں ہیں، وہ بھی ملکی تعمیر کے اصل

مسئلہ سے غیر متعلق ہیں، انگریزی کی جگہ ہندی اور سنسکرت لانا، مسجد توڑنا اور مندر بنانا، دستور کی سیکولر دفعات کو ختم کرنا، علیحدہ پرسنل لا کی جگہ یکساں سول کوڈ نافذ کرنا، ہندستانیوں کے لئے انڈین کے بجائے ہندو کا لفظ رائج کرنا، وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی تمام باتیں صرف کٹرپن کی علامتیں ہیں۔ ان کا کوئی بھی تعلق ملک کے وسیع تر قومی مفاد سے نہیں۔

ہندتو ایجنڈا کے علم بردار ایک بے حد اہم حقیقت سے ناواقف ہیں، وہ یہ کہ ہندتو ایجنڈے کے راستہ کی رکاوٹ ملک کا کوئی فرقہ یا گروہ نہیں ہے۔ بلکہ اس ایجنڈے کا اصل مخالف وقت کا عالمی سیلاب ہے۔ آج پوری کی پوری دنیا ہندتو سے مختلف ایک اور سماج کی طرف جارہی ہے۔ اس نئے عالمی سماج میں ہندتو کا کوئی مقام نہیں۔ حتی کہ اگر نئے عالمی افکار کے نئے سیلاب کو نظر انداز کر کے اپنے ملک میں ایک علیحدہ جزیرہ بنانا چاہیں تو گلوبل ولیج کے اس دور میں وہ کبھی بننے والا نہیں۔ ایسی کوئی کوشش ایک چلتے ہوئے ہاتھی کی دم میں پتنگ باندھنے کے ہم معنی ہے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ایسی پتنگ کبھی ہاتھی کی دم میں نہیں بندھتی بلکہ وہ ہوا میں اڑ کر رہ جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ سوشلسٹ اکسپریس یا ہندتو اکسپریس دونوں میں سے کوئی بھی ملک کو اس کی منزل پر پہنچانے والی نہیں۔ ہم کو ہماری منزل مقصود تک جو ٹرین پہنچائے گی وہ صرف تعمیر اکسپریس ہے نہ کہ کوئی اور اکسپریس۔

تعمیر اکسپریس سے میری مراد یہ ہے کہ ملک میں تعلیم کو عام کیا جائے۔ فرقہ وارانہ نفرت کی باتیں ختم کی جائیں۔ سیاست میں ووٹ بینک بنانے کی پالیسی کو ترک کیا جائے۔ سرکاری دفتروں سے بھرشٹاچار کا خاتمہ ہو۔ حکومت اپنی پوری طاقت کو استعمال کر کے ملک میں بہترین انفراسٹرکچر وجود میں لائے۔ مذہب کو سیاست سے الگ رکھ کر لوگوں کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے دائرہ میں جس مذہب کو چاہیں اختیار کریں، اور قومی پالیسی کو تمام تر سیکولرزم یا عمومی مفاد کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔ دنیا کے جس ملک نے بھی ترقی کی ہے، اس نے اسی تعمیری منصوبہ کو اختیار کر کے ترقی کی ہے۔ ہندستان کو ایک ترقی یافتہ ملک بنانے کے لئے بھی اس کے سوا کوئی اور دوسرا طریقہ نہیں۔

تعمیرِ ہند

ہندستان اپنے رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے دنیا کے ملکوں میں تیسرا سب سے بڑا ملک ہے۔ لیکن ترقی کے جدید معیار کے اعتبار سے وہ دنیا کے ملکوں میں ۱۳۸ویں نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔ شہری سہولتوں کے اعتبار سے وہ دبئی اور سنگاپور جیسے انتہائی چھوٹے ملکوں سے بھی بہت پیچھے ہے۔ ہندستان کا یہ حال اس وقت ہے جب کہ اس کی آزادی پر ۵۰ سال سے بھی زیادہ مدت گزر چکی ہے۔

اس صورت حال کے بے شمار نقصانات ہیں۔ انھیں میں سے ایک بہت بڑا نقصان یہ ہے کہ ملک کے بہترین دماغ بڑی تعداد میں باہر چلے جارہے ہیں۔ ہر نوجوان یہ چاہنے لگا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح باہر کے ترقی یافتہ ملکوں میں پہنچ جائے کیوں کہ ہندستان میں رہ کر وہ ان ترقیاتی سہولتوں کو حاصل نہیں کرپاتا جو دور جدید کے ایک ترقی یافتہ ملک کے شہریوں کو حاصل ہیں۔

ترقی کی دوڑ میں ہندستان اس قدر پیچھے کیوں ہے۔ غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہندستان میں ابھی تک وہ چیز نہ آسکی جس کو جواہر لال نہرو نے نیشنل انٹگریشن کا نام دیا تھا۔ یعنی ملک کے مختلف گروہوں کے درمیان وہ اتحاد جو اس بات کو ممکن بناتا ہے کہ مختلف گروہ یکجہتی کے ساتھ مل کر کام کریں۔

ہندستان کے مختلف گروہوں میں سے دو گروہ سب سے بڑے ہیں۔ ہندو اور مسلمان۔ انھیں دونوں گروہوں کے اتحاد پر ملک کے مجموعی اتحاد کا انحصار ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد ہو تو گویا کہ سارا ملک متحد ہو گیا۔ اور اگر ان دو بڑے گروہوں میں اتحاد نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک اختلاف و انتشار کا شکار رہے گا اور جو ملک اس طرح داخلی بے اتحادی کا شکار رہے وہ کبھی ترقی کے اعلیٰ درجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی اس اہمیت کو مہاتما گاندھی نے نہایت گہرائی کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ میں جب ملک آزاد ہوا تو انھوں نے اس کو اپنی زندگی کا واحد مشن بنالیا کہ ملک کے دونوں فرقے مل جل کر رہنے لگیں۔ اس وقت انھوں نے اپنے تاریخی الفاظ میں کہا تھا کہ اس ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو امن کے ساتھ اور مل جل کر رہنا ہوگا ورنہ میں اس کوشش میں اپنی جان دے دوں گا۔

Hindus and Musalmans should learn to live together in peace and amity. Otherwise, I should die in the attempt. (P 449)

ہندستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے اسی خاص مقصد کے لئے نیشنل انٹگریشن کونسل بنائی۔ اس کے بعد اس مقصد کے لئے بے شمار کوششیں کی جاتی رہیں جن کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ مگر ۵۰ سال سے بھی زیادہ مدت گزرنے کے باوجود اس مقصد میں ابھی تک شاید ایک فی صد بھی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ہندو مسلم تعلقات کا معاملہ بدستور ایک بعید خواب بنا ہوا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ملک کی مطلوب ترقی بھی۔

کیا وجہ ہے کہ اتنا زیادہ ضروری مقصد لمبی کوشش کے باوجود ابھی تک حاصل نہ کیا جاسکا۔ اس کی وجہ میرے نزدیک صرف ایک ہے، اور وہ ہے ایک ممکن چیز کو ناممکن طریقہ سے حاصل کرنے کی کوشش۔ ہوا سے آکسیجن کا حصول ہر آدمی کے لئے پوری طرح ممکن ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص آکسیجن کو اپنی ناک کے بجائے کان کے ذریعہ لینا چاہے تو یہ انتہائی ممکن چیز بھی اس کے لئے ناممکن ہو جائے گی۔

کوئی سماج، خواہ وہ ایک کلچر کا سماج ہو یا کئی کلچر کا سماج، اس میں ہمیشہ کچھ چیزیں لوگوں کے درمیان مشترک ہوتی ہیں۔ اور کچھ غیر مشترک۔ یہ فطرت کا ایک لازمی تقاضہ ہے۔ سماجی اتحاد در اصل انھیں دونوں تقاضوں کے درمیان ہم آہنگی کا فارمولا تلاش کرنے کا نام ہے۔ اسی فارمولا کے حصول یا عدم حصول پر اس معاملہ کا انحصار ہے۔

۱۹۴۷ سے لے کر اب تک اس رخ پر کی جانے والی کوششوں کی ناکامی کا اصل سبب یہی ہے کہ حقیقی اتحاد کا کوئی فارمولا ابھی تک دریافت نہ کیا جاسکا۔ اور جو فارمولا دریافت کیا گیا وہ سرے سے قابل عمل ہی نہ تھا۔

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا فارمولا وہ ہے جس کی پشت پر مہاتما گاندھی، ڈاکٹر بھگوان داس، ونوبا بھاوے جیسے بڑے بڑے لوگوں کے نام ہیں۔ اس فارمولے کو مختصر الفاظ میں مہاتما گاندھی نے اس طرح بیان کیا تھا ـــــ رام رحیم ایک ہے۔ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ مذہبوں کا الگ الگ ہونا یہی علیحدگی کا ذہن پیدا کرتا ہے۔ اس لئے اگر تمام مذہبوں کو ایک ثابت کر دیا جائے تو یہ اختلاف اپنے آپ مٹ جائے گا۔ اور لوگوں کے اندر وہ جذباتی ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی جو مطلوب ہے۔

مگر یہ نظریہ اصل مسئلہ کا معصومانہ حد تک کمتر اندازہ تھا۔ ان حضرات نے یہ کیا کہ مختلف مذاہب کی چند منتخب تعلیمات کو لے کر یہ سمجھ لیا کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔ مگر مطالعہ کا یہ طریقہ یقینی طور پر غیر سائنٹفک ہے۔ کسی مذہب کے بارے میں کوئی رائے اس کی مجموعی تعلیمات کی روشنی میں قائم کی جائے گی نہ کہ صرف منتخب تعلیمات کی روشنی میں۔ اور جب مجموعی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوازم اور اسلام میں کھلا ہوا اختلاف موجود ہے۔

مثلاً ہندو مذہب میں حقیقت اعلیٰ کے بارے میں وحدت وجود (monism) کا تصور ہے اور اسلام میں توحید (monotheism) کا۔ ہندوازم میں خدا کی تجسیم یا اوتار کا تصور ہے اور اسلام میں خدا کے فرستادہ پیغمبر کا تصور۔ ہندو مذہب میں انسانی زندگی کے بارے میں آواگمن کا تصور ہے اور اسلام میں پہلی ہی موت کے بعد جزا و سزا کا تصور، وغیرہ۔

اعتقادیات کا یہ فرق اتنا زیادہ بنیادی ہے کہ اگر مذکورہ فارمولے کو اتحاد کا وسیلہ سمجھا جائے تو مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان کبھی بھی اتحاد ممکن نہ ہوگا۔ مہاتما گاندھی

اور ان کے جیسے دوسرے لوگوں نے اتحاد کا جو فارمولا وضع کیا اس کو ایک لفظ میں باہمی اعتراف (mutual recognition) کا فارمولا کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ فارمولا حقیقت پر مبنی نہیں، اس لئے وہ قابل عمل بھی نہیں۔

مذہب ایک مقدس عقیدہ کا نام ہے، مذہب میں ترمیم ممکن نہیں ہوتی اس لئے ہمیں مذہب کو جیسا ہے ویسا (as it is) ہی ماننا ہوگا، ہمیں سماجی اتحاد کا ایک ایسا فارمولا دریافت کرنا ہوگا جو مذہبی تبدیلی کے بغیر قابل عمل اور قابل اختیار ہو۔

خوش قسمتی سے یہ قابل عمل فارمولا پیشگی طور پر ہمارے یہاں موجود ہے۔ اس دوسرے فارمولے کو مختصر طور پر باہمی احترام (mutual respect) کا فارمولا کہا جا سکتا ہے۔ جن ترقی یافتہ ملکوں (مثلاً امریکہ اور کناڈا) کے سماج میں اختلافات کے باوجود مذہبی جھگڑے نہیں ہیں وہاں اسی دوسرے فارمولے کو اختیار کر کے ان جھگڑوں کو ختم کیا گیا ہے۔ ان ملکوں میں بھی مختلف مذاہب کے لوگ موجود ہیں۔ مگر وہاں انھوں نے غیر ضروری طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ میرا اور تمہارا مذہب ایک ہے۔ اس کے بجائے انھوں نے انگریزی مثل کے مطابق، اس اصول کو استعمال کیا کہ آؤ، ہم اس پر اتفاق کر لیں کہ ہمارے درمیان اختلاف ہے:

Let us agree to disagree

یہ فارمولا کوئی انوکھا فارمولا نہیں۔ یہ فطرت کے اٹل اصول پر مبنی ہے۔ وسیع تر مطالعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا کے ہر شعبہ میں تعدد کا اصول ہے نہ کہ توحد کا۔ اسی حقیقت کا اعتراف شری گرو گولوالکر نے اپنے ایک انٹرویو میں ان الفاظ میں کیا تھا کہ فطرت یکسانیت سے نفرت کرتی ہے (nature abhors uniformity) سوامی وویکانند نے بھی اس حقیقت کا اعتراف اس طرح کیا کہ انھوں نے کہا کہ مذہبوں کے اختلاف کو مٹانا ممکن نہیں اس لئے تم کو ایسا کرنا چاہئے کہ ـــــ ایک کی پیروی کرو اور کسی سے نفرت نہ کرو (follow one,and hate none)

اسی فطری اصول کو اہل مغرب نے اختیار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے درمیان فوراً
ں سماجی اتحاد قائم ہو گیا۔ اور وہ ترقی کی طرف تیزی سے سفر کرنے لگے۔ اگر وہ لوگوں کو یہ یقین
انے کی کوشش کرتے کہ میرا اور تمہارا مذہب ایک ہے تو اس کے بعد ان کے یہاں جو چیز آتی
باہمی اتحاد نہ ہوتا بلکہ باہمی جھگڑا ہوتا۔ اور پھر وہ بھی اسی طرح ایک پس ماندہ ملک بنے رہتے
یسا کہ ہمارا ملک ہندستان ہے۔

اختلاف فطرت کا ایک اٹل اصول ہے۔ اختلافات کو ختم کرنا کسی کے لئے بھی ممکن
یں۔ اس لئے سماجی اتحاد کا قابل عمل فارمولا صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے ــــ اختلاف کے
جود اتحاد۔ جو لوگ اختلاف کو مٹا کر اتحاد قائم کرنا چاہتے ہیں وہ حقیقت سے لڑ رہے ہیں۔ اور
یقت سے لڑ کر جیتنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔

۲۔ اس سلسلہ میں دوسرا فارمولا وہ ہے جو گرو گولوالکر اور ان کے ہم خیال لوگوں نے پیش
ا۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان میں مختلف گروہوں کے درمیان اتحاد صرف اس وقت پیدا ہو سکتا
ہے جب کہ ان کے اندر سچی حب الوطنی (patriotism) پیدا کی جائے۔ بجائے خود یہ بات درست
ہے کہ حب الوطنی کا جذبہ کسی ملک کے باشندوں کے لئے اتحاد کا نہایت طاقتور ذریعہ ہے۔ لیکن
ب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے جو فارمولا گرو گولوالکر اور ان کے جیسے لوگوں نے پیش کیا
دوبارہ ایک ناقابل عمل فارمولا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نصف صدی سے زیادہ مدت تک اس کی
ظی دھوم مچانے کے باوجود عملاً وہ کسی بھی درجہ میں کامیاب نہ ہو سکا۔

گرو گولوالکر اور ان کے ہم خیال لوگوں کا کہنا ہے کہ سچا محبّ وطن صرف وہ ہو سکتا ہے
ملک (بھارت) کو مقدس سمجھے۔ ان کے نزدیک ہندو اس ملک کو مقدس سمجھتے ہیں اس لئے وہی
سچے محبّ وطن ہیں۔ مسلمان اپنے عقیدۂ توحید کی بنا پر کسی ملک کو مقدس نہیں سمجھتے اس لئے وہ
سچے محبّ وطن نہیں بن سکتے۔ اس مسئلہ کا حل انھوں نے یہ بتایا کہ مسلمانوں کو بھی اسی معنی میں
بّ وطن بنایا جائے جس معنی میں ہندو محبّ وطن ہیں۔ اس کے بغیر ملک میں حب الوطنی کی صحیح

فضا پیدا نہیں ہو سکتی۔

یہ نظریہ سراسر بے بنیاد ہے۔ وہ ایک خود ساختہ مفروضہ پر قائم ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ اپنی ماں سے محبت صرف ہندو کر سکتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی ماں کو ایک مقدس دیوی کے روپ میں دیکھتا ہے۔ مسلمان چونکہ اپنی ماں کو مقدس دیوی نہیں سمجھتا اس لئے وہ ماں سے محبت بھی نہیں کر سکتا۔ یہ بات بلاشبہ غلط ہے۔ اس لئے کہ ماں سے محبت ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کے اندر لازمی طور پر ہوتا ہے، خواہ وہ ایک مذہب کو ماننے والا ہو یا دوسرے مذہب کو ماننے والا۔ ماں سے محبت پیدا کرنے کے لئے اس کی ضرورت نہیں کہ کوئی شخص اس کے بیٹے اور بیٹی کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرے کہ تمہاری ماں ایک مقدس دیوی ہے۔ تم جب تک اس کو مقدس دیوی نہیں مانو گے، تم اس سے محبت بھی نہیں کر سکو گے۔

ٹھیک یہی معاملہ وطن کا ہے۔ وطن سے محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو ہر انسان میں لازمی طور پر ہوتا ہے۔ کسی آدمی کا نظریہ یا مذہب خواہ کچھ بھی ہو، وہ پیدائشی طور پر مجبور ہے کہ جہاں وہ پیدا ہوا اور جہاں وہ پلا بڑھا ہے، اس سے وہ محبت کرے۔ یہ محبت اپنے آپ آدمی کے دل میں ہوتی ہے، اس کے لئے کسی بیرونی کوشش کی ضرورت نہیں۔

دنیا میں تقریباً دو سو ملک پائے جاتے ہیں۔ ہر ملک کے لوگ اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ذاتی انٹرسٹ اور ملکی انٹرسٹ میں ٹکراؤ ہو تو وہ اپنے انٹرسٹ کو پیچھے رکھتے ہیں اور ملکی انٹرسٹ کو آگے۔ حالانکہ ان میں سے کسی بھی ملک کے باشندے اپنے ملک کو دیوی دیوتا کا درجہ نہیں دیتے۔ یہی حب الوطنی کا عالمی اصول ہے۔ ہمیں بھی اسی اصول کو اختیار کرنا چاہئے۔ ہندستان میں ہم حب الوطنی کا کوئی الگ جزیرہ نہیں بنا سکتے۔ اس قسم کی غیر حقیقی کوشش ملک کو تباہ تو کر سکتی ہے مگر ملک کی ترقی میں وہ ہرگز معاون نہیں ہو سکتی۔

۳۔ اسی نظریہ کو کچھ لوگوں نے ایک خوبصورت نام دیا ہے جس کو وہ کلچرل نیشنلزم کہتے

ں۔ یہ لوگ ہندستان کے اکثریتی فرقہ کے کلچر کو ملکی کلچر بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ملک کے تمام
شندوں کے لئے ضروری ہے کہ اس کلچر کو اختیار کریں ورنہ ملک میں نیشنل اسپرٹ پیدا نہیں ہو
ئے گی۔

یہ نظریہ بھی سراسر غیر علمی اور غیر فطری ہے۔ وہ دنیا میں کہیں بھی رائج نہیں اور نہ
رستان میں اس کو قائم کیا جاسکتا ہے۔

قومیت یا نیشن ہڈ کا تعلق صرف ہندستان سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق تمام ملکوں سے
ہے۔ اس کا ایک متفقہ عالمی نظریہ ہے۔ ہمیں بھی اس معاملہ میں وہی اصول اختیار کرنا ہے جو عالمی
طح پر رائج ہے۔ اس معاملہ میں ہم خود ساختہ طور پر کوئی علیحدہ اصول اختیار نہیں کر سکتے۔

تمام قوموں کے متفقہ اصول کے مطابق، قومیت یا نیشن ہڈ کی بنیاد وطن (motherland) پر
ہے۔ اسی اصول پر تمام دوسرے ملکوں میں قومیت کی تشکیل ہوئی ہے۔ ان ملکوں کے باشندوں
ں نیشنل اسپرٹ پوری طرح موجود ہے۔ حتی کہ شاید ہندستانیوں سے بہت زیادہ۔ گلوبل ولیج اور
ام متحدہ کے اس دور میں ہم اپنا کوئی علیحدہ سیاسی گھروندا نہیں بنا سکتے۔ اور اگر بنانے کی کوشش
گئی تو اس کے لئے پیشگی طور پر مقدر ہے کہ وہ ناکام ہو کر رہ جائے۔ اس نظریہ کے ماننے والوں
کوشش یہ ہے کہ وہ ملک کے تمام باشندوں کو سرسوتی دیوی کی وندنا کرائیں اور اسکول کے تمام
بہ کو وندے ماترم کے گیت میں شامل کریں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح اس کلچرل نیشنلزم کو
نے میں مدد ملے گی جس کے بغیر ان کے نزدیک ہندستان میں قومیت کی تشکیل ممکن نہیں۔

یہ بھی بلاشبہ ایک بے بنیاد مفروضہ ہے۔ مثال کے طور پر سرسوتی کو علم کی دیوی سمجھا
تا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ سرسوتی کی وندنا سے علم اور تعلیم کو فروغ حاصل ہوگا۔ مگر واقعات
ں کی کامل تردید کرتے ہیں۔ ہندستان میں سرسوتی کا گیت پچاس سال سے بھی زیادہ مدت سے
جارہا ہے۔ مگر یہاں ابھی تک کوئی قابل لحاظ علمی ترقی نہ ہو سکی۔ اس کے برعکس دور جدید کے

وہ ممالک جن کو ترقی یافتہ ممالک کہا جاتا ہے وہاں کے اسکولوں اور تعلیم گاہوں میں کسی علم کی دیوی کا گانا نہیں گایا جاتا۔ پھر بھی وہ ہم سے اتنا زیادہ آگے ہیں کہ ہم شاید ان کے پیچھے بھی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سرسوتی یا وندے ماترم مذہبی عقیدہ کی چیزیں ہیں۔ ان کا دنیوی شعبوں سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی شخص یا گروہ ذاتی عقیدہ کے طور پر ان کو اختیار کر سکتا ہے مگر وسیع تر اجتماعی زندگی میں ان کو داخل کرنا اور تمام لوگوں پر ان کو نافذ کرنے کی کوشش کرنا غیر فطری بھی ہے اور ناممکن بھی۔ اس طرح کی کوشش کا کوئی فائدہ تو نہیں ہوگا، البتہ جھگڑوں میں اضافہ کر کے اصل مطلوب مقصد کا حصول مزید دشوار ہو جائے گا۔

اگر ہم ہندستان کو ایک ترقی یافتہ ملک بنانا چاہتے ہیں تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ مذہبی عقیدہ کو لوگوں کا انفرادی معاملہ قرار دے کر ہر ایک کو اس کی آزادی دے دی جائے۔ اور جہاں تک اجتماعی معاملات کا تعلق ہے اس کو سیکولر بنیاد پر قائم کیا جائے۔ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں نے اسی اصول کو اختیار کر کے ترقی کی ہے۔ ہندستان بھی اسی اصول کی بنیاد پر ترقی کر سکتا ہے۔ اس کے سوا دوسرا کوئی بھی راستہ مفید یا قابل عمل نہیں۔

وندے ماترم، سرسوتی کا گیت یا اس طرح کی اور چیزیں کسی مذہب کے خلاف ہوں یا نہ ہوں مگر یہ یقینی ہے کہ وہ ترقی کے خلاف ہیں۔ وہ مستقبل کی مطلوب تعمیر میں فیصلہ کن رکاوٹ ہیں۔ ہمارے موجودہ لیڈروں کے لئے عقل مندی یہ ہے کہ وہ اس قسم کی چیزوں کو اپنے ذاتی عقیدہ تک محدود رکھیں۔ ان کو ملک کی قومی زندگی یا اجتماعی شعبوں میں داخل کرنے پر اصرار نہ کریں۔ اگر انھوں نے خود سے ایسا نہ کیا تو ملک کی اگلی نسلیں جبراً ان چیزوں کو پیچھے دھکیل دیں گی۔ وہ ان کو چھوڑ کر خالص سیکولر بنیاد پر ملک کی تعمیر کریں گی۔ کیونکہ ترقی اس ملک کے ہر انسان کا سب سے بڑا مطلوب ہے۔ اور ایسی مطلوب چیز کے بارے میں انسان کبھی سمجھوتہ کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔

یہ واقعہ مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں ہو چکا ہے۔ وہاں کا مذہبی طبقہ پہلے اپنے مذہبی رسومات و عقائد کو سیکولر شعبوں سے جوڑے ہوئے تھا۔ اس کے نتیجے میں ان کی ترقی صدیوں تک رُکی رہی یہاں تک کہ وہاں کے عوام نے بغاوت کر کے ان مذہبی زنجیروں کو توڑ دیا۔ اس کے بعد ترقی کی طرف ان کا سفر بے روک ٹوک شروع ہو گیا۔

یہ باغیانہ تحریک ہندستان میں بھی شروع ہو چکی ہے۔ اس کی ایک علامتی مثال یہ ہے کہ ہماری نئی نسل جو اسکولوں اور کالجوں میں پڑھ رہی ہے وہ نمستے یا نمسکار کہنے کے بجائے ہائے اور ہیلو کہنے لگی ہے۔ ایسی حالت میں ہندستانی لیڈروں کو چاہیے کہ وہ اس تبدیلی کو اختیارانہ طور پر قبول کر لیں جس کو انھیں مستقبل میں مجبورانہ طور پر قبول کرنا پڑے گا، کیونکہ عوامی بغاوت کا مقابلہ کرنے کی طاقت کسی کے اندر بھی نہیں۔

آخری بات

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان کی سیاسی آزادی کی جو پر جوش تحریک اٹھی اس کے ساتھ کس قسم کی بڑی بڑی امیدیں شامل تھیں اور کیسے رومانی خیالات کے سایہ میں وہ آگے بڑھ رہی تھی، اس کا اندازہ ایک شعر سے ہوتا ہے۔ ایک شاعر انقلاب کا یہ شعر اس زمانہ میں ہر گاؤں اور ہر شہر میں گونج رہا تھا:

آج ہمالہ کی چوٹی سے پھر ہم نے للکارا ہے دور ہٹو اے دنیا والو ہندستان ہمارا ہے

مگر آزادی ملنے کے بعد جلد ہی یہ سارا جوش و خروش جاتا رہا۔ آج ملک کے اہل فکر عام طور پر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہماری ہمالیائی تحریک نے ملک سے بیرونی قوم کے سیاسی غلبہ کو تو ختم لیا مگر اس کے جلد ہی بعد بیرونی قومیں اپنی تہذیبی برتری اور اقتصادی طاقت کی بنا پر دوبارہ ہندستان میں داخل ہو گئیں۔ آج ہر شعبہ میں دوبارہ انھیں کا غلبہ قائم ہو گیا ہے۔ دستوری اعتبار سے ملک کی قومی زبان ہندی ہے مگر عملی طور پر ملک میں جس زبان کا راج ہے وہ ہندی نہیں ہے

بلکہ انگریزی ہے۔

اسی طرح آج ہندستان کے سماج میں مغربی کلچر تیزی سے چھاتا جارہا ہے۔ یہاں کی مارکیٹ پر بیرونی کمپنیاں اپنی برتر حیثیت کے ساتھ داخل ہو گئی ہیں۔ یہاں کا پریس اور یہاں کا میڈیا ان کا خادم بنتا جارہا ہے۔ حتی کہ یہاں کی سیاست بھی بالواسطہ طور پر انھیں کے زیر اثر کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

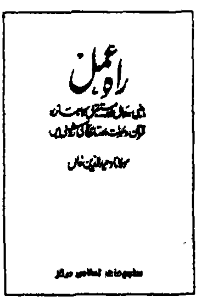
یہ المناک واقعہ ہندستانی لیڈرشپ کی ایک عظیم کوتاہی کو بتاتا ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہ لوگ ملک کے مسئلہ کو ہندستانی ورسس انگریز (ہندستانی بمقابلہ انگریز) کا مسئلہ سمجھ رہے تھے۔ وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ انگریزوں کے سیاسی اقتدار کا خاتمہ ملک کی عظمت کو قائم کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ مگر اصل حقیقت کے اعتبار سے یہ مسئلہ ہندستان ورسس برٹش راج نہ تھا بلکہ وہ ہندستان ورسس عالمی سیلاب تھا۔ پہلے تصور کے تحت یہ مسئلہ بظاہر طاقت ور ہندستان کے مقابلہ میں کمزور انگریز کا مسئلہ تھا۔ مگر دوسرے پہلو سے یہ مسئلہ کمزور ہندستان بمقابلہ طاقتور عالمی سیلاب بن گیا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ۱۹۴۷ میں نشانہ کے مطابق سیاسی آزادی حاصل کرنے کے باوجود ہندستان بدستور بیرونی طاقتوں کے مقابلہ میں مغلوب بنا ہوا ہے۔

یہی معاملہ اس مسئلہ کا بھی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا۔ قدیم مسئلہ کو ایک لفظ میں آزادی سے تعبیر کیا گیا تھا، اب جدید مسئلہ کو ایک لفظ میں ہندتو سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مگر ہندتو اندولن کی لیڈرشپ دوبارہ وہی غلطی کر رہی ہے جو آزادی اندولن کی لیڈرشپ نے کی تھی۔

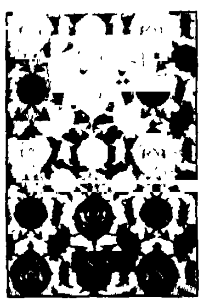
ہماری قدیم لیڈرشپ نے معاملہ کو دو ایسے فریقوں کے درمیان کا معاملہ فرض کر لیا تھا جس میں وہ بظاہر طاقتور دکھائی دے رہے تھے۔ اور فریق ثانی کمزور نظر آتا تھا جب کہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اسی طرح ہندتو لیڈرشپ اپنے معاملہ کو ہندو ورسس مسلم معاملہ سمجھ رہی ہے۔ اس تقسیم میں اس کو یہ سارا معاملہ اکثریتی فرقہ اور اقلیتی فرقہ کے درمیان کا معاملہ نظر آتا ہے۔

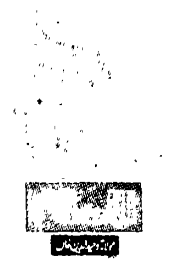
اس تقسیم کے تحت وہ سمجھتے ہیں کہ ہم طاقتور پوزیشن میں ہیں اور ہماری کامیابی یقینی ہے۔ مگر اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ دوبارہ ہندستان ورسس عالمی زمانی سیلاب کا ہے۔ یعنی یہ ہندستان کے قدیم کلچر اور جدید سائنٹفک کلچر کے درمیان کا معاملہ ہے۔ اس معاملہ میں یقینی طور پر ہندتو اندولن فریق ثانی کے مقابلہ میں بیحد کمزور ہے۔ اس معاملہ میں عالمی دھارے کی حیثیت اگر سیلاب کی ہے تو ہندتو دھارے کی حیثیت محض ایک تنکے کی۔ یہ یقینی ہے کہ اس جدید مقابلہ میں ہندتو لیڈر شپ اس سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوگی جتنا کہ قدیم مقابلہ میں آزادی کی لیڈر شپ ثابت ہوئی تھی۔

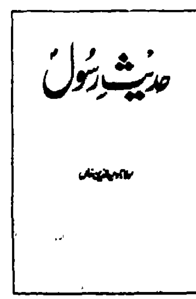
یہ تاریخ کا فیصلہ ہے، اور تاریخ کے فیصلہ کو بدلنا کسی بھی شخص کے لئے ممکن نہیں، خواہ وہ کوئی لیڈر ہو یا کوئی حکومت۔



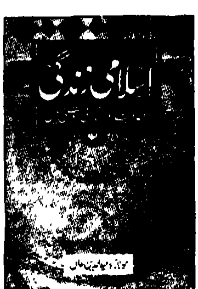
Size 22×14.5cm, 152 pages


Size 22×14.5cm, 128 pages


Size 22×14.5cm, 176 pages

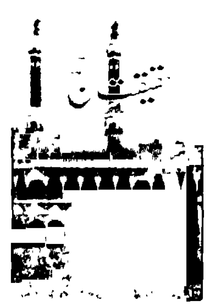


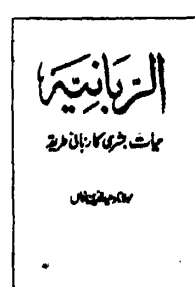
Size 22×14.5cm, 72 pages



Size 22×14.5cm, 160 pages


Size 22×14.5cm, 264 pages


Size 22×14.5cm, 116 pages



Size 22×14.5cm, 224 pages

پیغام عمل

آزادی کے بعد ہندستان میں جو نئے مسائل پیدا ہوئے ان میں سے غالباً سب سے زیادہ سنگین مسئلہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وہ انٹر ایکشن (ملنا جلنا) تقریباً ختم ہو گیا جو آزادی سے پہلے کے دور میں بڑے پیمانے پر جاری تھا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ ملک کے دونوں بڑے فرقے ان مواقع سے محروم ہو گئے جب دونوں کے درمیان نارمل فضا میں اختلاط ہو اور دونوں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نئے ہندستان کی فضا میں تعمیر کے لئے متحدہ کوشش کر سکیں۔ یہ بلا شبہ بے حد سنگین واقعہ تھا اور اس کے دور رس نتائج بر آمد ہوئے۔

آزادی کے بعد ملک میں ایک نئی بات یہ ہوئی کہ ہندوؤں کے وہ انتہا پسند طبقے ابھر آئے جو اس سے پہلے بڑی حد تک دبے ہوئے تھے۔ یہ واقعہ ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں فیصلہ کن رکاوٹ بن گیا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے دھارے ایک دوسرے سے بڑی حد تک الگ ہو گئے۔ اس کا نقصان بیک وقت دونوں فرقوں کو پہنچا، ہندوؤں کو بھی اور مسلمانوں کو بھی۔

نئے ہندستان میں جب مسلمانوں کا معاملہ ہندوؤں سے پیش آیا تو انھوں نے محسوس کیا کہ یہاں دو قسم کے ہندو پائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی نسبت سے ان دونوں قسم کے ہندوؤں کو الگ الگ نام دیا جائے تو وہ یہ ہوگا۔۔۔ نو پرابلم ہندو (بے مسئلہ ہندو) اور پرابلم ہندو (بامسئلہ ہندو) مسلمانوں نے محسوس کیا کو نو پرابلم ہندوؤں سے تو وہ بآسانی ملنے جلنے کا سلسلہ قائم رکھ سکتے ہیں، مگر پرابلم ہندو سے بظاہر اس قسم کا سلسلہ قائم رکھنا موجودہ حالت میں سخت مشکل ہے۔

آزادی کے بعد مسلمانوں کے درمیان جو قیادت ابھری اس نے اس مسئلہ کا حل یہ سمجھا کہ نو پرابلم ہندوؤں سے تعلقات بڑھائے جائیں اور ان کو لے کر پرابلم ہندوؤں کا مقابلہ کیا جائے۔ اس نظریہ کے تحت مسلمانوں میں کئی قیادتیں ابھریں اور کئی تحریکیں اور تنظیمیں برپا ہوئیں۔ ان

شخصیتوں اور تحریکیوں کے پر شور عمل کا سلسلہ تقریباً چالیس سال تک جاری رہا۔ مگر نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ بیسویں صدی کے آخر میں پہنچ کر پرابلم ہندوؤں نے ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں سو گنا زیادہ طاقت حاصل کرلی۔ وہ ملک کے اکثر اجتماعی اداروں میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے مرکزی اور ریاستی سطح پر اپنی حکومت بنالی، وغیرہ۔

نو پرابلم ہندوؤں کو لے کر پرابلم ہندوؤں کا مقابلہ کرنا، ایک غیر فطری اور غیر حکیمانہ نظریہ تھا۔ یہ ایک منفی نقطہ نظر ہے، اور منفی نقطہ نظر کے تحت کی ہوئی کوئی بھی کوشش کبھی مثبت نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ مثبت نتیجہ ہمیشہ مثبت جدوجہد کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے نہ کہ منفی جدوجہد کے ذریعہ۔

اس نقطۂ نظر کا مزید نقصان یہ ہوا کہ ہندستان کے مسلمان عملاً اس ملک میں ایک احتجاجی گروہ بن کر رہ گئے۔ مذکورہ نقطہ نظر عین اپنی فطرت کے مطابق، احتجاج اور شکایت کا ذہن پیدا کرتا ہے۔ اور یہی مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ ان کا ہر اخبار ایک احتجاج نامہ بن گیا۔ ان کے جلسے احتجاجی جلسوں میں تبدیل ہو گئے۔ ان کے درمیان ایسے لوگ قائد بن کر ابھرنے لگے جو اپنے پر شور الفاظ کے ذریعہ مسلمانوں کی احتجاجی نفسیات کو تسکین دے سکتے تھے۔

احتجاج یا شکایت، دل کی بھڑاس نکالنے کا دوسرا نام ہے۔ نئے ہندستان میں یہاں کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالیں، وہ اپنے اندر پائے جانے والے غم وغصہ کے لئے ایک لفظی نکاس (outlet) پالیں۔ اس ملک میں مسلمانوں کو ایک تخلیقی کردار (creative role) ادا کرنا تھا۔ اور ملک کی قسمت بنانے میں اپنا وہ تاریخی حصہ ادا کرنا تھا جو قانون فطرت کے تحت کسی زندہ اقلیت کے لئے مقدر ہے۔

انگریز مورخ آرنلڈ ٹوائن بی نے اپنی کتاب (اسٹڈی آف ہسٹری) میں اقلیتوں کے اس رول کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہی بات قرآن میں اس طرح بتائی گئی ہے۔۔۔ کتنی ہی

چھوٹی جماعتیں اللہ کے اذن سے بڑی جماعتوں پر فائق ثابت ہوئی ہیں۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (البقرہ ۲۴۹)

اس آیت میں اذن سے مراد قانون فطرت ہے جو اللہ نے اپنی حکمت کے تحت اس دنیا میں قائم فرمایا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ جب بھی کوئی اقلیتی گروہ کا مقابلہ کسی اکثریتی گروہ سے پیش آتا ہے تو اس کے بعد لازماً ایسا ہوتا ہے کہ اقلیتی گروہ کے اندر وہ اعلیٰ صفت پیدا ہوتی ہے جس کے مجموعہ کا نام قرآنی اصطلاح میں صبر ہے۔ یعنی چیلنج کا فائق تر سطح پر جواب دینے کا جذبہ پیدا ہونا۔ اس طرح چیلنج اور رسپانس کا میکانزم اقلیتی گروہ کے اندر نئی اور تخلیقی صفات پیدا کرتا ہے۔ وہ مسائل کا برتر حل دریافت کرتا ہے۔ یہ عمل جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اقلیت خود بھی کامیاب ہوتی ہے اور پورے سماج کے لئے بھی زندگی کا نیا تحفہ دینے کا سبب بن جاتی ہے۔

پیش آمدہ مسائل کا جواب اگر منفی انداز میں دیا جائے تو اسی کا نام بے صبری ہے۔ اور اگر پیش آمدہ مسائل کا جواب مثبت انداز میں دیا جائے تو اسی کو قرآن کی اصطلاح میں صبر کہا گیا ہے۔ منفی عمل کا مثبت جواب دینا، یہی تخلیقیت کا اہم ترین عنصر ہے۔ اور یہی وہ خاص صفت ہے جو کسی اقلیتی گروہ کو اکثریتی گروہ سے بھی زیادہ بڑا کردار ادا کرنے کے قابل بنا دیتی ہے۔

اب پہلا سوال یہ ہے کہ اس ملک کے مسلمان اس تاریخی کردار کو ادا کرنے کے لئے کیا کریں جو ان کے لئے فطرت کے قانون کے تحت مقدر ہے۔ اس سلسلہ کا پہلا اور ضروری کام وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ یعنی مسلمان اپنی احتجاجی سیاست کو ختم کردیں اور اس کے بجائے مثبت تعمیری سیاست کا طریقہ اختیار کریں۔

ہندستان کے مسلمان اس وقت جس مقام پر ہیں اس کو ایک لفظ میں فریاد و شکایت کا مقام کہا جا سکتا ہے۔ پچاس سال سے زیادہ مدت تک اس طرز کی پالیسی کو اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں مسلسل مدافعت کی زبان بولنی پڑی۔ ان کا کیس اس ملک میں مظلومانہ فریاد کا کیس بن گیا

۔جو گروہ اس قسم کی نفسیات میں مبتلا ہو وہ کبھی کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ بڑا کارنامہ انجام دینے کے لئے اقدامی نفسیات درکار ہوتی ہے نہ کہ مدافعانہ نفسیات۔

خوش قسمتی سے اس ملک میں وہ اسباب اور مواقع پوری طرح موجود ہیں جو مسلمانوں کو مدافعانہ مقام سے اٹھا کر اقدامی سطح پر پہنچادیں۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ مواقع کو جانیں اور ان کو بھرپور طور پر استعمال کریں۔

مسلمانوں کو مظلومانہ پوزیشن سے اٹھ کر اقدامی پوزیشن تک پہنچنے کے لئے کیا کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا کام یہ ہے کہ اس رکاوٹ کو درمیان سے ہٹادیا جائے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے بڑے پیمانہ پر میل جول میں حائل ہیں۔ وہ ہے ملک کی اجتماعی سرگرمیوں میں بھارتیہ سنسکرتی کو غیر ضروری طور پر داخل کرنا۔ مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ حکیمانہ جدوجہد کے ذریعہ برادران وطن کو اس پر راضی کریں کہ وہ اپنی قدیم سنسکرتی کو صرف اپنے ذاتی دائرے میں محدود رکھیں، وہ اس کو اجتماعی پروگراموں یا سماجی سرگرمیوں میں دخیل نہ کریں۔ جس دن ایسا ہو گا اسی دن اپنے آپ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان انٹر ایکشن بڑھ جائے گا اور وہ مشترکہ جدوجہد وجود میں آجائے گی جس میں دونوں فرقے مل کر ہندستان کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کریں۔

جب یہ واقعہ پیش آئے گا تو اس کے بعد خود قانون فطرت کے تحت ایسا ہونے لگے گا کہ جو مسلمان کے پاس ہے وہ اس کو ہندوؤں تک پہنچائیں گے۔ اور جو ہندوؤں کو حاصل ہے اس کے ثمرات مسلمانوں تک پہنچنے لگیں گے۔ اس مشترکہ عمل کے نتیجہ میں اپنے آپ ایک نیا کلچر ابھرے گا۔ نئی زندگی تشکیل پائے گی۔ اس کے بعد اپنے آپ ایک نیا نظام بنے گا جو ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے مفید ہو گا۔

اس تاریخی عمل کو ظہور میں لانے کے سلسلہ میں دونوں ہی فرقوں کی اہم ذمہ داریاں ہیں۔ ہندو فرقہ کو یہ جاننا ہو گا کہ وہ کسی انسانی گروہ سے تو لڑ سکتا ہے مگر وہ فطرت سے

نہیں لڑ سکتا۔ بھارتیہ سنسکرتی کو ملک کی اجتماعی زندگی میں شامل کرنے کا منصوبہ اصلاً کسی انسانی گروہ کے خلاف نہیں۔ وہ فطرت اور تاریخ اور عالمی رجحان کے خلاف ہے۔اس بنا پر وہ یقینی طور پر ناقابل عمل ہے۔

میں ایک بار مہاراشٹر کے ایک شہر میں گیا وہاں ایک ہندو اور ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ دونوں کے درمیان پہلے دوستی تھی،اس کے بعد دونوں میں ایک خاص مسئلہ میں نزاع ہو گئی۔ مہینوں کی کوشش کے باوجود جب یہ نزاع ختم نہ ہوئی تو ہندو نے مسلمان سے کہا کہ آؤ، ہم اپنے اختلاف کو بازو میں رکھ دیں اور بقیہ امور میں مل جل کر کام کریں۔اسی قسم کا ایک قصہ بمبئی میں پیش آیا۔ یہاں ایک مسلمان اور ایک یہودی کے درمیان تجارتی اشتراک ہوا۔ یہودی نے پہلے ہی دن اپنے مسلم پارٹنر سے کہا کہ دیکھو میرے اور تمہارے درمیان تجارتی معاملات میں کوئی اختلاف نہیں۔البتہ ایک مسئلہ ایسا ہے جس میں میرے اور تمہارے درمیان اتفاق نہیں،وہ اسرائیل کا مسئلہ ہے۔ میں اور تم دونوں یہ طے کرلیں کہ ہم اسرائیل کے مسئلہ پر کبھی بات نہیں کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہودی اور مسلمان کا یہ تجارتی اشتراک نہایت کامیاب رہا۔

ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو وسیع تر اعتبار سے اسی فارمولے کو اختیار کرنا ہے۔دونوں کے درمیان یہ امر مشترک ہے کہ ہندستان کو ایک ترقی یافتہ ملک بنایا جائے۔اس کے بعد جو چیز اختلاف کی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس تعمیری عمل میں غیر ضروری طور پر بھارتیہ سنسکرتی کو شامل کیا جائے۔اب ہندو فرقہ کو یہ کرنا ہے کہ وہ بھارتیہ سنسکرتی کو اپنے ذاتی دائرہ تک محدود رکھے۔اس معاملہ میں ہندو فریق اگر اس تفریق پر راضی ہو جائے تو اس کے بعد متحدہ عمل کے لئے تمام دروازے پوری طرح کھل جائیں گے۔

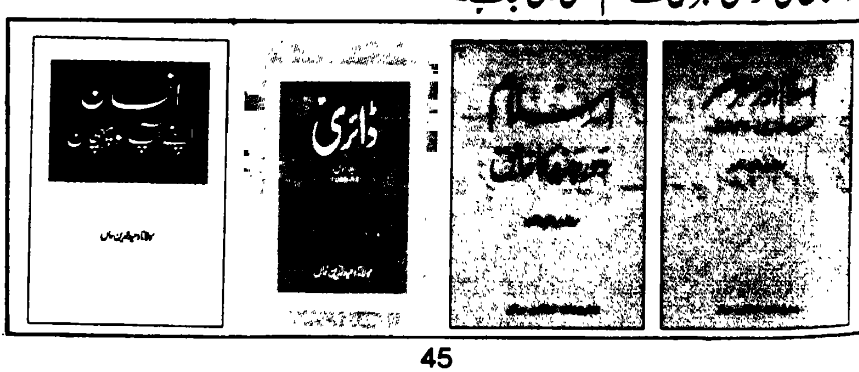
ایسا ہونا بے حد ضروری ہے۔اس کے بغیر ہندو مسلم تعلقات صرف نو پرابلم ہندوؤں تک محدود ہو کر رہ جائیں گے۔وہ پرابلم ہندوؤں تک وسیع نہ ہو سکیں گے۔جب کہ پرابلم ہندوؤں

کو شریک کیے بغیر ملکی تعمیر کی کوئی بڑی جدوجہد زیر عمل نہیں لائی جا سکتی۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، انھیں بھی صرف ایک کام کرنا ہے۔ وہ یہ کہ ہندستان میں ہندو فرقہ اکثریت میں ہے اس بنا پر فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کچھ معاملات پیش آتے ہیں جن کو اب تک تعصب اور زیادتی کی اصطلاحوں میں بیان کیا جاتا رہا ہے۔ اس طرح کے واقعات ہر سماج میں اور ہمیشہ پائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ ان واقعات کو چیلنج کے روپ میں لیں۔ وہ ان کو کسی مخصوص فرقہ کی کارروائی سمجھنے کے بجائے فطرت کے نظام کے تحت پیش آنے والا واقعہ سمجھیں۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ کسی واقعہ کو ظلم سمجھنے سے شکایت کا مزاج بنتا ہے۔ اس کے برعکس جب واقعہ کو چیلنج سمجھا جائے تو خود فطری قانون کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ اس کی خفیہ قابلیت (latent potential) ظہور میں آنے لگتی ہے۔ پہلے اگر وہ صرف ایک انسان تھا تو اب وہ سپر انسان (superman) بن جاتا ہے۔ اس طرح وہ اس قابل بن جاتا ہے کہ اپنی بڑھی ہوئی استعداد کے ساتھ چیلنج کا مقابلہ کرکے کامیابی سے دوچار ہو۔

یہی وہ مخصوص مقام ہے جہاں لمبے تاریخی عمل کے بعد ہندو اور مسلمان دونوں پہنچے ہیں۔ اب بہترین عقل مندی یہ ہے کہ بیسویں صدی کے خاتمہ کے ساتھ قدیم غیر فطری پالیسی کو ختم کر دیا جائے۔ تاکہ جب آنے والی صدی کا سورج طلوع ہو تو وہ ہمارے لئے ایک نئے اور بہتر ہندستان کی خوش خبری کے ہم معنی بن جائے۔



ایک سیاسی جائزہ

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں مسلم قائدین نے جو تحریکیں چلائیں وہ وسیع تر تقسیم میں دو تھیں۔ ایک کو عام فہم زبان میں اتحاد ہند کی تحریک اور دوسری کو تقسیم ہند کی تحریک کہہ سکتے ہیں۔ بظاہر یہ دونوں تحریکیں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ دونوں کے اندر ایک مشترک خامی موجود تھی۔ اور وہ تھی حقیقی حالات کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ نہ کرنا۔

جن قائدین نے اتحاد ہند کی تحریک چلائی وہ سارے معاملہ کو انگریز اور ہندستانی کا مسئلہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سارے مسئلہ کی جڑ انگریز ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں ایک جان دو قالب ہیں۔ ان کے درمیان جھگڑے کا کوئی امکان ہی نہیں۔ یہ صرف انگریز ہیں جنھوں نے ایک کو دو میں بانٹ کر لڑا رکھا ہے۔ اسی تصور کو اقبال احمد سہیل نے ۱۹۴۷ سے پہلے ان الفاظ میں نظم کیا تھا۔

یوں شیشہ و ساغر ٹکرائیں منہ دیکھتے میکش رہ جائیں
اس فن کو جہاں میں اور کوئی جز ساقی دانا کیا جانے

یہ اصل صورت حال کا نہایت سرسری اندازہ تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز ہی میں مختلف اسباب سے برادران وطن میں ہندو انتہاپسندی کی تحریک شروع ہو گئی تھی جو دن بدن طاقتور ہوتی چلی گئی۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد یقینی طور پر مسلمانوں کو ایک شدید تر خطرہ پیش آئے گا۔ یہ ہندو قوم پرستی یا ہندو انتہاپسندی کا خطرہ تھا۔

مگر اتحاد پسند مسلم قائدین نے اس خطرہ کے مقابلہ کے لئے کوئی تیاری نہیں کی۔ حتی کہ انھوں نے یہ بھی نہیں کیا کہ مسلمانوں کو پیشگی طور پر اس خطرہ سے آگاہ کردیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ کے بعد جب مسلمانوں کو یہ خطرہ پیش آیا تو وہ صرف احتجاج یا منفی رد عمل کے درجہ میں اپنی کارروائیاں کرتے رہے۔ انھوں نے اس خطرہ کے مقابلہ میں نہ تو کوئی گہری منصوبہ بندی کی اور نہ اس کے مقابلہ میں وہ کوئی حقیقی عملی تدبیر کر سکے۔

ہندستان میں سماجی اتحاد کے لئے سیکولر فارمولا استعمال کرنا تھا۔ مگر اصل صورت حال یہ تھی کہ یہاں مختلف مذہبی گروہ موجود تھے اور ہر گروہ کے لیڈروں نے ان کے اندر پرشور طور پر یہ مزاج بنایا تھا کہ ــــ میں ہندو ہوں، میں مسلمان ہوں، میں سکھ ہوں، میں عیسائی ہوں وغیرہ۔ اس طرح یہاں کا مذہبی طبقہ شدت کی حد تک اس احساس میں مبتلا تھا کہ ہم ایک الگ مذہبی گروہ ہیں اور یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی علیحدہ شناخت (identity) کو سختی کے ساتھ قائم رکھیں۔

اس طرح کے سماج میں سیکولرزم کا اتحادی فارمولا کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی کامیابی کی لازمی شرط یہ تھی کہ یا تو لوگوں کے اندر گروہی تفریق کے مزاج کو ختم کیا جائے یا ان کے اندر یہ ذہن بنایا جائے کہ اپنی علیحدہ مذہبی حیثیت کو باقی رکھتے ہوئے انہیں دوسروں کا بھی پورا احترام کرنا چاہئے۔ مگر ذہنی اور فکری تربیت کا یہ کام انجام نہیں دیا گیا۔ صرف نعروں اور تقریروں کے ذریعہ یہ امید کرلی گئی کہ لوگوں کے درمیان سیکولر اتحاد قائم ہو جائے گا۔ حقیقی حالات کے اعتبار سے یہ ناممکن تھا اس لئے وہ حاصل بھی نہ ہو سکا۔

یہی معاملہ نئے مسلم ملک (پاکستان) میں ایک اور شکل میں پیش آیا۔ جس خطہ میں پاکستان بنا وہاں مختلف بنیادوں پر زبردست گروہی احساسات موجود تھے۔ یہاں کے لوگ

انھیں احساسات میں جی رہے تھے۔ میں بنگالی ہوں، میں پنجابی ہوں، میں سندھی ہوں، میں بلوچی ہوں، میں سنی ہوں، میں شیعہ ہوں وغیرہ۔

ان تفریقی احساسات کو ختم کرنے یا ان کو غیر موثر بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ البتہ یہ کوشش کی گئی کہ نعروں اور تقریروں کی دھوم کے ذریعہ اسلام کو پورے ملک کے لئے اتحاد کی اساس بنادیا جائے۔ عالم اسباب میں ایسا ہونا ممکن نہ تھا اس لئے وہ کامیاب بھی نہیں ہوا۔

اسلام بلاشبہ انسانوں کو متحد کرنے کی طاقت رکھتا ہے مگر اسلام کی یہ کرامت اسی وقت ظاہر ہو سکتی ہے جب کہ لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں اسلام کو پوری طرح اتار دیا جائے۔ خارجی نعروں اور اوپری تقریروں کے ذریعہ یہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک تقسیم ہند کے حامی قائدین کا تعلق ہے وہ بھی اسی طرح کے بھرم میں مبتلا رہے۔ انھوں نے سمجھا کہ سارا معاملہ ہندو قوم اور مسلم قوم کے باہمی اختلاف کا ہے۔ اور اس کا آسان حل یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جغرافی تقسیم کر دی جائے ۔جب ہندو الگ ہو گا اور مسلمان الگ تو اپنے آپ تمام جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔

مگر یہ اصل صورت حال کا ایک غیر حقیقی اندازہ تھا۔ حقیقی حالات کے اعتبار سے اصل صورت حال یہ تھی کہ تقسیم کا نتیجہ صرف یہ نکلے کہ جو مسائل پہلے ہندو اور مسلمان کے درمیان تھے وہ تقسیم کے بعد نئے مسلم ملک میں مسلم اور مسلم کے درمیان مزید اضافہ کے ساتھ ابھر آئیں۔ ۱۹۴۷ کے بعد نئے مسلم ملک میں عملاً ایسا ہی پیش آیا۔ ہر وہ نزاع جس کا ذکر پہلے ہندو کی نسبت سے کیا جاتا تھا وہ نئے ملک میں خود مسلمانوں کی نسبت سے بہت بڑے پیمانے پر پیدا ہو گئی۔

۱۹۴۷ سے پہلے کچھ ایسے دانش ور موجود تھے جو دونوں گروہوں کو آنے والے خطرے سے ڈراتے تھے۔ اتحاد ہند کے قائدین کو ہندو انتہا پسندی کے خطرہ سے اور تقسیم ہند کے قائدین کو خود مسلمانوں کی نسل پسندی اور علاقہ پسندی کی ذہنیت سے۔ مگر دونوں گروہوں نے اس انتباہ کو نظر انداز کیا۔

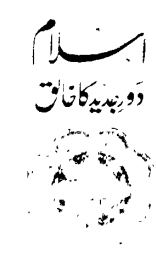
اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں اس بھرم میں مبتلا تھے کہ ان کے پاس اتحاد کا ایسا فار مولا موجود ہے جو ہر افتراق کی کاٹ کے لئے کافی ہے۔ اتحاد پسند قائدین سمجھتے تھے کہ ان کے پاس سیکولرزم کا تیر بہدف فار مولا موجود ہے۔ اور سیکولرزم کے نظریہ کے تحت ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک رشتہ میں جوڑ کر متحد کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف تقسیم ہند کے قائدین یہ سمجھتے تھے کہ ان کے پاس اسلام کا معیاری نظریہ ہے جو مختلف مسلم گروہوں کو ایک رشتہ میں باندھنے کے لئے کافی ہے۔ مگر تجربات بتاتے ہیں کہ یہ دونوں ہی خوش فہمی بے بنیاد ثابت ہوئی۔ نہ ہندستان میں سیکولرزم یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک رشتہ میں متحد کر سکا اور نہ پاکستان میں اسلام کے نعرہ کا یہ فائدہ ہوا کہ وہاں کے مختلف مسلم گروہ باہم متحد ہو کر رہیں۔

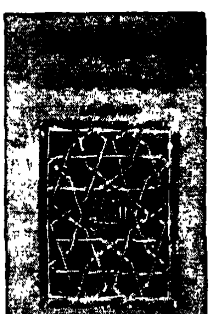
اس تلخ انجام کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ سیکولرزم یا اسلام میں لوگوں کو متحد کرنے کی طاقت نہیں۔ سیکولرزم اور اسلام دونوں ہی کسی سماج میں اتحادی فورس بن سکتے ہیں۔ مگر وہ اتحادی طاقت اسی وقت بنیں گے جب کہ انہیں استعمال کیا جائے۔ ہندستان اور پاکستان کے اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہو گا کہ دونوں میں سے کسی نظریہ کو صحیح طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔

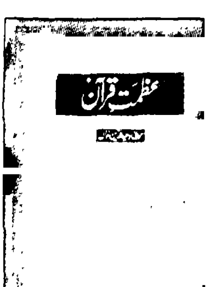
ہندستان پاکستان دونوں ملکوں میں جو ہوا وہ یہ تھا کہ یہاں سیکولرزم کے نعرے

لگائے گئے اور پاکستان میں اسلام کے نعرے۔ اور کسی نعرہ کو سماجی اتحاد کے لئے استعمال کرنا صرف اس وقت ممکن تھا جب کہ وہاں لمبی مدت تک فکری تحریک کا کام کیا جائے، سماج کے افراد اس سے متاثر ہوں۔ اور سماج میں پیش نظر منصوبہ کے موافق ضروری ذہنی فضا تیار ہو جائے۔

یہ کام اس حد تک ہو کہ پورا سماج مطلوب اسکیم کو قبول کرنے کے لئے فکری اور مزاجی طور پر تیار ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں فطرت کے مطابق اصلاح کا اصول یہ ہے کہ ـــ پہلے ایجوکیشن، اس کے بعد اقدام۔ یہی کسی اصلاح کی صحیح ترتیب ہے۔ مگر انڈیا اور پاکستان میں جو ہوا وہ انگریزی مثل کے مطابق، گاڑی کو گھوڑے کے آگے باندھنے کے ہم معنی تھا۔ اور جو لوگ اپنی گاڑی کو گھوڑے کے آگے باندھیں۔ ان کی گاڑی اس عالم اسباب میں کبھی چلنے والی نہیں۔









بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خصوصی شمارہ: آئینۂ ملت

الرسالہ

Al-Risala

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیرسرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
skhan@vsnl.com
http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf o
The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi

فہرست

خدائی قانون

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں اہل اسلام کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ---اور جولوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے ان کو ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنی بات میں سچا ہے۔ نہ تمہاری آرزوؤں پر ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو کوئی بھی برا کرے گا اس کا بدلہ پائے گا۔ اور وہ نہ پائے گا اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور نہ مددگار۔ اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ اور ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ ہو گا (النساء ۱۲۲۔۱۲۴)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاح و نجات کا خدائی قانون ایک ہی قانون ہے۔ مسلمان اور غیر مسلمان دونوں اسی قانون کے ماتحت ہیں۔ جو اس خدائی معیار پر پورا اترے گا اس کے لئے کامیابی ہے اور جو اس معیار پر پورا نہ اترے اس کے لئے ناکامی۔ کسی گروہ سے نسلی تعلق کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

نجات کی یہ بنیاد دو چیزوں پر قائم ہے، ایمان اور عمل صالح۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ نجات کا انحصار تمام تر کچھ صفات پر ہے نہ کہ کسی گروہ سے نسلی تعلق پر۔

اس سلسلہ میں پہلی مطلوب صفت اللہ پر ایمان ہے۔ ایمان سے مراد کچھ الفاظ کو زبان سے بول دینا نہیں بلکہ اس سے مراد معرفت اور یقین کی وہ حالت ہے جب کہ آدمی خدا کے وجود کو اس طرح دریافت کرے کہ وہی اس کے لئے سب سے بڑی حقیقت بن جائے۔ خدا اس کی یادوں کا سب سے بڑا سرمایہ ہو۔ خدا کی عظمت کا احساس اس کو ہلا دے۔ خدا کے انعامات کا تصور اس کے اندر شکر کا چشمہ جاری کر دے۔ وہ سب سے زیادہ خدا سے

ڈرے اور سب سے زیادہ خدا سے محبت کرے۔ خدا کی ذات ہی اس کی سوچ اور اس کے جذبات کا مرکز و محور بن جائے۔

اس قسم کا ایمان جب کسی کے اندر پیدا ہوتا ہے تو اس کی عملی زندگی بھی اس کے مطابق تشکیل پانے لگتی ہے۔ اس کی روزمرہ کی زندگی کا نقشہ بھی اس کی اسی اندرونی تڑپ کے مطابق بننا شروع ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام عمل صالح ہے۔ صحیح فکر لازمی طور پر صحیح عمل پیدا کرتی ہے۔ فکر اور عمل کے درمیان اسی مطابقت کا شرعی نام عمل صالح ہے۔

اس عمل صالح کا تعلق زندگی کے ان تمام معاملات سے ہے جس سے آدمی کا سابقہ پیش آئے۔ آدمی جب بولے تو اس کا ہر بول اسی ایمان کی خوشبو میں بسا ہوا ہو۔ جب وہ کسی سے معاملہ کرے تو اس کے ہر معاملہ میں اسی ایمان کا رنگ دکھائی دے۔ جب کسی کے ساتھ اختلاف یا نزاع پیش آئے تو یہاں بھی اس کا ایمان اس کے لئے رہنما بن جائے۔ وہ لوگوں کے درمیان اس طرح رہے کہ اس کی محبت اور نفرت، اس کی دوستی اور دشمنی، اس کا جڑنا اور اس کا کٹنا، سب اس کے ایمان کے تابع بن جائے۔ یہی عمل صالح ہے، اور اس عمل صالح کے بغیر کسی کے ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی۔

امت کے افراد میں جب زندہ شعور موجود ہو، تو وہ اسی معنی میں صاحب ایمان ہوتے ہیں اور اسی معنی میں صاحب عمل بھی۔ مگر جب امت پر دور زوال آتا ہے تو اس کے افراد میں اس قسم کا زندہ ایمان اور زندہ عمل باقی نہیں رہتا۔ وہ اب بھی ایمان اور عمل صالح کا نام لیتے ہیں مگر اس کی حقیقی اسپرٹ ان کے یہاں پائی نہیں جاتی۔ ان کے یہاں الفاظ ہوتے ہیں مگر وہ معانی سے خالی ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں بظاہر عمل ہوتا ہے مگر حقیقی روح کے بغیر۔

تنزل کے اس دور میں جو خرابی پیدا ہوتی ہے وہ یہ کہ لوگ امانی پر جینے لگتے ہیں۔ امانی

کی تشریح اس روایت سے ہوتی ہے جس کو اس آیت کا سبب نزول بتایا گیا ہے۔ روایت کے مطابق، یہود و نصاری نے کہا کہ جنت میں صرف وہ شخص جائے گا جو ہمارے گروہ سے ہو (**قالت الیھود والنصاری لن یدخل الجنة الا من کا ن منا**) اس پر یہ آیت اتری۔

ایک اور روایت کے مطابق مسلمانوں نے اور اہل کتاب نے ایک دوسرے پر فخر کیا۔ اہل کتاب نے کہا کہ ہمارا پیغمبر تمہارے پیغمبر سے پہلے ہے اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے ہے۔ پس ہم تمہارے مقابلہ میں اللہ کے یہاں زیادہ حق دار ہیں۔ اور مسلمانوں نے کہا کہ ہمارا نبی آخری نبی ہے۔ اور ہماری کتاب دوسری تمام کتابوں پر فیصلہ کرنے والی ہے۔ اس پر یہ آیت اتری (**تفاخر المؤمنون واھل الکتاب فقال اھل الکتاب :نبینا قبل نبیکم وکتابنا قبل کتابکم ونحن احق باللہ منکم وقال المؤمنون نبینا خاتم النبیین وکتابنا یقضی علی سائر الکتب فنزلت الایة**) تفسیر القرطبی ۳۹۶/۵

اس روایت سے امانی کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایمان اور عمل صالح کے بجائے آرزوؤں اور خوش فہمیوں پر نجات کی بنیاد رکھ لینا۔ اس کی ایک صورت فخر ہے یعنی ذاتی صفات کے بجائے کچھ ظاہری چیزوں کو بنیاد بنانا اور اس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر لینا۔

کون شریعت پہلے آئی اور کون شریعت بعد کو آئی، یہ خدا کے یہاں افضلیت کی بنیاد نہیں۔ اسی طرح یہ بھی اصل اہمیت کی چیز نہیں کہ کون اس رسول کے نام پر بننے والے گروہ سے وابستہ تھا اور کون اُس رسول کے نام پر بننے والے گروہ سے۔ اسی طرح یہ بھی فیصلہ کی بنیاد نہیں کہ کس کا دین افضل ہے اور کس کا دین غیر افضل۔ یہ سب خدا کے

نزدیک غیر متعلق باتیں ہیں۔ خدا ہر ایک کو اس کی ذاتی صفات کے اعتبار سے جانچے گا نہ کہ کسی اور اعتبار سے۔

بگاڑ کا دور

حضرت ابو سعید کہتے ہیں۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم ضرور اتباع کرو گے ان لوگوں کی جو تم سے پہلے تھے، بالشت برابر بالشت اور ہاتھ برابر ہاتھ۔ یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کی بل میں داخل ہوئے ہیں تو تم بھی اس میں داخل ہو جاؤ گے۔ کہا گیا کہ اے خدا کے رسول کیا وہ یہود و نصاری ہیں۔ آپ نے جواب دیا اور کون (**لتتبعن سنن من قبلكم شبر ا بشبر وذراعا بذ راع حتى لو دخلوا جحر ضب تبعتمو هم قيل يارسول الله اليهو د والنصارى قال فمن)متفق عليه، بحواله مشكاة المصابيح ١٤٧٣/٣**

یہ حدیث ایک اعتبار سے پیشین گوئی ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ نصیحت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پچھلی امتیں زوال کے جس قانون کی زد میں آئیں، امت مسلمہ اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اس امت کے بعد کی نسلوں میں بھی وہی تمام بگاڑ لازمی طور پر پیدا ہوں گے جو پچھلی امتوں کی بعد کی نسلوں میں پیدا ہوئے۔

یہ بگاڑ کیا ہے۔ وہ بگاڑ یہ ہے کہ لوگوں کے اندر شعوری ایمان کے بجائے نسلی ایمان پیدا ہو جائے۔ افراد امت میں دینی حساسیت باقی نہ رہے، اس کے بجائے لوگ دینی بے حسی میں جینے لگیں۔ دینی مظاہر تو ان کے درمیان دکھائی دیں مگر ان کے درمیان دینی اسپرٹ کا فقدان ہو چکا ہو۔ ان کا دین قومی دین ہو نہ کہ وہ دین جو خوف خدا کے تحت پیدا ہوتا ہے۔ وہ آخرت کا نام لیتے ہوں مگر ان کی توجہات کا مرکز صرف دنیا کے مفادات بنے ہوئے ہوں۔ وہ عملاً غیر دینی

سرگرمیوں میں مشغول ہوں مگر انہوں نے ان غیر دینی سرگرمیوں پر دین کا لیبل لگا رکھا ہو۔

جب امت پر یہ وقت آ جائے تو اس وقت اس کی اصلاح نو کی ضمانت یہ ہے کہ اس کے درمیان صحیح قسم کے مصلحین پیدا ہوں، ایسے مصلحین جو از سرنو ان کے اندر صحیح دینی بیداری پیدا کریں۔ وہ ان کی پسندیدہ خوراک دینے کے بجائے انہیں نصیحت کریں۔ وہ ان کے عیوب بتا کر انہیں اپنی اصلاح پر ابھاریں۔ وہ انہیں جھنجھوڑیں نہ کہ لوریاں سنا کر ان کو دوبارہ سلا دیں۔

امت مسلمہ اپنے بعد کے زمانے میں یہود و نصاریٰ کی پیروی کرے گی......اس سے مراد صرف شکلی تقلید نہیں ہے یعنی ایسا نہیں ہو گا کہ باعتبار شکل انہوں نے بگاڑ کے جو جو کام کئے ہیں ان کو امت مسلمہ کے لوگ بھی اسی طرح دہرائیں گے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہی بگڑا مزاج امت مسلمہ کے لوگوں میں بھی پیدا ہو جائے گا اس لئے وہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہی سب کام کرنے لگیں گے جو یہود و نصاریٰ نے اپنے دور زوال میں کیا۔

اصل یہ ہے کہ امت کی ابتدائی نسل میں خدا کا دین اپنی اصولی حیثیت میں ہوتا ہے۔ بعد کے زمانے میں وہ اصولی مذہب کے مقام سے گزر کر قومی مذہب کی سطح پر آ جاتا ہے۔ اس کے بعد مختلف قسم کے جو بگاڑ آتے ہیں وہ سب اسی قومی مذہب کے مظاہر ہوتے ہیں۔ اصولی مذہب اصولی کردار پیدا کرتا ہے اور قومی مذہب قومی کردار۔

گروہی صداقت

قرآن کی سورہ نمبر ۲/ میں ارشاد ہوا ہے کہ ــــ اور یہود نے کہا کہ نصاریٰ کسی چیز پر نہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ یہود کسی چیز پر نہیں اور وہ سب آسمانی کتاب پڑھتے ہیں۔

اسی طرح ان لوگوں نے کہا جن کے پاس علم نہیں، انہیں کے جیسا قول۔ پس اللہ قیامت کے دن اس بات کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ جھگڑ رہے تھے (البقرہ ۱۱۳)

قرآن کی اس آیت میں زوال یافتہ امت کی اس خرابی کا ذکر کیا گیا ہے جس کو گروہی صداقت کہا جا سکتا ہے۔ دور زوال میں ایسا ہوتا ہے کہ امت بہت سے گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔ اس کا ہر گروہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ صرف میرا گروہ حق پر ہے اور دوسرے تمام گروہ باطل پر۔ باعتبار حقیقت، ان میں سے ہر ایک کا دین گروہ پرستی ہوتا ہے مگر بطور خود ہر گروہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو حق پرستی پر قائم کر رکھا ہے۔

اس اختلاف کا سبب کیا ہے۔ اصل یہی ہے کہ امت پر جب زوال کا دور آتا ہے تو خدا کی رسی لوگوں کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ اب وہ خدا کو چھوڑ کر کسی نہ کسی غیر خدا کو اپنی توجہات کا مرکز بنا لیتے ہیں۔ یہی چیز اختلافات کا اصل سبب ہے۔ اگر لوگ خدا کی رسی پکڑے ہوئے ہوں تو چونکہ خدا ایک ہے اس لئے ان کی جماعت بھی ایک بنے گی۔ مگر جب خدا کے بجائے دوسری چیزیں لوگوں کی عقیدہ اور توجہ کا مرکز بن جائیں تو چونکہ چیزیں متعدد ہیں اس لئے ان کی جماعتیں بھی متعدد ہو جائیں گی۔

ایک خدا کے ساتھ اعتصام امت کو ایک واحد گروہ بناتا ہے۔ اس کے برعکس جب لوگوں کا تعلق خدا سے کمزور ہو جائے تو ہر طبقہ اپنے حالات کے لحاظ سے الگ الگ مرکز عقیدت بنا لے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امت کی وحدت کمزور ہو جائے گی اور اس کے افراد مختلف گروہوں میں بٹ کر منتشر اور منقسم ہو جائیں گے۔

اس معاملہ کی نسبت سے انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو سچائی کو خدا کی نسبت سے پہچانے۔ اور دوسرے وہ جو سچائی کو اپنے گروہ کی نسبت سے پہچانے۔ خدا کے نزدیک پہلا

گروہ ہدایت پر ہے اور دوسرا گروہ ضلالت پر۔

خدا کو سچائی کی نسبت سے پہچاننے والے وہ لوگ ہیں جو حق کو ماننے کے لئے صرف اس بات کو کافی سمجھیں کہ اس کے حق میں خدا کی دلیل موجود ہو۔ خدا کی دلیل سامنے آنے کے بعد اس کا اعتراف کرنے کے لئے انہیں کسی اور چیز کی ضرورت نہ ہو۔

اس کے برعکس حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو سچائی کو صرف اپنے گروہ کی نسبت سے پہچانتے ہوں۔ ان کے نزدیک حق صرف وہ ہوتا ہے جو ان کے گروہی مسلک کے مطابق ہو، جس کے حق میں ان کے گروہی بزرگوں کا قول موجود ہو، جس کی تائید ان کی گروہی کتابوں سے ہو رہی ہو۔ جس چیز کے حق میں یہ گروہی شہادتیں نہ پائی جائیں اس کی حقانیت پر یقین کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا، خواہ اس کے حق میں کتنی ہی زیادہ خدائی دلیلیں دے دی گئی ہوں۔

ان دونوں جماعتوں میں پہلی جماعت خدا پرست ہے اور دوسری جماعت گروہ پرست، خواہ وہ بطور خود اپنے آپ کو خدا پرست کیوں نہ بتا رہی ہو۔

ناحق مال کھانا

قرآن کی سورہ نمبر ۲/ میں ایک حکم اس طرح آیا ہے۔ اور تم آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق طور پر نہ کھاؤ اور اپنے مال کے مقدمہ کو اس لئے حاکموں کے پاس نہ لے جاؤ تاکہ تم دوسروں کے مال کا کوئی حصہ باطل طریقہ سے کھا جاؤ۔ حالاں کہ تم اس کو جانتے ہو (البقرہ ۱۸۸)

نزول قرآن کے زمانہ میں مدینہ کے بعض مسلمانوں سے ایک کمزوری ظاہر ہوئی۔ اس کے بعد قرآن میں یہ ہدایت اتاری گئی۔ یہ آیت خصوصی طور پر بعد کے مسلمانوں کے لئے بے حد اہم ہے۔ کیوں کہ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق، بعد کی مسلم نسلوں میں یہ خرابی عمومی طور پر پیدا ہو جائے گی جو کہ دور اول میں صرف جزئی طور پر ظاہر ہوئی تھی۔

اس آیت میں مال و جائداد کے ایسے نزاعی معاملات کا ذکر ہے جن میں آدمی کو معلوم ہو

کہ انصاف کی رو سے وہ اس کا حقدار نہیں۔ زیر نزاع جائداد یا مال حقیقۃً اس کے بھائی کا ہے نہ کہ اس کا۔ لیکن اس ذاتی علم کے باوجود وہ اپنے مقدمہ کو انسانی عدالت میں لے جائے۔ جس چیز کو وہ اپنے ضمیر کی عدالت سے بجا طور پر نہیں پا سکتا تھا اس کو خارجی عدالت کے ذریعہ بے جا طور پر حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

انسانی حاکم کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ظاہر کی بنیاد پر فیصلہ کرتا ہے۔ وہ مقدمہ کے الفاظ کو دیکھتا ہے نہ کہ اس کی اصل حقیقت کو۔ اس لئے یہاں یہ موقع ہوتا ہے کہ اپنے مقدمہ کی ایسی لفظی تصویر بنائی جائے جو حاکم یا جج کو گمراہ کر دے۔ وہ ظاہری الفاظ کی بنیاد پر ایسا فیصلہ دے دے جو حقیقت واقعہ سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو۔

جب لوگوں کے دلوں میں آخرت کی پکڑ کا خوف ہو تو وہ مال اور جائداد کے ایسے مقدمات عدالت میں نہیں لے جائیں گے جن کی بابت ان کا دل پیشگی طور پر یہ کہہ رہا ہو کہ یہ میرا حق نہیں ہے۔ مگر جب دلوں میں آخرت کا خوف نہ رہے تو ذاتی مفادات ہی لوگوں کے رہنما بن جاتے ہیں۔ وہ بے تکلف ایسے معاملات کو لے کر انسانی عدالت میں پہنچ جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کو یقین ہوتا ہے کہ وہ مقدمہ کو عدالت کے سامنے ایسے پر فریب الفاظ میں پیش کر سکیں گے جن سے متاثر ہو کر وہ ایک ایسی چیز انہیں دے دے جو از روئے حق ان کی نہیں ہے۔

ضمیر کی عدالت کے سامنے جھک جانا اس بات کی علامت ہے کہ امت زندہ دین پر قائم ہے اور جب لوگ ضمیر کی عدالت کو نظر انداز کر کے اپنے مقدمات انسانی عدالتوں میں لے جانے لگیں تو سمجھنا چاہیے کہ امت اپنے دور زوال میں پہنچ گئی۔

ایک شخص جس کے سینہ میں اللہ کا ڈر ہو، جو آخرت کی پکڑ کا اندیشہ رکھتا ہو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ عدالت میں صرف اپنا جائز حق لینے کے لئے جاتا ہے، نہ کہ عدالت کی طاقت سے دوسروں کے حق پر اپنا قبضہ قائم کرنے کے لئے۔ عدالت کے زور پر ایک ایسی

لو حاصل کرنے کی کوشش کرنا جرم ہے جو حقیقی معنوں میں اس کی نہ ہو۔ جو آدمی
ت کی پکڑ سے ڈرتا ہو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک چیز اس کے قبضہ میں ہو مگر اس
ں کہہ رہا ہو کہ وہ اس کی نہیں ہے تو عدالتی فیصلہ کا انتظار کئے بغیر وہ ایسی چیز کو اصل
ار کے حوالہ کر دے گا۔ کیونکہ اس کو یقین ہو گا کہ جو چیز از روئے واقعہ میری نہیں وہ
انسانی عدالت کے فیصلہ کی بنا پر میری نہیں ہو سکتی، خواہ وہ عدالت کتنی زیادہ بڑی کیوں
ے۔

غیر شرعی بنیاد

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں ارشاد ہوا ہے کہ ـــ اور تم آپس میں ایک دوسرے کے
کو ناحق طور پر نہ کھاؤ اور ان کو حاکموں تک نہ پہنچاؤ تا کہ دوسروں کے مال کا کوئی حصہ تم
تلفی کر کے کھا جاؤ۔ حالاں کہ تم اس کو جانتے ہو (البقرۃ ۱۸۸)

اس سے مراد وہ صورت حال ہے جب کہ ایک چیز جو شرعی قانون کے تحت نہ مل
ہو اس کو غیر شرعی قانون کے زور پر حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایک ایسا مال یا
۔ ایسی جائداد جس کے متعلق معلوم ہو کہ شریعت الٰہی کے مطابق وہ تمہارا حق نہیں ہے
کو غلط تدبیر کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو۔ ایسا نہ کرو کہ ایسے مال اور جائداد
معاملہ کو دنیوی عدالت میں لے جاؤ اور اس کے زور پر وہ چیز حاصل کرنے کی تدبیر کرو
ز روئے شریعت تمہاری نہیں ہے۔

جب بھی کسی مال یا جائداد کا مسئلہ پیدا ہو تو عام حالات میں انسان کا ضمیر ہی یہ بتانے
لئے کافی ہوتا ہے کہ از روئے واقعہ وہ کس کا حق ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کو چاہئے کہ
اپنے ضمیر کے مطابق معاملہ کرے۔ جو اس کا حق ہے اس کو اپنے پاس رکھے اور جو

دوسرے کا حق ہے اس کو دوسرے کے حوالے کر دے۔

تاہم بعض حالات میں ضمیر کی رہنمائی واضح نہیں ہوتی۔ایسی صورت میں آدمی کو چاہئے کہ شریعت کے معلوم قوانین کی روشنی میں اس کو جانچے اور شریعت کے ذریعہ جو فیصلہ مل رہا ہو اس کو خدائی فیصلہ سمجھ کر اسی پر راضی ہو جائے۔اگر معاملہ دو فریق کے درمیان نزاعی ہو اور بطور خود اس کا فیصلہ نہ کیا جا سکتا ہو تو دونوں فریقوں کا فرض ہے کہ وہ اس معاملہ کو شرعی عدالت میں لے جائیں۔اگر باضابطہ شرعی عدالت کا نظام قائم نہ ہو تو دوسری صورت یہ ہے کہ اس معاملہ میں علماء اسلام کی طرف رجوع کیا جائے اور یہ علماء اپنے شرعی علم کے مطابق جو فیصلہ دیں اس کو بلا بحث مان لیا جائے۔

نزاعی معاملات میں یہی طریقہ خدا کا مطلوب طریقہ ہے۔جو لوگ ایسا کریں کہ وہ اپنا مقدمہ غیر شرعی عدالتوں میں لے جائیں، جو مال یا جائداد انہیں شرعی قانون کے تحت نہیں مل سکتا تھا اس کو غیر شرعی عدالت کے زور پر حاصل کرنے کی کوشش کریں وہ بلاشبہ خدا کی نظر میں سرکشی کے مجرم ہیں۔ایسا کرنے والے لوگ بیک وقت اپنے لئے دو خطرہ مول لے رہے ہیں۔ایک یہ کہ غیر شرعی عدالت کے زور پر اپنے حق میں فیصلہ لینے کے باوجود زیر بحث معاملہ میں ان کی حیثیت خدا کے نزدیک غاصب کی رہے گی نہ کہ مالک کی۔ دوسرے یہ کہ موت کے بعد جب وہ خدا کی برتر عدالت میں پہنچیں تو وہاں ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو خدا کے نافرمانوں کے لئے مقدر ہے۔

موجودہ زمانہ میں بھی اکثر ملکوں (مثلاً ہندستان) میں تقریباً یہی صورت حال قائم ہے یعنی ہر ملک میں بیک وقت دو مختلف قسم کے فیصلے حاصل کرنے کے انتظامات ہیں ایک طرف علمائے دین ہیں، جو لوگ اپنے مسائل میں ان علماء سے رجوع کریں، وہ شریعت کی

روشنی میں ان کے معاملات کا فیصلہ دیں گے۔ دوسری طرف ملکی عدالتیں ہیں جہاں انسانی ساخت کے قوانین رائج ہیں، جہاں وکیلوں کو بڑی بڑی فیس دے کر ان کے ذریعہ غلط طور پر اپنے موافق فیصلے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

اس طرح دنیا کے اکثر ملکوں میں مسلمان دوبارہ اسی آزمائش میں مبتلا ہیں جس آزمائش میں مدینہ کے دور اوّل کے مسلمان مبتلا تھے۔ اب جو مسلمان ایسا کریں کہ جب بھی ان کے درمیان کوئی نزاع پیش آئے خواہ وہ نکاح وطلاق کا معاملہ ہو یا مال اور جائداد کا معاملہ، وہ اس کا فیصلہ خدائی شریعت سے کرائیں، یعنی وہ اپنے اس طرح کے معاملات کو دینی علماء (یا دارالافتاء اور دارالقضاء) کے پاس لے جائیں۔ معاملہ کے دونوں فریق اپنا اپنا نقطۂ نظر علماء کے سامنے بیان کریں۔ اس کے بعد وہ شریعت کی روشنی میں جو فیصلہ دیں اس کو دونوں فریق پوری طرح مان لیں۔ اس کے بعد نہ وہ اپنی نزاع کو دوبارہ جاری رکھیں اور نہ ایسا کریں کہ جس فریق کے خلاف فیصلہ ہوا ہو وہ اس کو لے کر ملکی عدالت تک پہنچ جائے اور دوبارہ وہاں از سر نو اس کے خلاف مقدمہ شروع کرادے۔

اس کے برعکس جو مسلمان اپنے نزاعی معاملات کو علماء کے پاس نہ لائیں بلکہ وہ اس کو ملکی عدالتوں میں لے جاکر ہر قیمت پر اپنے حق میں فیصلہ لینے کی کوشش کریں۔ ایسے لوگ بلاشبہ مذکورہ آیت کا مصداق ہیں۔ وہ خدا اور رسول کو چھوڑ کر شیطان (طاغوت) کے پاس جارہے ہیں۔

یہ صورت حال تمام مسلمانوں کے لئے ایک سنگین آزمائش ہے۔ جو لوگ اپنے نزاعی معاملات کا فیصلہ خدائی شریعت کے مطابق لیں اور برضا ورغبت اس کو قبول کرلیں، وہ اس آزمائش میں پورے اترے۔ ایسے لوگ خدا کے یہاں مخلص مسلمان ثابت ہوں گے

اور خدائی انعامات کے مستحق قرار پائیں گے۔

اس کے برعکس جو لوگ ایسے معاملات میں خدائی شریعت کو نظر انداز کر دیں، او
مفاد پرستی اور خود غرضی کے جذبہ کے تحت اپنا مقدمہ ان عدالتوں میں لے جائیں جن کے
متعلق ہندستان کے ایک ماہر قانون نے بجا طور پر کہا ہے کہ یہ عدالتیں مبنی بر مقدمہ بازی
(litigation-based) ہیں نہ کہ مبنی بر صداقت (truth-based)۔ ایسے لوگ بلاشبہ اسی
مجرمانہ ذہنیت کے شکار ہیں جس کا ذکر اوپر کی آیت میں آیا ہے ان عدالتوں کے متعلق
معلوم ہے کہ وہاں انصاف کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ وہاں معاملات کا فیصلہ قانونی نکتوں
پر ہوتا ہے نہ کہ حقیقی واقعات پر۔ اب جو لوگ ایسا کریں کہ وہ خدائی شریعت کے مطابق
فیصلہ لینے کے لئے تیار نہ ہوں۔ بلکہ مذکورہ قسم کی عدالتوں میں اپنے معاملات لے جائیں و
بلاشبہ اللہ کے پرستار نہیں، بلکہ وہ طاغوت کے پرستار ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے سخت
اندیشہ ہے کہ وہ "نماز روزہ" کے باوجود خدا کے نزدیک مجرم قرار پائیں اور آخرت میں ان
انجام وہ ہو جو غیر خدا کے پرستاروں کے لئے مقدر کیا گیا ہے۔

تحریف کتاب

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں یہود کے علماء کی بابت ارشاد ہوا ہے کہ پس خرابی ہے ا
لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے
ہے۔ تاکہ اس کے ذریعہ تھوڑی سی پونجی حاصل کرلیں۔ پس خرابی ہے اس چیز کی بدولت
جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور ان کے لئے خرابی ہے اپنی اس کمائی سے۔ (البقرہ۔ ۷۹)

کسی امت کے بعد کے لوگ جب زوال کا شکار ہوتے ہیں۔ تو ان کا حال یہ ہو جاتا
کہ ظاہری عقیدہ کے اعتبار سے تو وہ خدا کی کتاب کو مانتے ہیں مگر ان کی عملی زندگی سر تا

کتاب الٰہی سے آزاد ہو جاتی ہے۔ وہ خدا کی کتاب کا زبانی اقرار کرنے کے باوجود اپنی زندگی کو پوری طرح خواہشات کے راستہ پر چلا دیتے ہیں۔

اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر، اب بھی وہ اپنے کو حق پرست ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ خواہ وہ عملی اعتبار سے کتنا ہی زیادہ منحرف ہو جائیں مگر خدا پرست ہونے کا لیبل اب بھی ان کے اوپر لگا رہے۔ اس مقصد کے لئے وہ خدا کی کتاب کی ایسی خود ساختہ تفسیر و تعبیر کرنے لگتے ہیں جس کے تحت ان کی بگڑی ہوئی زندگی عین خدائی شریعت کے مطابق نظر آنے لگے۔

یہودی علماء نے خدا کی کتاب میں تحریف کا یہ کام بہت بڑے پیمانے پر کیا۔ انھوں نے اپنے فاسد خیالات اور غلط کردار کو درست ثابت کرنے کے لئے خدا کی کتاب میں تحریفات کر کے اس کو اپنے مطابق ڈھال لیا۔ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق، یہی فعل بعد کے حامل کتاب بھی انجام دیں گے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ یہود نے کتاب کے متن میں تحریفات کیں اور بعد کے لوگ متن کی تشریح میں یہی کام انجام دیں گے۔

غلط روی ایک عام انسانی کمزوری ہے۔ مگر جب کوئی حامل کتاب گروہ غلط روی کا شکار ہو جائے تو وہ اپنی مخصوص نفسیات کی بنا پر یہ چاہنے لگتا ہے کہ وہ جو کچھ کرے وہی خدا کی کتاب میں بھی لکھا ہوا ہو۔ اس قسم کی خود ساختہ تفسیر و تشریح بلاشبہ بہت بڑا جرم ہے۔ مگر جب زوال کا دور آتا ہے تو وہ اپنے ساتھ بے حسی بھی ضرور لے آتا ہے۔ اب لوگ خدائی معاملات میں زیادہ حساس نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ دور زوال میں حسب حال دینی تشریحات عام ہو جاتی ہیں۔ لوگ دنیا کے فائدہ کی خاطر دین کو بدل ڈالتے ہیں۔

تحریف کا یہ معاملہ ہمیشہ دور زوال میں پیش آتا ہے جب کسی حامل کتاب پر زوال

آتا ہے تو وہ اس معنی میں نہیں ہوتا کہ وہ علانیہ طور پر دین سے بے تعلق ہو جائے۔ وہ ہمیشہ اس معنی میں ہوتا ہے کہ لوگ بظاہر تو دین سے وابستگی کا اعلان کرتے ہیں مگر ان کا سرکش مزاج یا ان کی خود غرضانہ نفسیات دین کے تابع بننے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ یہی وہ وقت ہے جب کہ ان کے درمیان وہ عمل شروع ہو جاتا ہے جس کو قرآن میں تحریف کہا گیا ہے۔ اب وہ لوگ یہ کرتے ہیں کہ خدا کے کلام کو بدل کر یا اس کی خود ساختہ تشریح کرکے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہی خود خدا کے دین کا تقاضا بھی ہے۔ یہ گویا بے عملی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ بے عملی خدا کے یہاں معاف ہو سکتی ہے مگر سرکشی یقینی طور پر قابل معافی نہیں۔

فرضی کریڈٹ

قرآن کی سورہ نمبر ۳ میں اہل کتاب کے بارے میں ارشاد ہوا ہے--- جو لوگ اپنے کئے ہوئے پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کام انھوں نے نہیں کیا اس پر ان کی تعریف ہو، ان کو عذاب سے بری نہ سمجھو۔ ان کے لئے دردناک عذاب ہے (آل عمران۔۱۸۸)

آسمانی کتاب کے حامل کسی گروہ پر زوال آتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ وہ خدا اور رسول کا نام لینا چھوڑ دے یا خدا کی کتاب سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کر دے۔ دین ایسے گروہ کی نسلی روایات میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہ اس کا پر فخر قومی اثاثہ بن جاتا ہے۔ اور جس چیز سے اس طرح کا نسلی اور قومی تعلق قائم ہو جائے اس سے علیحدگی کسی گروہ کے لئے ممکن نہیں ہوتی۔ تاہم اس کا یہ تعلق محض رسمی تعلق ہوتا ہے نہ کہ فی الواقع کوئی حقیقی تعلق۔

وہ اپنی دنیوی سرگرمیاں بھی دین کے نام پر جاری کرتے ہیں، وہ بے دین ہو کر بھی اپنے کو دیندار کہلانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہنے لگتے ہیں کہ ان کو اس کا کریڈیٹ دیا جائے جس کو

انھوں نے کیا ہی نہیں۔ وہ نجات اخروی سے بے فکر ہو کر زندگی گزارتے ہیں اور اسی کے ساتھ ایسے عقیدے بنا لیتے ہیں جس کے مطابق ان کو اپنی نجات آخرت بالکل محفوظ نظر آتی ہے۔ وہ اپنے خود ساختہ دین پر چلتے ہیں مگر وہ اپنے کو دین خداوندی کا علم بردار بتاتے ہیں۔ وہ دنیوی مقاصد کے لئے سرگرم ہوتے ہیں اور اپنی سرگرمیوں کو آخرت کا عنوان دیتے ہیں۔ وہ خود ساختہ سیاست چلاتے ہیں اور اس کو خدائی سیاست ثابت کرتے ہیں۔ وہ قومی مفادات کے لئے اٹھتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ وہ خیر امت کا کردار ادا کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں۔

مگر کوئی شخص بے دینی کو دین کہنے لگے تو اس بنا پر وہ اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا ...... آدمی دنیا کی طرف دوڑے اور آخرت سے بے پرواہ ہو جائے تو یہ صرف گمراہی ہے اور اگر وہ اپنے دنیوی کاروبار کو خدا اور رسول کے نام پر کرنے لگے تو یہ گمراہی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ کیوں کہ یہ ایسے کام پر انعام چاہنا ہے جس کو آدمی نے انجام ہی نہیں دیا۔ یہی حال امت مسلمہ کے افراد کا بھی اس وقت ہو جاتا ہے جب کہ امت اپنے دور زوال میں پہنچ چکی ہو۔

امت کے افراد میں زندہ ایمان موجود ہو تو ان کی حساسیت پوری طرح بیدار رہتی ہے ان کی یہ حساسیت اس میں رکاوٹ بن جاتی ہے کہ وہ ایسے کام کا کریڈیٹ لینا چاہیں جس کو حقیقی اعتبار سے انھوں نے انجام ہی نہیں دیا مگر جب قوم پر زوال آتا ہے تو اس میں یہ حساسیت زندہ نہیں رہتی۔ اب اس کے افراد بے حسی کا شکار ہو جاتے ہیں یہی بے حسی وہ چیز ہے جو انھیں آمادہ کرتی ہے کہ وہ ایسے عمل کا انعام لینے کے لئے دوڑ پڑے جس کو از روئے واقعہ انھوں نے انجام ہی نہ دیا ہو۔

خدا کی رحمت سے دوری

قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں یہود کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ ...... بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر لعنت کی گئی داؤد اور عیسی بن مریم کی زبان سے۔ اس لئے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے برائی سے جو وہ کرتے تھے۔ نہایت برا کام تھا جو وہ کر رہے تھے۔ (المائدہ۔۷۹)

لعنت کے معنی عربی زبان میں رحمت اور خیر سے دور کرنے کے ہیں (**الابعاد والطرد من الخیر ، لسان العرب**) قرآن کی آیت بتاتی ہے کہ یہود جب دینی گراوٹ کا شکار ہوئے تو حضرت داؤد اور حضرت عیسی کے ذریعہ ان پر لعنت کی گئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انہوں نے آکر یہ کہا کہ اے یہود تم پر لعنت ہو۔ بلکہ انہوں نے یہ کیا کہ یہود کی چھپی ہوئی بے دینی کو ظاہر (expose) کر دیا۔ انہوں نے ان کی اصل حقیقت کو بے نقاب کر دیا۔

زوال کے دور میں کسی امت سے جو چیز رخصت ہوتی ہے وہ حقیقت دین ہے۔ جہاں تک رسوم و ظواہر کا تعلق ہے وہ اب بھی پوری دھوم کے ساتھ اس کے یہاں موجود رہتے ہیں۔ یہی حال یہود کا اپنے دور زوال میں ہوا۔ ان کے یہاں دین کی اصل حقیقت گم ہو چکی تھی مگر لباس، وضع قطع، ظاہری عبادات، دین کے نام پر نمائشی سرگرمیاں، اس قسم کی چیزیں ان کے یہاں دھوم کے ساتھ جاری تھیں۔ مگر دین کے جو حقیقی تقاضے ہیں وہ ان کے یہاں موجود نہ تھے۔ ان کے پیغمبر نے اس معاملہ کو طاقتور انداز میں بیان کر کے ان کی حقیقت کھول دی۔

اس آیت میں اس سلسلہ میں ایک بنیادی چیز کی نشان دہی کی گئی ہے، اور وہ ہے نہی عن المنکر کی اہمیت ۔ یہود جزئی اور ظاہری نوعیت کی چیزوں میں دین کی خوب نمائش کرتے تھے مگر اسی کے ساتھ ان کا یہ حال تھا کہ معاشرہ میں وہ دیکھتے تھے کہ لوگ اخلاقی برائیاں کر رہے ہیں، لوگ ایک دوسرے کے ساتھ زیادتیاں کر رہے ہیں، لوگ معاملات میں خدائی احکام کو چھوڑے ہوئے ہیں مگر وہ دیکھنے اور جاننے کے باوجود چپ رہتے تھے۔ وہ برائی کرنے والوں کی مذمت نہیں کرتے تھے۔ یہی دو عملی ان کو رحمت خداوندی سے دور کرنے کا باعث بنی۔

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ آئی ہے اس سے اس معاملہ کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ اس کے مطابق، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل جب گناہوں میں مبتلا ہوئے تو ان کے علماء نے ان کو ان گناہوں اور برائیوں سے روکا مگر وہ ان سے نہیں رکے۔ اس کے باوجود علماء ان کی مجلسوں میں بیٹھتے رہے۔ اور ان کے ساتھ کھاتے پیتے رہے۔ پھر اللہ نے ایک کا اثر دوسرے پر ڈال دیا اور پھر داؤد اور عیسیٰ کی زبان سے ان پر لعنت کی۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ پھر آپ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم کو معروف کا حکم دینا ہوگا اور تمہیں منکر سے روکنا ہوگا اور تمہیں ظالم کا ہاتھ پکڑنا ہوگا تمہیں لوگوں کو حق کی طرف موڑنا ہوگا ورنہ اللہ تم پر بھی اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح یہود پر لعنت کی (تفسیر ابن کثیر ۲/ ۸۳)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مراد اصلاً کوئی حکومتی نظام نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں ہر مسلمان، خصوصاً علماء کے اندر یہ اسپرٹ موجود ہو کہ وہ برائی کو کسی حال میں گوارہ نہ کریں۔ معاشرہ میں خیر کی نصیحت کا ماحول ہو۔ لوگوں میں

یہ عمومی مزاج ہو کہ وہ معاشرہ کے اندر برائی اور زیادتی کو کسی حال میں برداشت نہ کریں۔ جب بھی ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر کسی قسم کی زیادتی کرتا ہوا دکھائی دے تو پورا معاشرہ اس کو رد کر دے۔ ایسے مسلمان کو سمجھایا جائے۔ اگر سمجھانا کافی نہ ہو تو معاشرہ کے لوگ اس کی کھلی مذمت کریں۔ اس پر اتنا زیادہ معاشرتی دباؤ ڈالا جائے کہ وہ اپنی غلط کاری کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔

مسلم معاشرہ میں برائی کی مذمت کرنا اور برائی کرنے والے کو روکنا اتنا زیادہ ضروری ہے کہ اگر کوئی مسلم معاشرہ اس ذمہ داری کو ادا نہ کرے تو اس کیلئے اندیشہ ہے کہ وہ خدا کی رحمت سے محروم کر دیا جائے، خواہ اس کے درمیان نمائشی مذہب پوری دھوم کے ساتھ موجود ہو۔

فرضی عقیدہ

قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں یہود و نصاری کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ ــــــ اور یہود و نصاری کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ تم کہو کہ پھر وہ تمہارے گناہوں پر تم کو سزا کیوں دیتا ہے۔ نہیں بلکہ تم بھی اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق میں سے ایک آدمی ہو۔ وہ جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔ اور اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (المائدہ ۱۸)

دور زوال میں امت کے افراد میں جو غلط تصورات پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اس بھرم میں پڑ جاتے ہیں کہ وہ دوسروں سے افضل ہیں۔ ان کا معاملہ خدا کے یہاں دوسروں سے مختلف ہو گا۔ دوسرے لوگ جن باتوں پر پکڑے جائیں گے اس پر ان کی

پکڑ ہونے والی نہیں۔

اصل یہ ہے کہ امت جب خیر وصلاح کی حالت پر ہوتی ہے تو اس کو خدا کی طرف سے بشارتیں ملتی ہیں۔ اس کے افراد کے لئے رحمت و مغفرت کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ یہ وعدہ یا بشارت تمام تر ان کے حسن عمل کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ امت سے محض نسلی تعلق کی بنیاد پر۔ دور زوال میں لوگ اس فرق کو بھول جاتے ہیں۔ وہ ان بشارتوں کو نسل اور وراثت سے متعلق سمجھ لیتے ہیں جو صرف کردار اور صالحیت سے تعلق رکھتی تھیں۔ فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی یہی غلطی ہے جس کی بنا پر بعد کو آنے والے زوال یافتہ لوگ ایک ایسے انعام کو اپنا حصہ سمجھ لیتے ہیں جس کا استحقاق انہیں سرے سے حاصل ہی نہیں۔

خدا کے نزدیک ہر آدمی یکساں ہے۔ خدا ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان صرف کردار کی بنیاد پر فرق کرتا ہے نہ کہ کسی اور بنیاد پر۔ امت کے افراد میں جب دین کا حقیقی شعور زندہ ہو تو کسی اشتباہ یا مغالطہ کے بغیر وہ اس حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا رب ان کے ساتھ دوسروں سے مختلف معاملہ صرف اس وقت کرے گا جب کہ ان کا حقیقی عمل دوسروں سے مختلف ہو۔ بصورت دیگر، خدا کے یہاں ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو ان کے جیسے دوسرے انسانوں کا انجام ہونے والا ہے۔

لیکن امت جب اپنے دور زوال میں پہنچ جائے تو اس کے افراد حقائق کے بجائے خوش فہمیوں میں جینے لگتے ہیں۔ اس دور زوال میں امت کے افراد میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا۔

نسلی نجات یا گروہی نجات کا تصور قرآن وحدیث میں سراسر اجنبی ہے۔ خدا کی نظر میں تمام انسان یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ گروہ یا نسل جیسی چیزوں سے ایک انسان اور

دوسرے انسان میں فرق نہیں ہوتا۔ فرق کا سبب صرف ایک ہے اور وہ حقیقی عمل ہے۔ کوئی شخص اگر اپنے قول و عمل کے اعتبار سے اپنے آپ کو دوسروں سے مختلف ثابت کرے تو وہ خدا کی نظر میں مختلف انسان قرار پائے گا اور اس کا انجام دوسروں سے مختلف ہوگا۔

قرآن کی سورہ نمبر ۴۹ میں ارشاد ہوا ہے کہ ---اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تم کو قوموں اور خاندانوں میں تقسیم کردیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ بیشک اللہ جاننے والا، خبر رکھنے والا ہے۔ (الحجرات ۴۹)

اس سے معلوم ہوا کہ نسلی یا گروہی یا ملی بنیاد پر لوگوں کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے وہ صرف پہچان کے لئے ہے۔ اس فرق کا کوئی بھی تعلق فلاح و نجات سے نہیں۔ فلاح و نجات کا معاملہ سراسر انفرادی ہے۔ کوئی شخص خواہ کسی بھی گروہ سے تعلق رکھتا ہو، وہ اگر متقی ہے تو خدا کے یہاں اس کا درجہ ہے، ورنہ وہ دوسرے انسانوں کی طرح صرف ایک انسان ہے۔ یہ معاملہ ایک اور آیت میں مزید واضح کیا گیا ہے۔ یہ البقرہ کی آیت نمبر ۶۲ ہے۔

اس آیت میں چار معروف مذہبی گروہوں کا ذکر ہے۔ مسلمانوں کو بھی ان چار مذہبی گروہوں میں سے ایک مذہبی گروہ کی حیثیت دی گئی ہے۔ گویا کہ مذہبی گروہ یا مذہبی ملت ہونے کے اعتبار سے مسلمانوں کا معاملہ کچھ بھی دوسروں سے مختلف نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی بھی گروہ (بشمول مسلمان) محض ایک خاص گروہ ہونے کی حیثیت سے فلاح و نجات کا مستحق نہیں ہوسکتا۔

آیت کے مطابق خدا کے یہاں انعام کا استحقاق صرف ان افراد کے لئے ہے جو اللہ اور آخرت پر یقین کا ثبوت دیں اور اپنی زندگیوں میں عمل صالح کا طریقہ اختیار کریں۔ گویا نجات آخرت کا تعلق اس بات سے ہے کہ کسی فرد نے اپنے آپ کو کیسا بنایا، نہ یہ کہ وہ کس خاص گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔

سنت الٰہی

بنی اسرائیل (یہود) کے دور زوال کی تاریخ کا ایک واقعہ قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: اور ان سے اس بستی کا حال پوچھو جو دریا کے کنارے تھی۔ جب وہ سبت (سنیچر) کے بارے میں تجاوز کرتے تھے۔ جب ان کے سبت کے دن ان کی مچھلیاں پانی کے اوپر آتیں اور جس دن سبت نہ ہوتا تو نہ آتیں۔ ان کی آزمائش ہم نے اس طرح کی، اس لئے کہ وہ نافرمانی کر رہے تھے۔ (الاعراف۔ ۱۶۳)

اس آیت میں ایک خدائی قانون کو ایک تاریخی مثال کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے، وہ قانون یہ ہے کہ کتاب خداوندی کی حامل قوم کو ابتداً آسان حالات میں دین پر عمل کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ مگر جب وہ اس کی تعمیل نہ کرے تو حالات میں سختی پیدا کرنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ آسانی کے بعد مشکل، اور مشکل کے بعد مشکل تر، حتی کہ وہ وقت آجاتا ہے جب کہ دینی تقاضے پر عمل کرنا ہی حالات کے اعتبار سے اس کے لئے ممکن نہ رہے۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ تذکیر القرآن)

غور کیجئے تو موجودہ مسلم نسلوں کا معاملہ عالمی سطح پر ایسا ہی ہو رہا ہے۔ دعوت امت محمدی کی لازمی ذمہ داری ہے۔ یعنی خدا کے بندوں تک خدا کا پیغام رحمت پہنچانا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے چونکہ یہ کام انجام نہیں دیا اس لئے ہر اگلے مرحلے میں اسی نسبت

سے ان کے لئے حالات سخت سے سخت تر ہوتے جارہے ہیں۔

اس معاملہ کی ایک نمائندہ مثال ہندستان ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کی لازمی ذمہ داری تھی کہ وہ اس ملک کے غیر مسلموں سے معتدل تعلقات قائم کر کے انھیں خدا کے دین رحمت سے باخبر کریں۔

اٹھارہویں صدی کے آخر تک مسلمان برصغیر میں حاکمانہ حیثیت رکھتے تھے اس طرح انھیں یہ موقع حاصل تھا کہ وہ "الید العلیا" بن کر پوری آزادی کے ساتھ دعوت کا کام کر سکتے تھے مگر یہ مدت گزر گئی اور انھوں نے اپنی دعوتی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کیا۔

انیسویں صدی میں ہندستان میں انگریزوں کا سیاسی غلبہ ہو گیا۔ تاہم اب بھی دعوتی مواقع کسی قدر تبدیلی کے ساتھ موجود رہے۔ انگریزوں نے اپنی سیاسی مصلحت کے تحت ملک کے مختلف طبقوں کے درمیان توازن برقرار رکھا تھا۔ اس نے مسلمانان ہند کو یہ موقع دے دیا کہ وہ مساویانہ سطح پر برادران وطن کو دعوت پہنچائیں۔ مگر یہ موقع بھی انھوں نے کھو دیا۔ اس موقع کو انھوں نے اس طرح برعکس طور پر استعمال کیا کہ غیر مسلموں سے مناظرہ بازی جیسے کام کر کے ان کو اسلام سے دور کر دیا یہاں تک کہ یہ موقع بھی ختم ہو گیا۔

۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد ایک نیا دور آیا۔ اب سیکولرزم کے اصول کے تحت نیا دستور بنایا گیا۔ اس دور میں پہلا موقع تو ان کے لئے ختم ہو گیا۔ البتہ سیکولر دستور کے تحت انھیں ایک حقوق یافتہ اقلیت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ان کو دستور کی رو سے یہ حق دیا گیا کہ وہ جس مذہب کو چاہیں مانیں اور ملک میں پر امن طور پر جس مذہب کی چاہیں اشاعت کریں۔ مگر پچاس سال کی مدت گزر گئی اور وہ اس امکان کو استعمال کرنے میں بھی مکمل طور پر ناکام رہے۔

۱۹۹۸ سے ملک میں ایک نیا سیاسی دور شروع ہوا ہے۔ اس دور کے بارے میں تقریباً

یقینی ہے کہ یہ دور دعوتی اعتبار سے ان کے لئے مشکل ترین دور ہوگا۔ نئے ہندوستانی حکمراں دستور ہند میں مذہبی آزادی کی دفعہ (آرٹیکل ۲۵) کو بدلنے کی کوشش کریں گے۔ اور ایسے قوانین بنائیں گے جن کے تحت دعوتی کام کرنا مشکل ہو جائے۔

یہ عین وہی سنت الٰہی ہے جو ہمارے حالات کے لحاظ سے ہمارے اوپر نافذ ہو رہی ہے۔ حاکمانہ حیثیت کے بعد مساویانہ حیثیت، مساویانہ حیثیت کے بعد حقوق یافتہ حیثیت، حقوق یافتہ حیثیت کے بعد دعوتی اعتبار سے بے حقوق حیثیت۔

بعد کی نسلیں

قرآن کی سورہ نمبر ۷ میں سابق اہل کتاب کے بارے میں ارشاد ہوا ہے۔ پھر ان کے پیچھے ناخلف لوگ آئے جو کتاب کے وارث بنے، وہ اسی دنیا کی متاع لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم یقیناً بخش دیئے جائیں گے۔ اور اگر ایسی ہی متاع ان کے سامنے پھر آئے تو اس کو لے لیں گے۔ کیا ان سے کتاب میں اس کا عہد نہیں لیا گیا ہے کہ اللہ کے نام پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ کہیں۔ اور انھوں نے پڑھا ہے جو کچھ اس میں لکھا ہے۔ اور آخرت کا گھر بہتر ہے ڈرنے والوں کے لئے کیا تم سمجھتے نہیں۔ (الاعراف۔ ۱۶۹)

کسی امت کو جب خدا کی کتاب ملتی ہے تو اس کی پہلی نسل کے لوگوں کے لئے اس کی حیثیت ایک عہد نامہ کی ہوتی ہے۔ وہ اس کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ لیتے ہیں۔ ان کو یقین ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایک خدائی گائڈ بک ہے اور اس لئے ہے کہ وہ اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالیں۔ وہ اس کو اپنے حق میں ایک سنگین عہد و پیمان کا معاملہ سمجھتے ہیں۔

مگر امت کی اگلی نسلوں میں یہ شعور زندہ حالت میں باقی نہیں رہتا۔ خدا کی کتاب ان کے بعد کے لوگوں کو بطور وراثت ملتی ہے، وہ ان کے لئے ذاتی دریافت کے ہم معنی نہیں

ہوتی۔ جب یہ مرحلہ آتا ہے تو امت کے لوگ ایمانی گراوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں اس گراوٹ کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ان کے عمل کا نشانہ بدل جاتا ہے۔ ابتدائی نسلوں میں دین اگر ان کا نشانۂ عمل تھا تو بعد کی نسلوں میں دنیا ان کا نشانۂ عمل بن جاتی ہے۔

رسمی اور ظاہری اعتبار سے دین اب بھی ان کے یہاں دکھائی دیتا ہے مگر حقیقی اسپرٹ کے اعتبار سے وہ ان کے درمیان موجود نہیں ہوتا۔ اب ان کی عملی زندگی پوری طرح دنیا طلبی کے راستہ پر چل پڑتی ہے۔ مادی ترقی ان کا اصل مقصود بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ظاہری پہلوؤں کو ہٹا کر دیکھا جائے تو ان میں اور دوسری قوموں میں کوئی حقیقی فرق باقی نہیں رہتا۔

اس غیر دینی روش کو ہمہ تن اختیار کرنے کے باوجود وہ اپنی آخرت کی کامیابی کے معاملے میں پوری طرح مطمئن رہتے ہیں۔ اس اطمینان کا راز ان کا یہ خود ساختہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ہمارا معاملہ دوسروں سے مختلف ہے۔ ہم ہر حال میں بخش دیئے جائیں گے۔: ہمارے پیغمبر اور ہمارے بزرگ ہر حال میں ہم کو آخرت کے عذاب سے بچالیں گے۔

اس قسم کا عقیدہ سراسر فریب ہے۔ قرآن کے مطابق وہ کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں اس قسم کا خود ساختہ عقیدہ نہ پچھلی امت کے لوگوں کے لئے کار آمد ہو سکتا ہے اور نہ بعد کی امت کے لوگوں کے لئے۔

اکابر پرستی

قرآن کی سورہ نمبر ۹ میں دور زوال کے اہل کتاب کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے احبار اور اپنے رہبان کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا (التوبہ۔۳۱)

اس آیت میں اہل کتاب کی اس گمراہی کی نشاندہی کی گئی ہے کہ انھوں نے اپنے علماء

اور مشائخ کو رب کا درجہ دے دیا تھا۔ رب بنانے سے کیا مراد ہے۔ اس کی وضاحت ایک روایت سے ہوتی ہے۔ عدی ابن حاتم جو عہد جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے۔ آپ نے مذکورہ آیت انھیں سنائی۔ اس کو سن کر عدی بن حاتم نے کہا کہ اے خدا کے رسول انھوں نے اپنے احبار و رھبان کی عبادت تو نہیں کی تھی۔ آپ نے جواب دیا ہاں، ان کے احبار اور رہبان نے ان پر حلال کو حرام کیا اور حرام کو حلال کیا تو انھوں نے ان کی پیروی کی یہی ان کی طرف سے ان کی عبادت ہے۔ (تفسیر ابن کثیر۔ ۳۴۸/۲)

دور زوال میں کسی امت میں جو سب سے بڑی کمی پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے بارے میں اس کا عقیدہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کا عقیدہ معرفت پر مبنی نہ ہو کر تقلید پر قائم ہو جاتا ہے۔ اس کے افراد غیر محسوس خدا کی بڑائی میں نہیں جیتے بلکہ محسوس خداؤں کی بڑائی میں گم رہتے ہیں۔ یہی وہ دور ہے جب کہ امت اس خرابی میں مبتلا ہو جاتی ہے جس کا اوپر کی آیت میں ذکر ہوا۔

اس دور زوال میں امت اپنے قومی بڑوں کو وہ درجہ دے دیتی ہے جو صرف خدا کے لئے خاص ہے خدا کا مقام یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہے اس کو بلا بحث مان لیا جائے۔ زوال یافتہ امت اپنے قومی بڑوں کے معاملہ میں یہی کرتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں بلا بحث ان کو تسلیم کر لیتی ہے۔ حتی کہ اگر کوئی مصلح ان قومی بڑوں کی کسی بات پر تنقید کرے تو یہ لوگ اس پر اسی طرح برہم ہو جائیں گے جس طرح خدا کے خلاف بات پر انھیں برہم ہونا چاہیے۔

مومن وہ ہے جو خداوند عالم کی بڑائی میں جئے۔ ایسے انسان کو خدا کے سوا ہر دوسری بڑائی چھوٹی نظر آتی ہے۔ لیکن جن لوگوں کا دین رسمی عقیدہ پر قائم ہو، جنھوں نے خدا کو

اس کی عظمتوں کے ساتھ دریافت نہ کیا ہو وہ اپنے خود ساختہ اکابر کو بڑا سمجھ لیتے ہیں۔ وہ مخلوق کو وہ درجہ دے دیتے ہیں جو صرف خالق کے لئے خاص ہے۔

جب کسی قوم پر اس قسم کا زوال آتا ہے۔ تو اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس قوم کے لئے دین کا ماخذ بدل جاتا ہے۔ دین میں ماخذ کی حیثیت صرف خدا اور رسول کو حاصل ہے۔ مومن کو اپنا عقیدہ یا عمل براہ راست خدا سے اور اس کے رسول سے اخذ کرنا ہے۔ مگر جب کسی قوم پر مذکورہ قسم کا زوال آتا ہے تو اس کے یہاں دین کا ماخذ بدل جاتا ہے اب وہ اپنا دین اپنے علماء اور اپنے بزرگوں سے لینے لگتے ہیں۔ وہ اپنے مفروضہ اکابر کو وہ درجہ دے دیتے ہیں جو درجہ انھیں صرف خدا اور اس کے رسول کو دینا چاہیئے۔

پرستش ایک فطری جذبہ ہے۔ وہ ہر انسان کی داخلی شخصیت میں آخری حد تک سرایت کئے ہوئے ہے۔ انسان خود اپنی فطرت کے تحت مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی کو اپنی پرستش کا مرکز بنائے صاحب معرفت انسان ایک خدا کو پرستش کے اس جذبہ کا مرکز بناتا ہے۔ مگر جو لوگ معرفت سے خالی ہوں وہ ہر اس چیز کی پرستش کرنے لگتے ہیں جو بظاہر انہیں بڑی دکھائی دے۔

کتاب کو پس پشت ڈالنا

قرآن کی سورہ نمبر ۳ میں یہود کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ .... اور جب اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا کہ تم خدا کی کتاب کو پوری طرح ظاہر کرو گے اور اس کو نہیں چھپاؤ گے۔ مگر اس کو انھوں نے پس پشت ڈالدیا اور اس کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالا۔ کیسی بری چیز ہے جس کو وہ خرید رہے ہیں۔ (آل عمران۔۱۸۷)

خدا کی کتاب کی حقیقت ایک مقدس عہد نامہ کی ہے۔ خدا کی کتاب جب کسی قوم کو

دی جائے اور وہ قوم اس کتاب کو خدا کی کتاب کی حیثیت سے قبول کر لے تو ایسا کرنے کے بعد خدا اور اس قوم کے درمیان ایک پختہ عہد قائم ہو جاتا ہے۔ اس عہد کے مطابق، اس قوم کے لئے صرف یہ کافی نہیں ہو تا کہ وہ خود اس کی پیرو بن جائے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لازمی طور پر ضروری ہو تا ہے کہ وہ قوم خدا کے بندوں کے سامنے اس کتاب کی نمائندگی کرے۔

اسی نمائندگی کا دوسرا نام دعوت ہے۔ دنیا کی قوموں کے سامنے خدا کے پیغام کو نہ پہنچانا گویا کتاب الٰہی کو چھپانا ہے۔ اور دنیا کی قوموں کو اس سے باخبر کرنے کا مطلب خدا کے دین کا اظہار کرنا ہے۔

خدا کی کتاب کا کتمان (اس سے لوگوں کو باخبر نہ کرنا) حامل کتاب گروہ کے لئے ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ کوئی بھی عذر اس فریضہ کو اس سے ساقط نہیں کرتا۔ مزید یہ کہ انسان چونکہ مرتے ہیں اور نئے لوگ پیدا ہوتے ہیں اس لئے اظہار دین یا دعوت حق کا یہ عمل ہر نسل میں جاری رکھنا ہے، اس کو بار بار دہراتے رہنا ہے تاکہ کوئی بھی نسل یا کوئی بھی پیدا ہونے والا انسان اس سے بے خبر نہ رہے۔

دعوت کا یہ کام سادہ طور پر صرف اعلان کا کام نہیں ہے بلکہ اس کو اس کے تمام تقاضوں کے ساتھ انجام دینا ہے۔ مثلاً لوگوں کی قابل فہم زبان میں اس کو پیش کرنا، مدعو کی زیادتیوں کو یکطرفہ طور پر برداشت کرنا تاکہ دعوت کا معتدل ماحول باقی رہے، مدعو سے کسی بھی قسم کی مادی یا سیاسی کشمکش نہ کرنا تاکہ دعوت کی اخروی حیثیت مجروح نہ ہو۔ دعوت کے عمل کے ساتھ کسی بھی غیر دعوتی پہلو کو شامل نہ کرنا تاکہ اس کا خالص پن (purity) باقی رہے، وغیرہ۔

خدا کی کتاب کو کم قیمت پر بیچنے کا مطلب کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی

کتاب کو دنیوی مفادات کے تابع کر دیا جائے۔ دنیا کے کسی فائدہ کو لینے کی خاطر خدا کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ خدا کی کتاب کے نام پر خدا کی کتاب کا اس طرح استحصال کیا جائے کہ نام تو خدا کی کتاب کا لیا جائے مگر عملاً اس سے مادی فائدہ حاصل کرنا مقصود ہو۔

خدا کی کتاب کا حامل کوئی گروہ جب بھی اس کی تبلیغ واشاعت کا کام چھوڑتا ہے تو اس کا سبب ہمیشہ دنیوی اور مادی ہوتا ہے۔ حامل کتاب گروہ کے افراد پر اخروی فکر کا غلبہ ہو تو وہ لازماً اس کی تبلیغ واشاعت میں سرگرم ہوں گے۔ اس کے برعکس جب لوگوں کے اوپر دنیوی فکر کا غلبہ ہو جائے تو ان کے اندر سے وہ محرک یا داعیہ ختم ہو جاتا ہے جو انھیں تبلیغ واشاعت کے میدان میں سرگرم کرے۔

کتاب الٰہی کے حامل کسی گروہ پر جب اس قسم کا زوال آتا ہے تو اس کے فکری نتیجہ کے طور پر ایسے لوگوں میں خود غرضانہ نفسیات پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس قسم کی نفسیات بلاشبہ دعوت کے لئے قاتل ہے۔ دعوت کا کام وہ لوگ کرتے ہیں جن کے اندر وسیع تر انسانیت کے لئے تڑپ موجود ہو گروہی عصبیت میں مبتلا لوگ دعوت کا کام نہیں کر سکتے۔

اسی طرح جو لوگ مذکورہ قسم کی گراوٹ کا شکار ہوں وہ مختلف قومی یا مادی اسباب کے تحت دوسری قوموں کو اپنا دشمن سمجھ لیتے ہیں۔ اس قسم کا جذبہ بلاشبہ دعوت کے کام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ دعوت، اپنی حقیقت کے اعتبار سے دوسروں کے ساتھ محبت اور خیر خواہی کا معاملہ کرنا ہے۔ جس آدمی کے دل میں دوسروں کے لئے خیر خواہی نہ ہو وہ دوسروں کے اوپر دعوت و تبلیغ کا عمل بھی نہیں کر سکتا۔

کسی گروہ کو کتاب الٰہی کا حامل بنانا اس کو ایک مشن کا حامل بنانا ہے۔ کتاب الٰہی کا ابتدائی تقاضا یہ ہے کہ اس کے حاملین اس کو اپنی زندگیوں میں اختیار کریں۔ اسی کے ساتھ

اس کا دوسرا لازمی تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے کتاب الٰہی کا اعلان واظہار کیا جائے۔ کتاب الٰہی کے پیغام سے لوگوں کو پوری طرح باخبر بنادیا جائے۔

مگر کتاب الٰہی کا حامل گروہ اپنی بعد کی نسلوں میں جب زوال کا شکار ہوتا ہے تو جس طرح اس سے دوسری مطلوب صفات گم ہو جاتی ہیں، اسی طرح یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کتاب الٰہی کی تبیین و تبلیغ کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔

کتاب الٰہی کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ حاملین کتاب کے اندر دوسروں کے لئے خیر خواہی موجود ہو۔ اور دور زوال میں ایسے لوگوں سے جو چیز سب سے زیادہ رخصت ہو جاتی ہے وہ یہی انسانی خیر خواہی ہے۔ اس کام کو درست طور پر صرف وہ لوگ انجام دے سکتے ہیں جن کے اندر یہ اخلاقی بلندی ہو کہ وہ دوسروں کی زیادتیوں کو نظر انداز کر سکیں۔ مگر زوال یافتہ لوگوں میں یہ اخلاقی بلندی نہیں ہوتی اس لئے وہ کتاب الٰہی کی دعوتی ذمہ داریوں کو بھی پورا نہیں کر پاتے۔

کتاب الٰہی کی تبیین کا کام انتہائی نازک کام ہے۔ اس کو صرف ایسے افراد انجام دے سکتے ہیں جو انتہائی سنجیدہ اور باوصول ہوں۔ مگر زوال یافتہ لوگوں میں یہ دونوں صفات سرے سے موجود ہی نہیں ہوتیں۔ ان میں نہ سنجیدگی ہوتی ہے اور نہ اصول پسندی۔ یہی وجہ ہے کہ اس فرض کی ادائیگی میں وہ مکمل طور پر ناکام رہتے ہیں۔ دور زوال کا یہ مظہر پچھلے حاملین کتاب میں بھی دیکھا جا سکتا ہے اور بعد کے حاملین کتاب میں بھی۔

قول بلا فعل

قرآن کی سورہ نمبر ۶۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ ---اے ایمان والو تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں...... اللہ کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ تم ایسی بات کہو جو تم

کرو نہیں۔ (الصف ۲۔۳)

مسلمانوں میں جب ایمان کی کمزوری آتی ہے تو اس کمزوری کا اظہار "قول" کی سطح پر نہیں ہوتا بلکہ "فعل" کی سطح پر ہوتا ہے اب بھی لوگ اچھی اچھی باتیں بولتے ہیں، مگر وہ اپنی بات کے مطابق اچھے عمل نہیں کرتے۔ قرآن کے مطابق جن اچھے الفاظ کے ساتھ اچھا عمل شامل نہ ہو وہ آدمی کے لئے نہ کوئی قابل تعریف بات ہے نہ اس کو ایسی باتوں پر کوئی انعام ملنے والا ہے۔

مذکورہ آیت میں جس قول بلا فعل کا ذکر ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنی تقریروں میں جہاد اور اقدام کی باتیں کرے مگر وہ جہاد اور اقدام کی کارروائیوں میں عملی شرکت نہ کرے۔ اپنے الفاظ میں وہ اپنے آپ کو مجاہد ظاہر کرے مگر اپنے عمل کے اعتبار سے وہ صرف پیچھے رہنے والوں میں ہو۔ اپنی تقریر اور تحریر میں وہ عزیمت اور قربانی کا درس دے رہا ہو مگر حقیقی عمل کے اعتبار سے اس کا حال یہ ہو کہ اپنے ذاتی مفاد کے سوا کسی اور چیز سے اسے دلچسپی نہ ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو الفاظ کے اعتبار سے اپنے آپ کو اچھا انسان اور اچھا مسلمان ظاہر کریں مگر اپنی عملی زندگی کے اعتبار سے وہ صرف ایک سطحی اور خود غرض اور مفاد پرست انسان بنے ہوئے ہوں۔ خدا کی نظر میں ایسے لوگوں کی کوئی قیمت نہیں۔ ان کی اچھی باتیں صرف ان کے جرم کو بڑھانے والی ہیں، وہ کسی بھی درجہ میں ان کو انعام کا مستحق بنانے والی نہیں۔

امام مالک اپنی مؤطا میں کہتے ہیں قاسم بن محمد تابعی جنھوں نے صحابہ کو دیکھا تھا، وہ صحابہ کے بارے میں کہتے تھے کہ میں نے ان لوگوں کو دیکھا ہے اور ان کا حال یہ تھا کہ وہ قول پر خوش اور متعجب نہیں ہوتے تھے۔ امام مالک اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں

کہ اس سے ان کی مراد عمل ہے۔ کیوں کہ آدمی کا عمل دیکھا جائے گا نہ کہ اس کا قول۔:

قال مالك وبلغني ان القاسم بن محمد كان يقول:ادركت الناس وما يعجبون بالقول.قال مالك يريد بذٰلك العمل انما ينظرإلى عمله ولا ينظر إلى قوله (موطا الامام مالك ۷۰۲)

صحابہ کرام دین کے مزاج کو سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ خدا کو جو چیز مطلوب ہے وہ عمل ہے، خوشنما باتوں کی خدا کے یہاں کوئی اہمیت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں جب تک صحابہ کرام کا غلبہ تھا، ایسے لوگوں کو کوئی اہمیت نہیں ملی جو حقیقی عمل سے خالی ہوں، البتہ اچھی اچھی باتیں کر کے لوگوں کے درمیان عزت حاصل کئے ہوئے ہوں۔

مگر جب معاشرہ میں تقویٰ کی فضا باقی نہ رہے تو اسی قسم کے خوش کلام لوگ معاشرہ پر چھا جاتے ہیں وہ اپنے خوشنما الفاظ کے ذریعہ لوگوں میں عزت اور احترام کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ خدا کی نظر میں بے قیمت ہیں۔ آخرت میں ایسے لوگوں سے کہا جائے گا کہ تم عزت اور شہرت کی صورت میں پچھلی دنیا ہی میں اپنی قیمت پا چکے، آخرت کی دنیا میں اب تمہیں کچھ ملنے والا نہیں۔

اشاعت فاحشہ

غزوہ بنوالمصطلق کے ۶ھ کے بعد حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا۔ مدینہ کے کمزور مسلمانوں نے اس واقعہ کو ایک فتنہ کی شکل دے دی۔ اس کو لے کر انھوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔ بدنام کرنے کی یہ مہم اتنی بڑھی کہ کچھ مخلص مسلمان بھی اس سے متاثر ہو گئے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کی سورہ نمبر ۲۴ میں ارشاد ہوا ہے:

جن لوگوں نے یہ طوفان برپا کیا وہ تمہارے اندر ہی کی ایک جماعت ہے۔ تم اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو بلکہ یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ ان میں سے ہر آدمی کے لئے وہ ہے جتنا اس نے گناہ کمایا۔ اور جس نے اس میں سب سے بڑا حصہ لیا اس کے لئے بڑا عذاب ہے۔ جب تم لوگوں نے اس کو سنا تو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے ایک دوسرے کی بابت نیک گمان کیوں نہ کیا اور کیوں نہ کہا کہ یہ کھلا ہوا بہتان ہے۔ یہ لوگ اس پر چار گواہ کیوں نہ لائے۔ پس جب وہ گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ (النور ۱۱۔۱۲)

پیغمبر اسلام کے زمانے میں مدینہ میں بہت سے کمزور ایمان والے تھے۔ ان سے کوتاہیاں ظاہر ہوتی تھیں جن پر قرآن کی آیتیں اترتی تھیں، اس طرح کے واقعات بعد کے دور کے مسلمانوں کے لئے عبرت ونصیحت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مذکورہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی مسلم سماج میں کوئی شخص ایک بری خبر سنائے تو سننے والے ہرگز ایسا نہ کریں کہ وہ محض سن کر اس پر یقین کرلیں۔ ان کو اس معاملہ میں حسن ظن سے کام لینا چاہئے۔ خبر یا واقعہ کی کوئی اچھی توجیہہ کرنی چاہئیے تاکہ لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف بدگمانی کی فضا پیدا نہ ہو۔

بالفرض اگر اس خبر کو ماننا ہو تو ایسی صورت میں لازم ہے کہ سننے والے اس خبر کی تحقیق کریں۔ وہ خبر سنانے والے سے گواہی کا مطالبہ کریں۔ وہ اس سے کہیں کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس کا باقاعدہ ثبوت پیش کرو۔ اگر وہ آدمی اپنی خبر کے حق میں باقاعدہ شرعی ثبوت پیش کرے تو اس کو مانا جائے ورنہ اس کو قطعی طور پر رد کردیا جائے۔

کسی شخص کے خلاف ایک بری بات سن کر اس کو دوسروں سے بیان کرنا ایک ناقابل

معافی جرم ہے۔اس کو قرآن میں اشاعت فاحشہ کہا گیا ہے (النور۔۱۹) یعنی ایسی بات کا چرچا کرنا جو کسی شخص کو سماج میں بدنام کرنے والی ہو۔ زوال یافتہ سماج میں ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے کے بارے میں بری باتوں کو سننے سے بہت دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ الزام اور حقیقی واقعہ میں فرق نہیں کرپاتے۔ایک بے ثبوت الزام کو بھی وہ اسی طرح مان لیتے اور بیان کرتے ہیں جس طرح ثابت شدہ واقعہ کو۔ یہ کسی سماج کی بدترین حالت ہے ایسے لوگوں کے بارے میں سخت اندیشہ ہے کہ وہ خدا کے غضب کا شکار ہو جائیں۔

حامل کتاب

قرآن کی سورہ نمبر ۶۲ میں یہود کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ...... وہ لوگ جنھیں تورات کا حامل بنایا گیا پھر انھوں نے اس کو نہیں اٹھایا۔ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ کیا ہی بری مثال ہے ان لوگوں کی جنھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا،اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا (الجمعہ۔۵)

آسمانی کتاب کا حامل بننے کی دو صورتیں ہیں۔ایک یہ کہ اس کو اٹھانے والا اس کو انسان کی حیثیت سے اٹھائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو اس طرح اٹھایا جائے جیسے کوئی حیوان اپنی پیٹھ پر کتابوں کا بوجھ اٹھالیتا ہے۔ پہلی صورت میں یہ ہوگا کہ کتاب کو اٹھانے والا انسان اپنے ذہن اور قلب کے اعتبار سے اس کا حامل بنا ہوا ہوگا۔وہ کتاب کی تعلیمات کو اپنی حقیقی زندگی میں اور اپنے قول وعمل میں شامل کئے ہوئے ہوگا۔

اس کے برعکس حیوان کی پیٹھ پر جب کوئی کتاب لادی جائے تو وہ صرف اس کے پیٹھ کے اوپر ہوگی وہ اس کے اندرونی وجود میں داخل نہیں ہوگی۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی امت جب اس حال میں ہو کہ خدا کی کتاب

ں کے دماغ میں اتری ہوئی ہو اور اس کی روح میں سرایت کئے ہوئے ہو تو ایسی حالت
ں وہ حقیقی معنوں میں کتاب الٰہی کی حامل قرار پائے گی۔ لیکن جب امت زوال کا شکار
وتی ہے تو اس کے افراد کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگیاں الگ ہوتی ہیں اور خدا کی
تاب الگ۔

مذکورہ دونوں حالتوں میں سے پہلی حالت خدا کی مطلوب حالت ہے، اور دوسری
الت خدا کی غیر مطلوب حالت۔ جب کسی امت میں یہ دکھائی دے کہ اس کے افراد کی
ندگیاں کتاب الٰہی کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں، تو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ امت اپنے معیاری
ور میں ہے۔ لیکن جب امت کے افراد کی زندگیاں کتاب الٰہی سے بے تعلق نظر آئیں تو یہ
س بات کی علامت ہوگی کہ امت اپنے دور زوال میں پہنچ چکی ہے۔ ایسی قوم کے لئے کتاب
ہی کا حامل ہونا، ایسا ہی ہے جیسے کسی حیوان کی پیٹھ کے اوپر کتابوں کا بوجھ لاد دیا جائے اور یہ
یوان اس سے اتنا زیادہ بے خبر ہو کہ اس کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اس کی پیٹھ پر کیا چیز لادی
وئی ہے۔

یہی بات قرآن کی سورہ نمبرے میں اس طرح بیان ہوئی ہے --- پھر ان کے پیچھے
اخلف لوگ آئے جو کتاب کے وارث بنے، وہ اسی دنیا کی متاع لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم
یقیناً بخش دیئے جائیں گے۔ اور اگر ایسی ہی متاع ان کے سامنے پھر آئے تو وہ اس کو لے لیں
گے۔ کیا ان سے کتاب میں اس کا عہد نہیں لیا گیا ہے کہ اللہ کے نام پر حق کے سوا کوئی اور
بات نہ کہیں۔ اور انھوں نے پڑھا ہے جو کچھ اس میں لکھا ہے۔ اور آخرت کا گھر بہتر ہے
ڈرنے والوں کے لئے، کیا تم سمجھتے نہیں۔ (الاعراف۔ ۱۶۹)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی کتاب سے وابستہ ہونے کی دو صورتیں ہیں

ایک وہ شخص ہے جو صاحب کتاب ہو، اور دوسرا شخص وہ ہے جس کو یہاں وارث کتاب کہا گیا ہے۔ خدا کی کتاب سے مطلوب وابستگی صرف وہ ہے جو پہلی قسم کی وابستگی ہو۔ دوسری قسم کی وابستگی کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں۔

صاحب کتاب وہ ہے جو خدا کی کتاب کو اپنے ذہن میں اتارے ہوئے ہو۔ خدا کی کتاب جس کے لئے زندگی کی رہنما بن جائے۔ وہ خدا کی کتاب کو اس طرح لے کہ اس کے تمام حقوق ادا کر رہا ہو۔

وارث کتاب وہ ہے جس نے خدا کی کتاب کو بذات خود شعوری طور پر دریافت نہ کیا ہو، بلکہ اس کو خدا کی کتاب نسلی وارثت کے طور پر مل جائے خدا کی کتاب اس کے گھر کا اثاثہ تو ہو مگر وہ اس کے ذہن کی روشنی اور اس کی روح کی زندگی نہ ہو۔

مذکورہ آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صاحب کتاب اور وارث کتاب کی الگ الگ پہچان کیا ہے۔ وہ پہچان یہ ہے کہ صاحب کتاب ایک متقی انسان ہوتا ہے اور وارث کتاب ایک غیر متقی انسان۔ جو آدمی حقیقی معنوں میں صاحب کتاب ہو اس کو خدا کی کتاب خدا سے ڈرنے والا بنادے گی۔ وہ ایک اندیشہ ناک زندگی گزارنے لگے گا۔ خدا کا خوف ہر لمحہ اس کی رگوں میں تیرتا رہے گا۔

اس کے برعکس جو آدمی وارث کتاب ہو اس کا حال یہ ہوگا کہ اس کی زندگی الگ ہوگی اور خدا کی کتاب الگ۔ خدا کی کتاب اس کے گھر کے طاق پر تو ضرور رکھی ہوئی ہوگی مگر وہ اس کے سینہ میں داخل نہیں ہوگی، وہ قلب وروح میں بجلی بن کر نہیں تیرے گی۔ اس کے اور خدا کی کتاب کے درمیان ایسا ہی تعلق ہوگا جیسے کوئی کتاب بستہ میں بند کر کے کسی کھونٹی پر لٹکادی جائے۔

فتنۂ امت

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے بارے میں مجھے سب سے زیادہ جس چیز کا ڈر ہے وہ خواہش اور لمبی آرزو ہے۔ پس خواہش حق سے روکتی ہے اور لمبی آرزو آخرت کو بھلادیتی ہے (ان اخوف ما اتخوف علی امتی الھوی وطول الامل فاما الھو ی فیصدعن الحق واما طول الامل فینسی الاخرۃ)مشکاۃ المصابیح ۳/۱۴۳۸

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:ان لکل امۃ فتنۃ وفتنۃ امتی المال (المشکاۃ المصابیح ۳/ ۱۴۳۴) یعنی ہر امت کا ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔ یہاں یہ سوال ہے کہ خواہشوں اور آرزوؤں میں جینایا مال کا طالب بننا ایسے فتنے ہیں جن میں ہر زمانہ کے لوگ مبتلا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے ان چیزوں کو اپنی امت کا فتنہ بتایا اور خصوصی طور پر امت کو ان سے آگاہ کیا۔

اس کا سبب یہ ہے کہ امت مسلمہ کا زمانہ آخری زمانہ ہے، یعنی وہ زمانہ جب کہ جدید صنعتی انقلاب ظہور میں آیا۔ اس صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں لاکھوں نئی چیزیں وجود میں آئیں اس طرح موجودہ دنیا انسان کے لئے زیادہ حسین ہو گئی جیسی حسین وہ اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ آج کا انسان جب اس نئی دنیا کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے اس کے اندر اس بات کی لامحدود خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرے تاکہ وہ جدید دنیا کی رونقوں کو زیادہ سے زیادہ اپنے گرد اکھٹا کر سکے۔

اس نئی صورت حال نے آدمی کی خواہشوں اور آرزوؤں کو بے پناہ حد تک بڑھادیا

ہے۔ان میں سے ہر خواہش یاہر آرزواپنی تکمیل کے لئے مال چاہتی ہے اس لئے ہر آدمی بس مال ودولت کے پیچھے دوڑرہاہے ہر آدمی بس کمانے والا جانور (حیوان کاسب) بن گیا ہے جدید پر کشش سامانوں کی کوئی حد نہیں، اس لئے مادی دنیا کی طرف انسان کی دوڑ کی بھی کوئی حد نہیں۔

اس نئے دور نے ساری صورت حال کو بدل ڈالا ہے۔۔۔۔ اخلاقی اور روحانی قدروں کی جگہ مادی قدروں کا غلبہ ہے۔ وقت کا بہترین استعمال صرف یہ ہے کہ اس کو دولت کمانے میں لگایا جائے۔ مقصدی زندگی کا خاتمہ ہو گیا ہے اور اس کی جگہ مکمل طور پر مفاد پرستانہ زندگی نے لے لی ہے۔ انسانی صلاحیتیں بازار کا مال بن گئی ہیں، ہر آدمی تیار رہتا ہے کہ جس دکان پر اس کی زیادہ قیمت لگے وہاں وہ اپنے آپ کو بیچ دے۔ انسانی تعلقات تمام تر دنیوی مفاد کے تابع ہوگئے ہیں۔ دنیوی اہمیت کی چیزیں آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز بن گئی ہیں۔ ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ہر آدمی اتنی زیادہ دولت اکھٹا کرنا چاہتا ہے کہ اس کے بیٹوں اور پوتوں تک کے لئے پر تعیش زندگی یقینی ہو جائے۔

یہ ہے وہ ماحول جس میں آج کا انسان جی رہاہے۔ امت مسلمہ بھی اپنا سفر طے کرتے ہوئے اسی نئے زمانہ میں پہنچنے والی تھی اس لئے رسول ﷺ نے پیشگی طور پر اپنی امت کو آگاہ فرمایا تاکہ امت جب نئے فتنوں سے بھرے ہوئے اس دور میں پہنچے تو وہ اس کے بارے میں اس حد تک باشعور ہو کہ اپنے آپ کو اس کی آلائشوں سے بچاسکے۔

آج امت مسلمہ اسی طوفانی فتنہ کے دور میں ہے۔ ہر مرد اور عورت، ہر جوان اور بوڑھا اس فتنہ کبریٰ کی زد میں ہے۔ دیہاتوں سے لے کر شہروں تک کوئی بھی اس سے بچا ہوا نہیں۔ مذکورہ حدیث کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہو گا کہ موجودہ زمانہ میں کسی مسلمان کو

جانچنے کا یہی سب سے زیادہ کھلا ہوا معیار ہے۔ جو مسلمان اس نئے مادی سیلاب میں ڈوبنے سے اپنے آپ کو بچالے وہ کامیاب ہوا، اور جو مسلمان اس مادی سیلاب میں غرق ہو جائے وہ ہمیشہ کے لئے ہلاک ہو گیا۔

اضاعت صلاۃ

قرآن کی سورہ نمبر ۱۹ میں ارشاد ہوا ہے کہ ۔۔۔۔پھر ان کے بعد ایسے نا خلف جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو کھو دیا اور وہ خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے۔ پس عنقریب وہ اپنی خرابی کو دیکھیں گے، البتہ جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک کام کیا تو یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی (مریم ۶۰۔۵۹)

اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد امت مسلمہ کے بعد کے زمانے کے لوگ ہیں، یا تو اس کے مفہوم اول کے طور پر، ورنہ اس کے مفہوم ثانی کے طور پر۔۔ بعد کی نسلوں میں جب امت پر زوال آئے گا تو اس کے ایک گروہ کا وہ حال ہو جائے گا جو اس آیت میں بیان ہوا ہے (**هم قوم من امة محمد ﷺ فی آخر الزمان**) تفسیر القرطبی ۱۱/ ۱۲۲

اس آیت میں اضاعت صلاۃ سے مراد ترک صلاۃ نہیں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ سرے سے نماز پڑھنا چھوڑ دیں گے اور مسجدیں نمازیوں سے خالی ہو جائیں گی۔ ایسا نہ کسی سابقہ امت میں ہوا اور نہ امت محمد میں ایسا کبھی ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز کو ضائع کرنے سے مراد نماز کی روح کا ضائع ہونا ہے نہ کہ نماز کی شکل کا باقی نہ رہنا۔ (**هی عدم القیام بحقوقها**) **القرطبی ۱۱/ ۱۲۲**

یہ بات حدیث میں زیادہ واضح لفظوں میں آئی ہے۔ مسند احمد اور الترمذی (کتاب

العلم) میں روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ بعد کے زمانہ میں امت کا یہ حال ہو جائے گا کہ ان کی مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوئی ہوں گی مگر ان کی نمازیں خشوع سے خالی ہوں گی حتی کہ تم ان میں ایک بھی خاشع آدمی نہیں دیکھو گے (فلا تری فیہ رجلا خاشعا)

دور زوال میں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ نماز کی شکل باقی رہتی ہے مگر نماز کی روح غائب ہو جاتی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں اس کا سبب اتباع شہوات ہے۔ اس وقت ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کی خواہشیں ان کے اوپر غالب آجاتی ہیں۔ وہ دنیوی اور مادی مفاد کو اولین اہمیت دے دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نماز کے فارم کو اس کی اسپرٹ سے الگ کر دیتے ہیں۔ وہ اسپرٹ کو چھوڑ کر فارم کو اختیار کر لیتے ہیں۔

اتباع شہوات کی بنا پر ان کا مزاج یہ ہو جاتا ہے کہ ان کے مادی مفادات محفوظ رہیں اور اسی کے ساتھ وہ نمازی بھی بنے رہیں۔ یہ مقصد نماز کو باعتبار فارم لینے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ نماز کو اگر اس کی اسپرٹ کے ساتھ لیا جائے تو وہ مادی مفادات کے لئے قاتل بن جائے گی لیکن جب نماز کو صرف اس کی شکل کے اعتبار سے لے لیا جائے تو بیک وقت دونوں فائدے حاصل ہو جاتے ہیں۔

اب یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ آدمی کے مفادات بھی محفوظ رہیں اور اسی کے ساتھ نمازی ہونے کا کریڈٹ بھی اس کو حاصل ہو جائے۔

اس آیت میں توبہ سے کیا مراد ہے۔ یہاں توبہ سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی اس غلطی پر متنبہ ہو کہ اس نے خدا کے دین میں ایک عظیم جسارت کی ہے۔ اس نے نماز کی اسپرٹ کو اس کے فارم سے الگ کر دیا ہے۔ اس انتباہ کے بعد وہ اپنی غلطی کی اصلاح کرے یعنی نماز کے فارم کے ساتھ اس کی اسپرٹ کو بھی اس میں شامل کرے۔ وہ اس کامل نماز کا

نمازی بن جائے جس کو قرآن میں صلاۃ خشوع (المومنون۔ ۲) کہا گیا ہے۔

جب وہ ایسا کرے گا تو اس کے بعد فطری طور پر ایسا ہو گا کہ نماز کے ساتھ اتباع شہوات کا جمع ہونا ناممکن ہو جائے گا۔ نماز اگر اسپرٹ کے بغیر ہو تو ایسی نماز کسی آدمی کے لئے برائیوں کے خلاف چک نہیں بنتی مگر جو نماز اسپرٹ کے ساتھ ہو وہ عین اپنے مزاج کے مطابق برائیوں سے روکنے والی بن جاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں بتائی گئی ہے کہ "ان الصلاۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر "(العنکبوت)

تحاکم الی الطاغوت

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں ارشاد ہوا ہے ـــــ اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اصحاب امر کی اطاعت کرو۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، یہ بات اچھی ہے اور اس کا انجام بہتر ہے۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعوی کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں اس پر جو اتارا گیا ہے تمہاری طرف اور جو اتارا گیا ہے تم سے پہلے، وہ چاہتے ہیں کہ اپنا قضیہ لے جائیں طاغوت کی طرف، حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر بہت دور ڈال دے (۵۹۔۶۰)

یہ آیت مدینہ کے ابتدائی دور میں اتری۔ اس وقت مشترک سماج قائم تھا۔ چنانچہ لوگوں کے لئے اپنے معاملات کا فیصلہ لینے کی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ وہاں کے یہودی عالم کعب بن اشرف کے پاس جا کر اس کے سامنے اپنا معاملہ بیان کیا جائے اور اس سے فیصلہ لیا جائے۔ یہودی علماء سے فیصلہ لینے کی یہ روایت صدیوں سے مدینہ میں چلی آ رہی تھی۔

دوسرا یہ کہ معاملہ کے دونوں فریق رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور آپ سے اپنے معاملہ کا فیصلہ کرائیں رسول اللہ ﷺ معاملات کا فیصلہ خدائی شریعت کے مطابق کرتے تھے۔اس کے مقابلے میں کعب بن اشرف خدائی شریعت کا پابند نہ تھا۔اس کے یہاں یہ امید ہوتی تھی کہ کوئی لفظی یا عملی تدبیر کر کے غلط طور پر اپنے حق میں فیصلہ لے لیا جائے۔

مدینہ کے مخلص مسلمانوں کے درمیان جب بھی کوئی نزاع پیدا ہوتی تو وہ ہمیشہ اس کو لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے۔ان لوگوں کے پیش نظر یہ نہیں ہوتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے حق میں فیصلہ حاصل کرلیں۔ بلکہ ان کا جذبہ یہ ہوتا تھا کہ زیر بحث معاملہ میں خدائی شریعت کا جو حکم ہے اس کو معلوم کریں اور پھر اس کو پوری آمادگی کے ساتھ قبول کرلیں۔

تاہم مدینہ میں کچھ غیر مخلص اور مفاد پرست مسلمان بھی تھے جن کو منافق کہا جاتا ہے۔ غیر مخلص یا منافق مسلمان زیادہ تر وہ لوگ تھے جو یہودی قبائل سے نکل کر مسلمان ہوئے تھے۔اس زمانہ کے یہودی چونکہ اپنے دور زوال میں تھے ان میں ہر قسم کی اخلاقی کمزوریاں آچکی تھیں۔اس لئے جو لوگ ان یہودی نسلوں سے نکل کر اسلام میں آئے وہ اپنی قومی کمزوریاں بھی اپنے ساتھ لائے۔انھوں نے اسلام تو قبول کرلیا تھا مگر اخلاقی اعتبار سے وہ انھیں کمزوریوں کا شکار تھے جو اس زمانہ کے یہودیوں میں عام طور پر پائی جارہی تھیں۔

مذکورہ قسم کے کمزور ایمان والے مسلمانوں سے جب کسی شخص کی نزاع پیش آتی تو وہ اپنے مفاد پرستانہ مزاج کے تحت یہ چاہنے لگتا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے موافق فیصلہ حاصل کرے۔چونکہ اس طرح کا ناحق فیصلہ رسول اللہ ﷺ سے نہیں مل سکتا تھا اس لئے

وہ اپنا مقدمہ لے کر کعب ابن اشرف کے پاس جاتے، کیونکہ ان کو امید ہوتی تھی کہ اس یہودی عالم کے یہاں سے وہ اپنے موافق فیصلہ لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

مذکورہ آیت میں اس قسم کے غیر مخلص مسلمانوں کو سخت تنبیہ کی گئی ہے۔ کہا گیا ہے کہ تم اپنے معاملہ کا فیصلہ لینے کے لئے طاغوت (یہودی عالم) کے یہاں جاتے ہو۔ صرف اس لئے کہ اپنی خواہش کے مطابق وہاں سے فیصلہ حاصل کرو مگر اس قسم کا فعل خدا کی نظر میں سخت گناہ ہے۔ یہ شیطان کی پیروی ہے نہ کہ حق کی پیروی۔

جو چیز شرعی طور پر آپ کا حق نہ ہو اس کو غیر شرعی ذریعہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرنا ایک جرم ہے۔ مزید یہ کہ غیر شرعی ذریعہ سے ایسی چیز کسی کو مل جائے تب بھی وہ اس کی نہیں ہوگی۔ پھر بھی خدا کی نظر میں وہ غاصب قرار پائے گا۔ اور آخرت میں سخت سزا کا مستحق ہوگا۔

قساوت قلب

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ کسی مسلم قوم پر جب لمبی مدت گذر جائے تو اس کے افراد کے دلوں میں قساوت پیدا ہو جاتی ہے۔ (الحدید۔ ۵۳) اس قساوت کو قرآن میں دل کا مرض بتایا گیا ہے (الحج۔ ۵۳) یہ قساوت بڑھتے بڑھتے اس نوبت کو پہنچ جاتی ہے کہ لوگوں کے دل پتھر کی طرح غیر اثر پزیر ہو جاتے ہیں (البقرہ۔ ۷۴)

جن لوگوں کے دلوں میں یہ قساوت آجائے وہ نہایت آسانی سے شیطان کی تزئین کا شکار ہو جاتے ہیں (الانعام۔ ۴۳) قساوت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے سینے میں خدا کی والی کیفیات کا پیدا ہونا ختم ہو جاتا ہے (الزمر۔ ۳۹) قساوت کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی خدا کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے۔ یہی وہ صورت حال ہے جس کو قرآن میں لعنت کہا

گیاہے۔(المائدہ۔ ۱۳)

امام مالک نے اپنی موطا میں ایک حدیث نقل کی ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ جس دل کے اندر قساوت ہو وہ اللہ سے بہت دور ہو جاتا ہے۔(**فان القلب القاسی بعید من الله**)**موطا الامام مالك ۶۹۸**۔

قساوت کا مطلب ہے سخت ہونا۔ کہا جاتا ہے: حجر قاس۔ یعنی سخت پتھر۔ اسی طرح کہا جاتا ہے: ارض قاسیۃ: یعنی بنجر زمین۔ سختی کی یہی صفت جب کسی دل میں پیدا ہو جائے تو اس کو قلب قاسی کہا جائے گا۔ یعنی بے حس قلب، ایسا دل جس کے اندر سے حساسیت رخصت ہو گئی ہو، جس کا حال یہ ہو جائے کہ وہ برائی کرے تو اس کی شناعت پر اس کا دل نہ تڑپے۔ گناہ کا احساس اس کی آنکھوں سے آنسو بن کر نہ نکلے۔

اسی کا نام قساوت یا بے حسی ہے۔ یہ قساوت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ قساوت کا نقصان یہ ہے کہ اس کے بعد آدمی کے اندر سے ایمانی حساسیت ختم ہو جاتی ہے۔ بے حسی کا مطلب ہے دل کا مر جانا، اور حساسیت کا مطلب ہے دل کا زندہ رہنا۔ جن لوگوں کے دل زندہ ہوں انھیں کے اوپر خدا کا فیضان اترتا ہے۔ انھیں فرشتوں کی صحبت نصیب ہوتی ہے۔ دل کی یہ زندگی اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ ان کو خدا کے پسندیدہ اعمال کی توفیق ملتی رہے۔ ان کی روحانی ترقی کا سلسلہ برابر جاری رہے یہاں تک کہ ان کی شخصیت وہ ربانی شخصیت بن جائے جس کو آخرت میں خدا کا پڑوس ملے گا، جس کا دوسرا نام جنت ہے۔

اس کے برعکس جن لوگوں کے دلوں میں قساوت آجائے وہ اندر سے ایک مردہ انسان کی مانند ہو جاتے ہیں۔ ان کے اندر وہ صلاحیت ختم ہو جاتی ہے جو انھیں خدا سے قریب کرے، جو انھیں فرشتوں کا ہم نشیں بنائے۔ ایسے لوگوں کا دل اس طرح سخت ہو جا

ہے کہ وہ کسی تڑپانے والی بات پر نہ تڑپے۔ان کی آنکھیں اس طرح خشک ہو جاتی ہیں کہ وہ آنسوؤں کا دریا بہانے والی بات پر بھی آنسو نہ بہائیں۔

حساس آدمی کو جب شیطان بہکاتا ہے تو وہ اپنی حساسیت کی بنا پر فوراً اس سے باخبر ہو جاتا ہے۔اور اللہ کی طرف رجوع کر کے اسی وقت اپنی اصلاح کر لیتا ہے۔اس کے برعکس جو لوگ بے حس ہو جائیں، شیطان نہایت آسانی کے ساتھ ان کو بہکانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ ان کو تباہی کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔

اس حقیقت کو قرآن میں اس طرح بتایا گیا ہے: جو لوگ ڈر رکھتے ہیں، جب کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال انھیں چھو جاتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں اور پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے۔اور جو شیطان کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں پھر وہ کمی نہیں کرتے (الاعراف۔۲۰۲۔۲۰۱)

اب سوال یہ ہے کہ جو مرد یا عورت اپنے اندر قساوت یا بے حسی کی یہ بیماری پائیں وہ اپنی اصلاح کے لئے کیا کریں۔اور کس طرح اپنے مردہ دل کو دوبارہ وہ دل بنائیں جس کے اندر زندگی اور حساسیت موجود ہو۔اس سوال کا جواب ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

عن عبدا للہ بن عمر رضی اللہ عنہ :قال قال رسول اللہ ﷺ إن هذه القلوب تصدأ كما يصدأ الحديد إذا اصابه الماء. قيل يا رسول الله وما جلاؤها قال كثر ة ذكر الموت وتلاوة القرآن. (مشكاة المصابيح الجزء الاول صفحه۔٦٢٦)

حضرت عبداللہ ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دلوں کو زنگ لگتا ہے جس طرح لوہے کو پانی کے اثر سے زنگ لگتا ہے۔پوچھا گیا کے اے خدا کے رسول اس کی جلا کیا ہے آپ نے فرمایا کہ موت کو بہت زیادہ یاد کرنا اور قرآن کی بہت زیادہ تلاوت کرنا۔

حدیث میں آیا ہے کہ موت کی یاد لذتوں کو ڈھادینے والی ہے (مشکاۃ المصابیح الجزء الاول ص ۵۰۴) انسان کے اندر جب بھی بے حسی آتی ہے تو وہ اس لئے آتی ہے کہ وہ مادّی چیزوں میں لذت لینے لگتا ہے۔ وہ وقتی رونقوں میں گم ہو کر زیادہ اعلیٰ اور ابدی حقیقتوں کو بھول جاتا ہے۔ اس کمزوری کا سب سے زیادہ کارگر علاج موت کی یاد ہے۔ موت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ کسی بھی لمحہ وہ موجودہ دنیا کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا۔ کسی بھی لمحہ وہ وقت آجائے گا جب کہ اس کا رشتہ اس کی پسندیدہ چیزوں سے ٹوٹ جائے۔

اس طرح موت کا تصور آدمی کو ان چیزوں سے بے رغبت کر دیتا ہے جن میں پھنس کر وہ بے حسی کا شکار ہو جاتا ہے موت آدمی کو متنبہ کرتی ہے کہ کسی بھی وقت وہ ایک ایسے بھونچال کی زد میں آسکتا ہے جس کو لوٹانے کی طاقت اس کے اندر نہیں۔ یہ احساس اگر کسی کو پوری شدت کے ساتھ ہو جائے تو وہ اس سے اتنا زیادہ ہل جائے گا کہ اس کا جمود ٹوٹ جائے اور اس کے سینہ میں حساسیت کا سوکھا ہوا چشمہ رواں ہو جائے۔

مردہ قلب کو از سر نو زندہ کرنے والی دوسری چیز قرآن کی تلاوت ہے۔ قرآن کیا ہے، وہ خدا کے جلال کا اظہار ہے وہ قیامت اور آخرت کے زلزلہ خیز واقعات کا بیان ہے، وہ جمود شکن الفاظ میں یہ بتاتا ہے کہ انسان کی کامیابی کس چیز میں ہے اور ناکامی کس چیز میں۔ قرآن ایک خدائی نصیحت نامہ ہے جو اپنے زلزلہ خیز انداز کی بنا پر قلب و دماغ کو ہلا دینے والا ہے۔

اس بنا پر جب کوئی شخص بار بار قرآن کو پڑھتا ہے تو اس کی شخصیت ہل جاتی ہے۔ قرآن کا پر شکوہ انداز اس کو تڑپا دیتا ہے یہاں تک کہ بہت جلد ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے سینہ میں دوبارہ ربانی کیفیات کا چشمہ ابل پڑے۔ خدا کی عظمتوں کا احساس اس کی آنکھوں سے آنسو کی شکل میں بہہ نکلے۔ اس کی بے حسی آخر کار حساسیت میں تبدیل ہو جائے۔

قانون فطرت

قرآن کی سورہ نمبر ۵۷ میں اہل اسلام کو خطاب کرتے ہوے کہا گیا ہے کہ ...... کیا ایمان والوں کے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں اور اس حق کے آگے جو نازل ہو چکا ہے۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی۔ پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔ جان لو کہ اللہ زمین کو زندگی دیتا ہے اس کی موت کے بعد، ہم نے تمہارے لئے نشانیاں بیان کر دی ہیں، تاکہ تم سمجھو (الحدید ۱۶۔۱۷)

اس آیت میں یہود کی تاریخی مثال سے فطرت کے ایک قانون کو واضح کیا گیا ہے۔ اس دنیا کے فطری قوانین میں سے ایک قانون قانون زوال (degeneration) ہے۔ یعنی ابتدائی معیاری حالت کے بعد اس میں کمی واقع ہونا۔ یہود کی ابتدائی نسل نے جب پیغمبر کی دعوت کو قبول کیا تو یہ ان کے لئے ایک فکری انقلاب کے ہم معنی تھا۔ انھوں نے شعوری طور پر ایک دین کو چھوڑا اور شعوری طور پر دوسرے دین کو اختیار کیا۔ مگر ان کی بعد کی نسل کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ بعد کے لوگوں کو یہ دین وراثتی طور پر ملا تھا نہ کہ کسی شعوری فیصلہ کے تحت۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہود کی ابتدائی نسل میں جو دینی صفات تھیں وہ ان کی بعد کی نسلوں میں باقی نہ رہیں۔

یہ ایک عمومی قانون ہے اور اس کا تعلق ہر امت سے ہے۔ چنانچہ یہی اندیشہ خود امت مسلمہ کے لئے بھی ہے۔ اس امت کے ابتدائی لوگ (اصحاب رسول) شعوری فیصلہ کے تحت اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کے اندر اعلی ایمانی اوصاف پوری طرح موجود تھے مگر بعد کی نسلوں میں زوال آنا شروع ہوا یہاں تک کہ وہ اس نوبت کو پہنچ گیا جس

کا نمونہ آج ہر طرف نظر آتا ہے۔

زوال کے اس قانون سے بچنا کسی امت کے لئے ممکن نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ جب امت کے افراد میں زوال آجائے تو ان میں احیاء نو (regeneration) کی تحریک چلائی جائے۔ یعنی ان کی کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے ان کے اندر نیا شعور جگانا۔ تذکیر ونصیحت کے ذریعہ ان کے اندر اصلاحی اسپرٹ پیدا کرنا۔ یہی حقیقت مذکورہ آیت میں زمین کی مثال سے بتائی گئی ہے۔ ایک زمین اگر مردہ ہو جائے یعنی وہ فصل اگانے کے قابل نہ رہے تو ایسی زمین کو دوبارہ زرخیز بنانے کا طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ زمین میں دانا ڈالنے سے پہلے اس کو تیار کیا جائے۔ اس کے اندر سے کنکر پتھر کو نکالا جائے۔ جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کیا جائے۔ اس کی کھدائی کی جائے۔ اس میں کھاد ڈالی جائے۔ پانی سے سینچائی کر کے اس کو نرم بنایا جائے۔ اس طرح کے عمل کے بعد جب زمین تیار ہو جائے تو اس میں دانا ڈالا جائے۔ تیاری کے بغیر زمین میں دانا ڈالنا، دانے کو ضائع کرنا ہے۔ لیکن جب تیاری کے بعد زمین میں دانا ڈالا جاتا ہے تو وہ لہلہاتی ہوئی فصل میں بدل جاتا ہے۔

یہی معاملہ زوال یافتہ امت کا بھی ہے۔ ایسی امت کو دوبارہ اٹھانے کا کام اس طرح نہیں ہو سکتا کہ جوش دلا کر اس کو فوری طور پر حرکت میں لانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے بجائے صحیح اور نتیجہ خیز طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کے افراد کو تیار کیا جائے۔

ایسی امت میں کام کا آغاز عملی پروگرام سے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس میں کام کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ پہلے اس کے افراد میں ذہنی انقلاب لانے کی کوشش کی جائے یہاں تک کہ اسلام ان کے لئے از سر نو دریافت (rediscovery) بن جائے۔ اس کے بعد یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر اسلامی عمل کی شاندار فصل اگائی جا سکے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
skhan@vsnl.com
http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

ستمبر 1999 شمارہ 274

خصوصی شمارہ: ہند۔ پاک ڈائری
(پہلی قسط)

01

میں ایک غیر سیاسی آدمی ہوں میری بیشتر زندگی تنہائی میں گزری ہے۔ تاہم تاریخی اعتبار سے میرا تعلق اس نسل سے ہے جس کو تقسیم (۱۹۴۷) سے پہلے کے ہندستان کو سن شعور میں دیکھنے کا موقع ملا۔ جس نے مولانا حسین احمد مدنی، پنڈت جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس جیسے قومی رہنماؤں کی تقریریں اس وقت سنیں۔ جب کہ ہندستان کی آزادی ابھی بہت دور دکھائی دے رہی تھی۔ جس نے ۱۹۳۶ کے پہلے الکشن کو براہ راست دیکھا، جس نے ۱۹۴۷ سے پہلے بابری مسجد (ایودھیا) میں داخل ہو کر وہاں نماز پڑھی۔ جس نے اس ہندستان کو دیکھا جب کہ ریلوے اسٹیشنوں پر ہندو پانی اور مسلم پانی کے الگ الگ بورڈ ہوا کرتے تھے۔ اور اس ہندستان کو بھی جہاں اس قسم کے بورڈ ختم کر دیئے گئے ہیں۔ اس وقت کو بھی دیکھا جب کہ میرے وطن اعظم گڑھ میں صرف ایک موٹر کار تھی۔ اور آج کو بھی جب کہ اعظم گڑھ میں (اور اسی طرح ہر مقام پر) کثیر تعداد میں کاریں رات دن سڑکوں پر دوڑ رہی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس نے "غلامی" کے زمانہ کو بھی دیکھا اور "آزادی" کے زمانہ کو بھی۔

براہ راست اور بالواسطہ مشاہدہ کی یہ مدت تقریباً سو سال کے دائرہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس طویل مدت میں میں نے جو کچھ دیکھا اور جو پڑھا اور جانا وہ ایک لمبی کہانی ہے جو انشاء اللہ میری سوانح عمری میں جگہ پا سکے گی۔ یہاں اس کے بعض اجزاء درج کئے جاتے ہیں جو موجودہ حالات کو سمجھنے میں شاید رہنما بن سکیں۔

اس کا نام میں نے "ہندپاک ڈائری" رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ تحریریں کسی تاریخی ترتیب پر مشتمل ہیں۔ یہ حقیقۃً مختلف تاثرات اور مشاہدات ہیں جو تاریخی ترتیب سے زیادہ ذوقی ترتیب پر مشتمل ہیں۔ ان تحریروں کو میں نے حوالوں سے بوجھل کرنا پسند نہیں کیا ہے بلکہ زیادہ تر تاثراتی انداز کو اختیار کیا ہے، اور میرا خیال ہے کہ دونوں ہی انداز کی اپنی الگ الگ افادیت ہے۔

اس مجموعہ کا مقصد یہ جاننے کی کوشش کرنا ہے کہ پچھلے سو سال کی ہنگامہ خیز جدوجہد کے

باوجود کیا وجہ ہے کہ ہماری تباہی کا خاتمہ نہ ہو سکا۔ اس معاملہ میں راقم الحروف کا جو نقطۂ نظر ہے اس کو واضح کرنے کے لئے یہاں ایک مثال درج کی جاتی ہے۔

۱۹۴۷ کے بعد پیش آنے والے واقعات میں شاید سب سے زیادہ ہنگامہ خیز واقعہ وہ ہے جو بابری مسجد (اجودھیا) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مسئلہ میں ہندو اور مسلمان دونوں گہرے طور پر شامل ہوئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ مسئلہ اپنی ذات میں بہت زیادہ اہم ہے۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ اس مسئلہ کو انتہائی غیر متناسب طور پر ابھار اگیا۔ اور اس ابھارنے میں ہندو اور مسلمان دونوں یکساں طور پر شریک تھے۔

ایک طرف ہندو رہنماؤں اور دانشوروں نے، ہندوؤں کو گری لال جین (وفات ۱۹۹۳) کی زبان میں یہ کہہ کر ابھارا کہ یہ تمہارے لئے دوسری شکست (second defeat) کا مسئلہ ہے۔ ۱۹۴۷ میں بٹوارہ کے سوال پر تم کو مسلمانوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی، اب اجودھیا کے سوال پر ہمیں دوسری بار شکست کو قبول نہیں کرنا ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والوں نے، خواہ وہ بے ریش ہوں یا باریش بیک زبان مسلمانوں سے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ صرف ایک مسجد کا سوال نہیں ہے بلکہ وہ ملت مسلمہ کی بقا کا سوال ہے۔ بابری مسجد اس ملک میں ملت کی بقا کی علامت ہے۔ بابری مسجد اگر ڈھائی گئی تو اس ملک میں مسلمانوں کا پورا ملی وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔

یہ دونوں ہی باتیں سراسر بے بنیاد تھیں۔ بابری مسجد کا مسئلہ نہ تو ہندوؤں کے لئے دوسری شکست کا مسئلہ تھا، اور نہ مسلمانوں کے لئے ملت کی بقا کا مسئلہ۔ مگر اس قسم کی سنسنی خیز باتیں کہہ کر دونوں فرقوں کو اس طرح ابھارا گیا کہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ یہ صف آرائی اتنی بڑھی کہ اجودھیا کا سوال دونوں فرقوں کے لئے وقار کا سوال بن گیا۔ جب کسی مسئلہ کو وقار کا مسئلہ بنادیا جائے تو مسئلہ کے حل کے امکانات بڑھتے نہیں بلکہ خطرناک حد تک کم ہو جاتے ہیں۔ یہی مسجد مندر کے جھگڑے میں ہوا۔ جیسا کہ معلوم ہے ہندوستان میں تقسیم کے وقت سرحدی علاقوں میں ہزاروں مسجدیں ڈھائی گئیں خود مسلم دنیا میں بھی تقریباً ہر

مسلم ملک میں کثرت سے مسجدیں ڈھائی گئی ہیں۔ مگر ان مسجدوں میں سے کسی مسجد کا ڈھایا جانا کسی خطرناک صورت حال کا سبب نہیں بنا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مسجدوں کے نام پر مسجد والوں اور ڈھانے والوں کے درمیان ایسی تحریکیں نہیں چلائی گئیں جو اس معاملہ کو دونوں فریق کے لئے وقار کا مسئلہ بنادیں۔

بابری مسجد کو جس چیز نے ایک خطرناک مسئلہ بنایا وہ خود بابری مسجد کی انفرادی نوعیت نہیں تھی۔ بلکہ بابری مسجد کے نام پر چلائی جانے والی تحریک کی انفرادی نوعیت تھی۔ اس انداز کی جذباتی تحریک جس مسجد یا غیر مسجد کے لئے بھی چلائی جائے، وہ یقیناً اسی قسم کا منفی نتیجہ پیدا کرے گی۔

۱۹۱۳ میں اس وقت کی انگریز حکومت نے کانپور کی ایک مسجد کے صرف غسل خانہ کو سڑک کی توسیع کے لئے ڈھایا تھا۔ اس کے نام پر اس زمانہ کے لیڈروں نے زبردست تحریک اٹھادی۔ اس کے پیچھے مسجد کی حمایت سے زیادہ انگریز کی مخالفت کا جذبہ تھا۔ اس زمانہ کے مسلم لیڈروں کی جذباتی تقریروں نے مسلمانوں کو اس قدر بھڑکایا کہ وہ انگریز انتظامیہ سے لڑ گئے۔ اس کے بعد انگریزی پولیس نے گولی چلائی جس میں بہت سے مسلمان ہلاک ہوگئے۔ مولانا شبلی نعمانی نے اس واقعہ پر ایک جذباتی نظم لکھی جو اس زمانہ میں بہت مقبول ہوئی۔ اس نظم میں لاشوں کے منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے آخر میں یہ کہا گیا تھا کہ :

پوچھا جو میں نے کون ہو تم آئی یہ صدا — ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ اکثر عرب ملکوں میں سڑک کی توسیع کے لئے نہ صرف غسل خانہ بلکہ پوری کی پوری مسجدیں ڈھادی گئیں۔ مگر وہاں مسلمانوں کی لاشوں کا یہ دردناک منظر کبھی دکھائی نہیں دیا۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ وہاں اس قسم کے جذباتی لیڈر موجود نہ تھے جو مسلمانوں کو اشتعال دلا کر ان کو انتظامیہ سے ٹکرائیں۔ اس کے نتیجہ میں پولیس گولی چلائے اور مسلمانوں کی خونی لاشیں زمیں پر دکھائی دینے لگیں۔

02

آج بر صغیر ہند میں ہر سوچنے والے انسان کے سامنے ایک ہی سوال ہے۔ وہ یہ کہ پچھلے تقریباً سو سال کے درمیان یہاں بہت سی بڑی بڑی تحریکیں چلائی گئیں اور بے شمار قربانیاں دی گئیں مگر نتیجہ صفر رہا۔

ہماری تمام کوششیں اور قربانیاں عملاً رائیگاں ہو کر رہ گئیں۔ کچھ نئی چیزوں کا حوالہ دے کر کہا جاتا ہے کہ آزادی کے بعد انڈیا نے یہ اور یہ ترقیاں کی ہیں۔ مگر یہ حوالے درست نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ تمام جدید چیزیں زمانہ کی پیداوار ہیں۔ وہ صنعتی انفجار (industrial explosion) کا نتیجہ ہیں۔ وہ سیاسی آزادی یا ملکی حکومت کی دین نہیں۔ ہندستان میں اگر انگریزوں کی حکومت باقی رہتی تب بھی یہ نئی ترقیاں ہمیں اسی طرح حاصل ہوتیں جیسے کہ وہ آج حاصل ہیں۔ اس کی ایک مثال ملک میں جدید کمیونی کیشن (مثلاً ریلوے) کا نظام ہے جو زیادہ تر انگریزوں ہی کے زمانے میں قائم ہوا۔

اس المیہ کا سبب اصلاً صرف ایک ہے۔ پختگی کی عمر کو پہنچنے کے بعد میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ بر صغیر ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو لیڈر اٹھے وہ تقریباً سب کے سب ایک ہی غلطی کا شکار ہوئے۔ اس غلطی نے ان کی ہمالیائی کوششوں کو بے نتیجہ بنادیا۔ یہ ترجیحات (priorities) کا غلط تعین ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے کے ہندستان میں مہاتما گاندھی نے سیاسی آزادی کو اپنی پہلی ترجیح بنایا۔ حالانکہ زیادہ صحیح یہ تھا کہ وہ تعلیم کو اپنی پہلی ترجیح بنائیں۔ آزادی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے سوسلشٹ اکانومی (زیادہ صحیح لفظوں میں سرکاری اکانومی) قائم کرنے کو اپنی پہلی ترجیح بنایا۔ حالانکہ ان کے لئے صحیح یہ تھا کہ وہ ملک میں انفراسٹکچر (infrastructure) وجود میں لانے کو اپنی پہلی ترجیح بنائیں۔ اٹل بہاری باجپئی نے ایٹم بم بنانے کو اپنی پہلی ترجیح قرار دیا۔ حالانکہ ان کے لئے صحیح یہ تھا کہ وہ سرکاری بھرشٹاچار ختم کرنے کو اپنی پہلی ترجیح بنائیں۔

یہی معاملہ سرحد کے دوسری طرف پاکستان میں ہوا۔ مسٹر محمد علی جناح نے دو قومی دنیا

وجود میں لانے کو اپنی اولین ترجیح بنایا۔ حالانکہ ان کے لئے صحیح یہ تھا کہ وہ ایک قومی دنیا وجود میں لانے کو اپنی اولین ترجیح بنائیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلامائزیشن آف اسٹیٹ کو اپنی پہلی ترجیح بنایا۔ حالانکہ ان کے لئے صحیح یہ تھا کہ وہ اسلامائزیشن آف مین کو اپنی پہلی ترجیح بنائیں۔ محمد نواز شریف کو چاہئے تھا کہ وہ اقتصادی خود کفالتی کو پاکستان کی پہلی ترجیح بنائیں جو کہ تقریباً پچاس بلین ڈالر کا مقروض ہو چکا ہے۔ مگر انھوں نے شاہین بم اور غوری مزائل بنانے کو اپنی پہلی ترجیح قرار دیا۔ وغیرہ۔

صحیح ترجیح اختیار کرنیوالی قوم وقت پر اپنی منزل پر پہنچتی ہے۔ اور غلط ترجیح اختیار کرنے والی قوم کہیں بھی نہیں پہنچتی خواہ بظاہر وہ کتنی ہی زیادہ لمبی مدت تک سرگرمی دکھاتی رہے۔ بدقسمتی سے یہی دوسری صورت انڈیا اور پاکستان کے حصہ میں آئی ہے۔

03

آزادی سے پہلے غالباً ۱۹۴۴ میں میں لاہور گیا تھا۔ اس وقت شاہ گنج (جون پور) سے لاہور تک براہ راست ٹرین جاتی تھی۔ چنانچہ میں اپنے قریبی اسٹیشن شاہ گنج میں ٹرین پر بیٹھا اور سفر کر کے لاہور اسٹیشن پر اتر گیا۔ اس وقت وہاں میرا کوئی جاننے والا نہ تھا۔ پہلی رات میں نے ریلوے اسٹیشن سے قریب ایک مسجد میں گذاری۔ اس کے بعد دن کو میں شہر دیکھنے کے لئے نکلا۔

میں بغیر کسی منصوبہ کے لاہور کی سڑکوں پر چل رہا تھا۔ اتفاقی طور پر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کا پورا نام مجھے یاد نہیں۔ البتہ یہ یاد ہے کہ لوگ انہیں قریشی صاحب کہا کرتے تھے۔ وہ مجھ پر مہربان ہو گئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے جو صرف ایک کمرہ پر مشتمل تھا۔ میں تقریباً دو ہفتہ ان کے ساتھ رہا۔ انھوں نے مجھ کو جن لوگوں سے ملایا ان میں سے ایک لاہور کے ہندو تاجر تھے۔ لاہور کے مال روڈ پر ان کی ایک بڑی دوکان تھی جس کے اوپر جلی حرفوں میں انگریزی میں لکھا ہوا تھا : بی لیلا رام اینڈ سنز۔ قریشی صاحب کے اس ہندو تاجر سے بہت اچھے تعلقات تھے وہ کئی بار مجھ کو وہاں لے گئے۔ اس ہندو تاجر نے میرے ساتھ نہایت عزت اور محبت کا معاملہ کیا۔ اس وقت لاہور میں بہت سے ہندو رہتے تھے۔ ان ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس وقت

نہایت خوشگوار تعلقات تھے۔ یہی حال اس پورے خطہ کا تھا جس کو اب پاکستان کہا جاتا ہے۔

یہ آزادی سے پہلے کی بات ہے۔ اب آزادی کے بعد اسی خطۂ ارضی میں کیا حالات ہیں۔ اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ یکم جون ۱۹۹۸ کو میں نے ریڈیو پاکستان پر پاکستانی وزیر اعظم مسٹر محمد نواز شریف کی تقریر سنی۔ وہ پاکستانی عوام کو خطاب کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ جس دن (۲۸ مئی ۱۹۹۸) ہم اپنا ایٹمی دھماکہ کرنے والے تھے، اس سے پہلے کی رات کو میں بالکل نہیں سویا۔ اس لئے کہ ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ دشمن کہیں ہمارے اوپر حملہ نہ کر دے۔

آزادی سے پہلے جب میں نے مذکورہ سفر کیا تو اتر پردیس سے لے کر پنجاب تک ہر جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برادرانہ ماحول کا منظر تھا۔ اس وقت دونوں میں سے کوئی بھی ''دشمن'' کا لفظ نہیں بولتا تھا۔ مگر آج سرحد کے دونوں طرف اس لفظ کا استعمال عام ہو چکا ہے۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس فرق کا اصل سبب میرے علم کے مطابق زرد صحافت اور زرد قیادت ہے۔ جس نے مصنوعی طور پر دوستی کو دشمنی میں بدل دیا ہے۔

زرد صحافت اور زرد قیادت کا طریقہ کیا ہے۔ یہ طریقہ ایک لفظ میں منتخب رپورٹنگ (selective reporting) یعنی ایک ہزار میں سے ۹۹۹ اچھی باتوں کو چھوڑ دینا، اور صرف ایک بری بات کو مزید اضافہ کے ساتھ کثرت سے بیان کرنا۔ یہی پچھلے برسوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ دونوں طرف کے کچھ لکھنے اور بولنے والے اسی اسلوب کو اختیار کر کے دونوں گروہوں کو غیر فطری طور پر بھڑکاتے رہے۔ یہاں تک کہ دونوں کے درمیان فطرت کا قائم کردہ معتدل تعلق ٹوٹ گیا اور دونوں کے درمیان غیر معتدل تعلق قائم ہو گیا۔ زرد صحافت اور زرد قیادت کے معاملہ کو سمجھنے کے لئے دونوں طرف کی ایک ایک مثال یہاں درج کی جاتی ہے۔

میرے علم کے مطابق، پچھلے تقریباً ۶۰ سال سے ایک بات مسلمانوں کے درمیان بار بار دہرائی جاتی رہی ہے۔ وہ یہ کہ ہندوؤں کا یہ منصوبہ ہے کہ آزادی کے بعد جب اکثریتی فرقہ ہونے کی حیثیت سے انھیں ملک میں اقتدار حاصل ہو تو وہ ہندستان کو دوسرا اسپین بنانے کی کوشش

کریں۔ یعنی اس ملک سے مسلمانوں کا خاتمہ کردیں۔ یہ بات جمعیۃ علماء ہند کے مولانا محمد میاں (۱۹۷۵۔ ۱۹۰۳) سے لے کر ندوۃ العلماء کے مولانا علی میاں تک، لمبے عرصہ سے بار بار دہراتے رہے ہیں۔ مگر ان حضرات میں سے کسی نے کبھی اس کا کوئی ماخذ نہیں بتایا۔ یہ صرف ایک سنی سنائی بات ہے جس کو ہمارے علماء اور غیر علماء بلا تحقیق برابر دہراتے رہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے اندر برادران وطن کی طرف سے ایک غیر ضروری قسم کا خوف پیدا کردیا۔ ان کے اندر وہ معتدل مزاج باقی نہ رہا جو کسی ملک میں مستحکم ترقی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔

''دوسرے اسپین'' کا افسانہ ہر اعتبار سے بے بنیاد ہے۔ نہ اس کا کوئی واقعی ثبوت موجود ہے کہ ہندوؤں کی کوئی تنظیم اس مقصد کے لئے کام کر رہی ہے۔ اور اگر بالفرض ایسے کچھ سر پھرے ہندو ماضی میں رہے ہوں یا آج کہیں موجود ہوں تب بھی اس قسم کا تخریبی منصوبہ بلا شبہ خدا کی اس دنیا میں نا قابل عمل ہے۔ ایسی حالت میں ہمارا کام اس کو نظر انداز کرنا ہے نہ کہ اس کو ایک خطرہ بتا کر مسلمانوں کو اس سے ڈرانا (اس کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب ہندستانی مسلمان کے باب ''بے بنیاد خوف'' میں دیکھی جاسکتی ہے)

زرد صحافت اور زرد قیادت کا یہی معاملہ خود ہندوؤں کے درمیان بھی پیش آیا۔ لکھنے اور بولنے والے ہندوؤں کے ایک طبقہ نے عجیب وغریب طور پر ہندوؤں میں یہ افواہ پھیلائی کہ مسلمانوں کے لئے اپنے مذہب کے رو سے چار شادیاں کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ ہر مسلمان چار شادیاں کرتا ہے، جب کہ ہندو صرف ایک شادی کرتا ہے۔ اس طرح ایک مسلمان ایک ہندو کے مقابلہ میں چوگنا زیادہ بچے پیدا کر رہا ہے۔ گویا کہ ہندوؤں کی آبادی ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴ کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ جب کہ مسلمانوں کی آبادی ۱۔ ۲۔ ۴۔ ۸۔ ۱۶ کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ اس طرح مسلمان بہت جلد تعداد میں ہندوؤں سے زیادہ ہو جائیں گے۔

ایسی حالت میں ضروری ہے کہ مسلمانوں کے اضافۂ آبادی کو روکنے کیلئے سخت تدبیر اختیار کی جائے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی جیسی انتہا پسند جماعت کو سیاسی اقتدار تک پہنچانے میں اس قسم کے فرضی خطرہ کا بہت بڑا دخل ہے۔ ہندوؤں کو محسوس ہوا کہ کانگریس جیسی ''نرم'' پارٹی مسلم

نسل کی حد بندی نہیں کر سکتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایک "سخت" پارٹی کو مرکزی اقتدار دیا جائے، ورنہ ہندو پچاس برس بعد خود اپنے ہی ملک میں اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔

اس بے بنیاد افواہ کی مدلل تردید میں نے اپنے مضامین میں کی ہے۔ اس کے علاوہ خود ہندوؤں کے جلسہ میں بھی ایک سے زیادہ بار اس کی تردید کر چکا ہوں (ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب یکساں سول کوڈ) ۳؍ فروری ۱۹۹۷ کو نئی دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب میں ایک جلسہ تھا۔ اس میں دہلی کے آر ایس ایس گروپ کے لوگ بڑی تعداد میں شریک تھے۔ یہاں مجھے تقریر کرنے کا موقع ملا۔ میں نے جو باتیں کہیں ان میں چار شادی کا یہ افسانہ بھی تھا۔

میں نے کہا کہ قرآن و حدیث میں کہیں بھی یہ حکم نہیں ہے کہ ہر مسلمان چار شادی کرے۔ تاہم اس سے قطع نظر عقل عام ہی یہ سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ ایسا ہونا عملی طور پر ممکن نہیں۔ یہ بات اتنی زیادہ بے بنیاد ہے کہ وہ بظاہر ہی قابل رد ہے:

Prima facie it stands rejected.

میں نے کہا کہ بالفرض اگر ہر مسلمان چار شادیاں کرے تو یہ صرف اس وقت ممکن ہوگا جب کہ مسلم سماج میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلہ میں چار گنا زیادہ ہو۔ یعنی اگر ایک کرور مرد ہوں تو چار کرور عورتیں۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ نیچر ہمیشہ عورت اور مرد کی تعداد کے درمیان ایک توازن (equilibrium) برقرار رکھتی ہے۔ چنانچہ ہر سماج میں عورت اور مرد کی تعداد ہمیشہ تقریباً یکساں رہتی ہے۔ حتی کہ اگر جنگ یا کسی بڑے حادثہ کی وجہ سے وقتی طور پر یہ توازن ٹوٹ جائے تو نیچر بہت جلد اس کے مطابق افراد پیدا کر کے اس توازن کو دوبارہ قائم کر دیتی ہے۔

یہی تمام انسانی معاشروں کا حال ہے۔ اور یہی مسلم معاشرے کا حال بھی۔ ایسی حالت میں یہ بات سرے سے ممکن ہی نہیں کہ ہر مسلمان چار عورتوں سے شادیاں کرے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ مسلمانوں کے پاس کوئی عورت ساز فیکٹری ہو جس میں وہ اپنی مطلوب تعداد کے مطابق عورتیں بنالیا کرتے ہوں۔ مگر اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ مسلمانوں کے پاس ایسی کوئی

عورت ساز فیکٹری موجود ہے۔

پھر ہر مسلمان اگر چار شادی کرے گا تو کس طرح کرے گا۔ یہ فاضل عورتیں آخر کہاں سے لائی جائیں گی۔

اس قسم کی افواہی باتیں جو ہندو اور مسلمان دونوں کے درمیان پھیلائی گئیں۔ انھوں نے س فطری تعلق کو توڑ دیا جو دونوں کے درمیان سیکڑوں سال سے قائم تھا۔ اس کا ایک نتیجہ ملک کے بٹوارہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ تاہم بٹوارہ کے بعد اگر افواہوں کا یہ کارخانہ بند ہو جاتا تب بھی اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ایک عارضی وقفہ کے بعد دوبارہ فطرت اپنے آپ مطلوب اعتدال کو دونوں کے درمیان قائم کر دیتی۔ مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا بلکہ افواہوں کا یہ کارخانہ مزید اضافہ کے ساتھ جاری رہا۔ یہاں تک کہ اب سرحد کے دونوں طرف اس بات پر فخر کیا جا رہا ہے کہ ہم اب ایٹمی طاقت بن چکے ہیں۔ اب ہم دشمن کو اس طرح مٹا سکتے ہیں کہ اس کا کوئی وجود ہی زمین پر باقی نہ رہے۔

04

یوپی کے ضلع اعظم گڑھ میں میرے گاؤں سے تقریباً ۳ کیلو میٹر کے فاصلہ پر بسین پور تھا۔ یہاں ایک وسیع زرعی فارم کے اندر یورپی طرز کی ایک لال عمارت تھی جس کو "صاحب کا بنگلہ" کہا جاتا تھا۔ یہاں ایک انگریز مسٹر لاری رہا کرتا تھا جو غالباً پہلی عالمی جنگ کے بعد یہاں آکر آباد ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد وہ اپنے وطن انگلینڈ واپس چلا گیا۔ انگریزی حکومت نے یہاں اس کو ایک بڑی زمین دی تھی۔ وہ یہاں رہتا تھا اور زمین پر کاشت کرتا تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے میں نے کئی بار اس بنگلہ کو دیکھا تھا۔ اب نئے مالکوں نے اس کو توڑ کر وہاں کھیت بنا دیا ہے۔

اس وقت یہاں سڑک نہیں تھی۔ مسٹر لاری گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے بنگلہ سے ریلوے اسٹیشن پھریہا جایا کرتا تھا۔ یہ ریلوے لائن اس علاقہ میں ۱۹۰۱ میں بچھائی گئی۔ اس کا یہ راستہ ہمارے گھر کے سامنے سے گزرتا تھا۔ ہمارے گھر والے اس وقت علاقہ کے بڑے زمیندار تھے اور

اسی کے ساتھ آزادی کی تحریک سے متاثر تھے۔ چنانچہ یہ بات ان کو اپنے وقار کے خلاف معلوم ہوئی کہ ایک انگریز گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے گھر کے سامنے سے گزرے۔ ہمارے گھر والوں نے اس کو منع کیا۔ جب وہ نہیں مانا تو ایک روز اس کے گھوڑے کو روک کر اس کی پٹائی کی۔ تاہم اس نے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ اس نے صرف یہ کیا کہ آئندہ کے لئے اس نے اپنا اسٹیشن کا راستہ بدل دیا۔ اب وہ نظام آباد کے راستہ سے ریلوے اسٹیشن جانے لگا۔ اگرچہ یہ اس کے لئے ایک لمبا راستہ تھا۔

نوجوانی کی عمر میں میں اس پر فخر کرتا تھا کہ میرے خاندان والوں نے مسٹر لاری کو گھوڑے سے اتار کر مارا۔ مگر اب میں سوچتا ہوں کہ یہ بات نہ صرف غیر انسانی تھی بلکہ غیر دانشمندانہ بھی تھی۔

مسٹر لاری ایک ترقی یافتہ قوم کا فرد تھا۔ اس کے مکان کا طرز تعمیر، اس کی زراعت کا اصول، اس کے رہن سہن کا انداز، حتی کہ اس کے رد عمل کا طریقہ، ہر چیز میں لوگوں کیلئے نئی باتیں تھیں۔ جس سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس پورے علاقہ میں اس وقت غالباً وہ واحد شخص تھا جو انگریزی داں تھا۔ ہمارے خاندان کے لوگوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اس انگریز سے انگریزی زبان سیکھی جائے جو زمانہ کے لحاظ سے گویا ترقیاتی دور میں داخلہ کا دروازہ تھا۔

اس کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب انگریزوں کے خلاف وہ نفرت تھی جو اس زمانہ کے ہندو اور مسلم دونوں لیڈروں نے پورے ملک میں پھیلا رکھی تھی۔ اس زمانہ کے ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے انگریز کا لفظ صرف نفرت کی ایک علامت بنا ہوا تھا۔ اس نفرت کے جذبہ کو تیز کرنے کے لئے اس زمانہ کے لیڈر نئی نئی تحریکیں چلاتے رہتے تھے۔ مثال کے طور پر انگلینڈ کے کپڑوں کو جلانا۔ چنانچہ اس زمانہ میں انگلینڈ کے کپڑے خود ہمارے گاؤں میں بھی گھروں سے لے کر جلائے گئے۔ بد قسمتی سے برصغیر ہند میں پچھلے سو سال کے اندر جتنی بڑی بڑی تحریکیں چلائی گئیں وہ تقریباً سب کی سب مبنی بر نفرت تحریکیں تھیں۔ شاید ان میں سے کوئی بھی مبنی بر محبت تحریک نہ

تھی۔ نفرت انسان کا سب سے زیادہ طاقتور جذبہ ہے۔ نفرت کے جذبات کو بھڑکا کر بہت تھوڑی مدت میں بہت بڑی بڑی تحریکیں چلائی جاسکتی ہیں۔ مگر اس قسم کی تحریکیں انسانیت کو تباہی کے سوا اور کچھ نہیں دیتیں۔ نفرت کی بنیاد پر اٹھائی ہوئی تحریک میں لوگ انگریز سے بھی نفرت کرنے لگتے ہیں اور انگریزی سے بھی۔

اس کے برعکس اگر محبت کی بنیاد پر تحریک اٹھائی جائے تو لوگ ایک کو دوسرے سے الگ کرکے دیکھیں گے۔ وہ انگریز کو سیاسی اعتبار سے غیر مطلوب سمجھتے ہوئے بھی ان سے انگریزی زبان سیکھیں گے اور انگریزی علوم کو حاصل کریں گے۔ مگر بدقسمتی سے برصغیر ہند میں محبت پر مبنی کوئی بڑی تحریک اٹھائی نہیں جاسکی۔ یہی وجہ ہے کہ ہنگامہ خیز تحریکوں کے باوجود ہمارے ملک میں کوئی حقیقی تعمیری کام نہ ہو سکا۔

05

میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا جس کو آجکل کی اصطلاح میں فریڈم فائٹر کہا جاتا ہے۔ میرے گھر میں رات دن آزادی کا چرچا رہتا تھا۔ ہمارے خاندان کے سرپرست مولانا اقبال احمد سہیل (وفات ۱۹۵۵ء) کٹر کانگریسی تھے۔ ۱۹۴۲ میں میری شادی ہوئی تو انھوں نے سر سے پاؤں تک مجھے کھدر کے کپڑے پہنائے تھے۔ گاندھی اور نہرو نیز حب الوطنی کے بارے میں ان کے تین شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

آنند بھون سے کیا غرض اب   ہر دل ہے نشیمنِ جواہر
غلط ہے یہ کہ فقط ہندوؤں کا لیڈر تھا   کہ تھا تمام جہاں بھر کا رہنما گاندھی
محبت ہے وطن کی گل زمیں سے   ہمیں اب کیا غرض خلد بریں سے

اس زمانہ کے دوسرے بہت سے نوجوانوں کی طرح میں بھی آزادی کے سنہرے خواب دیکھا کرتا تھا۔ لوگوں کی باتیں سن کر آزاد ہندستان کا عجیب وغریب طلسماتی تصور میرے ذہن میں بسا ہوا تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو جب ہندستان آزاد ہوا، اس وقت میں یوپی کے شہر اعظم گڈھ میں تھا۔ رات کو میں اپنے گھر سے نکل کر شہر کے چوک کی طرف روانہ ہوا۔ چاروں طرف ایک

عجیب رومانی ماحول تھا۔ ۱۵اگست کی اس رات کو جب میں اعظم گڈھ کی سڑک پر چل رہا تھا تو مجھے وہ انوکھا تجربہ ہوا جس کو اب تک میں نے صرف افسانوں میں پڑھا تھا...... خوشی سے میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

اس رات کو میں نے دیکھا کہ پورا شہر (اور اسی طرح پورا ملک) چراغوں کی روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ مگر جب صبح ہوئی تو یہ تمام چراغ بجھ چکے تھے اور اس کے بعد وہ پھر کبھی نہیں جلائے گئے۔ اب ۱۵اگست صرف ایک سرکاری تہوار ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی قومی تہوار۔ کیوں کہ قوم نے سیاسی آزادی سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں۔

یہ احساس صرف میرا احساس نہیں۔ بلکہ یہی ملک کے تمام لوگوں کا احساس ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ تھوڑے سے لوگ ہو سکتے ہیں جنھیں اتفاق سے یہ موقع ملا کہ وہ ملک کی دولت کو لوٹ کر اپنے گھروں اور بینکوں میں بھر لیں۔ جن کا مسئلہ بقول ایک شخص، انکم نہیں ہے بلکہ انکم ٹیکس ہے۔

نوجوانی کی عمر میں میں آزادی کے مسرت بھرے انتظار میں جی رہا تھا۔ اب جب کہ میری عمر ہجری کلینڈر کے اعتبار سے ۸۰ سال کے قریب پہنچ رہی ہے، میں اس انتظار میں اپنی زندگی کے آخری لمحات گذار رہا ہوں کہ اپنی موت سے پہلے وہ دن دیکھ لوں جب کہ میرا ملک ترقی کی اس منزل میں اپنا قدم رکھ چکا ہو۔ جس کا خواب ۱۹۴۷ سے پہلے ہمارے رہنماؤں نے دیکھا تھا۔

06

مجھے باہر کے کئی ملکوں میں نہایت قیمتی مواقع ملے جہاں جاکر میں ایک مطمئن زندگی گذار سکتا تھا۔ مگر میرے دل میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں اپنے وطن کو چھوڑ کر کسی اور ملک میں چلا جاؤں اور وہاں آسائش کی زندگی گذاروں۔ اپنا مادر وطن مجھے اسی طرح عزیز ہے جس طرح مجھے اپنی ماں عزیز ہے۔

اپریل ۱۹۸۳ میں جب پہلی بار میں امریکہ گیا تو کسی غلط اطلاع کی بنا پر مجھے نیویارک ائیرپورٹ پر ہی پولیس کی حراست میں لے لیا گیا۔ ایک پولیس افسر جس نے اپنا نام مسٹر لوئی

(LOUIS) بتایا تھا، وہ مجھ کو اپنی گاڑی میں بیٹھا کر ائیر پورٹ سے پولس اسٹیشن لے گیا۔ اور جب واپسی کے جہاز کا وقت ہوا تو دوبارہ مجھے ائیر پورٹ پر لا کر جہاز کے اندر بٹھا دیا۔ اس نے میرا پاسپورٹ اور میرا ٹکٹ بھی مجھ کو نہیں دیا صرف یہ کہا کہ دوران پرواز وہ مجھ کو پائلٹ کے ذریعہ مل جائے گا۔ مسٹر لوئی جس وقت مجھ کو نیویارک ائیر پورٹ سے پولیس آفس کی طرف لے جا رہے تھے۔، میں نے ان سے کہا کہ مسٹر لوئی، آپ کو شاید یہ اندیشہ ہے کہ میں امریکہ میں رہ جاؤں گا۔ مگر میں ایک اور ڈھنگ کا آدمی ہوں، اگر آپ مجھے امریکہ کا صدر بنا دیں تب بھی میں یہاں رہنے والا نہیں ہوں۔ مجھے اپنے وطن جانا ہے۔ اور وہاں اپنے اس تعمیری مشن کو پورا کرنا ہے جس کے لئے میں نے اپنی ساری زندگی وقف کر رکھی ہے۔

۱۹۷۱ کے نصف اول میں میں نے بذریعہ ٹرین پاکستان کا سفر کیا جب میں بارڈر کے دوسری طرف پہنچا تو میرے قلی نے کہا کہ آپ کو وہ میجر صاحب بلا رہے ہیں۔ اس کے بعد قلی نے مجھے ایک فوجی خیمے کے اندر پہنچا دیا۔ وہاں ایک پاکستانی فوجی افسر بیٹھا ہوا تھا۔ اس خیمے میں صرف ہم دو آدمی تھے یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ بنگلہ دیش کی جنگ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ باوردی فوجی افسر نے مجھ سے کہا کہ انڈیا کے کچھ فوجی راز بتائیے۔ یہ سنتے ہی مجھے غصہ آ گیا۔

میں نے کہا میجر صاحب، آپ مجھ سے یہ سمجھ کر بات کیجئے کہ میں انڈیا کا ایک وفادار شہری ہوں (یہ بات میں نے پاکستان کی سرزمین پر ایک فوجی خیمے میں اس وقت کہی جب کہ اگر وہ فوجی افسر مجھے گولی مار دیتا تو شاید میری موت اس طرح واقع ہو جاتی کہ اس کی کوئی خبر بھی نہ بنتی)

پھر میں نے کہا کہ اگر انڈیا کے ساتھ آپ کی لڑائی کا انحصار ہمارے جیسے لوگوں سے فوجی راز حاصل کرنے پر ہے تو آپ اپنی لڑائی جیت چکے۔ کیوں کہ موجودہ زمانہ میں جنگی راز اتنا ٹاپ سیکریٹ ہوتا ہے کہ بعض اوقات وزیر دفاع کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک میں اس قسم کی باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد سلام کئے بغیر خیمے کے باہر نکل آیا۔ مذکورہ میجر مکمل خاموشی کے ساتھ میری باتوں کو سنتا رہا۔ جب میں باہر نکلا تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے باہر

آگیا۔اس نے کہا: مولانا صاحب، ہم کو آپ ہی جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔

میری زندگی کے سیکڑوں واقعات میں سے یہ صرف چند واقعات ہیں جو بتاتے ہیں کہ مجھے اپنے وطن سے کتنا زیادہ لگاؤ ہے۔ جو ہندو مجھے قریب سے جانتے ہیں، مثلاً سوامی اوم پورن سوتنترا (نئی دہلی) یا سوامی چیدانند (رشی کیش) وہ کہتے ہیں کہ تمہارے اندر جو دیش بھگتی ہے اس کی مثال ہم نے مہاتما گاندھی کے بعد کسی اور کے اندر نہیں دیکھی۔ میرے دل کی یہی تڑپ ہے جو مجھ کو مذکورہ قسم کی باتیں کہنے پر مجبور کرتی ہے۔

۲۰ جنوری ۱۹۹۷ کو نئی دہلی میں پانیر ہاؤس میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں شہر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک تھے۔ اس میٹنگ کا موضوع تھا: کیا گاندھی آج کے ہندستان میں کامیاب ہوتے۔ میں نے اس موقع پر ایک لمبی تقریر کی اس سلسلہ میں میں نے کہا کہ گاندھی پچھلے انڈیا میں بھی کامیاب نہیں ہوئے یہاں تک کہ ۱۹۴۷ میں انھیں خود یہ کہنا پڑا کہ: اب میری کون سنے گا۔ پھر گاندھی جب پچھلے انڈیا میں کامیاب نہیں ہوئے تو آج کی انڈیا میں وہ کس طرح کامیاب ہوتے۔ ایک ہندو پروفیسر نے میری بات سن کر کسی قدر برہمی کے ساتھ کہا کہ آپ مہاتما گاندھی پر تنقید کر رہے ہیں یہ سن کر میرا دل تڑپ اٹھا میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

I love Gandhi but I love India more than Gandhi

میری یہ بات سن کر پروفیسر صاحب خاموش ہوگئے۔ اس کے بعد کسی نے بھی میری تنقیدی تقریر کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ میری یہ تقریر مکمل طور پر انگریزی اخبار پانیر (نئی دہلی) کے شمارہ ۲۶ جنوری ۱۹۹۷ میں چھپ چکی ہے۔

انگریزی میگزین سنڈے کے شمارہ ۱۹۔۲۵ نومبر ۱۹۹۵ میں مسٹر ارن شوری کا ایک تفصیلی انٹرویو چھپا۔ اس کے انٹرویور منی شنکر ایر تھے۔ اس انٹرویو میں مسٹر ارن شوری نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ایک اچھے مسلمان (good muslim) کا ایک اچھا انڈین (good Indian) ہونا بہت مشکل ہے۔ میں نے اس انٹرویو کو پڑھنے کے بعد مسٹر ارن شوری کو

ٹیلی فون کیا۔ میں نے کہا: یہ بتائیے کہ میں گڈ مسلم ہوں یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ کون کہہ سکتا ہے کہ آپ گڈ مسلم نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر سن لیجئے کہ میں ایک گڈ مسلم بھی ہوں اور گڈ انڈین بھی ہوں۔ یہ کہتے ہوئے میری زبان سے نکلا: اگر میں گڈ انڈین نہیں ہوں تو مہاتما گاندھی بھی گڈ انڈین نہیں تھے۔

اس واقعہ کے چند روز بعد ڈاکٹر مہیش چندر شرما (ممبر پارلیمنٹ) میرے دفتر میں ملاقات کے لئے آئے۔ میں نے ان سے مذکورہ گفتگو نقل کی۔ انھوں نے اس کو سن کر کہا: مولانا صاحب، آپ کے گڈ انڈین ہونے کے لئے کسی ارن شوری کے سرٹفکٹ کی ضرورت نہیں۔ آپ ایسے کسی سرٹفکٹ کے بغیر ہی گڈ انڈین ہیں۔

میری بعض تنقیدوں کو سن کر ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ آپ ہمارے قومی لیڈروں کی اتنی سخت آلوچنا کرتے ہیں۔ آخر کس نے آپ کو اس کا ادھکار دیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میری دیش بھکتی (حب الوطنی) سے مجھ کو یہ ادھکار پراپت ہوا ہے۔ یہ سن کر وہ چپ ہو گئے۔

۱۹۴۷ سے پہلے کسی ہندستانی کی دیش بھکتی کا ثبوت یہ ہوتا تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف بولتا ہو، یہ بہت سستا معیار تھا۔ کیوں کہ اس زمانہ کے حالات میں کسی آدمی کو انگریز کے خلاف بولنے کا یہ شاندار انعام ملتا تھا کہ وہ اچانک ملک کے اندر ہیرو بن جائے۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد قومی تعمیر کا مسئلہ تھا۔ اور قومی تعمیر میں آدمی کو خود اپنی قوم کے خلاف بولنا پڑتا ہے۔ اس دوسرے معیار پر صرف مہاتما گاندھی پورے اترتے ہیں۔ تقسیم کے بعد پاکستان کو ۵۵ کروڑ روپیہ دینے کا سوال ایک انتہائی نازک اور حساس سوال تھا۔ اس حساس سوال پر مہاتما گاندھی واحد شخص تھے جو نازک قومی جذبات کے خلاف بولے۔ مہاتما گاندھی کے سوانح نگار لوئی فشر کے مطابق، مہاتما گاندھی کو جو گولی ماری گئی وہ اس معاملہ میں ان کے موقف کی قیمت تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ پچھلے پچاس سال کے دوران دیش کے لئے اس قسم کی نازک قربانی کی دوسری مثال صرف وہ ہے جس کی توفیق مجھے اللہ کی خصوصی مدد سے حاصل ہوئی۔ بابری مسجد کا سوال تمام مسلمانوں کے لئے وقار کا سوال بن گیا تھا۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب مشتعل ہندوؤں کی ایک

بھیڑ نے بابری مسجد کو ڈھادیا تو تمام مسلمانوں کے اندر غصہ کی آگ بھڑک اٹھی ۔ جذبات سے بے قابو ہو کر وہ کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہوگئے ۔ یہ ایک انتہائی نازک صورت حال تھی۔ لوگوں کے جذبات اتنے زیادہ بھڑکے ہوئے تھے کہ ملک کے دونوں بڑے فرقوں کے درمیان خونی ٹکراؤ کی حالت پیدا ہو گئی۔ اس وقت اپنی زندگی کا مشکل ترین رسک (risk) لے کر میں لوگوں کے سامنے آیا اور دونوں فرقوں کے سامنے یہ دو نکاتی فارمولا پیش کیا کہ ----- مسلمان ایک مسجد کے سوال پر چپ ہو جائیں، اور ہندو بقیہ مسجدوں کے سوال پر چپ ہو جائیں۔

یہ بات اس وقت کے ماحول میں آگ پر پٹرول ڈالنے کے ہم معنی تھی۔ وقتی طور پر لوگ میری جان کے دشمن ہوگئے قوم کی طرف سے مجھے سخت غضبناکی کا شکار ہونا پڑا مگر دھیرے دھیرے حالات بدلے اور لوگوں نے جان لیا کہ یہی واحد فارمولا تھا جس سے ملک کو ایک عظیم تباہی سے بچانا ممکن ہو سکا۔

07

میرے وطن اعظم گڑھ میں سب سے پہلی موٹر کار راجہ ہرکھ چند نے منگوائی تھی۔ یہ تقریباً ستر سال پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد شہر کی دوسری کار وہ تھی جو ہمارے خاندان نے خریدی۔ یہ فورڈ کا پرانا ماڈل تھا۔ جس کے اوپر موجودہ تھری وہیلر کے مانند کپڑا ہوا کرتا تھا۔ میں اس زمانہ میں اس موٹر کار کو دیکھتا تھا اور اس پر بیٹھتا تھا۔ اس کار کی حیثیت گویا ایک سائنسی واقعہ کی تھی۔ مگر اس نے میرے اندر کسی بھی درجہ میں کوئی سائنٹفک تھنکنگ پیدا نہیں کی۔

یہ کار کیا تھی، وہ امریکا کے ہنری فورڈ (وفات ۱۹۴۷) کی سرتاپا سائنسی زندگی کا ایک صنعتی نمونہ تھا۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک سائنسی انسان کی یاد دلاتی تھی۔ اس کے ساتھ وہ فورڈ سے پہلے کے ان انسانوں کی یاد دلاتی تھی جنھوں نے اپنی زندگیاں سائنسی میدان میں وقف کر دیں۔ یہاں تک کہ وہ اس قابل ہوئے کہ وہ فطرت کے اس راز کو دریافت کر سکیں کہ جامد مادہ کو کس طرح متحرک مشین میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ مذکورہ کار گویا ان باتوں کا ایک خاموش اعلان تھی۔ مگر میرے ذہن میں کبھی اس قسم کے سوالات نہیں ابھرے اور نہ میں نے کبھی ان

کے بارے میں جاننے کی کوئی کوشش کی۔ آج میں سوچتا ہوں کہ مجھ میں اور ہنری فورڈ میں یہ فرق کیوں تھا۔ ہنری فورڈ نے اپنی پوری زندگی سائنس اور ٹکنالوجی کے مطالعہ میں صرف کر دی اس نے اپنے رات دن کے تمام لمحات کو انہیں تجربات میں گذار دیا یہاں تک کہ وہ پہلی سب سے بڑی موٹر کمپنی بنانے میں کامیاب ہوا۔ جب کہ میرا یہ حال تھا کہ جزئی طور پر فورڈ کا ہم عصر ہوتے ہوئے میں اس قسم کے شعور تک سے بالکل خالی تھا۔ اس فرق کا سبب دونوں کے ماحول کا فرق ہے۔

ہنری فورڈ ۱۸۶۳ء میں امریکا کے ایک شہر میں پیدا ہوا۔ اس وقت امریکا میں ہر طرف سائنس اور طبیعاتی علوم کا چرچا تھا۔ اس ماحول میں پرورش پانے والا ہر نوجوان کسی ارادے کے بغیر خود بخود سائنسی باتوں سے مانوس ہو جاتا تھا۔ اس کے اندر اپنے آپ ہی سائنسی واقفیت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا تھا۔ یہی ماحول ہے جس نے انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کے زمانہ نے امریکا میں ہزاروں سائنسداں پیدا کئے۔ مگر میں اپنے وطن اعظم گڈھ میں اس قسم کے ماحول سے مکمل طور پر محروم تھا۔ اس محرومی کی ذمہ داری اس زمانہ کے ان رہنماؤں پر ہے جو اپنی بے شعوری کی بنا پر اس قسم کا ماحول نہ بنا سکے۔

اس زمانہ کے رہنماؤں نے ہمارے معاشرہ کا جو ماحول بنایا وہ کیا تھا ... سطحی سیاست، آزادی کے کھوکھلے نعرے، ادب اور شاعری، داستان امیر حمزہ اور الف لیلیٰ جیسی کتابوں کو پڑھنا، فرضی قصے کہانیاں سننا اور سنانا، وغیرہ۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، تقریباً پورا مسلم معاشرہ ہمارے رہنماؤں کے پیدا کردہ اسی قسم کے ماحول میں جی رہا تھا۔ میرے علم کے مطابق بر صغیر ہند کا کوئی بھی گوشہ ایسا نہیں جو اس زمانہ میں اس عام صورت حال سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہو۔

گھر کے ماحول سے نکل کر جب میں عربی اور دینی تعلیم کے لئے مدرسہ میں پہنچا تو وہاں بھی عین یہی ماحول تھا۔ حتی کہ اس زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے جدید تعلیم کے نام سے جو ادارے بنائے وہاں بھی حقیقی معنوں میں سائنسی ماحول کا کوئی وجود نہ تھا۔ پہلی بار جب میں مسلم یونیورسٹی (علیگڑھ) گیا اور وہاں "سر سید روم" کو دیکھا تو مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ سر سید (۱۸۹۸)

انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب لندن گئے تو وہاں کی سب سے زیادہ قیمتی چیز جو انھوں نے ہندستان لانے کے قابل سمجھی وہ قدیم وضع کا ایک صوفہ سٹ تھا۔ وہاں سے وہ نہ کوئی مشین لائے اور نہ کوئی سائنسی کتاب۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے میں بر صغیر ہند کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے۔ اس زمانہ میں یورپ اور امریکا کے لوگ سائنسی انقلاب لانے میں مصروف تھے۔ مگر جیسا کہ عرض کیا گیا، عین اسی زمانہ میں برے صغیر ہند میں اس سے بالکل مختلف چیزیں لوگوں کے ذہنوں پر چھائی ہوئی تھیں۔ آزادی کے کھوکھلے نعرے، نثر اور نظم میں خیالی مضمون بندیاں، مذہب کے نام پر سطحی بحثیں، ماضی پر فخر اور حال سے بے خبری، انسانوں سے محبت کرنے کے بجائے ان کو اپنا دشمن بتا کر ان سے نفرت کرنا، حقائق فطرت میں جینے کے بجائے مفروضات اور توہمات میں جینا۔ یہی وہ چیزیں تھیں جو اس زمانہ میں بر صغیر ہند میں عمومی طور پر چھائی ہوئی تھیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں (نیز ہندوؤں) کے تمام مسائل کی جڑ ان کی یہی مشترک فکری پس ماندگی ہے۔ اسی بات کو جواہر لال نہرو نے اپنے آخری زمانہ میں اس طرح کہا تھا کہ ہمارے دیش میں سب سے زیادہ جس چیز کی کمی ہے وہ سائنٹفک ٹمپر ہے۔ ماضی میں اگر ہمارے یہاں ایسے صاحب بصیرت لیڈر ابھرتے جو لوگوں کے اندر صحیح سوچ پیدا کرتے تو آج ہم اس کا مثبت نتیجہ پا رہے ہوتے۔ اب بھی اگر کوئی امید کا پہلو ہے تو وہ یہی ہے کہ ہمارے درمیان آج ایسے رہنما ابھریں جو دور رس نظر رکھتے ہوں اور سماج کو ایسی بنیاد پر کھڑا کریں جو مستقبل کے اعتبار سے نتیجہ خیز ہو اس کے بغیر نہ پہلے کوئی امید کی جا سکتی تھی اور نہ آئندہ کی جا سکتی ہے۔

08

۱۹۴۶ میں یہ بات واضح ہو گئی کہ اب انڈیا کو انگریزوں سے آزاد ہونا ہے۔ لوئی فشر کے بیان کے مطابق، ۵ دسمبر ۱۹۴۶ میں مہاتما گاندھی نے لکھا کہ۔ اس ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں کو امن اور میل ملاپ کے ساتھ رہنا ہے ورنہ اس کی کوشش میں میں اپنی جان دے دوں گا:

Hindus and Muslmans should learn to live together in peace and amity otheriwse I should die in the attempt .(p.449)

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ برصغیر ہند کی تقسیم نفرت کی بنیاد پر ہوئی۔ نفرت کی یہ لہر گست ۱۹۴۷ کو اچانک ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ فطری طور پر ایسا ہوا کہ یہ نفرت اس کے بعد بھی حد کے دونوں طرف جاری رہی۔ بلکہ مختلف اسباب کے تحت اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ شبہ ملک کے مستقبل کی تعمیر کے لئے سب سے بڑا خطرہ تھا۔ دو پڑوسیوں میں اگر نفرت اور اوت کی فضا ہو تو دونوں میں سے کوئی ایک بھی ترقی نہیں کر سکتا۔ مگر میرے علم کے مطابق رے برصغیر میں صرف ایک شخص تھا، یعنی مہاتما گاندھی۔ جو اس حقیقت کو شعوری طور پر جانتا ما۔ اس نے اس راہ میں اپنی آخری کوششیں بھی صرف کردیں۔ مگر مشن کی تکمیل سے پہلے زادی کے جلد ہی بعد ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو گولی مار کر گاندھی کو ہلاک کر دیا گیا۔ اگلی صبح کو تمام خباروں نے اس کو اپنی پہلی خبر بنایا۔ امرت بازار پتر کا کی سرخی ان الفاظ میں تھی:

Gandhi sacrificed by fanaticism

ہندو مسلم اتحاد، اور اسی طرح انڈیا اور پاکستان کے درمیان پرامن تعلقات بلاشبہ اس برصغیر کی سب سے بڑی ضرورت ہیں۔ اس فضا کو پیدا کئے بغیر برصغیر میں کوئی ترقی ممکن نہیں ہو سکتی، نہ ایک کے لئے اور نہ دوسرے کے لئے۔

مگر اس رخ پر ابھی تک کوئی مؤثر کوشش نہ کی جا سکی۔ مہاتما گاندھی نے اس کو اپنا آخری مشن بنا کر اپنی پوری زندگی اس کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر مشن کے آغاز ہی میں ان کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ان کے بعد میرے خیال کے مطابق، کوئی بھی قابل ذکر شخص اس خاص مقصد کے لئے نہ اٹھا، نہ ہندوؤں میں اور نہ مسلمانوں میں۔

ہندوؤں میں پنڈت جواہر لال نہرو اور مسلمانوں میں مولانا ابوالکلام آزاد۔ اس قابل تھے کہ وہ گاندھی کے اس ناتمام مشن کو پورا کر سکیں۔ مگر ان لوگوں نے اس رخ پر کوئی سنجیدہ کوشش نہ کی۔

اگر پنڈت نہرو پرائم منسٹر نہ بنتے۔ اس کے بجائے وہ گاندھی کے مذکورہ مشن کی تکمیل کے لئے ایک انگریزی میگزین نکالتے۔ اسی طرح مولانا آزاد وزیر تعلیم نہ بنتے اس کے بجائے وہ

ہندو مسلم اتحاد کے مقصد کے تحت ایک اردو میگزین جاری کرتے تو یہی دوافراد دس سال کے اندر پورے ملک میں ایک نیا فکری انقلاب لانے کے لئے کافی تھے۔

09

انسان کے لئے سب سے زیادہ تباہ کن نفسیات انتقام کی نفسیات ہے۔ انتقام کی سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ اس کا کوئی خاتمہ نہیں۔ ہر انتقام کا دوبارہ انتقام لیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تباہ کن سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک کہ خود انتقام لینے والوں کا خاتمہ نہ ہو جائے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہندستان کا بٹوارہ ہوا۔ اس بٹوارہ کے ذمہ دار بلا شبہ ہندستانی مسلمان تھے۔ ہندستانی مسلمانوں نے مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے اتحاد پسند قائدین کو رد کر دیا اور مسٹر محمد علی جناح کی قیادت میں ملک کے بٹوارے کا طوفانی مطالبہ کیا۔ ہندو قیادت نے تحریک کے آخری مرحلہ میں اس کو ناگزیر برائی (necessary evil) کے طور پر مان لیا۔

یہ ہندو ذہن کے لئے نہایت سخت صدمہ تھا۔ تاہم یہ عین ممکن تھا کہ فطرت کا خاموش عمل اس کو فراموشی کے خانہ میں ڈال دے۔ مگر پاکستان کی مسلسل حریفانہ پالیسی نے یہ نوبت نہ آنے دی کہ ہندو ذہن بٹوارے کے صدمہ کو بھلادے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو قیادت نے بلا اعلان بٹوارہ کا انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ سابق مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں شیخ مجیب الرحمن کی علیحدگی پسند تحریک نے ہندو قیادت کو موقع دیا۔ چنانچہ اس نے شیخ مجیب الرحمٰن کا ساتھ دے کر ۱۹۷۱ میں پاکستان کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

ہندو قائدین اگر دانشمند ہوتے تو وہ پیشگی طور پر اس حقیقت کو جان لیتے کہ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ وہ خود بنگالیوں کے ہاتھوں بنے۔ مگر اس وقت کے ہندو قائدین کی منفی ذہنیت ان کے لئے اس حقیقت کو سمجھنے میں رکاوٹ بن گئی۔ وہ یہ جاننے سے قاصر رہے کہ بنگلہ دیش کی تحریک میں ان کی شمولیت ان کے لئے ایک بوم رینگ کھیل ثابت ہوگا۔ اور دوبارہ انتقام کا انتقام لیا جائے گا۔ مگر وہ اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے یہاں تک کہ انتقام

در انتقام کا ایک لامتناہی سلسلہ بر صغیر ہند میں جاری ہو گیا۔

10

میرے بچپن کے زمانہ میں میرے وطن کے قریب مدرستہ الاصلاح کے میدان میں ایک عمومی جلسہ ہوا اطراف کے مسلمان ہزاروں کی تعداد میں امنڈ آئے۔ اس جلسہ کے خصوصی مقرر مولانا محمد علی جوہر (وفات ۱۹۳۱) تھے۔ انہوں نے اپنے مخصوص جوشیلے انداز میں تقریر کی اس وقت لاوڈ اسپیکر نہیں ہوتا تھا۔ مگر مولانا محمد علی اتنے گرج دار انداز میں بولتے تھے کہ لاوڈ اسپیکر کے بغیر ہی ہزاروں آدمی ان کی بات سن سکتے تھے۔ مولانا محمد علی کی تقریر ختم ہوئی تو ایک بوڑھا مسلمان اٹھا بھیڑ کو چیرتا ہوا وہ اسٹیج کے پاس پہنچا۔ اس نے مولانا محمد علی کی پیٹھ پر اپنا ہاتھ مارتے ہوئے اپنی دیہاتی زبان میں کہا کہ: محمد علی جون تیں کیہے کیہو نہ کیہس (محمد علی، جو تونے کیا کسی نے نہیں کیا)

خلافت تحریک کے زمانہ میں محمد علی اور شوکت علی کی تقریروں نے پورے ملک میں غلغلہ پیدا کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ مولانا شوکت علی نے ایک موقع پر کہا کہ: گاندھی میری جیب میں ہے۔ اس زمانہ میں مولانا محمد علی کے دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ کانپور کے محلہ مچھلی بازار کی مسجد کے ساتھ ۱۹۱۳ میں ایک واقعہ پیش آیا۔ اس وقت کی انگریز حکومت نے مسجد کا غسل خانہ سڑک کی توسیع کے لئے توڑ دیا۔ اس پر لیڈروں کی تقریروں نے مسلمانوں کے اندر اتنا جوش پیدا کیا کہ لوگ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ پولس نے گولی چلائی جس میں بہت سے مسلمان مارے گئے۔

جب یہ ہنگامہ جاری تھا، مولانا محمد علی ٹرین سے سفر کر کے کانپور پہنچے ریلوے اسٹیشن پر مسلمانوں کی بھیڑ ان کے استقبال کے لئے موجود تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یوپی کا انگریز گورنر اس وقت کانپور میں تھا اور کھانے کے میز پر کھانا کھا رہا تھا۔ عین اس وقت اس کو خبر دی گئی کہ مولانا محمد علی کانپور پہنچ گئے ہیں۔ انگریز گورنر نے یہ خبر سنی تو چمچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ مگر سوال یہ ہے کہ مولانا محمد علی کی زلزلہ خیز قیادت نے ہندستانی مسلمانوں کو کیا دیا۔ قیادت مستقبل کی تعمیر کے لئے ہوتی ہے نہ کہ وقتی دھوم کے لئے۔ مگر میرے علم کے مطابق مولانا محمد علی نے

پنے بعد کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جو مثبت معنوں میں بعد کے مسلمانوں کے لئے مفید ہو۔

البتہ اپنی پرجوش طبیعت کی بنا پر انھوں نے ایسی باتیں کہیں جو مسلمانوں کے لئے آج تک سئلہ بنی ہوئی ہیں۔

خلافت تحریک کے زمانہ میں مہاتماگاندھی بھی ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں یک بار ایسا ہوا کہ مولانا محمد علی نے دلی کی جامع مسجد میں مسلمانوں کا ایک جلسہ کیا۔ وہ ہاتماگاندھی کو بھی اس جلسہ میں لے گئے۔ مہاتماگاندھی نے وہاں ممبر پر بیٹھ کر تقریر کی۔ یہ قعہ مسلمانوں کی برہمی کا سبب بن گیا۔ کچھ لوگوں نے اس واقعہ کو لے کر مولانا محمد علی کو بدنام رنا شروع کر دیا۔ یہ ایک نازک صورت حال تھی۔ مولانا محمد علی نے اس موقع پر اپنا دفاع اس رح کیا کہ انھوں نے کہا: جہاں تک سیاست کا تعلق ہے، میں مہاتماگاندھی کو اپنا لیڈر سمجھتا وں۔ مگر جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو میرے نزدیک ایک فاسق و فاجر مسلمان بھی مہاتما ندھی سے اچھا ہے۔

ایک عام آدمی اگر اس طرح کی بات کہے تو وہ نیوز (خبر) نہیں بنتی۔ مگر جب ایک مشہور یڈر اس قسم کی بات کہے تو وہ نیوز بن کر فوراً ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ چنانچہ مولانا محمد علی کی س بات پر ہندوؤں میں بہت زیادہ چہ می گوئیاں ہوئیں۔ میرے نزدیک مولانا محمد علی کا جواب رست نہ تھا۔ انھوں نے غیر ضروری طور پر بات کو اتنا پیچیدہ بنا دیا۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ اگر میں ہاتماگاندھی کو مسجد میں لایا ہوں تو میں نے کوئی غیر اسلامی کام نہیں کیا۔ خود رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں غیر مسلم مسجد کے اندر آتے تھے اور ایسے بھی واقعات موجود ہیں کہ انھوں نے سجد کے اندر تقریر کی۔ اور اس کو کوئی برا نہیں مانا۔

اس کے مقابلہ میں مہاتماگاندھی کا انداز دیکھئے۔ اس واقعہ کے بعد غالباً کلکتہ میں کانگریس سالانہ اجلاس ہوا۔ وہاں مہاتماگاندھی اور مولانا محمد علی دونوں موجود تھے۔ جب اجلاس شروع دنے والا تھا تو اچانک ایک سنسنی خیز واقعہ ہوا۔ مہادیو ڈیسائی اچانک اسٹیج پر آئے۔ انھوں نے بلند واز سے کہا کہ میں اجلاس کی کارروائی ہونے نہیں دوں گا۔ مولانا محمد علی نے مہاتماگاندھی کی

توہین کی ہے۔ سب سے پہلے وہ یہاں آکر معافی مانگیں۔ اس کے بعد ہی جلسہ شروع ہوگا۔

مہادیو ڈیسائی کے اس پرجوش اعلان کے بعد جلسہ گاہ میں ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگوں کی نظریں مولانا محمد علی پر پڑنے لگیں مگر مولانا محمد علی اس کے لئے تیار نہیں ہوئے کہ وہ کھڑے ہو کر برسرِ عام معافی مانگیں۔ غالبًا انھیں ڈر تھا کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو جلسہ گاہ سے نکلنے کے بعد مسلمان ان کا دامن پکڑیں گے اور ان کو مطمئن کرنا ان کے لئے سخت مشکل ہوگا۔

کچھ دیر یہ حالت طاری رہی اس کے بعد ایک انوکھا واقعہ ہوا۔ مہاتما گاندھی جو اسٹیج پر دوسری طرف موجود تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور چلتے ہوئے مولانا محمد علی کے پاس پہنچے۔ انھوں نے مولانا محمد علی کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں اور کہا: میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ یہ سن کر لوگ ہنس پڑے اور جو بات بے حد سنگین نظر آتی تھی وہ ایک لمحہ میں ختم ہوگئی اور اپنے معمول کے مطابق جلسہ شروع ہوگیا۔

11

کشمیر کی متشددانہ تحریک ۱۹۷۹ کے آخر میں شروع ہوئی۔ چند سال بعد میری ملاقات کچھ پاکستانی دانشوروں سے ہوئی۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ کیوں کشمیر میں خونی تحریک چلا رہے ہیں، جب کہ آپ یقینی طور پر جانتے ہوں گے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ کشمیر میں جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا ایک فیصلہ تھا، اور تاریخ کے فیصلہ کو اس قسم کے گن کلچر کے ذریعہ بدلنا ممکن نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم بھی اس حقیقت کو جانتے ہیں مگر ہم بنگلہ دیش کو بھلا نہیں سکتے۔ ہمیں انڈیا سے ۱۹۷۱ کا انتقام لینا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ لوگ مسلم دانش ور سمجھے جاتے ہیں مگر آپ کے اس جواب کا دانشوری سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک جھوٹی دانشوری ہے۔ سچی دانشوری کیا ہے۔ اس کی ایک مثال میں آپ کو بتاتا ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ امریکہ نے ۱۹۴۵ میں جاپان کے اوپر پہلی بار ایٹم بم گرایا۔ جاپان کا سب سے بڑا صنعتی شہر ہیروشیما بالکل تباہ ہوگیا۔ یہ جاپانیوں کے لئے ایک ناقابل برداشت صدمہ تھا۔

ں کے لوگوں میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ وہ ہیرا کری (خود کش بمباری) کی حد تک جا کر ریکہ سے انتقام لینے کے لئے تیار ہوگئے۔ اس وقت کچھ جاپانی دانشور اٹھے انھوں نے زیرو تحریر کے ذریعہ اپنی قوم کی انتقامی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ۱۹۴۵ میں اگر امریکہ نے ہمارے ہیروشیما کو تباہ کیا ہے تو ہم بھی اس سے پہلے ۱۹۴۱ میں ریکہ کے پرل ہاربر کو تباہ کر چکے تھے اس لئے معاملہ برابر ہوگیا۔ آؤاب ماضی کو بھلا کر ملک کا نیا ستقبل تعمیر کرنے کی کوشش کریں۔ یہی وہ مثبت رہنمائی تھی جس کا یہ شاندار نتیجہ نکلا کہ وسری عالمی جنگ میں تباہ ہونے والا جاپان صرف چالیس سال کے اندر ایک عالمی اقتصادی اقت بن گیا۔

یہ واقعہ بتا کر میں نے پاکستانی دانشوروں سے کہا کہ اگر آپ لوگوں کے اندر حقیقی دانشوری وتی تو جاپانی دانشوروں کی طرح آپ بھی اپنی قوم سے یہ کہتے کہ ----- انڈیا نے اگر ۱۹۷۱ میں مارے ملک کو توڑا تو ہم بھی اس سے پہلے ۱۹۴۷ میں ان کے ملک کو توڑ چکے تھے۔ اس طرح عاملہ برابر ہوگیا۔ آؤاب ماضی کی باتوں کو بھلادیں اور مثبت ذہن کے تحت ملک کے مستقبل کی نمیر کریں۔

پاکستان کے دانشور اگر منفی سوچ سے بلند ہوتے تو وہ وہی کرتے جو جاپانی دانشوروں نے لیا۔ وہ اپنی قوم کو انتقام کی دلدل سے نکالتے اور لوگوں کے اندر مثبت اور تعمیری ذہن پیدا کرتے۔ گر ایسا ہوتا تو آج پاکستان بلاشبہ ایشیا کا ایک انتہائی ترقی یافتہ ملک ہوتا، نہ کہ ایک تباہ شدہ ملک جیسا کہ آج وہ دکھائی دیتا ہے۔

12

بر صغیر ہند میں بہت پہلے سے ہندو مسلم مسئلہ موجود تھا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے مختلف نزاعات کی صورت میں اس کی مثالیں سامنے آتی رہتی تھیں۔ ہمارے رہنما برابر اس مسئلہ پر غور کرتے تھے۔ آخر کار اس معاملہ میں دو نظریئے زیادہ ابھرے۔ ایک، مہاتما گاندھی کا نظریہ۔ دوسرا، مسٹر محمد علی جناح کا نظریہ۔ مہاتما گاندھی کا حل فکری نوعیت کا تھا اور مسٹر محمد علی کا حل عملی نوعیت کا۔

مہاتما گاندھی کا کہنا تھا کہ یہ نزاعات زیادہ تر مذہبی نوعیت کے ہیں۔ مذہبی اختلافات بڑھ کر جھگڑے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کا حل ان کی سمجھ میں یہ آیا کہ لوگوں کو یقین دلایا جائے کہ مذاہب میں کوئی اختلاف نہیں۔ اسلام بھی ایک سچا مذہب ہے اور اسی طرح ہندوازم بھی ایک سچا مذہب۔ اپنے اس نظریہ کو انھوں نے ایک جملے میں اس طرح بیان کیا کہ ــــ رام رحیم ایک ہے۔

یہ کوئی نیا نظریہ نہیں۔ چار سو سال پہلے شہنشاہ اکبر نے سیاسی طاقت کے ذریعہ اس کو رائج کرنا چاہا۔ ڈاکٹر بھگوان داس نے مذاہب کے بارے میں اپنے انسائیکلوپیڈیائی علم کے ذریعہ اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مہاتما گاندھی نے اپنی قائدانہ مقبولیت کے ذریعہ اس کو عام کرنا چاہا۔ ونوبا بھاوے جیسی روحانی شخصیت نے اس کے لئے اپنی عمر صرف کر دی۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ جہاں تک اصل مقصد کا تعلق ہے وہ ایک فیصد بھی حاصل نہیں ہوا۔

''تمام مذاہب سچے ہیں'' کا نظریہ خود مذہب کی نفی ہے۔ مذہب کا مقصد انسان کو یقین کی نعمت دینا ہے۔ یقین اپنی ذات میں توحد چاہتا ہے نہ کہ تعدد۔ یقین کسی ایک ہی چیز کو حق ماننے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ہر چیز کو یکساں طور پر حق ماننا کبھی آدمی کے اندر یقین کی کیفیت پیدا نہیں کر سکتا۔

اس معاملہ کی ایک مثال خود مہاتما گاندھی کی زندگی میں موجود ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے عقیدے کو ''رام رحیم ایک ہے'' کے الفاظ میں بیان کرتے تھے۔ مگر ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو جب انھیں گولی ماری گئی تو موت سے پہلے جو آخری لفظ ان کی زبان سے نکلا وہ ''ہے رام'' ہے رحیم نہیں تھا۔ بلکہ صرف ''ہے رام'' تھا۔ کئی سچائی کی بات آپ ڈپلومیسی کے طور پر کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کو سچائی پر یقین ہے تو وہ لازماً صرف ایک سچائی ہو گی نہ کہ کئی سچائیاں۔

''تمام مذاہب ایک ہیں'' کا نظریہ ایک غیر حقیقی نظریہ ہے۔ اس لئے وہ سرے سے قابل عمل ہی نہیں۔ اس قسم کے لوگ ظاہری نوعیت کی کچھ مشترک باتوں کو لے کر یہ کہنے لگتے ہیں کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے درمیان انتہائی اساسی اختلافات پائے

تے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام اور ہندوازم کو لیجئے رام اور رحیم یا نوح اور منو جیسے ناموں کی
ی مشابہت سے یکسانیت ثابت کرنا کوئی علمی استدلال نہیں۔ علمی استدلال کا طریقہ یہ ہے کہ
وں کی اساسی تعلیمات کا موازنہ کیا جائے۔ مذکورہ استدلال ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ
ستان اور کیوبا دونوں ایک ہیں کیونکہ یہاں بھی درخت ہیں اور وہاں بھی درخت، یہاں بھی
مدری ساحل ہے اور وہاں بھی سمندری ساحل۔

میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے دل میں ہر انسان کے لئے یکساں
رام ہے، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان۔ مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ تمام مذاہب ایک ہیں، یعنی ایک
ب کی کتاب میں جو تعلیم ہے وہی تعلیم دوسرے مذہب کی کتاب میں بھی ہے۔ اس قسم کا
ریہ یقینی طور پر ایک غیر علمی اور غیر واقعی نظریہ ہے۔

مثال کے طور پر ہندوازم میں خدا کی بابت وحدتِ وجود (monism) کا تصور ہے اور
ام میں اس کے برعکس توحید (monotheism) کا تصور۔ توحید کے مطابق، خدا مخلوقات
، الگ ہے۔ وہ ایک مستقل ہستی کی حیثیت رکھتا ہے، جب کہ وحدت وجود میں خالق اور مخلوق
علیحدگی کا کوئی تصور نہیں۔ اس کے مطابق، ہر چیز ایک ہی غیر مشخص حقیقت کا مختلف اور متنوع
ہار ہے۔ چنانچہ آپ کو ایسے ہندو ملیں گے جو اپنا یہ عقیدہ بیان کرتے ہوئے نعوذ باللہ یہ کہیں
، کہ: سو دیراز نوڈ فرینس بٹوین جی اوڈی اینڈ ڈی او جی۔

اسی طرح اسلام میں پیغمبر خدا کا تصور ہے اور ہندوازم میں تجسیم خدا کا تصور۔ اسلام
، موت کے بعد جنت اور جہنم کا تصور ہے اور ہندوازم میں آواگمن کا تصور وغیرہ۔ مزید یہ
''تمام مذاہب ایک ہیں'' کا نظریہ اہل مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کے مقصد کے لئے
، بھی درجہ میں کار آمد نہیں۔ اس کا ایک تجرباتی ثبوت یہ ہے کہ کسی ایک مذہب کے
ننے والوں کے درمیان عملاً آج بھی یہ اعتقادی یکسانیت موجود ہے، اس کے باوجود ان کے
میان برابر داخلی لڑائیاں جاری رہتی ہیں۔

مہابھارت کی لڑائی میں کورو اور پانڈو دونوں ہندو دھرم کو مانتے تھے۔ اس کے باوجود ان

کے درمیان خونیں لڑائی ہوئی۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے دونوں فریق زیادہ تر عیسائی تھے اس کے باوجود ان کے درمیان تاریخ کی سب سے زیادہ ہولناک جنگ ہوئی۔ افغانستان اور دوسرے مسلم ملکوں میں آج جو داخلی لڑائیاں جاری ہیں اس کے دونوں فریق اسلام کو اپنا مذہب بتاتے ہیں۔اس کے باوجود وہ دشمنوں کی طرح ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اس مسئلہ کا حل مذہبی یکسانیت نہیں بلکہ مذہبی رواداری ہے۔اہل مذاہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کا راز باہمی اعتراف (mutual recognisation) میں نہیں ہے بلکہ باہمی احترام (mutual respect) میں ہے۔اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ لوگوں میں ٹالرنس کی اسپرٹ پیدا کی جائے،نہ کہ بے فائدہ طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔

اس معاملہ میں مہاتما گاندھی کا نظریہ اگر بے فائدہ تھا تو مسٹر محمد علی جناح کا پیش کردہ حل صرف الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا تھا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہ مسئلہ دو بے اقتدار کمیونٹی کے درمیان تھا، کیونکہ اس وقت سیاسی اقتدار انگریزوں کو حاصل تھا جو اپنے سیاسی مصالح کے تحت ہندوؤں اور مسلمانوں میں موازنہ قائم کرنے کا رول ادا کر رہے تھے۔ مگر مسٹر محمد علی جناح کے فارمولے کے تحت جب ہندو انڈیا (بھارت) اور مسلم انڈیا (پاکستان) بنا تو دو کمیونٹی کا مسئلہ مزید اضافہ کے ساتھ دو اسٹیٹ کا مسئلہ بن گیا۔ پہلے جس اختلاف کا اظہار جلسوں اور مظاہروں کی سطح پر ہوتا تھا وہ اب مسلح مقابلہ کی سطح پر ہونے لگا۔ یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے وہ "ہندو بم" اور "اسلامی بم" تک جا پہنچا۔

حقیقت یہ ہے کہ جغرافی تقسیم کسی بھی درجہ میں ہندو مسلم مسئلہ کا حل نہیں۔اس کا حل پہلے بھی یہ تھا کہ دونوں فرقے اختلافات کو نظرانداز کرتے ہوئے باہم مل جل کر رہیں اور آج بھی اس کا حل یقینی طور پر یہی ہے۔ مزید یہ کہ اس تقسیم نے اس مساوات کو توڑ دیا جو انگریزوں نے قائم کر رکھا تھا۔ موجودہ پاکستان کے مقابلہ میں ہندستان پانچ گنا زیادہ بڑے ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔ایسی حالت میں محاذ آرائی کی پالیسی کسی بھی درجہ میں پاکستان کے لئے مفید نہیں۔پاکستان

کے لئے زندگی کی واحد ضمانت یہ ہے کہ وہ نزاعی طریقہ کو مکمل طور پر چھوڑ دے۔ وہ یکطرفہ ایڈ جسٹمنٹ کا طریقہ اختیار کرے۔ مگر بدقسمتی سے پاکستان میں کوئی بھی بے ریش یا باریش قائد نہیں جو اہل پاکستان کو اس قسم کا حقیقت پسندانہ مشورہ دے رہا ہو۔

13

ملک کی تقسیم (۱۹۴۷) کے بعد ہندستان اور پاکستان کے درمیان سیاسی جھگڑے ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر اس کے بعد بھی وہ مزید شدت کے ساتھ جاری رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی اصل وجہ کشمیر کا مسئلہ ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ خود کشمیر کا مسئلہ کس نے پیدا کیا۔ تاریخی ریکارڈ بتاتا ہے کہ اس مسئلہ کو پیدا کرنے کی سب سے بڑی ذمہ داری پاکستان کے غیر دانشمند لیڈروں پر ہے۔اس معاملہ کا غیر جانب دارانہ جائزہ جس نتیجہ تک پہنچاتا ہے وہ یہی ہے۔

آزادی کے بعد جب یہ مسئلہ پیدا ہوا، اس وقت مسٹر مہر چند مہاجن ریاست جموو کشمیر کے وزیر اعظم تھے۔ وہ اس سے پہلے ہندستان کے چیف جسٹس رہ چکے تھے۔ انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری لوکنگ بیک (Looking back) میں تفصیل کے ساتھ کشمیر کا قصہ بیان کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۳ میں ایشیا پبلیشنگ ہاؤس (بمبئی) سے شائع ہوئی ہے۔

مسٹر مہر چند مہاجن لکھتے ہیں کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو مہاراجہ کشمیر نے انھیں ریاست کا وزیر اعظم مقرر کیا۔ کشمیر کے لئے روانگی سے پہلے وہ نئی دہلی میں مرکزی حکومت کے ذمہ داروں سے ملے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت ہندستانی حکمراں ہندستان سے کشمیر کے الحاق کے بارے میں زیادہ سنجیدہ نہیں تھے۔ (صفحہ ۲۶۹) جسٹس مہر چند کے اس بیان کا جو مطلب ہے اس کو سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں۔

اس سلسلہ میں دوسری شہادت جو پیش کرنا چاہتا ہوں وہ پاکستان کے سابق وزیر اعظم چودھری محمد علی کی ہے۔ ان کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے ظہور پاکستان (Emergence of Pakistan) اس کتاب میں انھوں نے کشمیر کے مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ۱۹۴۸ میں جب انڈیا نے ریاست جونا گڑھ میں اپنی فوجیں داخل کر دیں اور اس کو انڈیا کے

ساتھ ملالیا تو پاکستانی حکومت کی درخواست پر نئی دہلی میں ایک خصوصی میٹنگ ہوئی۔ اس میں ہندستان کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل شریک تھے۔ پاکستان کی طرف سے نواب زادہ لیاقت علی خاں اور مصنف کتاب چودھری محمد علی نے شرکت کی۔

چودھری محمد علی بتاتے ہیں کہ میٹنگ شروع ہوئی تو لیاقت علی خان (وزیر اعظم پاکستان) نے اس پر تقریر شروع کی کہ انڈیا نے ریاست جوناگڈھ میں اپنی فوجیں کیوں داخل کیں جب کہ اس نے پاکستان سے الحاق کر لیا تھا۔ ان کی لمبی تقریر پر سردار پٹیل صبر نہ کر سکے اور درمیان میں بول اٹھے۔ چودھری محمد علی کے بیان کے مطابق، سردار پٹیل اگرچہ متعصب تھے مگر وہ حقیقت پسند (realistic) تھے۔ چنانچہ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ جوناگڈھ کی بات چھوڑو، کشمیر اور حیدر آباد کی بات کرو۔ اور ہم باآسانی دونوں کے بارے میں ایک اگریمنٹ تک پہنچ سکتے ہیں۔

Why do you compare Junagarh with Kshmir ? Talk of Hyderabad and Kashmir, and we could reach an agreement (p 300)

مگر چودھری محمد علی کے بیان کے مطابق وزیر اعظم پاکستان نے سرادار پٹیل کی اس پیشکش پر کوئی دھیان نہیں دیا اور گفتگو بے نتیجہ طور پر ختم ہو گئی۔

اس تاریخی شہادت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ابتداءً اتنا سادہ تھا کہ وہ بات چیت کی میز پر حل ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود پاکستانی لیڈر کیوں اس کو حل کرنے میں ناکام رہے۔ اس کی وجہ پاکستان کے قائدین کی سیاسی حرص تھی۔ وہ عجیب وغریب طور پر اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ حیدر آباد اور کشمیر دونوں کو پاکستان میں شامل کرلیں گے۔ حیدر آباد کو اس منطق سے کہ اس کا صدر ریاست مسلمان ہے۔ اور کشمیر کو اس منطق سے کہ اس کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یہ ڈبل منطق یقینی طور پر نا قابل عمل تھی۔ چنانچہ اس معاملہ میں پاکستانی قائدین کا انجام وہی ہوا جس کو ایک جاپانی مثل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ـــــ جو آدمی بیک وقت دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑے وہ ایک کو بھی پکڑ نہیں سکتا۔

14

میرے والد فرید الدین خاں مرحوم اپنے علاقے کے بڑے زمیں دار تھے۔ ان کا انتقال

۱۹۲۹ میں ہوا۔ وہ نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ہندوؤں میں بھی اتنا زیادہ مقبول تھے کہ لوگ اپنے جھگڑوں کو طے کرنے کے لئے ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ معاملہ کو سننے کے بعد وہ جو فیصلہ دے دیتے اس کو دونوں فریق بلا بحث مان لیتے۔ اس علاقہ میں ہندوؤں کی اکثریت تھی مگر میرے والد کی نسبت سے کبھی کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔

والد صاحب ایک مثالی قسم کے نیک نفس اور فیاض آدمی تھے۔ علاقہ کے ہر شخص کی خاموش مدد کرتے رہتے تھے۔ مثلاً کسی شخص کا گھر بن رہا ہے اور اس کو لکڑی کی ضرورت ہے تو کہتے کہ جاؤ فلاں درخت سے اپنی ضرورت کے مطابق لکڑی کاٹ لو۔ اسی طرح اگر کسی شخص کی شادی ہے اور اس کو غلہ کی ضرورت ہے تو اس سے کہہ دیتے کہ تم کو جتنے چاول اور دال کی ضرورت ہے ہمارے یہاں سے لے جاؤ۔ ایک مرتبہ ہمارے دروازہ سے ہندوؤں کی ایک بارات گذری اس وقت رات ہو گئی تھی اور اندھیرا چھا گیا تھا۔ والد صاحب نے کہا کہ اندھیرے میں آپ لوگ کہاں جائیں گے۔ رات کو ہمارے یہاں ٹھہریئے اور صبح کو چلے جایئے۔ اس کے بعد پوری بارات کو ٹھہرا کر سب کے لئے کھانے پینے اور سونے کا انتظام کیا۔

جھگڑوں کو طے کرنے کے لئے ان کا طریقہ بڑا عجیب تھا۔ ہمارے گاؤں کے ایک طرف ہریجنوں کا محلّہ تھا۔ ایک دن دو ہریجن خاندان آپس میں لڑ گئے۔ جھگڑا ہوتا رہا یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ شام کو وہ لوگ اپنا جھگڑا طے کرنے کے لئے والد صاحب کے پاس آئے والد صاحب نے کہا کہ جب دن بھر تم جھگڑتے رہے تو تم نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہو گا۔ پہلے کھاؤ پیو اس کے بعد جھگڑا طے کیا جائے گا۔ یہ کہہ کر ان کو راشن اور لکڑی دی اور کہا کہ تم لوگ اپنا کھانا پکاؤ اور سیر ہو کر کھاؤ۔ جب وہ لوگ کھا پی کر فارغ ہوئے تو جھگڑا اپنے آپ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد وہ لوگ خوش ہو کر اپنے گھر واپس چلے گئے۔

یہ وہ ماحول ہے جو ہمارے ملک میں ۱۹ویں صدی کے آخر اور ۲۰ویں صدی کے آغاز میں پایا جاتا تھا۔ اس وقت نہ صرف میرے والد صاحب بلکہ عام طور پر بستیوں کے بڑے لوگ اسی مزاج کے ہوا کرتے تھے۔ یہ ماحول مسلسل باقی رہا۔ حتی کہ ۱۹۴۷ کا انقلاب بھی اس ماحول کو برہم

نہ کر سکا۔ ۱۹۴۷ کے بعد کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہاں بطور مثال نقل کیا جاتا ہے۔

میرے گاؤں میں ایک مسلمان زمیں دار تھے۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے۔ ۱۹۹۴ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی بہادری نے ان کو غیر مصالحت پسند بنادیا تھا۔ ان کے پاس لائسنس یافتہ بندوق بھی تھی۔ جس کو وہ اکثر اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

ہمارے گاؤں سے ملا ہوا ایک اور گاؤں ہے جس کو بکیہ کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک راجپوت چھتر دھاری سنگھ رہتے تھے۔ مذکورہ مسلمان زمیں دار اور چھتر دھاری سنگھ کے درمیان مال یا جائداد کا کوئی جھگڑا نہ تھا۔ مگر غالباً دونوں میں انا کا ٹکراؤ ہوا اور باہم دشمنی قائم ہو گئی۔ غالباً ۱۹۶۶ کا واقعہ ہے۔ دونوں بذریعہ ٹرین شہر اعظم گڈھ جارہے تھے دونوں کی ملاقات ریلوے اسٹیشن (سنجر پور) میں ہوئی۔ یہاں کسی بات پر دونوں کے درمیان تکرار ہو گئی۔ مسلمان زمیں دار حسب معمول اپنی بندوق اپنے ساتھ لئے ہوئے تھے۔ انھوں نے جوش میں آکر بندوق اٹھائی اور بے تکلف چھتر دھاری سنگھ پر گولی چلادی۔ وہ فوراً ہی ہلاک ہو گئے۔

یہ خبر اچانک پورے علاقہ میں پھیل گئی۔ ہندو بہت بڑی تعداد میں چھتر دھاری سنگھ کے مکان کے پاس جمع ہو گئے۔ یہ ہندو غصہ میں بپھرے ہوئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ فوراً ہمارے گاؤں میں پہنچیں اور نہ صرف مذکورہ مسلمان سے بلکہ پورے گاؤں سے اس کا انتقام لیں۔

ہندوؤں کی یہ مشتعل بھیڑ اگر اس وقت ہمارے گاؤں میں داخل ہوتی جو کہ بکیہ سے بمشکل ایک کیلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے تو یقیناً وہ لوگ پورے گاؤں کو آگ لگادیتے۔ مگر عین اس وقت ایک غیر معمولی واقعہ ہوا مقتول چھتر دھاری سنگھ کا بھائی چتری سنگھ چٹان کی طرح ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ہم بدلہ ضرور لیں گے مگر سارے مسلمانوں سے نہیں بلکہ صرف اس قاتل مسلمان سے جس نے میرے بھائی کو قتل کیا ہے۔ ہمارا بدلہ بھی یہ نہیں ہو گا کہ ہم اس کے جواب میں قاتل مسلمان کو قتل کریں۔ ہم صرف یہ کریں گے کہ اس معاملہ کو عدالت میں لے جائیں گے اور وہاں قاتل مسلمان کو قانونی سزا دلوائیں گے۔
چنانچہ یہی ہوا۔ مذکورہ مسلمان پر قتل کا مقدمہ چلا ان کو عدالت سے لمبی قید کی سزا دی گئی۔

یہ حال صرف ہمارے علاقہ کا نہیں تھا بلکہ پورے بر صغیر ہند میں ہندو اور مسلمان اسی طرح مل جل کر پر امن طور پر رہتے تھے۔ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس کو میری جیسی عمر کے لاکھوں لوگوں نے اس ملک میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کا تجربہ کیا ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وہ تفریقی سیاست کیسے ابھری جس کا نتیجہ ملک کا بٹوارہ (۱۹۴۷) تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ملک کا بٹوارہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے نہیں کروایا۔ بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کچھ لیڈروں نے کروایا۔ یہ دو فرقوں کے عوام کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ وہ کچھ لیڈروں کا مسئلہ تھا جنھوں نے عوام کے نام پر اپنی لیڈری کو فروغ دیا۔ ہندو اور مسلمان ابتداءً اپنی فطرت پر تھے۔ فطرت کی رہنمائی عین وہی ہوتی ہے جس کی ایک جھلک مذکورہ واقعات میں نظر آتی ہے۔ اس کے بعد اخبارات کا دور آیا اور اخبارات کے ساتھ قیادتیں ابھرنے لگیں۔ اب فطرت لوگوں کی رہنما نہ رہی بلکہ لیڈران کا رہنما بن گیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ہماری تمام سیاسی مصیبتوں کا آغاز ہوتا ہے۔

لیڈر یا قائد کون بنتا ہے، یہ وہ افراد ہیں جن کے اندر عام لوگوں سے زیادہ ذہانت پائی جاتی ہو۔ اور یہ تجربہ ہے کہ جو آدمی زیادہ باصلاحیت اور زیادہ ذہین ہو وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر انانیت پسند (egoist) بن جاتا ہے۔ چنانچہ ہر بڑا لیڈر لازمی طور پر انانیت پسند ہوتا ہے۔ بر صغیر ہند کے لیڈروں میں اس اعتبار سے غالباً صرف ایک قابل ذکر استثنا نظر آتا ہے اور وہ مہاتما گاندھی کا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر قومی المیے صرف ایک سبب سے پیدا ہوئے۔ اور وہ دو لیڈروں کے درمیان انا کا ٹکراؤ (ego clash) ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۱ میں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کا ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو جانا زیادہ تر ذوالفقار علی بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان اسی انا کے ٹکراؤ کا نتیجہ تھا۔ اسی طرح کشمیر کا مسئلہ بروقت طے نہ ہونے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ شیخ محمد عبداللہ اور مسٹر محمد علی جناح کے درمیان انا کا ٹکراؤ پیش آگیا وغیرہ۔

اس حیثیت سے بر صغیر ہند کی سیاست کا مطالعہ نہایت عبرت انگیز ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ملک کا بٹوارہ ہندو مسلم عوام نے نہیں کیا بلکہ ہندو مسلم عوام کے نام پر ہندو مسلم لیڈروں نے کیا۔ یہ لیڈر اپنی انا کے خول کے باہر نہ آسکے یہاں تک کہ ان کی انانیت پسندی کی قیمت ملک کو نہایت مہنگی صورت میں دینی پڑی۔

جب بھی کچھ آدمی مل جل کر رہیں گے تو ان کے درمیان لازمی طور پر کچھ ناخوشگوار واقعات پیش آئیں گے، ایک فرقہ اور دوسرے فرقہ میں بھی اور خود ایک فرقہ کے اندر بھی۔ اس قسم کی ناخوشگوار صورت حال سے بچنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ ایسی حالت میں سماج کے اندر اتحاد قائم رکھنے کا راز کیا ہے وہ صرف ایک ہے، اور وہ اعراض (avoidance) اور ٹالرنس ہے۔ ناخوشگوار صورت حال پیدا ہونے پر اگر اعراض کا انداز اختیار کیا جائے تو اتحاد باقی رہے گا اور اگر اعراض نہ کیا جائے تو لوگوں کی انانیت بھڑکے گی اور پورا سماج اختلاف اور انتشار کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

اس سلسلہ کی ایک علامتی مثال یہ ہے کہ مسٹر محمد علی جناح انگلینڈ جانے سے پہلے تک کانگریس میں شامل تھے ایک بار ایسا ہوا کہ کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ مہاتما گاندھی اور دوسرے لیڈروں کے ساتھ مسٹر محمد علی جناح بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ اپنی باری پر وہ تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو عام مزاج کے مطابق، انھوں نے اپنی تقریر کا آغاز اسٹیج پر بیٹھی ہوئی ممتاز شخصیتوں کے نام سے کرنا چاہا۔ چنانچہ انھوں نے کہا: مسٹر گاندھی۔

یہ سن کر بعض کانگریسی بگڑ گئے۔ انھوں نے کہا کہ مہاتما گاندھی کہو، ہم مسٹر گاندھی نہیں سن سکتے۔ جناح صاحب ایک لمحہ کے لئے رکے۔ اس کے بعد انھوں نے دوبارہ تقریر شروع کی تو پھر یہی کہا کہ مسٹر گاندھی۔ اب مذکورہ کانگریسی دوبارہ اپنی مانگ لے کر کھڑے ہوگئے۔ اور انھوں نے کہا کہ مہاتما گاندھی کہو۔ اس کے بعد جناح صاحب نے اپنی تقریر روک دی۔ وہ خاموشی کے ساتھ اسٹیج سے اترے اور اپنے گھر واپس آگئے۔

یہ بحران نہایت آسانی کے ساتھ ٹل سکتا تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ مہاتما گاندھی

کھڑے ہو کر کہتے کہ جناح صاحب مجھ سے سینئر ہیں۔ ان کو حق ہے کہ وہ مجھ کو مسٹر گاندھی کے لفظ سے خطاب کریں۔ اگر مہاتما گاندھی بروقت ایسا کرتے تو یہ تعطل فوراً ختم ہو جاتا۔ اور اجلاس کی کارروائی معمول کے مطابق جاری ہو جاتی۔

مگر ایسا نہیں ہوا۔ مسٹر محمد علی جناح اس واقعہ کے جلد ہی بعد لندن چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد وہ واپس آئے۔ اب انھوں نے کانگریس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شرکت کرلی۔ جلد ہی وہ مسلم لیگ کے سب سے بڑے قائد بن گئے۔

یہ بلاشبہ ایگو کا مسئلہ تھا۔ جناح صاحب اگر رعایت کا انداز اختیار کرتے تو وہ دوسری بار مہاتما گاندھی کہہ سکتے تھے مگر جب آدمی کی انا بھڑک اٹھے تو اس کے بعد اس کے اندر سے رعایت کا ذہن ختم ہو جاتا ہے۔ وہ معاملہ کو اپنے وقار کا معاملہ بنالیتا ہے۔ اور جہاں وقار کی نفسیات بھڑک اٹھے وہاں وہی ہوتا جو عملاً ہماری تاریخ میں پیش آیا۔ (اس سلسلہ میں مہاتما گاندھی کا رویہ قابل تعریف ہے۔ چنانچہ انھوں نے جناح صاحب کو خط لکھا تو لوگوں کے اختلاف کے باوجود انھوں نے جناح صاحب کو قائداعظم کے لفظ سے خطاب کیا)

اسی انانیت کی ایک مثال وہ ہے جو پنڈت جواہر لال نہرو کے یہاں پائی جاتی ہے اس مثال کو مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب آزادیٔ ہند (India Wins Freedom) میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۹۳۶ کے الیکشن میں ایک معاہدہ کے تحت مسلم لیگ نے کانگریس کی حمایت کی تھی۔ اس معاہدہ کا ایک جزء یہ تھا کہ یوپی کیبنٹ میں جو مسلمان وزیر بنایا جائے گا وہ مسلم لیگ کا آدمی ہوگا۔ الیکشن میں کانگریس کو بھاری جیت ہوئی اس وقت جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر تھے۔ انہوں نے فتح کے جوش میں یہ اعلان کردیا کہ یوپی میں ہم خود اپنی پسند کی وزارت بنائیں گے۔ مسلم لیگ کا کوئی آدمی ہم اس میں شامل نہیں کریں گے۔ اس اعلان کے بعد سنجیدہ لوگوں نے جواہر لال نہرو کو سمجھانے کی کوشش کی مگر مذکورہ اعلان کے بعد وہ ان کے لئے وقار کا مسئلہ بن گیا۔ چنانچہ وہ اپنے اعلان سے پھرنے پر راضی نہ ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ

کے نمائندہ عبد الرب نشتر کے بجائے کانگریس کے نمائندہ حافظ محمد ابراہیم کو یوپی وزارت میں مسلمان کی سیٹ دی گئی۔

جیسا کہ معلوم ہے ۱۹۳۶ میں کانگریس اور مسلم لیگ ایک دوسرے کے قریب آچکے تھے اور بظاہر بٹوارہ کا معاملہ ٹل گیا تھا مگر جواہر لال نہرو کی خود رائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگی لیڈر بھڑک اٹھے۔ وہ دوبارہ کانگریس سے دور ہو گئے یہاں تک کہ ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

حدیث میں آیا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی اور مجوسی اور نصرانی بنادیتے ہیں (صحیح البخاری، کتاب الجنائز) اس بات کو توسیع دیتے ہوئے میں کہوں گا کہ عام انسان ہمیشہ صحیح فطرت پر ہوتے ہیں۔ پھر ان کے لیڈر ان کو بہکا کر غیر فطری راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔

برصغیر ہند کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اگر وہ لیڈر نہ ابھرتے جن کا نام بدقسمتی سے ملک کی تاریخ میں ہیرو کے طور پر لکھا ہوا ہے تو یقینی طور پر ملک کا نقشہ آج سے بہت زیادہ بہتر ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مسٹر لیڈر مسٹر ایگو ہوتا ہے، اور ہر مسٹر ایگو یہ کرتا ہے کہ اپنی ذات کی خاطر وہ پوری قوم کو داؤ پر چڑھا دیتا ہے۔ جس سماج میں اس قسم کے لیڈر موجود نہ ہوں وہاں خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت لوگوں کی رہنما ہوگی اور فطرت بلاشبہ صحیح ترین رہنما ہے۔ وہ رہنمائی میں کبھی غلطی نہیں کرتی۔

15

انڈیا میں ہندو اور مسلمان کے درمیان جو مسئلہ ہے اس کا بڑا سبب سیاسی تاریخ ہے۔ یہ زیادہ تر مسلم حکمرانوں کی وراثت ہے جس کو بعد کی مسلم نسلیں بھگت رہی ہیں۔ اس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ کشیدگی کی یہ صورت حال زیادہ تر شمالی ہند میں ہے، جنوبی ہند کا علاقہ اس برائی سے اب تک پاک رہا ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ مسلم حکمرانوں اور ہندو راجاؤں کے درمیان لڑائیاں زیادہ تر شمالی ہند میں ہوئیں۔ جنوبی ہند کا علاقہ بڑی حد تک اس قسم کی خونیں داستانوں سے محفوظ رہا۔

ہندوؤں کی باتیں سننے یاان کی کتابیں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں انھیں سب سے زیادہ شکایت مسلم حکمرانوں سے ہے، خاص طور پراورنگ زیب سے۔ مثلاً ان حکمرانوں کا یہ فعل کہ انھوں نے اپنے دور حکومت میں کئی مندروں کو توڑااور اس کی جگہ مسجدیں بنائیں۔ جہاں تک اس الزام کی تاریخی حیثیت کا تعلق ہے، تواس سے انکار کرنا مشکل ہے۔ یہاں میں اس سلسلہ میں صرف ایک حوالہ دیتاہوں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد محترم مولانا حکیم سید عبدالحی کی ایک کتاب ہے۔ یہ کتاب مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (ندوہ لکھنؤ) سے ۱۹۷۳ میں شائع کی گئی ہے اس کتاب کا نام یہ ہے "ہندوستان اسلامی عہد میں" اس کتاب کے ساتھ مولاناابوالحسن علی ندوی کاایک مبسوط مقدمہ شامل ہے۔ مولانا نے اپنے اس مقدمہ میں مذکورہ کتاب کو مسلم عہد کے ہندستان کی صحیح تصویراور مکمل دستاویز قرار دیاہے(صفحہ ۱۷)

اس کتاب میں، بابری مسجد سمیت کئی مسجدوں کے بارے میں بتایاگیاہے کہ وہ مندروں کو توڑ کر عین اسی جگہ بنائی گئیں۔ مثلاً بابری مسجد کی بابت اس کتاب میں یہ الفاظ درج ہیں: کہاجاتا ہے کہ سیتاکا یہاں ایک مندر تھا، جہاں وہ رہتیں، اور اپنے شوہر کے لئے کھانا پکاتی تھیں، اسی جگہ بابر نے ۹۲۳ھ میں یہ مسجد تعمیر کی (صفحہ ۱۴۱)

اس کتاب میں اس طرح کی متعدد مسجدوں کا تذکرہ ہے جو ہندو عبادت گاہوں کی جگہ بنائی گئیں مثلاً "عالمگیری مسجدیں" کے زیر عنوان بتایاگیاہے: کہاجاتا ہے کہ بنارس کی مسجد عالمگیر نے بنارس کے بشیشور مندر کی جگہ بنائی تھی۔ وہ مندر بہت بلند اور ہندوؤں میں مقدس تھا، اس نے اس کی جگہ انہی پتھروں سے بلند مسجد تعمیر کی، اور اس کے قدیم پتھر کو دیواروں میں معکوس کر کے نصب کردیئے۔ (صفحہ ۱۴۶)

اس قسم کے واقعات جو مغل عہد میں پیش آئے ان کے بارے میں ہندو مصنفین اور مسلم مصنفین دونوں عام طور پر غیر منصفانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ ہندو مصنفین عام طور پر ان واقعات میں اضافہ کر کے ان کو مزید سنسنی خیز انداز میں پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف مسلم مصنفین یا تو

ان کو گھٹا کر پیش کرتے ہیں یا سرے سے ان کی واقعیت کا انکار کر دیتے ہیں۔ مگر یہ دونوں ہی طریقے اس معاملہ میں غیر مفید ہیں۔

اس معاملہ کے تصفیہ کے لئے کوئی سنجیدہ کوشش نہ ۱۹۴۷ سے پہلے کی گئی اور نہ ۱۹۴۷ کے بعد۔ ضرورت تھی کہ اس مسئلہ پر ایک مستقل کمیشن بنایا جاتا جو ہندو مورخین اور مسلم مورخین پر مشتمل ہوتا۔ وہ اس قسم کی نزاعی عبادت گاہوں کا جائزہ لے کر باضابطہ رپوٹ پیش کرتا اور قانون اور شریعت کی روشنی میں اس کا حل بتاتا۔ اس کے بعد ہندو اور مسلمان دونوں طرف کے ذمہ داروں کے دستخط سے ایک معاہدہ کیا جاتا اور آربٹریشن ایکٹ کے تحت اس پر عدالتی تصدیق حاصل کرلی جاتی۔ اس طرح یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو سکتا تھا۔ مگر بدقسمتی سے اس نوعیت کی کوئی مؤثر کوشش اس معاملہ میں نہ کی جاسکی۔

16

۱۹۴۷ میں جب ہندستان ایک آزاد ملک بنا، اس وقت ملک کے باشندوں کی تعداد ۳۶ کرور تھی اس وقت وزیر اعظم پنڈت جو ہر لال نہرو نے کہا کہ ہندستان کا ہر آدمی ایک مسئلہ ہے، اس طرح ہندستان ۳۶ کرور مسائل سے دوچار ہے، پنڈت نہرو نے یہاں کے باشندوں کو مسائل کے روپ میں دیکھا۔ اس لئے ان کے بارے میں وہ صحیح منصوبہ بندی نہ کر سکے۔ اگر وہ ان باشندوں کو اثاثہ (asset) کے روپ میں دیکھتے تو ان کی منصوبہ بندی بالکل مختلف ہوتی۔

ہندستانی باشندوں کو اثاثہ کے روپ میں دیکھنے کے بعد ان کے اندر یہ سوچ ابھرتی کہ ملک میں ایسے اسباب پیدا کئے جائیں کہ یہ لوگ اس میں اپنا استعمال پاسکیں۔ ہر انسان پیدائشی طور پر ایک ہیرو ہوتا ہے لیکن اس کو اپنے ہیروانا کردار کو ادا کرنے کے لئے موافق خارجی اسباب کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر اس قسم کے خارجی اسباب حاصل ہوں تو ہر آدمی اس کے اندر عمل کر کے ہیرو بن جائے گا۔ اور اگر موافق اسباب نہ ملیں تو یہی انسان زیرو کے روپ میں دکھائی دینے لگے گا۔

اس معاملہ کی ایک عملی مثال خود ہندوستانی باشندوں کی صورت میں موجود ہے۔ یہ لوگ

ب اپنے ملک میں ہوتے ہیں تو عام طور پر وہ کوئی بڑا کام نہیں کرپاتے۔ لیکن جب یہی لوگ ریکہ اور یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں میں جاتے ہیں تو اچانک وہاں وہ ہیرو کی طرح کام کرنے لگتے ں ہے۔

مثال کے طور پر ہر گوند کھورانا جب ہندستان میں تھے تو یہاں وہ کوئی کارنامہ انجام نہ دے یکے۔ انھوں نے دلی یونیورسیٹی میں لیکچرشپ کے لئے درخواست دی مگر وہ یونیورسیٹی میں اس مدہ کے لئے نااہل سمجھے گئے۔ اس کے بعد مسٹر کھورانا امریکہ چلے گئے۔ وہاں انھیں ہر قسم کے ی اور سائنسی مواقع ملے جس میں وہ اپنی صلاحیتوں کا استعمال پا سکیں۔ اب انھوں نے محنت روع کر دی۔ اس کے بعد یہی ہر گوند کھورانا ممتاز سائنسی پروفیسر بن گئے۔ اور آخر کار اپنی غیر عمولی تحقیقات کے نتیجہ میں انھیں نوبل انعام سے سرفراز کیا گیا۔

میں نے اپنے بیرونی سفروں کے درمیان کئی ہندستانیوں سے پوچھا کہ آپ لوگ باہر آکر ں محنت اور لگن کے ساتھ کام کرتے ہیں اسی محنت اور لگن کے ساتھ انڈیا میں کام کریں تو وہاں ں آپ بڑی بڑی ترقیاں حاصل کر سکتے ہیں۔ ان ہندستانیوں میں سے تقریباً ہر ایک نے میری ئے سے اتفاق کیا۔ مگر انھوں نے کہا کہ انڈیا میں اور ان ترقی یافتہ ملکوں میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ یہاں جب ہم کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہر طرف رے لئے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک طرف یہ کہ جب ہم اپنا کوئی منصوبہ لے کر اٹھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس کی تکمیل کے تمام ضروری اسباب بہترین طور پر یہاں موجود ہیں۔ دوسری رف یہ کہ یہاں جب ہم محنت کرتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو لگاتے ہیں تو ہم کو یقین ہوتا ہے ہمیں اس کی پوری قیمت ملے گی۔ جب کہ انڈیا میں ان دونوں میں سے کوئی بھی چیز موجود یں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اپنے وطن میں اگر یہ دونوں چیزیں ہمیں مل جائیں تو شاید ہم میں سے ئی بھی شخص بدیش میں رہنا پسند نہ کرے۔

پانی کے بہاؤ کے لئے پانی کو دھکیلنا نہیں پڑتا۔ پانی اپنے آپ بہتا ہے اگر آپ پانی کو جاری نا چاہیں تو صرف یہ کیجئے کہ اس کے لئے راستہ بنا دیجئے۔ اس کے بعد پانی اپنے آپ بہنے لگے گا۔

یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ انسان خود اپنی فطرت کے مطابق، ترقی کی طرف دوڑنا چاہتا ہے۔ اگر اس کو نظر آئے کہ یہاں میرے لئے مواقع موجود ہیں تو وہ اپنے آپ ترقی کی منزل کی طرف رواں دواں ہو جائے گا۔

آزادی کے بعد ہمارے سیاسی لیڈروں کو صرف یہ کرنا تھا کہ وہ ملک میں ترقیاتی سرگرمیوں کے لئے وہ اسباب مہیا کریں جن کو موجودہ زمانہ میں انفراسٹرکچر کہا جاتا ہے---- ملک میں وقت کے معیار کے مطابق اچھی سڑکیں بنائیں۔ بجلی اور ٹیلی فون کا عمدہ نظام قائم کریں، ہر بستی میں ٹرانسپورٹ کی قابل اعتماد سہولتیں مہیا کریں۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کے لئے اچھے ادارے بنائیں۔ ہر جگہ معیاری لائبریریاں قائم کریں۔ دیہاتوں میں بھی کام کی وہی سہولتیں مہیا کریں جو شہروں میں پائی جاتی ہیں، وغیرہ۔

اسی کے ساتھ ان کو یہ کرنا تھا کہ وہ ملک میں ایسی انتظامیہ (ایڈمنسٹریشن) قائم کریں جہاں رشوت اور بدعنوانی کے بغیر ہر کام ہو سکے۔ ہر شہری کو یہ یقین ہو کہ وہ ایک ایسے نظام کے تحت جی رہا ہے جہاں اس کا جائز حق اس کو ملے گا، اس کا حق کبھی مارا نہیں جائے گا۔ ہر ایک کو پیشگی طور پر یہ اطمینان حاصل ہو کہ اگر اس نے اہلیت اور قابلیت کا ثبوت دیا تو ضرور وہ اس کی قیمت پائے گا۔ ہر ایک کو یہ اعتماد ہو کہ اگر اس کے ساتھ کوئی بے انصافی ہوئی تو وہ عدالت میں جا کر وہاں سے بھر پور انصاف حاصل کر سکتا ہے۔ ہر ایک پیشگی طور پر یہ یقین رکھتا ہو کہ میں ایک ایسے نظام کے تحت جی رہا ہوں جس میں ہر ایک برابر کی حیثیت رکھتا ہے، عزت کے اعتبار سے بھی اور حقوق کے اعتبار سے بھی۔ بمبئی کے ایک تاجر مہیش بھائی شاہ نے بجا طور پر کہا: سرکار کا کام دھندا کرنا نہیں ہے، سرکار کا کام دھندا کرنے والوں کو اوسر مہیا کرنا ہے۔

اس قسم کا نظام کوئی یوٹوپیا نہیں، وہ عملاً آج بھی ان ملکوں میں قائم ہے جن کو ترقی یافتہ ملک کہا جاتا ہے۔ یہی وہ اصل کشش ہے جو لاکھوں ہندستانیوں کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنا وطن چھوڑ کر ان بدیشی ملکوں میں چلے جائیں۔ آزادی کے بعد ہمارے حکمرانوں کا اصل کام یہی تھا کہ وہ انڈیا کو اسی قسم کے مواقع اور انفراسٹرکچر والا ملک بنائیں۔

اس کے بعد ہمارے حکمراں دیکھتے کہ وہ کروڑوں ہندستانی جن کو انھوں نے بطور خود مسئلہ فرض کر رکھا ہے وہ ملک کے لئے قیمتی اثاثہ اور سرمایہ ہیں۔ مگر ملک کی آزادی کے بعد ہمارے حکمرانوں نے قیمتی پچاس سال بے فائدہ سرگرمیوں میں کھودیئے۔ مثلاً تان الائنڈ موومنٹ کھڑی کرنا، پبلک سیکٹر بنانا، مالیاتی اداروں کو نیشنلائز کرنا، قوانین میں اضافہ کرنا وغیرہ۔ وہ اسی قسم کی بے فائدہ سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ اور آخرکار ہمارے حصہ میں ایک برباد ملک کے سوا اور کچھ نہ آیا۔

۱۸ستمبر ۱۹۹۸ کو ایک صاحب سے گفتگو ہوئی۔ وہ دہلی کے ایک بزنس گروپ میں بڑے افسر ہیں۔ انہوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ ہندستان پچھلے پچاس سال میں بہت زیادہ ترقی کر چکا ہوتا مگر ایک چیز نے اس کی ترقی کو روک دیا اور وہ سرکاری قانون قاعدے کی بھرمار ہے۔ ہم لوگ جو بزنس کرتے ہیں، ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ہم کوئی بھی چھوٹا یا بڑا کام سرکار کی منظوری کے بغیر نہیں کر سکتے، حتی کہ لبرلائزیشن کے بعد بھی نہیں۔

انھوں نے کہا کہ نہرو کے زمانہ میں جو سوشلسٹ اسکیم چلائی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر کام میں سرکاری افسروں اور سرکاری اداروں کا دخل ہو گیا۔ جو لوگ ان دفتروں میں قلم لئے ہوئے بیٹھے تھے انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے دستخط کے بغیر کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی منظوری کی قیمت وصول کرنا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ سارا سماج رشوت کا جنگل بن گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ملک ترقی نہیں کر سکتا۔

میں نے کہا کہ ہمارے ملک میں گاندھی اور نہرو کو سب سے اونچا درجہ حاصل ہے مگر میرے نزدیک یہی دونوں شخصیتیں ہیں جنھوں نے ملک کی آزادی کو بربادی میں تبدیل کر دیا ہے۔ گاندھی کا عدم تشدد کا ہتھیار عملاً ملک میں لاقانونیت کو فروغ دینے کا سبب بنا اور نہرو کے سرکاری کنٹرول نے سارے ملک کو رشوت اور بدعنوانی کی جال میں اس طرح پھنسا دیا کہ اب بظاہر اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔

17

تقسیم (۱۹۴۷) کے بعد سرحد کے دونوں طرف ملک کی تعمیر نو کے نام پر دو مختلف تحریکیں چلائی گئیں۔ ہندستان میں اس تحریک کا عنوان تھا: سوشلسٹک پیٹرن آف سوسائٹی۔ اور پاکستان، میں اس تحریک کا عنوان تھا: اسلامک پیٹرن آف سوسائٹی۔ نام کے اعتبار سے دونوں تحریکیں بظاہر ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دونوں کا انجام ایک ہوا۔ اور وہ یہ کہ دونوں ہی تحریکیں کسی تعمیری انجام تک نہ پہنچ سکیں۔

جنوری ۱۹۵۵ میں آوڈی (مدراس) میں کانگریس کا ڈائمنڈ جوبلی سشن ہوا۔ اس سشن میں اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں متفقہ طور پر یہ رزولیوشن پاس ہوا کہ ہندستان میں سوشلسٹ طرز کا سماج بنایا جائے گا۔

میں اول دن سے اس نظریہ کا مخالف تھا۔ میں نے اس کے بعد ہی اس موضوع پر ایک کتاب کی تیاری شروع کر دی۔ سوشلزم اور مارکسزم کو سمجھنے کے لئے میں نے دس ہزار سے زیادہ صفحات پڑھے۔ اس کے بعد میں نے وہ کتاب لکھی جو پہلی بار اپریل ۱۹۵۹ میں چھپی۔ اس کتاب کا نام تھا۔ مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے:

Marxism a rejected idealogy

پنڈت جواہر لال نہرو اس وقت پورے ملک کے واحد سب سے بڑے لیڈر تھے۔ انھوں نے اپنی پوری طاقت اس تجویز کو زیر عمل لانے میں لگادی۔ پانچ سالہ منصوبے وضع کئے گئے۔ پبلک سکٹر (صحیح تر لفظ میں گورنمنٹ سکٹر) کے نام سے دیو پیکر صنعتی ادارے قائم ہوئے۔ ہزاروں کی تعداد میں ایکٹ اور ضابطے بنائے گئے۔ یوجنا بھون اور ویکاس بھون جیسے ناموں سے بہت سی ہمالیائی عمارتیں کھڑی کی گئیں۔ ملک کی پوری اقتصادیات کو براہ راست یا بالواسطہ طور پر گورنمنٹ کے کنٹرول میں لے لیا گیا۔ ان سارے رومانوی منصوبوں کو وقوع میں لانے کے لئے ملک کے اوپر بھاری ٹیکس لاد دیئے گئے۔ اس نام نہاد "سوشلسٹ ماڈل" کے اوپر ملک ۴۰ سال سے زیادہ مدت تک چلتا رہا۔

مگر اس انتہائی مہنگے منصوبے کا جو نتیجہ نکلا اس کو سی راج گوپال اچاری نے لائسنس پرمٹ

راج کا نام دیا تھا۔ تاہم راج گوپال اچاری (وفات 1972) یہ دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہے کہ نہرو کا لائسنس پرمٹ راج مزید ترقی کر کے لیتھارجی اور کرپشن کا راج بن گیا۔ نام نہاد نیشنلائزیشن کے نظام نے لوگوں کو عمومی طور پر کاہل بنا دیا۔ زندگی کے تمام شعبوں کو سرکاری آدمیوں کے ہاتھ میں دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف نا قابل بیان حد تک رشوت اور کرپشن کا بازار گرم ہو گیا۔

نہرو کے سوشلسٹ نظام نے ملک میں بے شمار کلرکوں کی ایک فوج بنائی اور پھر قوم کو کلرکوں کی اس بے رحم فوج کے حوالہ کر دیا۔ نئے نظام کے تحت ان کو اتنے اختیارات حاصل تھے کہ ہر کلرک گویا کہ ایک گورنر تھا۔

اس سوشلسٹ نظام نے ملک کو طرح طرح کے مہلک نقصان پہنچائے۔ مثلاً اس نظام کے نتیجہ میں ٹریڈ یونین جیسی تحریکیں وجود میں آئیں جنھوں نے پورے کارکن طبقہ کو اور آخر کار پورے سماج کو ڈیوٹی کے بجائے حقوق پر نظر رکھنے والا بنا دیا۔ اس طرح ملکی صنعت کی ترقی کے نام پر اس کو غیر فطری تحفظ دیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں ملک کا مارکیٹ غیر معیاری سامانوں سے بھر گیا۔

اس سے بھی زیادہ بڑا نقصان یہ ہوا کہ اسمگلنگ کا جال سارے ملک میں پھیل گیا۔ حوالہ سسٹم کی صورت میں کرنسی کی ایک ایسی غیر قانونی تجارت وجود میں آگئی جو قانونی مالیاتی اداروں کے حجم سے بھی زیادہ بڑی تھی اس کے نتیجہ میں کھربوں کی بیرونی کرنسی ملک میں داخل ہوئے بغیر باہر ہی باہر فرخت ہو گئی۔

۲ جولائی ۱۹۹۸ کو حبیب محمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ حیدر آباد کے ایک تاجر ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ میں ایک صنعتی ادارہ چلاتا ہوں۔ اس کو چلانے کے لئے مجھے تقریباً ۴۵ سرکاری کھڑکیوں (windows) پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ ان میں سے ہر ونڈو کو مجھے پرسیکیوٹ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس صورت حال نے مجھے اتنا پریشان کیا کہ اب میں نے اپنا کاروبار تقریباً ختم کر دیا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے کہا کہ حال میں میں امریکہ گیا تھا۔ وہاں میں ایک مہینہ رہ کر واپس آیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا کہ حکومت نے اپنے شہریوں کو ہر قسم کی سہولت دے رکھی ہے آپ

کو کسی سرکاری ونڈو پر لائن لگانے کی ضرورت نہیں۔ وہاں کھلا مقابلہ ہے وہاں آپ کو صرف ایک کام کرنا ہے۔ مقابلہ میں اپنے آپ کو اہل ثابت کیجئے اور جتنی چاہے ترقی کرتے چلے جایئے۔ انہوں نے کہا کہ اب میں نے طے کیا ہے کہ اپنے بچہ کو امریکہ بھیج کر وہاں سٹل کراؤں۔

حبیب محمد صاحب کی یہ گفتگو سن کے مجھے ۳۵ سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آیا۔ میرے بھائی عبدالعزیز خاں مرحوم جو یوپی میں ایک تجارتی ادارہ چلاتے تھے، وہ اپنے کسی کام کے لئے اسی قسم کی ایک سرکاری ونڈو پر گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ونڈو کے پیچھے بیٹھے ہوئے کلرک نے کچھ رعونت دکھائی۔ اس پر میرے بھائی نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہاں کے گورنر ہیں۔ ونڈو کے پیچھے سے ایک متکبرانہ آواز آئی: اس میں کیا شک ہے، اس آفس میں تو میں ہی گورنر ہوں۔

یہ تھاوہ پرعذاب اور ترقی شکن نظام جو جواہر لال نہرو اور ان کے سوشلسٹ ساتھیوں نے اس ملک میں قائم کیا۔ نہرو کے ذہن میں نوجوانی کی عمر سے ایک سوشلسٹ خواب تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندستان کی حکومت پر قبضہ کر کے یہاں کی تمام چیزوں کو سرکاری کنٹرول میں لے لیں اور پھر حکومتی طاقت سے ایک نیا انڈیا بنائیں۔ اس خود ساختہ نئے انڈیا کی تعمیر کے لئے وہ اتنا زیادہ بے تاب تھے کہ اس کے قیام کا جلد موقع حاصل کرنے کے لئے انھوں نے ملک کی تقسیم کو منظور کرلیا۔ مگر آزادی کے بعد جب ان کا نام نہاد سوشلسٹ نظام قائم ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ صرف ایک ایسا مصنوعی نظام تھا جو بے رحم شکنجہ بن کر خود ترقی کے عمل ہی کو روک دیا۔

۱۹۹۲ میں بابری مسجد کے ڈھائے جانے سے پہلے اس وقت کے وزیر اعظم نرسمہاراؤ نے مجھے بابری مسجد کے بارے میں بات چیت کے لئے بلایا تھا۔ پرائم منسٹر ہاؤس میں جب ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں بے اختیار رو پڑا۔ میں نے کہا کہ بابری مسجد کو بچانے سے بھی بڑا مسئلہ ملک کو بچانا ہے۔ جواہر لال نہرو کے نام نہاد سوشلزم نے ملک کو تباہی کے آخری کنارے پر پہنچادیا ہے۔ آپ اگر کچھ کرسکتے ہیں تو اس اقتصادی عذاب سے ملک کو نجات دیجئے۔ اس کے بعد لبرلائزیشن کا وہ واقعہ وجود میں آیا جس کو عام طور پر ڈاکٹر من موہن سنگھ کی طرف منسوب کیا جاتا

ہے جواس وقت کی نرسمہاراؤ گورنمنٹ میں وزیر مالیات تھے۔

سوشلسٹ ماڈل کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ اس عالم اسباب میں قابل بقا (sustainable) نہ تھا۔ اسکے لئے ہندستان میں بھی اسی طرح ٹوٹنا مقدر تھا جس طرح وہ سوویت یونین میں ٹوٹ گیا۔ کسی ملک کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کو ایسے دور اندیش لیڈر ملیں جو قوم کو ایسا نظام دے سکیں جو قابل بقا ہو۔ کسی بھی نظام کا پورا نتیجہ "نصف صدی" میں نکلتا ہے۔ اگر نصف صدی گزرنے کے بعد یہ معلوم ہو کہ چلایا جانے والا منصوبہ بے نتیجہ رہا تو نصف صدی کھو کر قوم کو اپنا سفر از سر نو پیچھے سے شروع کرنا پڑے گا۔

18

پاکستان کے قیام کے بعد وہاں جو نشانہ اختیار کیا گیا وہ بظاہر ایک صحیح نشانہ تھا، یعنی اسلامک پیٹرن آف سوسائٹی کا قیام مگر نتیجہ کا برعکس صورت میں نکلنا بتاتا ہے کہ اس نعرہ میں کوئی بنیادی غلطی تھی اس لئے اس معاملہ کا بے لاگ جائزہ ضروری ہے تاکہ اس نقصان کا کم سے کم وہ فائدہ ہو جس کو فارسی شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: من نکردم شما خدا بکنید۔ تاکہ اس تجربہ سے اگر کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا تو کم از کم اس کے سبق سے بعد کے لوگ محروم نہ رہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، مولانا شبیر احمد عثمانی (وفات ۱۹۴۹) پاکستان کے سرگرم حامیوں میں سے تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد وہ کراچی چلے گئے۔ پاکستان میں جو دستور ساز اسمبلی بنائی گئی اس کے وہ ایک اہم رکن تھے۔ دستور ساز اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے انہوں نے داخلی طور پر اپنا پورا زور اس پر ڈال دیا کہ پاکستان کا دستور اسلامی اصولوں پر بنایا جائے۔ داخلی اعتبار سے مولانا شبیر احمد عثمانی کی کوشش اور خارجی اعتبار سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور دوسرے علماء کی تقریری اور تحریری مہم کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۱۹۴۸ میں دستور ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد (Obectives reso-lution) کو منظوری دے دی۔ اس قرارداد مقاصد کے الفاظ شریعت کی روشنی میں وضع کئے گئے تھے۔ اس کا استقبال مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ کہہ کر کیا کہ پاکستان کی ریاست نے اب کلمہ پڑھ لیا ہے۔ حالانکہ زیادہ صحیح یہ تھا کہ وہ اعلان کرتے کہ ہم پاکستانیوں کے دلوں پر تو اسلام نہ

لکھ سکے البتہ ہم نے اسمبلی کے کے کاغذ پر اسلام کا نام تحریر کر دیا ہے۔

اس کے بعد نفاذ شریعت کے حصول کی مہم شروع ہوئی۔ اس مہم کے نتیجہ میں پاکستان دو طبقوں میں بٹ گیا۔ ایک حکمراں طبقہ اور دوسرا غیر حکمراں طبقہ۔ حکمراں طبقہ تقریباً سب کا سب سیکولر ذہن کا تھا۔ وہ سیکولر نظام بنانے کا حامی تھا۔ دوسری طرف غیر حکمراں طبقہ اسلامی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اس کے نتیجہ میں دونوں طبقوں کے درمیان زبردست ٹکراؤ ہوا۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان قتل کئے گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو وزارت عظمیٰ سے ہٹا کر پھانسی دی گئی۔ جلسوں اور مظاہروں کے دوران بہت سے لوگ زخمی ہوئے یا مارے گئے۔ اس ہنگامہ خیز سیاست کے نتیجہ میں پاکستان میں اقتصادی ترقی کا عمل ٹھپ ہو کر رہ گیا۔

اسلام کے نام پر جو پر شور سیاست پاکستان میں چلائی گئی اس کا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان میں نہ سیکولر نظام قائم ہوا اور نہ اسلامی نظام۔ بلکہ ان دونوں کے سوا ایک تیسری چیز ظہور میں آئی، اور وہ تھی خانہ جنگی اور انارکی۔

کیوں ایسا ہوا کہ اسلام کے نام پر چلائی جانے والی مہم کا نتیجہ غیر اسلام کی صورت میں بر آمد ہوا۔ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ اسلامی نظام کے نام پر پاکستان میں جو پر شور تحریک چلائی گئی وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک جذباتی ہنگامہ تھا نہ کہ صحیح معنوں میں کوئی سوچی سمجھی تحریک۔ اور کوئی حقیقی نتیجہ ہمیشہ سوچی سمجھی تحریک کے ذریعہ نکلتا ہے نہ کہ جذباتی ہنگاموں سے۔

اکتوبر ۱۹۷۰ میں پاکستان میں عام انتخابات ہوئے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی قیادت میں جماعت اسلامی پاکستان نے بھی اس میں حصہ لیا۔

مولانا مودودی کا کہنا تھا کہ پاکستان اسلام کے نام الاٹ ہو چکا ہے (اور شاید اسلام خود ان لوگوں کے نام) جماعت اسلامی پاکستان نے نہایت زور و شور کے ساتھ الکشن میں حصہ لیا۔ الکشن کے خاتمہ کے بعد ۱۹۷۱ میں جب میں پاکستان گیا اس وقت میں نے دیکھا کہ اب بھی لاہور کی دیواروں پر ایسے پوسٹر موجود ہیں جن کے اوپر یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں: انشاء اللہ جیتے گی جماعت اسلامی جیتے گی۔

اس موقع پر جماعت اسلامی پاکستان نے ایک لمبا انتخابی منشور شائع کیا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ پاکستان میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ لوگ کس طرح پاکستان کو اسلامائز کریں گے۔ اس مفصل منشور کا ایک جزئیہ تھا: اتوار کے بجائے جمعہ کو تعطیل مقرر کی جائے گی (الجمعیۃ ویکلی، دہلی، ۶ مارچ ۱۹۷۰)

جماعت اسلامی پاکستان اس الکشن میں بری طرح ہار گئی۔ تاہم اس نے اور دوسرے پاکستانی علماء نے اتوار کے بجائے جمعہ کی چھٹی کی مانگ عوامی سطح پر بدستور جاری رکھی یہاں تک کہ پاکستان کے فوجی صدر جنرل محمد ضیاء الحق (وفات ۱۹۸۸) نے ایک صدارتی حکم کے ذریعہ اتوار کی چھٹی منسوخ کردی اور اس کے بجائے جمعہ کے دن کو سارے پاکستان میں سرکاری تعطیل کا دن قرار دے دیا۔

''اسلامی تعطیل'' کا یہ تجربہ چند سال کے بعد سخت تنقیدوں کا شکار ہو گیا۔ خاص طور پر تاجر طبقہ اس کی کھلی مخالفت کرنے لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس ''اسلامی تعطیل'' کے نتیجہ میں پاکستان کو ہفتہ میں دو دن کا اقتصادی نقصان برداشت کرنا پڑتا تھا۔ پاکستان کے تجارتی ادارے جمعہ کو چھٹی کرتے تھے جب کہ ساری دنیا اس دن تجارتی سرگرمیوں میں مشغول ہوتی تھی۔ اس کے بعد پاکستان کے تجارتی ادارے اتوار کو اپنے دفاتر کھولتے تھے جب کہ ساری دنیا اس دن اپنے دفتروں کو بند کئے ہوئے ہوتی تھی۔ آخر کار ۱۹۹۷ میں نواز شریف کی حکومت نے ایک حکم کے ذریعہ جمعہ کی چھٹی منسوخ کردی اور اس کے بجائے اتوار کے دن کی چھٹی کو بحال کردیا۔

اس عجیب وغریب صورت حال کا ایک معکوس نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں وقت کا ساتھ دینے کی طاقت نہیں۔ حالانکہ ''جمعہ کی چھٹی'' کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ یہ کچھ سیاسی ہنگامہ پسندوں کا ایک طبع زاد شوشہ تھا نہ کہ اسلام کا کوئی حکم۔

قرآن کی سورۃ ۶۲ اس معاملہ میں ایک واضح رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سورہ میں جمعہ کے آداب بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: اے ایمان والو، جب جمعہ کے دن کی نماز کے لئے پکارا

جائے تو اللہ کی یاد کی طرف چل پڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (۱۰۔۹)

اس آیت میں اسلامی زندگی کا جو نقشہ بتایا گیا ہے اس کے مطابق، جمعہ کا دن چھٹی کا دن نہیں ہے۔ یہ آیت تصدیق کرتی ہے کہ اہل ایمان جمعہ کی نماز کے مختصر وقفہ کو چھوڑ کر، جمعہ سے پہلے بھی اقتصادی سرگرمیوں میں مصروف ہوں گے۔ اور جمعہ کے بعد بھی دوبارہ اقتصادی عمل میں مصروف ہوں گے۔ اس آیت کے مطابق جمعہ کے دن کی تخصیص صرف یہ ہے کہ اس دن ظہر کی نماز کی جگہ جمعہ کی نماز پڑھی جائے گی۔ اس مختصر وقفہ کے علاوہ مسلمان جمعہ کے دن بھی اسی طرح مشغول رہیں گے جس طرح وہ عام دنوں میں مشغول رہتے ہیں۔

یہ ایک علامتی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نفاذ شریعت کے نام پر چلائی جانے والی مہم محض کچھ مذہبی لیڈروں کی جذباتی ہنگامہ آرائی تھی نہ کہ حقیقۃً اسلامی نفاذ کی کوشش۔ اور اس طرح کی غیر سنجیدہ کوشش کا انجام خدا کی اس دنیا میں وہی ہو گا جو عملاً پاکستان میں پیش آیا۔

("بقیہ نومبر کے شمارہ میں")

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
skhan@vsnl.com
http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi

اکتوبر 1999 شمارہ نمبر 275

فہرست

مشاہدۂ خداوندی

قال رسول الله ﷺ : اهل الجنة فی نعیمهم اذسطع علیهم نور فرفعوا رؤسهم فاذا الرب تبارك وتعالی قد اشرف علیهم من فوقهم. فقال السلام علیکم یا اهل الجنة. وذالك قوله تعالی (سلام قولا من رب الرحیم) قال فینظر الیهم وینظرون الیه . فلا یلتفتون الی شیٔ من النعیم ما داموا ینظرون الیه حتی یحجب عنهم (ابن ماجه) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اہل جنت اپنی نعمتوں میں ہوں گے کہ ان کے اوپر ایک روشنی نمودار ہو گی۔ وہ اپنا سر اٹھائیں گے۔ اچانک وہ دیکھیں گے کہ ان کا رب ان کے اوپر جلوہ گر ہے۔ وہ کہے گا کہ اے اہل جنت، تم پر سلامتی ہو۔ یہ وہی قول خداوندی ہے جس کا ذکر قرآن (یٰس ۵۸) میں ہے۔ پھر اللہ انھیں دیکھے گا اور وہ اللہ کو دیکھیں گے، وہ کسی دوسری نعمت کی طرف متوجہ نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ اللہ ان سے حجاب میں چلا جائے۔

یہ سب سے زیادہ عجیب تجربہ ہے جو اہل جنت کو ہو گا۔ یہ اتنا زیادہ پر کشش ہو گا کہ اس وقت جنت کے لوگ دوسری تمام اعلیٰ ترین نعمتوں کو بھول جائیں گے۔ وہ خدا جو خود اپنی ذات پر قائم ہے۔ جس نے تمام چیزوں کو عدم سے وجود بخشا۔ جو پوری کائنات کو اپنے کنٹرول میں لئے ہوئے ہے۔ جس کا علم تمام چیزوں پر محیط ہے۔ جس کی قدرت سب سے بالا اور سب سے برتر ہے۔ جو ہر قسم کے حسن اور کمال اور معنویت کا ابدی سرچشمہ ہے۔ جو انسان کی ہر سوچ سے بلند اور اس کے ہر تصور سے ماورا ہے۔ ایسے جلال و کمال والے خدا کا مشاہدہ بلاشبہہ ایک ایسا بے مثال تجربہ ہو گا جس کو بیان کرنے کے لئے کوئی لفظ انسانی زبان میں نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی روح اسی رب العالمین کو دیکھنے کے لئے بے قرار ہے۔ موجودہ آنکھ سے انسان اس ہستی کو نہیں دیکھ سکتا۔ مگر آخرت میں انسان کو وہ آنکھ حاصل ہو جائے گی جس سے وہ اس برتر ہستی کو دیکھے اور اپنی روح کو ابدی تسکین دے سکے۔

رسول کی سنت

عن عائشة ، قالت : ماخُیر رسول الله ﷺ بین امرین قطُ الا اخذ ایسر هما مالم یکن اثما، فان کا ن اثما کان ابعد الناس منه (متفق علیہ)

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو جب بھی دو چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان کو اختیار کرتے جب تک کہ وہ گناہ نہ ہو۔ پس اگر وہ گناہ ہوتا تو آپ سب سے زیادہ اس سے دور رہنے والے تھے۔

اس حدیث میں ''ایسر'' کا لفظ سادہ طور پر محض سہل کے معنی میں نہیں ہے۔ آپ کے حالات بتاتے ہیں کہ آپ سہولت پسندی سے بہت دور تھے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی قربانی اور جفاکشی کی اعلیٰ سطح پر گزاری۔ ایسی حالت میں اس حدیث کو سہولت پسندی کے معنی میں کیسے لیا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں ''ایسر'' کا لفظ زیادہ قابل عمل کے معنی میں ہے۔ حضرت عائشہ کی یہ روایت بتاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ممکن دائرہ میں کوشش کرنے کا تھا نہ کہ غیر ممکن دائرہ میں غیر ضروری طور پر اپنے وقت اور اپنی قوت کو ضائع کرنے کا۔

زندگی میں ہمیشہ دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک ہے ممکن سے آغاز، اور دوسرا ہے ناممکن سے آغاز۔ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ناممکن کو چھوڑ کر ممکن میں اپنی قوت صرف فرماتے تھے۔

مکہ کے ابتدائی سالوں میں ایک طریقہ کھلم کھلا تبلیغ کا تھا اور دوسرا خفیہ تبلیغ کا۔ آپ نے تین سال تک کھلم کھلا تبلیغ کو چھوڑ کر خفیہ تبلیغ کا طریقہ اختیار فرمایا۔ مکہ میں جب لوگوں نے مخالفت اور ایذا رسانی شروع کی تو ایک طریقہ جوابی کارروائی کا تھا اور دوسرا اعراض کا۔ آپ نے جوابی کارروائی کا طریقہ چھوڑ کر اعراض کا طریقہ اختیار فرمایا۔ مکی دور کے آخر میں لوگ آپ کے

قتل کے درپے ہوگئے۔ اب ایک طریقہ ان سے لڑنے کا تھا اور دوسرا طریقہ یہ تھا کہ مکہ کو چھوڑ دیا جائے۔ آپ نے لڑائی کو چھوڑ کر مکہ سے چلے جانے کا طریقہ اختیار فرمایا۔ ہجرت کے بعد آپ کے سامنے ایک طریقہ جنگ کو جاری رکھنے کا تھا اور دوسرا طریقہ صلح کر لینے کا۔ آپ نے جنگ کے طریقہ کو چھوڑ کر یک طرفہ شرائط پر صلح کر لینے کا طریقہ اختیار فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں جو کامیابیاں حاصل کیں وہ اسی اصول کے ذریعہ حاصل کیں۔ آئندہ بھی جو لوگ کوئی کامیابی حاصل کرنا چاہیں انھیں بھی اسی سنت رسول کی پیروی کرنا چاہئے۔ اس کے سوا اس دنیا میں کامیابی کا کوئی اور طریقہ نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے جب مکہ میں مخالفین سے ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر ہجرت کا طریقہ اختیار فرمایا تو یہ اختیار ایسر کی ایک نہایت واضح مثال تھی۔ اس وقت آپ کے سامنے دو صورتیں تھیں۔ ایک تھی ۔۔۔ مکہ میں رہ کر اپنے دعوتی کام کو جاری رکھنا۔ اور دوسری صورت تھی ۔۔۔ مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے جانا۔ پہلی صورت کا انتخاب گویا مشکل کا انتخاب (اختیار اعسر) کے ہم معنی تھا۔ اور دوسری صورت کا انتخاب آسان کا انتخاب (اختیار ایسر) کی حیثیت رکھتا تھا۔ آپ نے مشکل کو چھوڑ کر آسان کو اختیار فرمایا۔

اس اصول کو دوسرے لفظوں میں حکیمانہ تدبیر بھی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ یہ ممکن ہو گیا کہ اسلامی دعوت کا کام بلا روک ٹوک جاری رہے۔ جبکہ اگر آپ پہلی صورت کا انتخاب فرماتے تو دعوت کا کام شاید معطل ہو جاتا۔ دعوت کے بجائے جنگ اور ٹکراؤ کا عمل شروع ہو جاتا۔ مشکل کا انتخاب صرف اس وقت کیا جائے گا جب کہ کوئی دوسرا چوائس نہ ہو۔ لیکن اگر مشکل اور آسان میں سے ایک لینا ہو تو مشکل کو چھوڑ کر آسان کو اختیار کیا جائے گا۔

کسی منصوبہ کی تکمیل کے لئے مذکورہ حکیمانہ تدبیر انتہائی طور پر ضروری ہے۔ اگر اس حکمت کا لحاظ نہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ قربانیوں کی تاریخ بن جائے، مگر مثبت تعمیر کی تاریخ کبھی نہیں بن سکتی۔

زند3گی اور کائنات

انسان جب اپنے گردوپیش کو دیکھتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ یہاں ایک وسیع کائنات موجود ہے۔ یہ مشاہدہ اس کو اس یقین کی طرف لے جاتا ہے کہ جب یہاں ایک وجود ہے تو اس کا ایک موجد بھی ضرور ہونا چاہئے۔اس طرح وجود کو ماننا اسے خالق وجود کو ماننے پر مجبور کر دیتا ہے۔

وہ مزید غور کرتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ کائنات کا کارخانہ انتہائی بامعنی کارخانہ ہے۔ اس کی ہر چیز میں حکمت اور معنویت ہے۔ یہ احساس اس کے یقین کو مزید آگے بڑھاتا ہے۔ وہ یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کائنات کا جو خالق ہے وہ اس اعلیٰ صفت سے متصف ہے جس کو ذہن کہا جاتا ہے۔ کائنات کی معنویت یہ ماننے پر مجبور کر دیتی ہے کہ اس کے پیچھے ایک اعلیٰ ذہانت کی کارفرمائی ہے۔

اب انسان کے سامنے ایک اور سوال آجاتا ہے۔ وہ یہ کہ اس تخلیق کا مقصد کیا ہے۔ انسان اس زمین پر کیوں بسایا گیا ہے۔ انسان مر کر ختم ہو جاتا ہے یا موت کے بعد بھی کوئی زندگی ہے۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ یہاں وہ عاجز ہے۔ ان سوالات کے جوابات کے لئے جو معلومات درکار ہیں، وہ اس کے پاس موجود نہیں۔ اس سوال کا حقیقی جواب وہی شخص دے سکتا ہے جو دکھائی دینے والی دنیا سے آگے دیکھتا ہو۔ جس کا ادراک محسوس سے گزر کر غیر محسوس تک پہونچ گیا ہو۔ انسان اپنی محدودیت کی بنا پر اس سوال کا صحیح جواب متعین نہیں کر سکتا۔

یہاں پیغمبر انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ تمام پیغمبر انسان کو یہی رہنمائی دینے کے لئے آئے۔ تاہم پچھلے پیغمبروں کی تعلیمات محفوظ نہ رہ سکیں۔ اب پیغمبر آخر الزماں ﷺ ہی پیغمبرانہ رہنمائی کا واحد مستند ذریعہ ہیں۔ جو آدمی اپنی زندگی اور اس کے انجام کے بارہ میں سنجیدہ ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ آپ کی تعلیمات کا مطالعہ کرے اور اس پر غور کر کے اپنے لئے راہ عمل کا تعین کرے۔

جنت کی قیمت

جنت اس سے زیادہ قیمتی ہے کہ کسی انسان کا عمل جنت کی قیمت بن سکے۔ انسان کا ہر عمل ناقص ہوتا ہے۔ جب کہ جنت ایک کامل اور معیاری دنیا ہے۔ پھر ایک ناقص چیز ایک کامل چیز کا بدل کیسے بن سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر تمام انسانوں کے اعمال صالحہ کسی ایک شخص کو دے دیئے جائیں تب بھی وہ اس شخص کے لئے جنت کی قیمت نہیں بنیں گے۔ کیوں کہ تمام انسانوں کے اعمال کا مجموعہ بھی بہر حال محدود ہوگا۔ جب کہ جنت لامحدود اور ابدی ہے۔ پھر کوئی محدود چیز اس کی قیمت کس طرح بن سکتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جنت کس کو ملے گی۔ جنت اس شخص کو ملے گی جس کو خدا جنت دینا چاہے۔ جنت کسی انسان کے لئے سراسر خدا کا عطیہ ہوگی، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

پھر وہ کون خوش قسمت انسان ہے جس کو خدا اس لئے چنے گا کہ اس کو اپنی قیمتی جنت کا باشندہ بنائے۔ یہ وہ انسان ہے جس نے اپنے اندر اس شخصیت کی تعمیر کی جو جنت کی لطیف دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہو۔ بادشاہ کے محل کا ایک ملازم بادشاہ کے محل کی قیمت ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ لیکن اگر وہ صفائی اور سلیقہ کے اعتبار سے اس قابل ہو کہ وہ شاہی محل کے آداب کے مطابق وہاں رہ سکے تو اس کو محل میں داخلہ کی اجازت دے دی جاتی ہے۔

یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر جنت کا ہے۔ جنت کی لطیف اور نفیس کالونی اتنی زیادہ قیمتی ہے کہ کوئی بھی اس کو خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ وہاں جو انسان بھی رہے گا وہ اللہ کی اجازت کی بنیاد پر وہاں رہے گا۔ مگر یہ اجازت صرف ان لطیف روحوں کو دی جائے گی جو جنت کی لطیف دنیا میں رہنے بسنے کے قابل ہوں۔

موجودہ دنیا میں انسان کا اصل کام یہی ہے کہ وہ اپنے اندر اس لطیف شخصیت کی تعمیر کرے۔ جن لوگوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ اعلیٰ شخصیت پائی ان کو وہ جنت میں داخل کر دے گا۔

حقیقی انسان

اس دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی چیز ایک حقیقی انسان ہے۔ مگر انسانوں کے ہجوم میں یہی قیمتی چیز اتنی کم یاب ہے کہ ساری تاریخ میں شاید بہت کم انسان ایسے نظر آئیں جن کو واقعی معنوں میں حقیقی انسان کہا جاسکے۔

حقیقی انسان وہ ہے جو تمام ذہنی پردوں کو پھاڑ کر چیزوں کو ویسی ہی دیکھے جیسی کہ وہ ہیں۔ جو اپنے بارے میں اور دوسرے کے بارے میں یکساں طور پر بے لاگ رائے قائم کر سکے۔ جو بولے تو اس کا بولنا حقیقت واقعہ کا اعتراف ہو، جو عمل کرے تو اس کا عمل حقیقت واقعہ سے مطابقت رکھنے والا ہو۔ حقیقی انسان بننا ہمیشہ ایک مشکل ترین قربانی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ یہ نفسیاتی قربانی ہے۔ لوگ نفسیاتی قربانی کی قیمت ادا نہیں کرتے اس لئے وہ حقیقی انسان بھی نہیں بنتے۔

حقیقی انسان وہ ہے جو سطحیت، خود غرضی، جھوٹے وقار اور رد عمل کے احساسات سے اپنے آپ کو اوپر اٹھا سکے۔ جو اختیار کے باوجود اپنے آپ کو بے اختیار کرنے کے لئے تیار ہو۔ جو اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل ہونا نہ جانے۔ جو شکایت کے باوجود انصاف کی بات کہے۔ جو ذاتی تقاضوں کو کچل کر حق کی حمایت کرے۔ جو شخصی مفاد پر کھڑا ہونے کے بجائے برتر اصول کی بنیاد پر کھڑا ہونے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ جو نفرت کے حالات میں محبت کرے اور جنگ کے حالات میں صلح پر راضی ہو جائے۔

لوگ اپنی ذات کے لئے جیتے ہیں، حقیقی انسان وہ ہے جو مقصدِ حق کے لئے جیئے۔ لوگ دوست کے لئے دوست اور دشمن کے لئے دشمن ہوتے ہیں، حقیقی انسان ہر ایک کا خیر خواہ ہوتا ہے، چاہے وہ اس کا دوست ہو یا اس کا دشمن۔ لوگ ماحول کے مطابق سوچتے ہیں اور ماحول کے اثر کے تحت اپنا عمل کرتے ہیں، حقیقی انسان فطرت کی سطح پر سوچتا ہے، وہ فطرت کے زیر اثر اپنا سارا عمل کرتا ہے۔

اضداد کا مجموعہ

ہر آدمی کے اندر ''میں'' کا جذبہ ہے۔ میں کو بے قید چھوڑ دیا جائے تو آدمی سرکش بن جاتا ہے۔ اور اگر اس کی میں کو کچل دیا جائے تو وہ ایک بے حمیت انسان بن جائے گا۔ دونوں ہی صورتوں میں وہ ایک غیر مطلوب انسان ہو گا جو انسانیت کے لئے ایک بوجھ ہے، وہ انسانیت کے لئے کوئی سرمایہ نہیں۔

میں ایک نہایت قیمتی جذبہ ہے۔ اس سے آدمی کے اندر یقین، حوصلہ، عزم، جرأت، خود اعتمادی اور مقصدی لگن جیسی اعلیٰ صفات پیدا ہوتی ہیں۔ میں کا جذبہ نہ ہو تو یہ تمام اعلی انسانی اوصاف ختم ہو جائیں۔ مگر یہی میں ہے جو بڑھ کر سرکشی اور تکبر اور انانیت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ تمام بری چیزوں میں سب سے زیادہ بری چیز بن جاتا ہے۔

صحیح اور مطلوب انسان وہ ہے جو معتدل انسان ہو۔ جس کے اندر میں کے ساتھ نفی ذات بھی ہو۔ نہ ماننے کے ساتھ ماننے کا جذبہ بھی ہو۔ جرأت کے ساتھ تواضع بھی ہو۔ خود اعتمادی کے ساتھ نرم دلی بھی ہو۔ آگے بڑھنے کے ساتھ پیچھے ہٹنے کا مزاج بھی ہو۔ وہ تنقید کرنے کے ساتھ تنقید سننا بھی جانتا ہو۔ وہ فتح پر خوش ہونے کے ساتھ شکست کو تسلیم کرنا بھی جانتا ہو۔ وہ مقابلہ کے میدان کا مرد ہونے کے ساتھ صبر و اعراض کا پہلوان بھی ہو۔ وہ جوش کا مالک ہونے کے ساتھ ہوش کا سرمایہ بھی رکھتا ہو۔

بظاہر یہ ایک ایسا انسان ہے جو اضداد کا مجموعہ ہے۔ مگر مجموعۂ اضداد انسان ہی در اصل کامل انسان ہوتا ہے۔ یہی وہ انسان ہے جو حقیقی معنوں میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دیتا ہے۔ یہی تاریخ ساز انسان ہے۔ یہی انسان نسل انسانی کا حاصل ہے۔ ایسے انسان نہ ہوں تو نسل انسانی سرے سے بے معنی ہو کر رہ جائے۔ زندگی کی تمام حقیقی سرگرمیاں اسی وقت وجود میں آتی ہیں جب کہ اس قسم کے اعلیٰ انسان سماج میں پائے جاتے ہوں۔

تکمیل آرزو

مشہور آرٹسٹ فدا حسین اگر چہ اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے مگر اپنی محنت اور فطری لیاقت کے ذریعہ انھوں نے مصوری کے فن میں غیر معمولی ترقی حاصل کی۔ ان کی شہرت سب سے زیادہ اس وقت بڑھی جب بمبئی کے تاج محل ہوٹل میں ایک نمائش کے دوران ایک بیرونی کمپنی نے ان کی ایک تصویر پانچ لاکھ روپیہ میں خریدی۔ اس کے بعد وہ ہندستان کے عظیم ترین مصور کہے جانے لگے۔

ٹائمس آف انڈیا (۶ راکتوبر ۱۹۹۰) میں ان سے ملاقات کی ایک روداد شائع ہوئی ہے۔ مسٹر پال نے ان سے پوچھا کہ کیا کوئی چیز ہے جس سے آپ خوفزدہ ہوں۔ ۷۵ سالہ فدا حسین نے جواب دیا کہ نہیں۔ مگر کبھی کبھی مجھے عجیب قسم کی مایوسی ہوتی ہے وہ یہ کہ عین اس وقت جب کہ مجھے پینٹنگ میں کچھ درک حاصل ہوا، جب میں اس کے رازوں کو جاننے لگا تو میرے لئے اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آگیا۔ ابھی بہت سی چیزیں ہیں جن کو مجھے پینٹ کرنا ہے۔ اب بھی میں خیالات سے بھرا ہوا ہوں:

At times, there is a strange sadness though. That just when I have got a grip over painting, when I have begun to grasp its mystery, it is time to pack up. There is so much I can still paint. I am still so full.

یہی اس دنیا میں ہر انسان کا معاملہ ہے۔ آدمی بے پناہ آرزوؤں اور حوصلوں کو لے کر دنیا میں آتا ہے۔ وہ رات دن محنت کرتا ہے مگر اس کی آرزوؤں کی تکمیل نہیں ہوتی کہ موت کا وقت آجاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی چھوٹا ہو یا بڑا، ہر ایک غیر تکمیل شدہ حوصلوں کا ایک مزار ہے۔ یہ اس بات کا ایک سبق ہے کہ موجودہ دنیا صرف جدو جہد کی جگہ ہے۔ وہ پانے کی جگہ نہیں۔

زندگی کی تعمیر

۲۲ دسمبر ۱۹۸۴ کو ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور انھوں نے علم معاشیات کا خصوصی مطالعہ کیا تھا، انھوں نے کہا کہ میں ''آخری سچائی'' صرف انسانی مفاد کو سمجھتا ہوں۔ میری دلچسپی کا موضوع موجودہ دنیا کے مسائل ہیں۔ انسان کی آج کی زندگی کو کیسے بہتر بنایا جائے، بس یہی سوال میرے نزدیک اصل سوال ہے اور میں اسی کا جواب پانا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا کہ اگر آپ فرد کے مفاد کے حصول کو اصل قرار دیں تو یہ بھی ماننا ہوگا کہ فرد کی اپنی رائے ہی اس بات کا فیصلہ کرے گی کہ وہ کس چیز کو اپنا مفاد سمجھتا ہے۔ مگر اس سے زیادہ مہلک اور کوئی چیز نہیں۔ اگر آپ ہر فرد کو کھلی اجازت دے دیں کہ وہ جس چیز کو اپنا مفاد سمجھتا ہے اس کو وہ بے روک ٹوک حاصل کرے تو اس کے بعد جو چیز وجود میں آئے گی وہ ایک خود غرضانہ سماج ہوگا۔ یہ ایسا سماج ہوگا جہاں ہر آدمی کا مفاد دوسرے کے مفاد سے ٹکرا رہا ہو۔

اور اگر پوری انسانیت کے مجموعی مفاد کو اصل قرار دیا جائے تو سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ انسانیت کا مجموعی مفاد کیا ہے۔ جب تک یہ بات متفقہ طور پر طے نہ ہو جائے، کوئی عملی منصوبہ نہیں بنایا جا سکتا۔

مگر یہ حقیقت ہے کہ انسان اپنی محدودیت کی وجہ سے یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ انسانیت کا مجموعی مفاد کیا ہے۔ اس کو جاننے کے لئے جن علوم سے کامل واقفیت درکار ہے وہ کسی ایک دماغ میں جمع نہیں ہو سکتے۔ انسان کی عمر بھی محدود ہے اور اس کی عقلی صلاحیتیں بھی محدود۔ ایسی حالت میں یہ مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے کہ انسان کبھی بھی حقیقی طور پر یہ دریافت کر سکے کہ پوری انسانیت کا مجموعی مفاد کیا ہے۔

فرد کے مفاد کو اہمیت دینا خود غرضی تک لے جاتا ہے اور مجموعی انسانیت کے مفاد کی تلاش تشکیک تک۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لئے یقین کا ذریعہ پیغمبر کی رہنمائی کے سوا اور کچھ نہیں۔

منصوبۂ حیات

آہ، زندگی مجھے صرف ایک بار ملی تھی، مگر میں کیسا نادان تھا کہ اس ایک بار ملی ہوئی زندگی کو بھی میں نے کھو دیا ــــ یہ احساس ایک ناقابل برداشت درد بن کر اس وقت آدمی کے اوپر چھا جائے گا جب کہ وہ موجودہ مرحلۂ حیات سے گزر کر موت کے دروازہ پر پہنچے گا۔

یہاں وہ اپنے ایک دور حیات کا خاتمہ اور اپنے دوسرے دور حیات کا آغاز دیکھے گا۔ اس کے پیچھے وہ دنیا ہوگی جہاں وہ اپنے قیام کی مدت پوری کر چکا۔ اور اس کے آگے وہ آخرت ہوگی جہاں اب اس کو اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتنے کے لئے داخل کر دیا جائے۔ اس وقت آدمی سوچے گا کہ دنیا کی زندگی کی صورت میں اس کو کتنا قیمتی موقع ملا تھا جس کو استعمال کر کے وہ اپنے اخروی مستقبل کی تعمیر کر سکتا تھا۔ مگر وہ اس موقع کو اپنے حق میں استعمال نہ کر سکا۔ یہ تلخ یاد حسرت کا ایک سلگتا ہوا آتش فشاں بن کر آدمی کے سینہ میں دہکتا رہے گا اور اس کے بعد کبھی وہ ٹھنڈا نہ ہوگا۔

جو آدمی بھی اس دنیا میں پیدا ہوا ہے اس کے لئے سب سے پہلا ضروری کام یہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں خالق کے منصوبہ کو سمجھے۔ انسان کیوں پیدا ہوتا ہے۔ کیوں اس کو مختلف قسم کا سامان حیات دیا جاتا ہے۔ پھر کیوں ایسا ہے کہ ایک محدود مدت گزار کر ہر آدمی لازمی طور پر موت سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ سب کیوں ہے۔ زندگی کے اس نقشہ کی معنویت کیا ہے اور اس کا آخری انجام کیا ہے۔ کون سی روش کامیابی کی طرف لے جاتی ہے اور کون سی روش ناکامی کی طرف۔ ان باتوں کو جاننا ہر آدمی کا پہلا مسئلہ ہے، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل۔ غریب ہو یا امیر۔ کمزور ہو یا طاقتور۔ وہ اہم شخصیت ہو یا غیر اہم شخصیت۔ ہر حال میں اور ہر ایک کے لئے یکساں طور پر یہ سوال سب سے بڑا سوال ہے۔ اور اس سوال کا جواب معلوم کرنا اس کی سب سے پہلی ترجیح۔

ہر آدمی پر لازم ہے کہ وہ موت سے پہلے خالق کے منصوبۂ حیات کو جان لے۔ موت سے پہلے اس کو جاننا راہ عمل کو جاننا ہے اور موت کے بعد اس کو جاننا نتیجۂ عمل کو جاننا۔

فتح کے باوجود

مکہ پیغمبرؐ اسلام کا وطن تھا۔ مگر وہاں کے لوگوں نے آپ کو اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ ظلم اور تشدد اور سرکشی کی تقریباً ۲۰ سالہ تاریخ ہے جس سے آپ کو مجبورانہ طور پر گذرنا پڑا۔ آخر کار حالات بدلے اور رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہو گیا۔ جس شہر سے آپ مظلومانہ نکلے تھے اسی شہر میں آپ دوبارہ فاتحانہ داخل ہوئے۔

مگر اس وقت آپ کے دل کی جو کیفیت تھی وہ اس سے بالکل مختلف تھی جو دنیا کے عام فاتحین کے یہاں نظر آتی ہے۔ دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ مکہ میں داخلہ کے وقت آپ ایک اونٹ پر سوار تھے۔ حالت یہ تھی کہ آپ اس وقت سراپا تواضع بنے ہوئے تھے۔ اللہ کے غیر معمولی شکر کے احساس نے آپ کو جھکا دیا تھا۔ یہاں تک کہ آپ کی داڑھی اونٹ کے کجاوا کو چھونے لگی۔ (سیرت ابن ہشام ۴/ ۲۴)

روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں داخل ہو کر آپ کعبہ کے دروازہ پر کھڑے ہو گئے اور فرمایا: ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، اس نے اپنے وعدہ کو پورا کیا، اور اپنے بندے کی مدد فرمائی، اور مخالف گروہوں کو تنہا شکست دی (**لا اله الا الله وحده، لاشريك له ، صدق وعده ، ونصر عبده ، وهزم الاحزاب وحده**) صفحہ ۳۳

فتح وہ موقع ہے جب کہ لوگ خوشی مناتے ہیں، فخر کرتے ہیں، اپنی کامیابی کا جشن مناتے ہیں۔ مگر اس قسم کی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کی نظر اپنے آپ پر ہوتی ہے۔ جو فتح کو خود اپنا ایک کارنامہ سمجھتے ہیں۔ لیکن پیغمبر اسلام کی نفسیات اس سے بالکل مختلف تھی۔ ان کے لئے فتح کا واقعہ ان کا اپنا کارنامہ نہ تھا۔ وہ مکمل طور پر خدا کی طرف سے ظاہر ہونے والا ایک واقعہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایسا واقعہ جو بظاہر ان کا اپنا کارنامہ تھا، اس کو انھوں نے مکمل طور پر خدا کے خانہ میں ڈال دیا۔

ایک واقعہ

کہا جاتا ہے کہ شیخ حسن البنا ایک بار سابق شیخ الازہر الشیخ المراغی سے ملے۔ دونوں کے درمیان مسلمانوں کی حالت کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ شیخ مراغی نے کہا کہ ان کی لڑکی ٹرین سے سفر کر رہی تھی۔ اس دوران اس کی ملاقات غیر قوم کی ایک خاتون سے ہوئی۔ دونوں کے درمیان گفتگو ہوئی۔ غیر قوم کی خاتون نے ایک صحابی کا ذکر کیا اور بہت سی باتیں کیں۔ اس سے شیخ مراغی کی لڑکی کے اندر مذکورہ صحابی کے بارے میں جاننے کا زبردست شوق پیدا ہوا۔ سفر سے واپسی کے بعد لڑکی نے مذکورہ صحابی کے بارے میں کوئی کتاب مانگی۔ والد نے اپنی لڑکی سے کہا کہ میں لمبے عرصے سے صحابہ کرام اور ان کی تاریخ اور ان کے کارناموں کے بارے میں تم کو بتا رہا ہوں۔ مگر تم نے میری بات کو اہمیت نہ دی۔ یہاں تک کہ جب اجنبی قوم کی وہ خاتون آئی اور اس نے صحابی مذکور پر گفتگو کی تو تم نے اس کی بات کو بہت توجہ کے ساتھ سنا اور اس کی گفتگو نے تم کو متاثر کر لیا۔

شیخ مراغی نے یہ قصہ بیان کرنے کے بعد حسن البنا سے کہا، اے شیخ حسن، کیا ہم حق کو اس وقت مانیں گے جب تک دوسری قوم کے لوگ اس کو نہ مان لیں۔ کیسی عجیب بات ہے (اتو انا یا شیخ حسن لن نسلم حقاً الا إذا أسلم الاجنبی اولاً ، شیء عجیب)۔ الثقافۃ دیوبند ۱۹۸۳

اس واقعہ کو دیکھنے کے دو زاویے ہیں ایک تو یہ کہ اس کو غیرت قومی کی نظر سے دیکھا جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کو داعیانہ نظر سے دیکھا جائے۔ دونوں زاویے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ قومی غیرت کی نظر سے دیکھنے میں آدمی کے اندر وہی تاثر پیدا ہوگا جو شیخ مراغی کے جملہ میں نظر آتا ہے۔ لیکن داعیانہ نظر سے دیکھئے تو صورت حال بالکل بدلی نظر آئے گی۔ اب دیکھنے والا اس کو مسئلہ غیرت کے طور پر نہیں دیکھے گا بلکہ اس کو امکان دعوت کے طور پر دیکھے گا وہ کہے گا کہ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ غیر مسلموں میں اسلام کے مطالعہ کا نیا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ آؤ ہم اس شوق کو استعمال کریں اور اسلامی لٹریچر کو ساری دنیا میں پھیلا دیں۔

زبان کا استعمال

عربی کا ایک مقولہ ہے: عیّ صامت خیر من عیّ ناطق (خاموش عاجز بولنے والے جز سے بہتر ہے) یعنی ایک آدمی کو بولنا نہیں آتا اس بنا پر وہ چپ رہا، تو ایسا شخص اس آدمی سے تر ہے جس کے اندر بولنے کا سلیقہ نہ تھا اس کے باوجود وہ بولا اور بات کو بگاڑ دیا۔

اس حقیقت کو حدیث میں زیادہ بہتر طور پر اس طرح کہا گیا ہے کہ ـــــ جو شخص اللہ پر اور خرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اس کو چاہئے کہ بولے تو درست بات بولے ورنہ چپ رہے (من ان یومن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیرا او لیصمت) صحیح البخاری، کتاب الادب۔

بولنا اپنی ذمہ داری کا اظہار ہے۔ سچا بولنے والا وہ ہے جس کے ذمہ داری کے احساس نے ں کو بولنے پر مجبور کیا ہو۔ جس بولنے میں اس قسم کا جذبہ شامل نہ ہو وہ حقیقی معنوں میں بولنا ہیں ہے بلکہ خدا کی دی ہوئی صفت نطق کا بے جا استعمال ہے۔ اسلام میں جن چیزوں سے منع کیا یا ہے ان میں سے ایک اصراف ہے۔ یعنی خدا کی دی ہوئی چیزوں میں سے کسی چیز کو غیر ضروری ور پر خرچ کرنا۔ نطق بھی خدا کی ایک نعمت ہے۔ نطق کی صلاحیت کا مصرفانہ استعمال ایک ایسا ل ہے جس پر خدا کے یہاں سخت پکڑ کا اندیشہ ہے۔

اس قسم کے استعمال پر خدا کی طرف سے پکڑ کا اندیشہ ہے نہ کہ انعام کی امید۔ آدمی کو اگر قعۃً احساس ہو کہ نطق کی عظیم صلاحیت جو اس کو دی گئی ہے۔ وہ ایک مقصد خاص کے تحت دی گئی ہے اور وہ مقصد خاص یہ ہے کہ آدمی اپنی اس صلاحیت کو امر حق کے اظہار میں صرف کرے تو کبھی ہ غیر ذمہ دارانہ گفتگو کی غلطی نہیں کر سکتا۔ وہ بولے گا تو وہی بات بولے گا جو بولنے کے قابل ہے۔ ر اگر اس کے پاس بولنے کے قابل کوئی بات نہ ہو تو وہ چپ رہے گا، نہ کہ غیر ضروری طور پر بے ئدہ کلام کرنے لگے۔ بولنا اگر کام ہے تو چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ خدا کے یہاں اگر بولنے پر اجر ہے تو خدا اس انسان کو بھی اجر دے گا جس کے احساس ذمہ درای نے اس کو بولنے سے روک دیا۔

خاموش منصوبہ

ابو موسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ ایک بار ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک مہم پر
ہے تھے۔ راستہ میں کچھ لوگ بلند آواز سے اللہ اکبر پکارنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے سنا تو
ایا کہ اے لوگو، خاموشی کا طریقہ اختیار کرو۔ تم جس خدا کو پکار رہے ہو وہ بہرا یا غائب نہیں
۔ وہ تمہارے قریب ہے اور سب کچھ سنتا اور جانتا ہے (بخاری و مسلم)

اسی طرح ۹ھ میں جب آپ اپنے دس ہزار ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ سے مکہ کے لئے
نہ ہوئے تو آپ نے مکمل خاموشی اور رازداری کا طریقہ اختیار فرمایا جس کی تفصیلات سیرت
تابوں میں موجود ہیں۔ اس مہم کے دوران آپ نے جو طریقہ اختیار فرمایا وہ آپ کی اس دعا
الفاظ میں واضح طور پر جھلک رہا ہے۔ آپ نے دعا کرتے ہوئے کہا۔ اے اللہ، میری کوئی خبر
ش کو اس وقت تک پہنچنے نہ دے جب تک میں ان کی بستیوں میں داخل نہ ہو جاؤں۔

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ پیغمبر کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی مقصد کو حاصل کرنا
اس کی ساری منصوبہ بندی رازداری کے ساتھ ہونی چاہئے۔ فریق ثانی کے خلاف اقدام اس
ح کیا جانا چاہئے کہ اس کو صرف اس وقت خبر ہو جب کہ واقعہ عملاً ہو چکا ہو۔

ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا کہ رازداری سے مدد لو۔ یہ بے حد اہم ہدایت
۔ رازداری ایک مددگار ہتھیار ہے۔ جو لوگ اس پر امن ہتھیار کو استعمال کریں وہ ہمیشہ اپنے
ہ کی تکمیل میں کامیاب رہیں گے۔

یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ ایک لفظ میں اس کو خاموش منصوبہ کہا جا سکتا ہے۔ یعنی
غل کے طریقہ سے مکمل پرہیز کرتے ہوئے فریق ثانی تک اس طرح پہنچنا کہ پیشگی طور پر
واس کی اطلاع نہ مل سکے۔ اور اس کے لئے جوابی تیاری کرنا ممکن نہ رہے۔ یہی اس دنیا میں
ب کا واحد راز ہے۔

مشترک عمل

ایک کامیاب تاجر سے پوچھا گیا کہ دولت کمانے کا راز کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ دولت کمانے کا راز صرف آپ کا اپنا عمل نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ آپ دوسروں کو اپنے عمل میں ساتھ لے سکیں:

The secret of making money is not in working but in making others work for you.

یہ بلا شبہ ایک نہایت درست بات ہے۔ کوئی بھی شخص محض اپنے ذاتی عمل سے بہت بڑا کام نہیں کر سکتا۔ بڑے کام کے لئے ہمیشہ ضروری ہوتا ہے کہ بہت سے دوسرے افراد اس میں شریک ہو کر مشترک عمل کریں۔ انفرادی عمل سے چھوٹی کامیابی ملتی ہے اور مشترک عمل سے بڑی کامیابی۔

یہ اصول صرف دولت کمانے کا نہیں ہے بلکہ ہر معاملہ میں دینی اور عملی کام کے لئے بھی یہی اصول اتنا ہی درست ہے جتنا کہ دنیوی کام کے لئے۔ کوئی بڑا عملی منصوبہ، کوئی وسیع دعوتی نشانہ، کوئی ہمہ گیر دینی پروگرام اس کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا کہ اس کی تکمیل میں بہت سے لوگ اپنی صلاحیتوں کے ساتھ کامل طور پر جڑے ہوئے ہوں۔

یہ مشترک جدوجہد کس طرح ممکن ہوتی ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ اس کو ہر ایک کا ذاتی انٹرسٹ بنادیا جائے۔ آدمی اپنی فطرت کے اعتبار سے اسی کام میں اپنے آپ کو وقف کر سکتا ہے جس میں وہ ذاتی انٹرسٹ دیکھ رہا ہو۔ ذاتی انٹرسٹ کی کشش کے بغیر بہت سے لوگ کسی ایک نشانہ پر اپنے آپ کو جمع نہیں کر سکتے۔

دنیوی قسم کے کاموں میں یہ ذاتی انٹرسٹ مادی چیزوں کی صورت میں فراہم کیا جاتا ہے۔ دینی نوعیت کے کام میں یہ مقصد آخرت کے شعور کو بیدار کرنے سے حاصل ہوگا۔

مذہبِ امید

اسلام امید کا مذہب ہے۔ اسلام کی تمام تعلیمات امید اور حوصلہ کا سبق دیتی ہیں۔ بظاہر مشکل اور ناکامی اور محرومی جیسے حالات میں بھی اسلام انسان کو امید اور حوصلہ کا سبق دیتا ہے۔ وہ شام کے اندھیرے میں بھی صبح کی روشنی کی خوشخبری سناتا ہے۔ قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ: **وترجون من الله ما لا يرجون** (النساء ۱۰۴)۔ یعنی اور تم اللہ سے وہ امید رکھتے ہو جو امید وہ نہیں رکھتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک شخص جو اسلامی فکر کا حامل ہو وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو تاریکی میں روشنی دیکھتا ہے، جو وہاں بھی پر امید رہتا ہے جہاں دوسرے لوگ امید اور حوصلہ کھو بیٹھتے ہیں۔

اس معاملے میں اسلام اس حد تک جاتا ہے کہ اسلام میں مایوسی کو حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ قرآن میں ایک پیغمبر کی زبان سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ: **ولا تيئسوا من روح الله انه لا يايئس من روح الله الا القوم الكافرون ٥** (یوسف ۸۷) یعنی تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، اللہ کی رحمت سے صرف منکر ہی ناامید ہوتے ہیں۔ اس کے مطابق، اہل اسلام کے لئے کسی بھی حال میں جائز نہیں کہ وہ مایوس ہو جائیں۔ حالات بظاہر خواہ کتنے ہی زیادہ غیر موافق ہوں مگر اہل ایمان پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ آخر وقت تک پر امید بنے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں خودکشی کی موت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

سچائی کا یقین

موجودہ دنیا میں آدمی کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ اس یقین پر قائم ہو کہ اس نے سچائی کو پالیا ہے۔ وہ جس راستہ پر چل رہا ہے اس کے حق ہونے پر اسے کوئی شبہ نہ ہو۔ اس قسم کا یقین آدمی کی لازمی ضرورت ہے۔ یہی یقین آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان معتدل طور پر رہے۔ اس کو ذہنی سکون حاصل ہو۔ وہ رات کو اطمینان کی نیند سوئے اور دن کو

اعتدال کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے۔ اسلام آدمی کو یقین کی یہی نعمت عطا کرتا ہے۔

ایک پہاڑ یا ایک جانور کی یہ ضرورت نہیں کہ وہ دنیا میں اپنے وجود کا جواز تلاش کرے۔ مگر انسان فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ یہ جانے کہ وہ کیا ہے۔ اور وہ کس مقصد کے تحت دنیا میں پیدا کیا گیا ہے۔ اس کو ایک لفظ میں زندگی کا نظریہ (آئیڈیالوجی) کہا جاسکتا ہے۔

فلسفہ اس نظریۂ حیات کی تلاش کا علم ہے۔ مگر پانچ ہزار سال سے بھی زیادہ مدت کی تلاش کے باوجود ابھی تک فلسفہ اپنی تلاش کا جواب نہ پا سکا۔ فلسفہ اپنے آخری مرحلہ میں پہنچ کر انسان کو صرف تشکیک اور بے یقینیت دینے میں کامیاب ہوا ہے۔ فلسفہ کے بعد سائنس کا درجہ آتا ہے مگر سائنس نے پیشگی طور پر یہ مان لیا ہے کہ وہ حقیقت کا صرف جزئی علم دے سکتی ہے، کلی حقیقت تک پہنچنا سائنس کے لئے ممکن ہی نہیں۔

گویا سائنس نے خود ہی یہ اعلان کر دیا ہے کہ وہ مقابلہ کے میدان میں اترنے کی سرے سے اہل نہیں۔ اب آخری چیز جس سے اس معاملہ میں رجوع کیا جائے وہ مذہب ہے۔ یہاں بھی منظر زیادہ مختلف نہیں۔ بظاہر دنیا میں ایک درجن بڑے مذاہب پائے جاتے ہیں۔ مگر اسلام کے سوا تمام مذاہب کی حالت بلا استثناء یہ ہے کہ ان کو نہ علمی تائید حاصل ہے اور نہ تاریخی اعتباریت۔ ان مذاہب کی مقدس کتابیں تحریف کی بناء پر صحیح باتوں کے ساتھ غلط باتوں کا مجموعہ بن گئی ہیں۔

اسی طرح ان کے تاریخی حالات اتنے کم معلوم ہیں کہ خالص علمی اور عقلی اعتبار سے ان کی سچائی پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح یہ تمام مذاہب بھی عملی طور پر اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہ انسان کو وہ سچائی دے سکیں جس پر وہ کامل یقین کے ساتھ قائم ہو جائے۔

افکار کے اس جنگل میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو نہ صرف کامل سچائی کا حامل ہے بلکہ واقعاتی اعتبار سے وہ ایک ایسا مذہب ہے جس کی تاریخی اعتباریت میں کوئی شبہ نہیں۔

اسلام انسان کے لئے ایک نادر تحفہ ہے۔ اسلام ایک ایسا دین ہے جو غیر مشتبہ سچائی کا حامل ہے۔ جو کلی صداقت کا سرمایہ اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے۔ جو اپنی تاریخی نوعیت کے اعتبار سے اس

قابل ہے کہ انسان اس یقین کے ساتھ اس کو اختیار کر سکے کہ اس نے اس سچائی کو پالیا ہے جس کی تلاش اس کی فطرت میں پیشگی طور پر موجود تھی۔

اسلام ایک متلاشی روح کا حقیقی جواب ہے۔ وہ انسان کی شخصیت کی تکمیل ہے۔ وہ انسان کو وہ غیر متزلزل یقین دیتا ہے جس کے سہارے وہ دنیا میں زندہ رہ سکے۔ اسلام آدمی کی قبل از موت زندگی کو بھی با معنی بناتا ہے اور اس کی بعد از موت زندگی کو بھی۔

زندگی ایک قیمتی موقع

زندگی اگر صرف وہی ہے جو موجودہ دنیا میں ہر آدمی کو ملتی ہے تو بلا شبہ وہ اتنی زیادہ بے معنی ہے کہ اس سے زیادہ بے معنی چیز اور کوئی نہیں۔ انسان لا محدود صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ مگر دنیا میں وہ اپنی ان صلاحیتوں کا پانچ فیصد حصہ بھی استعمال نہیں کر پاتا کہ وہ مر جاتا ہے۔ انسان کے اندر تمناؤں اور آرزوؤں کی ایک کائنات بسی ہوئی ہے۔ مگر کوئی بھی شخص اپنی ان تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل اس دنیا میں نہیں کر پاتا۔ تمام موجودات اور مخلوقات میں انسان واحد مخلوق ہے جو مستقبل کا تصور رکھتا ہے۔ مگر تمام انسان ابھی اپنے حال میں ہوتے ہیں کہ ان کی دنیوی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے، بغیر اس کے کہ انھوں نے اپنے مستقبل کو پایا ہو۔ ہر انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے کامیاب زندگی کا حریص ہے، مگر یہاں کوئی بھی انسان اپنی کامیابی کو نہیں پاتا۔ بظاہر انسان کے لئے صرف یہ المناک انجام مقدر ہے کہ وہ اپنی کامیابی کی تاریخ بنانے سے پہلے اس دنیا سے چلا جائے۔

اسلام اس اندھیرے میں انسان کے لئے ایک روشنی ہے۔ اسلام کا جنت کا تصور آدمی کو یہ بتاتا ہے کہ کس طرح وہ اپنی ناکامی کو کامیابی سے بدلے۔ کس طرح وہ اپنے خوابوں کے اس مستقبل کا مالک بنے جہاں وہ اپنی شخصیت کی تکمیل (fulfillment) کو پا سکے۔

حقیقت کا یہ انکشاف جو اسلام کے ذریعہ کیا گیا ہے وہ ہر آدمی کے لئے زندگی کو ایک قیمتی موقع بنا دیتا ہے۔ اب ہر آدمی ایک مطلوب منزل دریافت کر لیتا ہے جس کی طرف وہ چل سکے۔

ہر آدمی ایک ایسے نشانہ کو جان لیتا ہے جس کو وہ اپنی تمام سرگرمیوں کا مرکز توجہ بنالے۔

دونوں حالتوں میں صبر

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **عجبت من قضاء الله عزوجل للمؤمن ان اصابه خير حمد و شكر وان اصابته مصيبة حمد ربه وصبر المومن يوجر في كل شيء** (مسند الامام احمد بن حنبل ۱/ ۱۷۳) یعنی مومن کے معاملے میں اللہ کا فیصلہ کیسا عجیب ہے۔ اگر اس کو بھلائی پہونچتی ہے تو وہ حمد کرتا ہے اور شکر کرتا ہے اور اگر اس کو کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ حمد کرتا ہے اور صبر کرتا ہے۔ اس طرح مومن کو ہر چیز میں اجر ملتا رہتا ہے۔

مومن سے مراد وہ انسان ہے جس کا شعور پوری طرح بیدار ہو چکا ہو جس کی سوچ اس حد تک ترقی کر چکی ہو کہ وہ ہر پیش آنے والی صورت حال پر مثبت جواب (positive response) دے سکے۔ وہ قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر حقائق کو دیکھنے والا بن چکا ہو۔ یہی وہ انسان ہے جس کا ذکر اوپر کی حدیث میں کیا گیا ہے۔

ایسے انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کو کوئی پسندیدہ چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ اس غلط فہمی میں نہیں پڑتا کہ یہ اس کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ خدا کے قائم کردہ نظام کی بنا پر ممکن ہوا ہے۔ یہ چیز اس کو حقیقت پسند بناتی ہے اور اس کو نظام خداوندی کا اعتراف کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اسی طرح اگر اس کو کوئی ناخوشگوار تجربہ پیش آئے تب بھی اس کا ترقی یافتہ شعور اس بات کی ضمانت بن جاتا ہے کہ اس کا ذہنی سکون نہ ٹوٹے۔ وہ فریاد یا شکایات کے بجائے صبر و تحمل کے ساتھ اس کا سامنا کرے۔

موجودہ دنیا میں یہ مزاج آدمی کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ اس کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ حالات کے اتار چڑھاؤ کے باوجود وہ ہمیشہ اعتدال پر قائم رہے۔ وہ ہر نہیں میں اپنے لئے ایک ہے کا راز دریافت کرلے۔ اس کی زندگی کبھی تعطل سے دوچار نہ ہو۔ اس کی امیدوں کا چراغ کبھی

بجھنے نہ پائے، وہ اس کو ہمیشہ روشنی اور حرارت دیتا رہے۔

دشمن میں دوست

قرآن کی سورہ نمبر ۴۱ میں ارشاد ہوا ہے ـــــ اور اس سے بہتر کس کی بات ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔ (حم السجدہ ۳۳۔۳۴)

کسی سے دشمنی ہو جائے یا کسی آدمی کو ایک شخص اپنا دشمن نظر آئے تو اس کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ یہ میرا دشمن ہے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کو تباہ کر دیا جائے۔ مگر اسلام ایسے معاملہ میں بھی ایک امید افزا پہلو کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ تمہارے دشمن کے اندر تمہارا ایک دوست چھپا ہوا ہے۔ اس دوست کو دریافت کرو، اور پھر تمہارا دشمن تمہارا قریبی ساتھی بن جائے گا۔

دوستی یا دشمنی کوئی پیدائشی صفت نہیں۔ کوئی آدمی پیدائشی طور پر کسی کا دشمن نہیں ہوتا۔ اگر ایک شخص آپ کو اپنا دشمن نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ یہ اس کی ایک مصنوعی حالت ہے۔ آپ اپنے میٹھے بول اور اپنے حسن سلوک سے اس کو ایک نیا انسان بنا سکتے ہیں۔ آپ اپنے دوستانہ عمل سے اس کو اس حد تک بدل سکتے ہیں کہ آپ کے خلاف اس کی ضد اور نفرت ختم ہو جائے۔ جو شخص اب تک بظاہر آپ کا غیر بنا ہوا تھا وہ آپ کا اپنا بن جائے۔

یہ ہر انسان کے لئے ایک عظیم خوشخبری ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں بہتر امکانات کی فہرست اتنی لمبی ہے جو دشمن تک کو دوست کے خانہمیں درج کئے ہوئے ہے۔ یہ اسلامی تعلیم آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ کانٹے کو بھی پھول کے روپ میں دیکھے، وہ مخالف انسان میں بھی اپنا ایک موافق انسان پا لے۔ یہ خود فطرت کا ایک اٹل قانون ہے نہ کہ سادہ طور پر محض ایک مذہبی عقیدہ۔

صبر کا فائدہ

ایک حدیث قدسی کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **إذا ابتلیت عبدی بحبیبتیه فصبر عوضته منهما الجنة** (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱۰/۱۲۰) یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب میں اپنے کسی بندے کو اس کی دو محبوب چیزوں سے آزماتا ہوں اور وہ اس پر صبر کرتا ہے تو میں اس کو اس کے بدلے جنت دے دیتا ہوں۔ راوی کہتے ہیں کہ دو محبوب چیزوں سے مراد دو آنکھیں ہیں۔

دو آنکھوں کی محرومی پر صبر کا جو انعام کسی کو خدا کی طرف سے ملتا ہے اس کا تعلق صرف جنت سے نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے انسان کا انعام موجودہ دنیا ہی سے شروع ہو جاتا ہے جس کی آخری اور تکمیلی صورت یہ ہے کہ اس کو جنت میں داخلہ مل جائے۔ ایسا انسان دنیا میں نابینا ہونے کے باوجود کامیاب رہتا ہے اور آخرت میں مزید اضافہ کے ساتھ بینا بھی اور کامیاب بھی۔

دونوں آنکھوں کی محرومی پر جب ایک آدمی صبر کر لے تو اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ اس کی اندرونی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اس کی داخلی شخصیت میں ایک نیا نفسیاتی عمل شروع ہو جاتا ہے جو اس کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کر دیتا ہے۔ اس کے دماغ کی وہ مخصوص کھڑکیاں کھل جاتی ہیں جو خالق فطرت نے صرف اس لئے اس کے اندر رکھی ہیں تاکہ وہ ایمر جنسی کے وقت اس کے کام آئیں۔

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسان کے دماغ میں بہت سے خانے ایسے ہیں جو عام حالات میں بالکل بند رہتے ہیں۔ وہ صرف اس وقت کھلتے ہیں جب کہ انسان کسی ہنگامی حالت سے دوچار ہو جائے۔ صبر انھیں بند دروازوں کو کھولنے کی کنجی ہے۔ ایسے حادثے کے موقع پر جو لوگ غم اور فریاد کا شکار ہو جائیں، ان کے دماغ کے یہ ہنگامی خانے بدستور بند پڑے رہیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ ایسے موقع پر صبر کا مثبت رسپانس (positive response) دیں وہ فطرت

کو اپنا عمل کرنے کا موقع دیتے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ظاہری آنکھوں سے محروم ہو کر وہ داخلی آنکھوں کی صورت میں اس کا بدل پالیتے ہیں۔

راقم الحروف نے خود اپنی زندگی میں کئی ایسے افراد کو دیکھا ہے۔ مثال کے طور پر بھوپال کے جناب الطاف احمد صاحب طویل عرصے سے بینائی سے محروم ہیں مگر وہ اپنے تمام کام معمول کے مطابق اور کامیابی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ اسی طرح امریکہ کے ایک سفر میں میری ملاقات ڈاکٹر ایوب لبنانی سے ہوئی۔ وہ ٹمپل ٹن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور اپنے تمام کام بالکل معمول کے مطابق انجام دیتے ہیں۔ حتی کہ مشین کی مدد سے وہ کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔

آنکھ انسان کی تمام قیمتی چیزوں میں سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ جب آنکھ جیسی قیمتی چیز سے محرومی پر صبر سے انسان کو نئی زندگی ملتی ہے تو دوسری محرومیوں پر صبر سے بدرجہ اولیٰ اس کو یہ چیز حاصل ہو گی۔ صبر ایک ایسی نعمت ہے جو کسی انسان کی ہر محرومی میں اس کا مددگار ہے۔ صبر کسی انسان کے لئے کھونے کو دوبارہ پانا بنا سکتا ہے۔

موت خاتمہ حیات نہیں

موجودہ دنیا میں انسان کے ساتھ جو حادثات پیش آتے ہیں ان میں سب سے بڑا حادثہ موت کا حادثہ ہے۔ موت ہر شخص کی زندگی میں ایک ایسا فیصلہ کن زلزلہ ہے جس سے بچنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ کوئی بھی تدبیر اتنی طاقتور نہیں جو موت کو ٹالنے میں کار آمد ہو سکے۔ موت کا شکار ہر آدمی لازمی طور پر ہوتا ہے خواہ وہ غریب ہو یا امیر، خواہ وہ بے زور ہو یا زور آور۔

یہی وجہ ہے کہ ہر دور کا انسان موت کے بارے میں انتہائی سنجیدگی سے سوچتا رہا ہے۔ موت کی یاد ہر آدمی کی خوشیوں کے چراغ کو بجھادیتی ہے۔ ہر آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا پیدا کرنے والے نے مجھ کو اسی لئے پیدا کیا تھا کہ میں چند سال زندہ رہ کر ختم ہو جاؤں، ایک محدود مدت دنیا میں گزار کر اس طرح یہاں سے جاؤں کہ میری کوئی بھی کامیابی موت کے اس

سفر میں میرے ہمراہ نہ ہو۔

اس معاملے میں اسلام ہر انسان کے لئے امید کا ایک چراغ ہے۔ اسلام کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا جو تخلیقی منصوبہ انسان پر منکشف کیا ہے وہ بتاتا ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں، موت دراصل ایک درمیانی وقفہ ہے جس کے بعد آدمی اپنے اگلے مرحلۂ حیات میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس دوسرے مرحلۂ حیات میں انسان اسی طرح ایک زیادہ کامل اور وسیع دنیا میں جئے گا جس طرح وہ موجودہ دنیا میں نسبتاً بہت مختصر اور کمتر زندگی گزار رہا تھا۔

اسلام کے ذریعہ یہ خبر جو انسان کو دی گئی ہے وہ ہر مرد و عورت کے لئے زندگی کا نیا پیغام ہے۔ اس خبر کی صورت میں آدمی اس امکان کو دریافت کرتا ہے کہ وہ اگلی دنیا کے قوانین کو جانے اور اس کے مطابق زندگی گزارے تاکہ وہ موت کے بعد دوبارہ ایک نئی اور زیادہ بہتر زندگی پالے۔ اس تخلیقی منصوبہ سے بے خبری انسان کو اپنی زندگی کے بارے میں مایوسی میں مبتلا کرتی ہے۔ مگر جب وہ اس تخلیقی منصوبہ کو جان لے تو اس کے بعد اس کے سامنے زندگی کا نیا وسیع تر دروازہ کھل جاتا ہے۔ وہ بظاہر اپنی محرومی میں ایک نئی یافت کا راز پا لیتا ہے۔

ایک انوکھی خوشخبری

قرآن کی سورۃ نمبر ۳۹ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''تم کہہ دو کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔'' (الزمر ۵۳)

قرآن کی یہ آیت انسان کے لئے ایک عظیم خوشخبری ہے۔ موجودہ دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے ہر آدمی سے طرح طرح کی کوتاہیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ ان گناہوں کا انجام اگر لازمی طور پر بھگتنا ہو تو انسان کے لئے زندگی کتنی بڑی مصیبت بن جائے۔ مگر خدا کی کتاب انسان پر یہ راز کھولتی ہے کہ اس کے لئے اس معاملہ میں مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔

گناہوں سے معافی کا یہ راز کیا ہے۔ وہ ہے گناہ پر شرمندگی اور اللہ کی طرف دوبارہ رجوع

کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح کچھ اعمال کو گناہ قرار دیا ہے اسی طرح اس نے اس دنیا میں امکان بھی رکھ دیا ہے کہ گناہ سرزد ہونے کے بعد آدمی اپنے کو اس سے پاک وصاف کر سکے۔ وہ خدا کی دنیا میں ایک بے گناہ انسان کی حیثیت سے داخل ہو۔

قرآن کی ایک اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے انسان کے لئے یہ عجیب امکان بھی رکھا ہے کہ اس کا گناہ بدل کر اس کے لئے نیکی بن جائے (الفرقان ۷۰)۔ وہ اس طرح کہ گناہ کے بعد جب آدمی شرمندہ ہوتا ہے اور گریہ وزاری کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع ہوتا ہے تو یہ گویا ایک ایسا واقعہ ہوتا ہے جب کہ اس کا گناہ اس کے لئے ایک نیکی کا سبب بن گیا۔ ابتداءً اگر وہ خدا سے دور ہوا تھا تو بعد کے مرحلہ میں وہ خدا سے اور زیادہ قریب ہو گیا۔ اس کی یہ روش خدا کو اتنا زیادہ پسند آتی ہے کہ اس کے گناہ کو بھی نیکی کے خانہ میں لکھ دیا جاتا ہے۔

خدا کا یہ قانون جو قرآن کے ذریعہ کھولا گیا ہے انسان کے لئے ایک عجیب نعمت ہے۔ وہ انسان کے لئے لازوال تسکین کا سرمایہ ہے۔

قناعت ایک نعمت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **قد افلح من أسلم ورزق کفافاً وقنعه الله بما آتاه** (مسند الامام احمد ۲/۱۶۸) یعنی وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اسلام قبول کیا اور اس کو بقدر ضرورت روزی ملی اور اللہ کی توفیق سے وہ اس پر قانع رہا جو اللہ نے اس کو دیا تھا۔

موجودہ دنیا میں ہمیشہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان اونچ نیچ رہتی ہے۔ اس بنا پر اکثر انسان سکون سے محروم زندگی گزارتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کو دیکھتے رہتے ہیں جن کو ان سے زیادہ ملا ہوا ہے۔ اس طرح وہ مسلسل طور پر ایک قسم کی حسرت کی نفسیات میں مبتلا رہتے ہیں اور اسی حال میں مر جاتے ہیں۔

اس کا حل اسلام میں قناعت بتایا گیا ہے۔ قناعت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ ملے

ہوئے پر مطمئن رہے اور نہ ملے ہوئے کے غم میں اپنے آپ کو ہلکان نہ کرے۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق دنیا میں ہر ایک کو وہی ملتا ہے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ جس آدمی کو کم ملا وہ بھی خدا کے حکم سے تھا اور جس کو زیادہ ملا وہ بھی خدا کے حکم سے تھا۔

یہ عقیدہ آدمی کو ابدی سکون عطا کرتا ہے۔ وہ اس یقین میں جینے لگتا ہے کہ اس کو جو کچھ ملا وہ اتفاقاً نہیں تھا بلکہ یہ عین وہی ہے جو خود اس کی بہتری کے لئے اس کو ملنا چاہئے تھا۔ اگر ایک شخص کو بظاہر دنیا کا رزق کم ملا ہے تو یہ اس کے حق میں خدا کی ایک عظیم مہربانی ہے۔ اس طرح خدا چاہتا ہے کہ وہ شخص ظاہری ساز و سامان میں زیادہ مصروف نہ ہو سکے۔ وہ خارجی ظواہر سے بلند ہو کر معنوی حقائق میں زیادہ سے زیادہ مشغول ہو۔

مادّی چیزوں میں کم پر راضی ہونے کا نام قناعت ہے۔ اسی طرح مادی چیزوں میں زیادہ کا طالب بننے کا نام حرص ہے۔ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ جو آدمی قناعت کی روش پر قائم ہو اس پر ہر قسم کے علمی دروازے کھلتے چلے جائیں گے، اس پر معرفت اور روحانیت کی بارشیں ہوں گی۔ اس کے برعکس جو آدمی حرص و ہوس کا طریقہ اختیار کرے وہ ظواہر کی محدود دنیا میں گم ہو کر رہ جائے گا۔ حقائق کی وسیع تر دنیا اس کی دسترس سے باہر ہو گی۔ وہ ایک خوشنما حیوان کی طرح زندگی گزارے گا، وہ انسانیت کا اعلیٰ درجہ پانے سے محروم رہے گا۔

کم پر قناعت کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ جو آدمی مادّی چیزوں میں کم پر راضی ہو جائے وہ گویا غیر مادّی چیزوں میں اپنے آپ کو زیادہ کا مستحق بنا رہا ہے۔ وہ غیر اہم چیزوں میں پیچھے کی سیٹ کو قبول کر کے زیادہ اہم چیزوں میں آگے کی سیٹ پر اپنے لئے زیادہ بہتر جگہ حاصل کر رہا ہے۔

تکلیف میں راحت

پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: **مایصیب المسلم من نصب ولا وصب ولا هم ولاحزن ولا اذى ولاغم — حتى الشوكة يشاكها — الا كفّر الله بها من خطاياه**

(فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱۰؍۱۰۷) یعنی جب بھی کسی مسلم پر کوئی تھکان یا درد یا رنج یا حزن یا تکلیف یا غم پہنچتا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی کانٹا بھی چبھتا ہے تو اللہ ضرور ان مصیبتوں کو اس کی خطاؤں کے لئے کفارہ بنا دیتا ہے۔

یہاں مسلم سے مراد وہ انسان ہے جس کو حقیقت کی پہچان ہو گئی ہو۔ جو چیزوں کو اس کے صحیح رخ سے دیکھنے کے قابل ہو جائے، جو خدا کی خدائی کو دریافت کرلے اور اسی کے ساتھ انسان کی انسانیت کو بھی۔

ایسا انسان اپنی حقیقت شناسی کی بنا پر وہ انسان بن جاتا ہے جو ہر آنے والی صورت حال کا صحیح جواب (response) دے سکے۔ ایسے انسان پر جب کوئی چھوٹی یا بڑی مصیبت آتی ہے تو وہ اس کی سوچ کو جگانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ایسے تجربات کے درمیان وہ اپنے عجز کو دریافت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصیبت کے وقت فریاد اور شکایات کرنے کے بجائے وہ قادر مطلق خدا کو یاد کرنے لگتا ہے۔ ان تجربات کے درمیان وہ اپنی حیثیت واقعی کا ادراک کرلیتا ہے۔

اس معاملے کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مسلم وہ ہے جو زندگی کے تلخ تجربات کو منفی معنوں میں لینے کے بجائے ان کو مثبت معنوں میں لے سکے۔ مسلم انسان کی یہ صفت اس کے لئے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی اصلاح کا محرک بن جاتی ہے۔ دنیا کی ہر ٹھوکر اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے معاملے پر از سر نو غور کرے۔ وہ اپنا احتساب آپ کرنے لگے۔ اصلاحِ خویش کے اس عمل کا دینی نام کفارہ ہے۔

اسلام کا یہ اصول انسان کے لئے ایک عظیم خوش خبری ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو بار بار مختلف قسم کی مصیبتیں پیش آتی ہیں۔ آدمی اگر باشعور نہ ہو تو دنیا کی مصیبت اس کے لئے صرف مصیبت یا تکلیف ہو گی، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ مگر جو انسان صاحب معرفت ہو، جس کے ایمان نے اس کو باشعور بنا دیا ہو وہ اس پوزیشن میں ہو جاتا ہے کہ اپنی تکلیف کو بھی راحت بنا سکے، اپنے نہیں کو ہے میں تبدیل کر سکے۔ وہ کھونے کو بھی اپنے لئے پانا بنا لے۔

اسلام کا یہ تصور انسان کے لئے ایک عظیم نعمت ہے، وہ تکلیف کے احساس کو بھی راحت کے احساس میں بدل دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی پر جب کوئی چھوٹی یا بڑی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کبھی گھبراہٹ میں مبتلا نہیں ہوتا۔ ہر مصیبت کے موقع پر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس مصیبت نے میری زندگی کی کسی غلطی کو میرے اعمال کے ریکارڈ سے مٹادیا۔ مجھے قصوروار انسان کے مقام سے اٹھا کر بے قصور انسان کی صف میں پہونچادیا۔

توکل اور اعتماد

اسلام کی ایک اہم تعلیم وہ ہے جس کو توکل علی اللہ کہا جاتا ہے۔ یعنی ہر حال میں اللہ کے اوپر بھروسہ رکھنا، اللہ کی رحمت سے کبھی ناامید نہ ہونا، قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ "اور تم اللہ پر توکل کرو، اور اللہ کارساز ہونے کے لئے کافی ہے (الاحزاب ۳) دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ تم اللہ پر توکل کرو اگر تم مومن ہو۔ (المائدہ ۲۳) اسی طرح قرآن میں اہل حق کی زبان سے کہا گیا ہے کہ "اور جو تکلیف تم ہمیں دوگے ہم اس پر صبر کریں گے، اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے"۔ (ابراھیم ۱۲) اسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ تم اس طرح کہو کہ "اللہ میرے لئے کافی ہے، بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ (الزمر ۳۸)

توکل کا عقیدہ امید اور یقین کا لازوال سرچشمہ ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کو یہ یقین عطا کرتا ہے کہ جہاں تمہاری کوششوں کی حد آجائے وہاں ایک اور ہستی تمہاری مدد کے لئے موجود رہتی ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ جہاں معلوم اسباب ختم ہو گئے ہوں وہاں نامعلوم اسباب کا کبھی نہ ختم ہونے والا ذریعہ تمہارا ساتھ دینے کا انتظار کر رہا ہے۔ جہاں تم اپنی طاقت سے کامیاب نہیں ہو سکتے وہاں تمہارا خدا اپنی لامحدود طاقتوں کے ساتھ تم کو کامیاب بنانے کے لئے موجود ہے۔

توکل کا یہ عقیدہ اہل ایمان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ وہ آدمی کو یہ یقین عطا کرتا ہے کہ بظاہر حوصلہ شکن حالات میں بھی اس کا حوصلہ نہ ٹوٹے۔ بظاہر ناامیدی کے طوفان میں بھی وہ اپنی

امید کو بر قرار رکھے۔

اس پہلو سے غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ ایک شخص کا اسلام کے عقیدہ پر کھڑا ہونا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ اٹل حوصلہ کی زمین پر کھڑا ہونا ہے۔ یہ ناقابلِ شکست عزم کی چٹان پر کھڑا ہونا ہے۔ یہ ایک ایسی برتر امید پر کھڑا ہونا ہے جو طوفانی حالات میں بھی آدمی کو مایوسی سے بچائے رکھے۔ جو اس کو ہر حال میں عزم وہمت کا پیکر بنائے رہے۔

ناخوش گواری میں خوش گوار پہلو

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں فطرت کا ایک قانون ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **وعسی ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم وعسی ان تحبّوا شیئاً و ھو شر لکم واللہ یعلم و انتم لاتعلمون ٥** (البقرۃ ۲۱٦) یعنی ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے لئے بھلی ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لئے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

انسان ایک ایسی دنیا میں جیتا ہے جہاں اس کے سوا بے شمار دوسرے اسباب ہیں جو رات دن اپنا کام کر رہے ہیں۔ موجودہ دنیا میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ زیادہ تر انھیں خارجی اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس بنا پر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جو اس کی خواہش یا اس کے اپنے منصوبہ کے خلاف ہو۔ اگر آدمی زیادہ باشعور نہ ہو تو وہ ایسے واقعات کو دیکھ کر گھبرا جائے گا۔ وہ اپنے کو ایک مصیبت زدہ یا ناکام انسان سمجھ لے گا۔

قرآن کے مذکورہ بیان میں ایسے انسان کے لئے ایک عظیم رہنمائی ہے۔ یہ رہنمائی انسان کو ایک مستقل سکون عطا کرتی ہے۔ وہ انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ مصیبت کے لمحات میں بھی یہ سوچ کر مطمئن رہے کہ اس مصیبت میں بھی یقیناً راحت کا کوئی پہلو چھپا ہوا ہو گا۔ وہ انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ مشکل لمحات میں بھی وہ انتظار کی پالیسی اختیار کرے۔ وہ اپنے ناخوشگوار حال میں ایک خوشگوار مستقبل کا منظر پیشگی طور پر دیکھنے لگے۔

ایسا انسان اپنے اس مزاج کی بنا پر ایک بے پناہ انسان بن جاتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت یا اپنے وجود کا کوئی حصہ بے فائدہ طور پر ضائع نہو نے دے۔ وہ اس المناک انجام سے محفوظ رہے کہ ایک ناخوشگوار صورت حال سے متاثر ہو کر وہ اپنے آپ کو ہلاک کرلے، حالانکہ آئندہ آنے والے حالات اس کے لئے ایسی خبریں لائیں جو عین اس کے حق میں ہوں اور مزید اضافے کے ساتھ ٹھیک وہی ہو جس کو وہ اپنے لئے چاہ رہا تھا۔

کمزور اور طاقتور

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص کے یہاں دو بھائی تھے۔ ایک بھائی گھر کا کاروبار سنبھالتا تھا اور دوسرا بھائی دینی کاموں میں مصروف رہتا تھا۔ پہلے بھائی نے رسول اللہ ﷺ سے دوسرے بھائی کی شکایت کی اور کہا کہ وہ گھر کے کاروبار میں حصہ نہیں لیتے۔ آپ نے فرمایا کہ شاید تم کو اُسی کی وجہ سے روزی مل رہی ہو۔ (**لعلك ترزق به**) اسی طرح ایک اور روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: **إنماتنصرون و ترزقون بضعفائکم** (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۶/۱۰۵۔ ۱۰۴) یعنی تم کو جو مدد ملتی ہے یا جو رزق ملتا ہے وہ صرف تمہارے کمزوروں کی وجہ سے ملتا ہے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ہر گھر میں اور ہر سماج میں ایسے افراد ہوتے ہیں جو بظاہر کمزور ہوتے ہیں، ترقیاتی سرگرمیوں میں بظاہر ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ ایسے افراد عام طور پر گھر میں بھی اور سماج میں بھی حقیر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کو اجتماعی زندگی میں عزت کا مقام نہیں ملتا۔ ایسے لوگ خود بھی مایوسی کا شکار رہتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی ان کو شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک بوجھ سمجھ لیتے ہیں نہ کہ اپنے حق میں کوئی مفید اثاثہ۔

ایسے حالات میں مذکورہ اسلامی تعلیم ایک عظیم سماجی نعمت ہے۔ یہ تعلیم بتاتی ہے کہ خدائی منصوبے کے مطابق، سماج کی ترقیاتی سرگرمیوں میں ان کمزوروں کا بھی ایک عظیم حصہ ہے۔ کسی سماج میں ان کا وجود خدا کی رحمتوں کو اس کی طرف مائل کرنے کا سبب بنتا ہے۔ بظاہر نہ کرنے کے

باوجود وہ سماج میں بہت بڑی خدمت انجام دیتے ہیں۔

یہ سادہ طور پر صرف ایک اخلاقی تعلیم نہیں، یہ فطرت کا اٹل قانون ہے، یہ خداوند عالم کا تخلیقی منصوبہ ہے۔ اس حقیقت کا شعور جب کسی سماج کے افراد میں پیدا ہو جائے تو ایسا سماج اپنے کمزوروں کے بارے میں آخری حد تک مہربان ہو جائے گا۔ وہ اپنے کمزوروں کو اپنے معاملات میں برابر کا حصہ دار سمجھے گا نہ کہ محض ایک بے فائدہ بوجھ۔

مشکل میں آسانی

قرآن کی سورہ نمبر ۹۴ میں بتایا گیا ہے کہ ــــــ پس مشکل کے بعد آسانی ہے... بے شک مشکل کے بعد آسانی ہے (الانشراح ۵۔۶) ان الفاظ میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے جس کو خدا نے ابدی طور پر پوری دنیا میں قائم کر رکھا ہے۔ آدمی خواہ کسی بھی ملک میں ہو، خواہ وہ کسی بھی زمانے میں ہو، خواہ وہ کسی بھی حالت میں ہو، ہر جگہ اور ہر حال میں وہ فطرت کے اس قانون کو کارفرما پائے گا۔

موجودہ دنیا اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں کسی بھی شخص کے لئے ہمیشہ یکساں حالات نہیں ہوتے۔ مگر قرآن میں بیان کردہ مذکورہ فطری قانون بتاتا ہے کہ کسی بھی حال میں انسان کو بددل یا پست ہمت نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں کہ خود خالق عالم کے قائم کردہ اصول کی بنا پر ہر ناموافق صورت حال میں ایک موافق امکان چھپا ہوا ہے۔

مثلاً ایک شخص کا باپ اس کی کم عمری میں انتقال کر جائے تو یہ بظاہر اس کے لئے ایک ناموافق بات ہے۔ مگر اس حادثے کا موافق پہلو یہ ہے کہ باپ کے سائے سے محرومی اس کے اندر خود اعتمادی کی صفت جگانے والی ثابت ہو گی۔ ایک شخص غریب گھر میں پیدا ہو تو بظاہر یہ محرومی کی بات ہے مگر اس کا روشن پہلو یہ ہے کہ ایسا آدمی اپنے حالات کی بنا پر زیادہ محنت کرے گا اور زیادہ بڑی کامیابی حاصل کرے گا، وغیرہ۔

اسی طرح ہر مشکل، ہر محرومی اور ہر حادثے میں ہمیشہ ایک نیا اور بہتر امکان چھپا ہوتا

ہے۔ناموافق حالات چیلنج بن کر آدمی کو جھنجھوڑتے ہیں۔ وہ اس کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کرتے ہیں۔ اس طرح ہر ناموافق جھٹکا آدمی کے لئے ترقی کا زینہ بنتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ معمولی انسان سے اوپر اٹھ کر غیر معمولی انسان بن جاتا ہے۔

خوبی تلاش کرو

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا یفرك مومن مومنة ان کرہ منھا خلقا رضی منھا آخر** (مسند الامام احمد بن حنبل ۲/۳۲۹) یعنی کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے بغض نہ رکھے، اگر اس کے اندر کوئی ناپسندیدہ خصلت ہو گی تو اسی کے ساتھ اس کے اندر کوئی پسندیدہ خصلت بھی موجود ہو گی۔ اس حدیث میں مومن اور مومنہ سے مراد مومن شوہر اور مومن بیوی ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا تخلیقی نظام ہے کہ کسی ایک مرد اور عورت کو تمام انسانی خوبی نہیں دی جاتی۔ ایک مرد اگر جسمانی حیثیت سے زیادہ طاقت ور ہو تو وہ دماغی صلاحیت کے اعتبار سے کم ہو گا اسی طرح اگر کوئی مرد دماغ کے اعتبار سے غیر معمولی صلاحیت کا حامل ہو تو وہ جسم کے اعتبار سے ایک کمزور انسان ہو گا۔ اسی طرح ایک عورت کو اگر صورت کے اعتبار سے زیادہ حصہ ملا ہو تو سیرت کے اعتبار سے وہ زیادہ خصوصیات کی حامل نہ ہو گی۔ اور اگر وہ سیرت میں ممتاز ہو تو صورت کے اعتبار سے وہ کوئی ممتاز خاتون نہ ہو گی۔ اس میں استثناء ہو سکتا ہے مگر عام اصول یہی ہے۔ فطرت کا یہی اصول ہے جس کی طرف مذکورہ حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ ایک ایسا اصول ہے جس میں ہر شادی شدہ جوڑے کے لئے کامیابی کا راز موجود ہے۔ شادی شدہ زندگی کی ناکامی کا سبب اکثر حالات میں یہ ہوتا ہے کہ زوجین میں سے کوئی ایک دوسرے کو بظاہر اپنی مرضی کے مطابق نہیں پاتا اس لئے وہ اس سے بددل ہو جاتا ہے۔ مگر مذکورہ اصول کے مطابق، اس بددلی کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ فریق ثانی فی الواقع ویسا ہی ہے جیسا کہ فریق اول اس کو سمجھ رہا ہے۔ اس طرح کے معاملے میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ فریق اول کی رائے

یک طرفہ ہوتی ہے۔ وہ فریق ثانی کی شخصیت کے ایک پہلو کو دیکھ کر اس سے بیزار ہو جاتا ہے حالانکہ اگر وہ فریق ثانی کے دوسرے پہلو کو دیکھے تو اس کے بارے میں اس کی رائے بالکل بدل جائے۔

مثال کے طور پر ایک شوہر اپنی بیوی کو ظاہری خصوصیات میں کم پاتا ہے اور اس بنا پر وہ اس کو ناپسند کرنے لگتا ہے۔ لیکن اس کو جاننا چاہئے کہ یہی اس کی بیوی کی کل شخصیت نہیں، عین ممکن ہے کہ ظاہری کمی کے باوجود اس کی شخصیت میں اندرونی اخلاقی صفات بہت زیادہ موجود ہوں۔ اور یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ کسی خاتون کے اندر سیرت و کردار کے اعلیٰ اوصاف ہونا خاندانی زندگی کے لئے زیادہ اہم حیثیت رکھتا ہے۔

فطرت کا نظام

قرآن کی سورہ نمبر ۹۰ میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بیان ہوا ہے کہ: **لقد خلقنا الانسان فی کبد** (ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے) اسی طرح قرآن میں دوسری جگہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کے بارے میں پیشگی طور پر یہ بتادیا تھا کہ دنیا میں تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔ **بعضکم لبعض عدو** (البقرہ ۳۶)

قرآن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تکلیف (suffering) موجودہ دنیا کا ایک لازمی حصہ ہے۔ یہ خود خالق فطرت کا مقرر کیا ہوا نظام ہے۔ اس لئے اس کو ختم کرنا کسی کے لئے ممکن نہیں۔ یہ انسانیت کے نام قرآن کا ایک عظیم فکری تحفہ ہے۔ انسان اگر اس راز کو نہ جانے تو وہ غیر حقیقت پسند بنا رہے گا، وہ غیر ضروری طور پر ہمیشہ یہ کوشش کرے گا کہ وہ اپنے لئے ایک بے مشقت دنیا یا خرابیوں سے پاک سماج (evil-free society) بنا سکے۔ مگر ساری کوشش کے باوجود وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو گا۔ کیوں کہ فطرت کے قانون کے مطابق ایسا ہونا ممکن نہیں۔ مگر جب وہ اس حقیقت کو جان لے گا تو وہ مسائل کے ساتھ جینے کی کوشش کرے گا اور پھر وہ اسی طرح اپنی پسند کی ایک دنیا بنا لے گا جس طرح ایک درخت کانٹوں کے باوجود پھولوں اور پتیوں کے

ذریعہ اپنی ایک پرکشش دنیا بنالیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے مسائل انسان کے لئے مصیبت نہیں۔ وہ انسان کے لئے ترقی کا زینہ ہیں۔ یہ مسائل انسان کو بیدار کرتے ہیں۔ وہ اس کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو حرکت میں لاتے ہیں۔ وہ اس کے جمود کو توڑ کر اس کو مسلسل طور پر زندہ رکھنے کی ضمانت ہیں۔

مسائل زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ مزید یہ کہ وہ ایک مفید حصہ ہیں نہ کہ کوئی مضر حصہ۔ جو لوگ اس حقیقت کو جان لیں وہ بے فائدہ چیزوں میں اپنی طاقت کو ضائع نہیں کریں گے۔ وہ زندگی کی اعلیٰ تعمیر میں یقینی طور پر کامیاب رہیں گے۔

اقلیت کے لئے خوشخبری

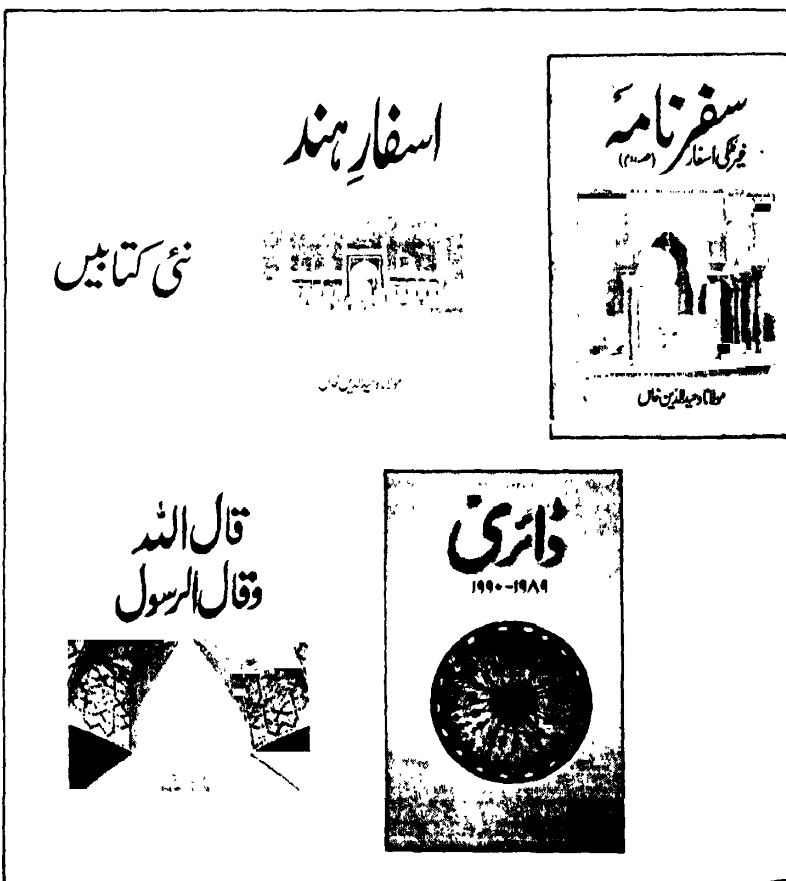
قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: **کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله والله مع الصابرين** (البقرۃ ۲۴۹)۔ یعنی کتنے ہی چھوٹے گروہ ہیں جو بڑے گروہ پر غالب آئے ہیں، اللہ کے اذن سے، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

قرآن کی اس آیت میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے، اس قانون کے مطابق اس دنیا میں عددی اکثریت والا گروہ اگر بظاہر برتر دکھائی دیتا ہے تو عددی اقلیت والا گروہ امکانی طور پر اس سے بھی زیادہ برتر حیثیت رکھتا ہے۔ اس دنیا میں فطرت کا قانون اکثریت سے زیادہ اقلیت کے حق میں ہے۔ اس آیت میں اقلیتی گروہ کے لئے یہ خوشخبری ہے کہ اس کو اپنی عددی کمی کی بنا پر ناامیدی اور پست ہمتی کا شکار نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کو چاہئے کہ وہ اذن اللہ (قانون فطرت) پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے اندر پرامید سوچ پیدا کرے۔ یقینی ہے کہ کامیابی آخر کار اسی کو حاصل ہوگی۔

اقلیتی گروہ کس طرح اکثریتی گروہ پر غالب آسکتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جس سماج میں ایسا ہوتا ہے وہاں اکثریتی گروہ اقلیتی گروہ کے خلاف ایک مسلسل چیلنج بن جاتا ہے۔ اکثریتی گروہ زندگی کے ہر میدان میں اقلیتی گروہ کو للکارنے لگتا ہے کہ اگر تم کو جینا ہے تو ہوشیار ہو جاؤ،

غفلت تم کو موت کے کنارے پہونچادے گی۔ اکثریت کی طرف سے یہ چیلنج اقلیت کے
ے زبردست تازیانہ کا کام کرتا ہے۔ وہ چوکنا ہو کر زیادہ مستعدی اور زیادہ ہوشمندی کے
پنا عمل کرنے لگتا ہے۔ اکثریتی گروہ کا چیلنج اقلیتی گروہ کے افراد کی فطری صلاحیتوں کو
عد تک جگادیتا ہے۔

آیت میں اذن اللہ کا مطلب یہی ہے۔ جہاں بھی اکثریت اور اقلیت کا فرق پایا جائے وہاں
اذن اللہ کا یہ عمل جاری ہو جائے گا اور آخر کار اس کا وہی نتیجہ نکلے گا جس کی نشاندہی قرآن
ہ آیت میں کی گئی ہے۔



مستحکم سماجی نظام

بیسویں صدی عیسوی کے آخر میں ہندستان میں ایک خطرناک علامت ظاہر ہوئی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل بعید تک کے لئے ملک میں مستحکم حکومت کا دور ختم ہو ہے۔ حکومت کا اور پارلیمنٹ کا بار بار ٹوٹنا اب یہاں کا سالانہ معمول بنتا جارہا ہے۔ ایسی حالت میں ملک کے لئے آخری امید صرف یہ باقی رہ گئی ہے کہ غیر مستحکم سیاسی نظام کے درمیان مستحکم نظام قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔

۱۹۹۷ میں یورپ کے ایک سفر کے دوران مجھے دو دن کے لئے روم میں ٹھہرنے کا ملا۔ یہاں میری ملاقات ایک اٹیلین پروفیسر سے ہوئی۔ ان سے میں نے پوچھا کہ اٹلی میں ع سے سیاسی استحکام نہیں ہے۔ حکومتیں ہر سال ٹوٹتی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود حالیہ سروے مطابق اٹلی میں اقتصادی شرح ترقی (rate of growth) پورے یورپ میں سب سے ہے۔ سیاسی عدم استحکام کے باوجود اس اقتصادی ترقی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ عمل کے بعد ہمارے یہاں غیر سیاسی سطح پر سسٹم بہت مضبوط ہو گیا ہے جو سیاسی تبدیلیوں باوجود بدستور قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی انتشار کی حالت میں بھی قومی ترقی کے عمل خلل واقع نہیں ہوتا۔

میرا احساس یہ ہے کہ موجودہ حالات میں انڈیا میں بھی اسی ماڈل کو اختیار کیا جانا چ خوش قسمتی سے یہ نظام آج بھی ہمارے ملک میں تقریباً پچاس فیصد تک موجود ہے۔ اب تھوڑی سی محنت کے ذریعہ اس کو ایک مکمل سسٹم کے درجہ تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

یہاں میں کچھ مثالیں دوں گا۔ ۱۹۴۷ کے بعد انڈیا کی قسمت جن بڑے سیاسی لیڈر ہاتھ میں آئی وہ تقریباً سب کے سب سوشلسٹ ذہن رکھنے والے لوگ تھے۔ انھوں نے تعمیر نو کے لئے مقلدانہ طور پر روسی ماڈل کو اختیار کر لیا۔ اس میں صرف اتنا فرق تھا کہ ملکی

بنا پر وہ یہاں اشتراکی ڈکٹیٹر شپ قائم کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اس لئے انھوں نے نام
باد پبلک سکٹر کے ساتھ پرائیویٹ سکٹر کو بھی جینے کی اجازت دے دی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ 1991 میں جب سوویت یونین ٹوٹا تو وہاں کی اقتصادیات کامل دیوالیہ پن کی شکار ہو گئیں۔ لیکن انڈیا میں ہم پاتے ہیں کہ اگرچہ ہمارے یہاں سوشلسٹ حکمرانوں قائم کردہ پبلک سکٹر سوویت یونین ہی کی طرح مکمل طور پر ناکام ہو گیا اس کے باوجود ملک کی اقتصادیات دیوالیہ پن کا شکار ہونے سے بچی ہوئی ہیں۔ اس کا کریڈٹ کسی بھی درجہ میں ہمارے حکمرانوں کو نہیں جاتا۔ یہ تمام تر اسی پرائیوٹ سکٹر کا کارنامہ ہے جس کو آزادی کے بعد ہمارے سوشلسٹ حکمرانوں نے صرف ایک ناگزیر برائی کے طور پر باقی رکھا تھا۔

ہندستان میں پچھلے کئی سو سال سے ایک مضبوط تجارتی طبقہ موجود تھا۔ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ شہنشاہ اورنگ زیب اور ایسٹ انڈیا کمپنی کو قرض دے سکے۔ یہ بزنس کمیونٹی مسلسل قائم رہی۔ آزادی کے دور میں اس کی نئی نسل نے بڑے پیمانہ پر جدید تعلیم حاصل کر لی اور اس طرح اپنے تجارتی ڈھانچہ کو جدید معیار کے مطابق بنا کر اپنے آپ کو مزید مستحکم کر لیا۔

دور آزادی کے حکمرانوں نے اس معاملہ میں کوئی بھی مثبت کام نہیں کیا۔ اس مدت میں ان کا واحد کارنامہ یہ ہے کہ فلاح عامہ کے نام پر انھوں نے بے شمار مصنوعی قوانین بنائے اور اس طرح سوشلسٹ جنون کے تحت تجارتی طبقہ کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ مگر یہ طبقہ اپنی سخت جانی کا ثبوت دیتے ہوئے پھر بھی زندہ رہا۔ دراصل ملک کا یہی تجارتی طبقہ (private sector) وہ سب سے بڑا عامل ہے جس نے حکمرانوں کی بدترین نااہلی کے باوجود ملک کو اقتصادی دیوالیہ پن سے بچایا ہے۔

اس سلسلہ میں دوسرا مددگار عامل وہ ہے جس کو زرعی سکٹر کہا جاتا ہے۔ ہندستان میں ہزاروں سال سے مضبوط زرعی نظام قائم تھا۔ یہ گاؤں کے کسانوں نے اپنی ذاتی محنت سے قائم کیا تھا۔ سابق سوویت یونین نے وہاں کے زرعی سکٹر کو بے دردانہ طور پر نام نہاد سرکاری کنٹرول

میں لے لیا تھا۔ ہندستان کے سوشلسٹ حکمراں اس پوزیشن میں نہ تھے کہ وہ ملک کی اسی فیص
کسان آبادی پر اپنا سوشلسٹ بلڈوزر چلا سکیں۔ چنانچہ یہ زرعی سکٹر حکمرانوں کی مدد کے بغیر خو
اپنی طاقت پر قائم رہا۔

ہندستان سوویت یونین جیسی اقتصادی تباہی سے بچا ہوا ہے۔ اس کا دوسرا بڑا سبب ا
زرعی سکٹر کا زندہ رہنا ہے۔ اس زرعی سکٹر نے نہ صرف ملک کو غذائی اعتبار سے خود کفیل بن
بلکہ برآمدات کی صورت میں وہ ملک کے لئے قیمتی زرمبادلہ حاصل کرنے کا ذریعہ بنا رہا
حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمارے حکمراں سوشلسٹ ریفارم کے نام پر اس زرعی سکٹر کو سرکا
سکٹر بنانے میں کامیاب ہو جاتے تو یقینی طور پر ملک کا وہی اقتصادی انجام ہوتا جو سوویت یونی
کے ساتھ پیش آیا ہے۔

تیسرا شعبہ جو نسبتاً کمزور حالت میں قائم ہوا وہ تعلیم کا شعبہ ہے۔ تعلیم کا رواج ہندستان م
اگرچہ قدیم زمانہ سے تھا مگر وہ صرف خاص طبقوں تک محدود تھا۔ مسلمان جب ہندستان میں آ
انہوں نے ہر مسجد کو مدرسہ کی صورت دے کر تعلیم کو کافی پھیلا دیا۔ بہت سے ہندو مثلاً ڈاکٹر راجن
پرساد نے اسی نظام کے تحت اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انگریز ملک میں جدید تعلیم ۔
آئے ۔ آزادی (۱۹۴۷) کے بعد ملک میں ہزاروں کی تعداد میں نئے تعلیمی ادارے ق
ہو گئے۔ انھیں مختلف کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ملک میں پچاس فیصد لوگ کم یا زیادہ تعلیم ی
دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تعلیمی ڈھانچہ ملک کو آخری تباہی سے بچانے میں بہت کامیاب ثابت ہوا ہ

چوتھا نظام، اقدار کے نظام (Value System) کا ہے۔ آزادی کے بعد ہمار
لیڈروں نے پولیٹیکل کرپشن کا جو طوفان برپا کیا، اس کے بعد ملک کا یہ حال ہونا چاہئے تھا ک
آخری حد تک اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار ہو جائے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ آج بھی ملک میں اخلاقی اقد
کی روایات کسی نہ کسی درجہ میں زندہ اور قائم ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قومی اور سماجی زندگی ۔
تمام شعبے اس حد تک تباہ ہو چکے ہوتے کہ بازار میں چلنا اور ٹرینوں میں سفر کرنا بھی عام ان

کے لئے سخت مشکل ہو جاتا۔

ناموافق سیاسی حالات کے باوجود ملک میں اخلاقی روایت کے باقی رہنے کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب دوبارہ اخلاقی تعلیم کا وہ خاموش نظام ہے جو غیر سیاسی سطح پر قائم چلا آرہا ہے۔ سو سال پہلے کے دور میں یہ نظام زیادہ تر صوفیوں کے ذریعہ قائم تھا۔ اب اس نظام کا تسلسل اس طرح قائم ہے کہ ایک طرف ہندوؤں کے اندر بہت بڑی تعداد میں گرو اور سادھو سنت موجود ہیں جو ہر دن اپنی قوم کو امن اور پیار اور سہن شیلتا کا اپدیش دیتے رہتے ہیں۔ یہ کام بہت بڑے پیمانہ پر پورے ملک میں ہو رہا ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں میں لاکھوں کی تعداد میں مسجد اور مدرسے اور دینی حلقے قائم ہیں۔ مسلمانوں کی بیشتر تعداد کسی نہ کسی طور پر ان اداروں اور حلقوں سے جڑی ہوئی ہے۔ یہاں ان کو مسلسل طور پر اخلاق اور شرافت اور انسانیت کا سبق دیا جاتا ہے۔ یہ کام ہر شہر اور گاؤں میں ہو رہا ہے، جب کہ سیاست اور حکومت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

یہ ایک غیر سیاسی نظام ہے جس کے چار بڑے بڑے شعبے ہیں ـــــ تجارت، زراعت، تعلیم اور اخلاقیات۔ موجودہ حالت میں جب کہ ہمارے نااہل لیڈروں نے ملک کو سیاسی دیوالیہ پن کی حد تک پہنچادیا ہے، یہی غیر سیاسی نظام ہے جو ملک کو آخری تباہی سے بچائے ہوئے ہے۔

لارڈ ایکٹن نے کہا تھا کہ اقتدار بگاڑتا ہے (power corrupts)۔ یہ مقولہ ہمارے ملک میں اپنی بدترین صورت میں صحیح ثابت ہوا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بگاڑ کا یہ مسئلہ صرف موجودہ سیاسی لیڈروں تک نہیں رکے گا بلکہ جو شخص بھی سیاست کے میدان میں داخل ہوگا وہ اسی مقولہ کا شکار ہوتا رہے گا۔ اس لئے کم از کم موجودہ حالت میں عقلمندی یہی ہے کہ ہم سیاسی لیڈروں سے زیادہ امید رکھنا چھوڑ دیں اور مذکورہ غیر سیاسی نظام کو مزید مکمل اور مستحکم بنانے میں لگ جائیں۔

ہمارے لئے اب امید کا مقام ملک کا سیاسی ادارہ نہیں ہے بلکہ وہ غیر سیاسی ادارے ہیں جن

کااوپر ذکر ہوا۔ جو شخص بھی ملک کی تعمیر میں اپنا کچھ حصہ ادا کرنا چاہتا ہے اس کو اسی غیر سیاسی نظام کی تعمیر و تشکیل میں مصروف ہو جانا چاہئے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم صرف غیر سیاسی شعبوں میں مشغول ہو جائیں اور سیاسی شعبے کو اس کی بگڑی ہوئی حالت پر چھوڑ دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر سیاسی شعبے کو بہتر بنانا بالواسطہ طور پر خود سیاسی شعبے کو بہتر بنانے کا ذریعہ ہے۔

ملک کے سیاسی شعبے کے بگاڑ کو درست کرنے کی کوشش پچھلے پچاس سال سے جاری رہی ہے۔ اس میں ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اور جے پرکاش نرائن جیسے بہت سے لوگوں کے نام شامل ہیں۔ مگر لمبی کوشش کے باوجود اس معاملے میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ایسی حالت میں اس تجربہ کو مزید جاری رکھنا کوئی معقول بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اصلاح کی براہ راست کوشش پوری طرح ناکام ہو چکی ہے۔ اب ہمارے لئے جو صورت باقی ہے وہ یہی ہے کہ اس معاملے میں بالواسطہ اصلاح کے آزمودہ طریقہ کو اختیار کر لیا جائے۔

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جیسے تم ہو گے ویسے ہی تمہارے حکمراں ہوں گے (**كما تكونون، كذالك يؤمر عليكم**) اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاست ہمیشہ سماجی حالات کے تابع ہوتی ہے۔ اگر سیاسی شعبہ میں تبدیلی لانا ہے تو سب سے پہلے سماجی نظام میں تبدیلی لانا چاہئے۔ یہ دراصل سماج ہے جو سیاسی شعبہ کی تشکیل کرتا ہے، نہ کہ اس کے برعکس۔

خلاصہ یہ کہ موجودہ حالات میں ملک کے مستقبل کے لئے اگر کوئی امید ہے تو وہ الیکشنی ہنگاموں اور سیاسی اکھیڑ پچھاڑ میں نہیں ہے بلکہ سماجی شعبوں کی خاموش تعمیر میں ہے۔ جو لوگ بھی ملک کا سچا درد رکھتے ہیں انھیں اسی ایک کام میں مشغول ہو جانا چاہئے۔ اگر ملک میں مستحکم سماجی نظام قائم ہو جائے تو وہ غیر مستحکم سیاسی نظام کے باوجود ترقی کرتا رہے گا۔ اس کے بعد ملک کی ترقی کو کوئی روکنے والا نہیں۔

سوال

آج کل ہر جگہ مسلمانوں کے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ ہو رہا ہے۔ ہر جگہ مسلمان ہی نقصان میں رہتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہم کو مسلمان ہونے کی سزا دی جا رہی ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ مسلمان ہونے کی بنا پر ہمارے خلاف یہ زیادتیاں کی جا رہی ہیں۔ (نسیم علی خان، بمبئی)

جواب

قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ بات بالکل غلط ثابت ہوتی ہے۔ دور اول کے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا کہ: **وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم** (الشوریٰ ۳۰) یعنی جو مصیبت بھی تم کو پہنچتی ہے تو وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس آیت کے مطابق، یہ بالکل بے بنیاد بات ہے کہ کوئی شخص یا گروہ جب کسی مسئلہ سے دوچار ہو تو وہ مفروضہ دشمنوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس کی شکایت کرنے لگے۔ یہ قانون فطرت کے خلاف ہے کہ کوئی شخص مستقل طور پر کسی کو نقصان پہنچانے میں کامیاب رہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ آدمی کی اپنی کمزوری دوسروں کو یہ موقع دیتی ہے کہ وہ اس کو اپنی ظالمانہ کارروائیوں کا نشانہ بنائے۔ جہاں تک اہل ایمان کا تعلق ہے تو قرآن میں بار بار یہ ضمانت دی گئی ہے کہ اہل ایمان اگر صحیح معنوں میں دینی روش پر قائم ہوں تو وہ کبھی بھی اغیار کے ظلم یا سازش کا نشانہ نہیں بنیں گے۔ اس سلسلہ میں قرآن سے چند حوالے یہاں نقل کئے جاتے ہیں، مثلاً قرآن میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ: تم ہی غالب رہو گے اگر تم مؤمن ہو (آل عمران ۱۳۹) اسی طرح فرمایا: اللہ ہرگز کافروں کو مؤمنوں کے اوپر کوئی راہ نہیں دے گا (النساء ۱۴۱) مزید فرمایا کہ اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچائے گی۔ (آل عمران ۱۲۰) قرآن کے ان ارشادات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جب بھی اغیار کے ظلم وزیادتی کا شکار ہوں تو ہمیشہ اس کا سبب خود مسلمانوں کے اندر ہوگا نہ کہ مسلمانوں کے باہر۔ اس اصول کی عملی مثال یہ ہے کہ دور اول کے مسلمانوں کو جب احد کی

جنگ میں جان و مال کا سخت نقصان پیش آیا تو قرآن میں اس کا سبب خود مسلمانوں کے باہمی نزاع کو قرار دیا گیا (آل عمران ۱۵۲) اسی طرح حنین کی جنگ میں ابتدائی مرحلہ میں مسلمانوں کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا تو اس کا سبب بھی قرآن میں خود مسلمانوں کے عجب کو قرار دیا گیا (التوبہ ۲۵) قرآن کے یہ ارشادات واضح طور پر بتاتے ہیں کہ ایسے معاملات میں ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ ہم دشمنوں کی سازش کا انکشاف کرنے میں اپنا وقت ضائع نہ کریں اور نہ مفروضہ دشمنوں کے خلاف منفی کارروائیوں میں لگ جائیں۔ اس کے برعکس ہمیں یہ کرنا چاہئے کہ ہم خود اپنا احتساب کریں۔ ہم اپنی داخلی کمزوریوں کو تلاش کرکے ان کی اصلاح کریں۔ یہی اس معاملہ میں قرآنی ذہن ہے اور یہی اس معاملہ کا قرآنی حل۔

سوال

آپ نے اپنی کتاب "اسلام دور جدید کا خالق" اور دوسرے کئی مضامین میں یہ لکھا ہے کہ جدید دور کی ترقیوں کے پیچھے مسلمانوں کا ہاتھ ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آج کی دنیا میں ان ترقیوں کے لئے مسلمانوں کا نام نہیں لیا جاتا۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ کیا ایسا تعصب کی بنا پر ہے۔

(عمران احمد اصلاحی، دہلی)

جواب

یہ کوئی تعصب کا معاملہ نہیں۔ بلکہ یہ ایک سادہ فطری معاملہ ہے۔ ہر گھر میں اور ہر سماج میں آپ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ کسی کو جو عزت ملتی ہے وہ اس کے آج کے کارناموں کی بنیاد پر ملتی ہے نہ کہ ماضی کے کارناموں کی بنیاد پر۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں نے جدید ترقیاتی دور کا آغاز کیا۔ لیکن اگلے مرحلے میں وہ زوال کا شکار ہوگئے۔ اگلے مرحلے کے تمام کام مغربی قوموں نے انجام دئے۔ اس لئے ہر طرف انھیں کا نام لیا جانے لگا۔ مثلاً ہزاروں سال سے انسان دریاؤں کو معبود کا درجہ دے کر ان کی پرستش میں مبتلا تھا۔ مسلمانوں نے یہ کام کیا کہ دریاؤں کو معبودیت کے درجہ سے ہٹایا۔ مگر پانی کو اسٹیم پاور میں بدلنے کا کام اہل مغرب نے انجام دیا نہ کہ مسلمانوں نے۔ اسی طرح

دنیا آفتاب پرستی میں مبتلا تھی۔ مسلمانوں نے انسان کو آفتاب پرستی کی ذلت سے نکالا۔ مگر آفتاب کو سولر انرجی میں تبدیل کرنے کا کام تمام تر اہل مغرب نے انجام دیا، وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا نام ماضی کی تاریخ میں تو ضرور لکھا ہوا ہے مگر حال کی دنیا میں ان کا کوئی چرچا نہیں۔ یہی معاملہ تمام ترقیات کا ہے۔ جن چیزوں کو تمدنی ترقی کہا جاتا ہے وہ سب فطرت کے اندر چھپی ہوئی طاقتوں کو دریافت کر کے ان کو استعمال کرنے کا نتیجہ ہے۔ قدیم زمانے کا انسان فطرت کو معبود کا درجہ دیئے ہوئے تھا۔ اس بنا پر اس کے اندر فطرت کی تسخیر کا ذہن پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اہل اسلام کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے فطرت کو معبود کے بجائے مخلوق کا درجہ عطا کیا۔ اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ تاریخ میں پہلی بار فطرت کی پرستش کے بجائے فطرت کی تسخیر کا عمل شروع ہو گیا۔ اسی کا براہ راست نتیجہ وہ تمام ترقیاں ہیں جو آج کی دنیا میں نظر آتی ہیں۔

سوال

اسلام کے معاشی نظریات جو شروع کے دور میں نافذ کئے گئے تھے کیا وہ نظام آج کے دور میں کامیاب ہو سکتا ہے؟ جبکہ ساری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کا رواج ہے۔ مختصراً یہ کہ آپ اسلام کے معاشی نظریات کو عصری اسلوب میں کس طرح پیش کریں گے۔ (ڈاکٹر کلیم انصاری، دھولیہ)

جواب

میرے نزدیک اصل مسئلہ نظام کا نہیں ہے بلکہ افراد کا ہے۔ نظام افراد کو نہیں بناتا بلکہ یہ دراصل افراد ہیں جو کسی نظام کو بناتے یا چلاتے ہیں۔ خود اسلام کے دور اول کی تاریخ بھی اسی کی تصدیق کرتی ہے۔ موجودہ زمانے میں بھی جو لوگ (اسلامی نظام قائم کرو) کے نام پر نام نہاد انقلابی تحریکیں چلاتے ہیں اور مفروضہ مخالفین اسلام کو گولی مار کر یا پھانسی دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسلامی نظام قائم کرنے کی طرف بڑھ رہے ہیں، ان کا یہ عمل اتنا زیادہ بے معنی ہے کہ وہ یا تو ان کی عقل کو مشکوک ثابت کرتا ہے یا ان کی نیت کو۔ چونکہ عقل پر شک کرنا اهون ہے اس لئے میں اس معاملہ میں اسی رائے کو اختیار کرتا ہوں۔ کیوں کہ اس طرح نہ کبھی اسلامی نظام قائم ہوا ہے اور نہ

وہ کبھی قائم ہو سکتا ہے۔ اسلامی نظام قائم کرنے کی طرف پہلا قدم انسان سازی ہے نہ کہ وہ توڑ پھوڑیا تخریبی سیاست جو آج اسلامی نظام قائم کرنے کے نام پر مختلف مسلم ملکوں میں جاری ہے۔

جہاں تک اسلام کے معاشی نظریات کو عصری اسلوب میں بیان کرنے کا سوال ہے اس پر موجودہ زمانہ میں بہت سی قیمتی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مثال کے طور پر ایم عمر چھاپرا کی کتاب: Towards a just Monetary System. اس کتاب پر سعودی عرب کی طرف سے انعام بھی دیا گیا ہے۔ اس کہ علاوہ اس موضوع پر بہت سی کتابیں اردو، عربی اور انگریزی میں چھپ چکی ہیں۔ کتابوں کے علاوہ اس موضوع پر کثیر تعداد میں مقالات اور رپورٹیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ مگر عملاً ان کا کوئی فائدہ نہیں۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے افراد کار موجود نہیں۔ مثال کے طور پر اسلام کے معاشی نظام پر لکھنے اور بولنے والے لوگ خود اپنے آپ کو غیر اسلامی معاشی نظام کا پرزہ بنانے پر راضی ہو جاتے ہیں، صرف اس لئے کہ اسلام کا معاشی نظام قائم کرنے میں انھیں فوری طور پر ذاتی فائدہ ملتا ہوا نظر نہیں آتا۔ جبکہ غیر اسلامی معاشی نظام کا پرزہ بننے میں فوراً ہی ان کو بڑے بڑے مادی فائدے ملنے لگتے ہیں۔

سوال

آج کل عالم اس کو کہا جاتا ہے جس نے نام کے ساتھ قاسمی، ندوی، مظاہری وغیرہ نسبتی لفظ لگا ہوا ہو۔ کیا عالم کی یہ تعریف درست ہے (مفتی محمد ظہیر قاسمی، ناندیڑ)

جواب

عالم ہونے کے لئے مدرسہ سے تحصیل علم کی شرط درست ہے۔ مگر یہ شرط درست نہیں کہ نام کے ساتھ قاسمی یا ندوی جیسا کوئی لفظ لگا ہوا ہو۔ نام کے ساتھ اس قسم کا لاحقہ لگانا اکابر علماء کی روایت نہیں۔ مثال کے طور پر مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا اعزاز علی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا شبلی نعمانی جیسے افراد جو مسلمہ طور پر عالم تھے مگر انھوں نے اپنے نام کے ساتھ ایسا کوئی لاحقہ نہیں لگایا۔

۔ ایک پروگرام کے تحت صدر اسلامی مرکز نے امریکہ اور یورپ کا دورہ کیا۔ یہ پانچ ہفتہ تک جاری رہا۔ اس سلسلہ میں وہاں کے مختلف شہروں میں خطابات اور ملاقاتوں کے پروگرام ہوئے۔ ان میں خاص طور پر اسلام کے دعوتی پہلو کی وضاحت کی گئی۔ امریکہ کے الرسالہ فورم نے الرسالہ مشن کو انٹرنٹ اور ویب سائٹ پر پہنچادیا ہے۔ اس کے ذریعہ عالمی سطح پر الرسالہ مشن کی اشاعت ہو رہی ہے۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ سفر نامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔ یہ سفر ۲۴ مئی ۱۹۹۹ کو شروع ہوا اور ۳۰ جون ۱۹۹۹ کو ختم ہوا۔

ا۔ راشٹریہ سہارا (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر ظفر حسن نے ۱۶ اپریل ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال یہ تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ یہ استحصال کی بات نہیں بلکہ قانون فطرت کی بات ہے۔ ہم کو چاہئے کہ محنت اور لیاقت کے ذریعہ اس کا سامنا کریں نہ کہ شکایت اور احتجاج کے ذریعہ۔

۲۔ ابوظبی میں یکم مارچ سے لے کر ۱۲ مارچ ۱۹۹۹ تک نویں انٹر نیشنل بک فیر ہوئی۔ اس موقع پر جناب ادریس محمد انصاری صاحب نے الرسالہ مشن کا بک اسٹال لگایا۔ اس کام میں ایک سعودی بک اسٹال (استاذ احمد ابوذھب) نے تعاون کیا۔ بک اسٹال بہت کامیاب رہا۔ بک اسٹال کی تمام کتابیں لوگوں نے حاصل کر لیں۔ بہت سے لوگوں سے تعارف حاصل ہوا۔ اس سے پہلے ۳ نومبر سے ۱۴ نومبر ۱۹۹۸ تک شارجہ میں زیادہ بڑے پیمانہ پر انٹر نیشنل بک فیر لگائی گئی تھی۔ اس میں بھی الرسالہ مشن کا بک اسٹال لگایا تھا جو بہت کامیاب رہا۔ شارجہ ٹی وی کے اردو چینل نے اسٹال کے فوٹو لئے اور ایک انٹرویو ریکارڈ کیا جس کو وہاں ٹی وی پر دکھایا گیا۔

۔ دو کتاب انگریزی میں زیر طبع ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی چھپ کر آجائے گی۔ ان کے نام یہ ہیں:

1. Islam Rediscovered
2. Al- Islam "Belief, System and History"

۵۔ دوردرشن (انٹرنیشنل) کی ٹیم نے ۲۰ مارچ ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ریکارڈ کی۔ اس کا موضوع عید اضحیٰ تھا۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ عید اضحیٰ کی اسپرٹ قربانی ہے۔ اس سے لوگوں کے اندر یہ روح پیدا کرنا مطلوب ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کو قربان کر کے دین کے مقاصد کو پورا کریں جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے کیا۔

۶۔ ۵ اگست ۱۹۹۹ کو ہندی اخبار دینک بھاسکرن کے نمائندہ مسٹر دیپ اپادھیائے نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستان میں کسی اقلیت یا غیر اقلیت کو یہاں کے نظام سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر کسی کو خطرہ ہے تو صرف مفاد پرست لیڈروں سے ہے جو اپنے نادان اقدامات سے عوام کو خطرہ میں ڈال دیتے ہیں۔

۷۔ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی نے ۸ جولائی ۱۹۹۹ کو ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس کا موضوع اسلام اور امن تھا۔ گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ اسلام میں دفاع کے سوا کوئی جنگ جائز نہیں۔

۸۔ مسوری میں لال بہادر شاستری ایڈمنسٹریٹیو اکیڈمی کے تحت ۲۵ جولائی ۱۹۹۹ کو ایک انٹر فیتھ ڈائیلاگ ہوا۔ اس میں وہ لوگ شریک تھے جو آئی اے ایس کرنے کے بعد پروفیشنل ٹریننگ کے لئے یہاں آتے ہیں۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور اسلامی تعلیمات پر ایک تقریر کی اور لوگوں کے سوالات کے جواب دئے۔ مزید تفصیل سفر نامہ کے تحت آئے گی۔

۹۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۸ کو زی ٹی وی پر (دہلی) کے اسٹوڈیو میں ایک پینل ڈسکشن تھا۔ اس کا موضوع کنورژن تھا۔ اس میں اسلام، ہندوازم اور مسیحیت کے نمائندوں نے حصہ لیا۔ صدر اسلامی مرکز نے اسلام کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی اور کنورژن کے موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ بقیہ شرکاء کے نام یہ ہیں: ایم جے اکبر کوآرڈینیٹر، بیکنٹھ لال شرما پریم Tel. 2207269 فادر جوئل ڈی کوٹھا Tel. 3366093

۱۰۔ میرٹھ کے مولانا شکیل احمد قاسمی نے دار العلوم کے دار الافتاء سے جاری شدہ ایک فتویٰ برائے اشاعت روانہ کیا ہے۔اس پر تین مفتی صاحبان کے دستخط ہیں۔ یہ فتویٰ ایک استفتاء کے جواب میں ہے۔ جناب سید محمد ظفر نعیم (۴۱۴، پروہ فیاض علی، میرٹھ) نے اس تصویری قضیہ کے بارے میں ایک استفتاء دار العلوم دیوبند کے دار الافتاء کے نام روانہ کیا تھا۔ جس کی کافی وضاحت الرسالہ کے پچھلے شماروں میں آچکی ہے۔اس استفتاء میں پوچھا گیا تھا کہ دہلی کے ہندی ہفت روزہ ''پانچ جنیہ'' (۲۹ نومبر ۱۹۹۸) میں مولانا وحید الدین کی جو تصویر چھپی ہے اس کا شرعی حکم کیا ہے۔ کیا یہ فوٹو ان کی مسلمان ہونے کی حیثیت پر سوالیہ نشان لگا رہا ہے۔ دار العلوم کے دار الافتاء کی طرف سے مستفتی کو جو جواب روانہ کیا گیا تھا اس کی نقل یہ ہے۔

فتویٰ دار العلوم دیوبند

نمبر ۱۱۶۳

الجواب وما بعد التوفیق: محض کسی کی قیاس آرائی پر مولانا وحید الدین خاں پر کوئی شرعی حکم لگانا درست نہیں۔ آپ براہِ راست مولانا موصوف سے دریافت کریں کہ اخبار ''پانچ جنیہ'' والے نے جو کچھ ان کے بارے میں تصویر دی ہے یہ کہاں تک صحیح ہے۔ یہ حقیقت ہے یا محض بدنام کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ اور حقیقت ہے تو کہاں تک۔ کفر کا فتوی لگانا بہت اہم ہے۔ اسطرح اٹکل پچو اور قیاس آرائی پر یہ حکم لاگو نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جب تک خود ان کے قلم سے اور ان کے دستخط سے تصدیق نہ ہو۔ فقط

الجواب صحیح:
مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی
مفتی سید عبداللہ کشمیری

واللہ اعلم
حبیب الرحمٰن عفااللہ عنہ
مفتی دار العلوم دیوبند
۱۴۱۹/۹/۲۲ھ

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضہ ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو اور انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فیصد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں گے، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

	INLAND		ABROAD	
	Urdu	English	Air-Mail	
	Rs.	Rs.	US $	£
1 Year	100	60	10	6
2 Years	195	120	20	12
3 Years	290	175	30	18
5 Years	480	280	50	30

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحیدالدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
I, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
skhan@vsnl.com
http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY

AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi

نومبر 1999 شمارہ 276

خصوصی شمارہ: ہند۔ پاک ڈائری

(دوسری قسط)

نئی کتابیں





۱۹۴۷ کے بعد کے انڈیا میں مسلمانوں کے درمیان کم از کم دو شخصیتیں ایسی تھیں جو پورے معنوں میں قائدانہ اوصاف کی حامل تھیں۔ ایک مولانا سید حسین احمد مدنی، دوسرے مولانا ابوالکلام آزاد۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہ دونوں ۱۹۴۷ سے پہلے کے ہندستان میں سراپا سرگرم بنے ہوئے تھے ۱۹۴۷ کے بعد کے ہندستان میں وہ تقریباً خاموش ہو کر رہ گئے۔ ان کے قائدانہ اوصاف کا کوئی فائدہ ۱۹۴۷ کے بعد کے ہندستان کو نہیں ملا۔

ان کے بعد اگر چہ بہت سے لوگ مسلم قیادت کے میدان میں سرگرمی دکھانے کے لئے اٹھے مگر وہ حقیقۃً اس عربی مثل کا مصداق تھے کہ : **کبرنی موت الکبراء** (بڑوں کی موت نے مجھ کو بڑا بنادیا)

آزادی کے بعد کے دور میں مسلمانوں کے درمیان بہت سی قیادتی تحریکیں اٹھیں مگر وہ سب کی سب بے نتیجہ اچھل کود کے ہم معنی بن گئیں۔ اس سلسلہ میں غالباً پہلی نمایاں تحریک وہ ہے جو اترپردیش میں اٹھی۔ اس کا مقصد ریاست میں اردو کو ثانوی درجہ دلانا تھا۔ یہ ایک طوفان خیز تحریک تھی۔ کثیر تعداد میں مسلمانوں نے شہر شہر اور گاؤں گاؤں گھوم کر چودہ لاکھ دستخطوں کا ایک ڈھیر اکٹھا کیا۔ کاغذوں کا یہ ڈھیر ٹرکوں پر لاد کر دہلی لایا گیا تاکہ اس کو صدر جمہوریۂ ہند کی خدمت میں منظوری کے لئے پیش کیا جائے۔

یہ تحریک اپنے سارے جوش و خروش کے باوجود کتنی زیادہ بے حقیقت تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی طور پر کیا جاسکتا ہے۔ پریزڈنٹ آف انڈیا کے سامنے اردو کی درخواست پیش کرنے کی یہ مہم جس کمیٹی کے تحت چلائی گئی اس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین (وفات ۱۹۶۹) تھے۔ بعد کو یہی ڈاکٹر ذاکر حسین خود پریزڈنٹ آف انڈیا کی کرسی پر پہنچ گئے مگر وہ اردو کی اس درخواست کے بارے میں کچھ بھی نہ کر سکے۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ صدر ذاکر حسین اس کو کر سکتے تھے اور انھوں نے نہیں کیا، اس کا سبب یہ تھا کہ یہ کام حقیقی حالات کے اعتبار سے ہونے والا ہی نہ تھا اس

لئے وہ نہیں ہوا۔

۱۹۴۷ کے بعد بار بار مسلمانان ہند کے درمیان اس قسم کی جذباتی تحریکیں اٹھائی جاتی رہی ہیں جو یا تو بے نتیجہ رہیں یا ان کا معکوس نتیجہ برآمد ہوا۔

مثلاً آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کے لئے اٹھی۔ مگر وہ ایک فی صد بھی فسادات کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ مسلم یونیورسٹی کو مسلم کردار دینے کے لئے طوفان خیز تحریک اٹھی مگر وہ ظاہری کامیابی کے باوجود مسلم یونیورسٹی کے معیار کو صرف پست کرنے کا ذریعہ بنی۔ ریزرویشن کی پرجوش تحریک نے مسلمانوں کو ریزرویشن تو نہیں دیا البتہ ان کے اندر سے اس جذبہ کو چھین لیا کہ وہ محنت کر کے آگے بڑھیں۔ شاہ بانو تحریک کی بظاہر شاندار کامیابی کا انجام صرف یہ ہوا کہ ہندو فرقہ پرست طاقتیں از سر نو زندہ ہو گئیں۔ بابری مسجد تحریک کا یہ برعکس انجام ہوا کہ ہندوؤں کا انتہا پسند طبقہ شدت سے بھڑک اٹھا یہاں تک کہ آپے سے باہر ہو کر اس نے بابری مسجد کو ڈھادیا۔

جو لوگ چیزوں کو ظاہری سطح (face value) پر لینے کے عادی ہیں وہ صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ کچھ غضبناک ہندوؤں نے بابری مسجد کو ڈھادیا مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ بابری مسجد کو مسٹر ہندو نے نہیں ڈھایا بلکہ مسٹر ایگو نے ڈھایا۔ اور مسٹر ہندو کو مسٹر ایگو بنانے والے خود مسلمانوں کے نااہل قائدین تھے۔

جہاں تک میرا خیال ہے، ۱۹۴۷ کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے درمیان کوئی ایسی قابل ذکر تحریک نہیں اٹھی جس کو مثبت معنوں میں تعمیری تحریک کہا جاسکے۔ اور موجودہ حالات میں غالباً ایسا ہونا ممکن بھی نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ ہندستانی مسلمانوں کی غیر حقیقت پسندانہ سوچ ہے۔ وہ اپنے آپ کو غیر واقعی حد تک برتر اور اپنے ہم وطنوں کو غیر واقعی حد تک کمتر سمجھتے ہیں۔ جو لوگ اس طرح کی منفی نفسیات میں مبتلا ہوں ان کے درمیان صرف ردّعمل کی تحریکیں ابھر سکتیں ہیں نہ کہ مثبت معنوں میں کوئی نتیجہ خیز تحریک۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے یہاں ایک نمائندہ مثال درج کی جاتی ہے۔ دہلی کے سہ روزہ دعوت میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ایک انٹرویو "افادۂ عام کی غرض سے" شائع کیا گیا ہے۔ اس انٹرویو کا ایک سوال اور جواب من وعن یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

سوال : ملک میں روز بروز بڑھتی ہوئی ہندو فرقہ پرستی کے تناظر میں آپ کو یہاں انسانیت کا مستقبل کیسا نظر آتا ہے خصوصاً جب کہ آنجناب "پیام انسانیت" تحریک کے داعی و علم بردار ہیں؟

جواب : درحقیقت انسانیت کا پیغام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے ۔ ملکی سطح پر جو زبردست سیاسی، تہذیبی اور اخلاقی خلا موجود ہے، اسے صرف مسلمان ہی پر کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ وہ کتاب و سنت اور سیرت رسول ﷺ کے وارث ہیں۔ بلکہ میں تو پورے یقین واعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر مسلمان نہ ہوتے تو یہ ملک عذاب الٰہی کا نشانہ بن جاتا اور اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا ہوتا۔ (سہ روزہ۔ دعوت دہلی، ۲۵ جنوری ۱۹۹۷)

جس ملک کے دو گروہوں میں سے ایک گروہ کی سوچ یہ ہو کہ دوسرا گروہ عذاب الٰہی کا مستحق ہو چکا ہے اور ملک میں صرف میری موجودگی اس کو اس بھیانک انجام سے بچائے ہوئے ہے۔ وہاں نفرت اور حقارت کا ماحول تو بن سکتا ہے مگر محبت اور احترام کا ماحول ایسے لوگوں کے درمیان کبھی نہیں بنے گا۔ اور جس ملک کے دو بڑے گروہوں کے درمیان اس قسم کا منفی ماحول ہو وہاں مثبت معنوں میں لوگوں کے درمیان معتدل انسانی تعلقات کا قیام ممکن ہی نہیں۔

20

آزادی (۱۹۴۷) کے بعد ہندستان میں جو پہلی پارلیمنٹ بنی اس کے ایک بنگالی ممبر پروفیسر ہیرن مکرجی تھے۔ پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کے بعد وہ دہلی سے کلکتہ کے لئے بذریعہ ٹرین روانہ ہوئے۔ وہ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ انھوں نے جب چلتی ہوئی ٹرین کے باہر نظر ڈالی تو سڑک کے دونوں طرف جھگی جھونپڑی کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ گندگی اور

تاریکی کے غیر صحت مند ماحول میں عورت، مرد اور بچے اس طرح رینگ رہے تھے جیسے کہ وہ انسان نہ ہوں بلکہ جانور ہوں۔

پروفیسر ہیرن مکرجی اس منظر کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ واپس پہنچ کر کلکتہ سے انھوں نے اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک خط روانہ کیا۔ اس خط میں انھوں نے لکھا کہ ٹرین کے فرسٹ کلاس میں بیٹھا ہوا جب میں جھگی جھونپڑی کی ان گندی بستیوں سے گذرا تو میں نے سوچا کہ اگر یہ لوگ مجھ سے پوچھیں کہ انڈیا کی آزادی سے ہم کو کیا ملا، تو میں ان کو کیا جواب دوں گا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اسکے جواب میں پروفیسر ہیرن مکرجی کو جو خط روانہ کیا اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ تم اپنے حساس ہونے کی قیمت ادا کر رہے ہو:

You are paying the price of being sensitive.

یہ ایک علامتی واقعہ ہے جو بتاتا ہے کہ آزادی کے ابتدائی زمانہ ہی میں دردمند لوگوں نے ہمارے لیڈروں کے ضمیر کو کھٹکھٹایا۔ مگر وہ جاگنے کے بجائے خواب آور گولیاں کھا کر گہری نیند سو گئے۔ انھوں نے یاد دلانے والوں کو یہ کہہ کر چپ کرادیا کہ یہ تمہاری حساسیت کا مسئلہ ہے نہ کہ کوئی حقیقی مسئلہ۔

ہمارے لیڈروں نے ایسا جواب کیوں دیا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ایک بار حکومت کا تجربہ کرنے کے بعد ان کی ساری دلچسپی اس سے ہوگئی کہ وہ اپنے اقتدار کو آخر وقت تک باقی رکھ سکیں۔ اب ان کی توجہات کا مرکز صرف یہ تھا کہ وہ کس طرح اگلے الکشن میں اپنے آپ کو شکست سے بچائیں اور الکشن جیت کر دوبارہ سیاسی اقتدار کی گدی پر بیٹھ جائیں۔ اس خود غرضانہ طرز فکر نے ہندستانی سیاست کو پہلے کرپٹ پالیٹکس بنایا، اور اس کے بعد اس کو وہ بدترین صورت دے دی جسے ممبئی کے مسٹر مدھو مہتا (وفات ۱۹۹۵) کریمنلائزیشن آف پالٹکس کہا کرتے تھے۔

شیخ سعدی شیرازی کا ایک شعر ہے کہ کسی چشمہ کا منبع ابتدا میں ایک تیلی سے بند کیا جاسکتا

ہے۔ مگر جب وہ بھر جائے تو اس کو ہاتھی کے ذریعہ بھی بند کرنا ممکن نہیں:

سر چشمہ شاید گرفتن بہ میل   چو پر شد نشاید گذشتن بہ پیل

آزادی کے بعد ابتدائی دور میں اگر ہمارے لیڈر صرف اتنا کرتے کہ وہ جیت کے ساتھ ہار کو قبول کرنے کے لئے بھی تیار ہو جاتے تو ملک میں اتنا بگاڑ کبھی نہیں آسکتا تھا۔ ڈیماکریسی کی بنیاد الکشن پر ہے اور الکشن اگر صحیح طور پر کرائے جائیں تو کبھی ایک گروہ جیتے گا اور کبھی دوسرا گروہ۔ اس لئے ڈیماکریسی کا نظام درست طور پر صرف اس وقت چل سکتا ہے جب کہ پارٹیاں ہارنے کو بھی اسی طرح قبول کریں جس طرح وہ جیتنے کو قبول کرتی ہیں۔ اگر یہ مزاج نہ ہو تو برسر اقتدار پارٹی اپنے اقتدار کو مسلسل باقی رکھنے کے لئے ایسی بدعنوانیاں کرے گی جس کے نتیجہ میں پورا ملک تباہ ہو کر رہ جائے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں یہی کچھ پیش آیا ہے۔

21

۱۹۴۷ سے پہلے جو لوگ آل انڈیا کانگریس میں جڑے وہ طرح طرح کی سوچ کے لوگ تھے۔ ان کو جس چیز نے کانگریسی اتحاد میں اکھٹا کیا وہ صرف انگریز مخالف سیاست تھی۔ یہ لوگ پروانڈیا جذبہ سے زیادہ اینٹی برٹش جذبہ کے تحت کانگریس کے پلیٹ فارم پر اکھٹا ہوئے تھے۔ آزادی کے بعد جب پنڈت جواہر لال نہرو کو ملک کا وزیر اعظم بنایا گیا تو کسی نے ان سے کہا کہ کانگریس میں تو طرح طرح کے لوگ اکھٹا ہیں۔ اس قسم کے مختلف لوگوں کو لے کر آپ کس طرح حکومت کا کاروبار چلائیں گے۔ پنڈت نہرو نے جواب دیا: ہر ایک کی ایک قیمت ہے، اور وہ قیمت میں اس کو ادا کر سکتا ہوں۔

پنڈت نہرو کا یہ فارمولا ایک مفاد پرست حکومت کو چلانے کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔ مگر وہ ایک بااصول اور باکردار حکومت کو چلانے کے لئے قطعی طور پر ناکافی تھا۔ چنانچہ آزادی کے بعد ملک میں جو سیاسی ڈھانچہ بنا وہ یہ تھا کہ یہاں کوئی بااصول سیاسی نظام قائم نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس جو کچھ پیش آیا وہ یہ تھا کہ ہر ایک اپنی "قیمت" وصول کرنے لگا۔ مزید یہ کہ اس کی یہ قیمت

بھی خود اس کے اپنے خود ساختہ اندازوں کی بنیاد پر تھی نہ کہ حقیقت واقعہ کی بنیاد پر۔

چنانچہ قیمت وصول کرنے کا یہ سلسلہ کہیں نہیں رکا۔ پہلے یہ قیمت ہزاروں میں وصول کی جاتی تھی۔ اس کے بعد لاکھوں میں قیمت لی جانے لگی۔ پھر کروڑوں میں اور مزید بڑھ کر اربوں کی مقدار میں لوگ اپنی قیمت وصول کرنے لگے۔ یہ معاملہ اتنا بڑھا کہ ہندستانی روپیہ کی شکل میں اپنی قیمت لینا لوگوں کو کم دکھائی دینے لگا۔ اب لوگ ڈالر اور پونڈ کی صورت میں اپنی قیمت وصول کرنے لگے۔ ملک کی دولت ہندستان سے نکل کر بیرونی ملکوں کے بینکوں میں جمع ہو گئی۔

یہاں تک کہ قیمت وصول کرنے کا یہ معاملہ ایک مستقل فن بن گیا۔ اب سیاسی اور حکومتی شخصیتوں نے یہ کیا کہ وہ ملکی اور سماجی ترقی کے نام پر بڑے بڑے منصوبے بنائے، صرف اس لئے کہ اس کے بہانے سے اپنے گھروں کو نوٹ سے بھرے ہوئے بوروں کا گودام بنا سکیں۔ ملک بدستور بے ترقی کی حالت میں رہا مگر ملکی ترقی کے نام پر حکومتی شخصیتوں اور بڑے بڑے افسروں کا یہ حال ہوا کہ ان کے گھروں میں دولت کے انبار لگ گئے۔ ملک کی سڑکیں بدستور ٹوٹی پھوٹی حالت میں پڑی رہیں مگر انھیں سڑکوں کے نام پر لوگوں کے شاندار ذاتی محل تعمیر ہو گئے۔

یہ معاملہ یہاں بھی نہیں رکا۔ حکومتی شخصیتوں نے دیکھا کہ ملکی ترقی کے نام پر وہ صرف ہندستانی روپیہ لوٹ سکتے ہیں۔ اب انھوں نے جنگ کا ہوا کھڑا کیا۔ سرحدی خطرات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ صرف اس لئے تاکہ مغربی ملکوں کی اسلحہ فیکٹریوں سے نہایت مہنگی قیمت پر ہتھیاروں کی خریداری کا معاملہ کریں اور اس بہانے کروروں اور اربوں ڈالر باہر کی کمپنیوں سے بطور کمیشن وصول کر کے سوئزر لینڈ کے بنکوں میں خفیہ کھاتے کے طور پر جمع کر سکیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو کا سوشلسٹ فارمولا ابتدائی طور پر ایک سادہ فارمولا دکھائی دیتا تھا۔ مگر اپنی انتہا کو پہنچ کر ان کا سوشلسٹ فارمولا ایک ایسا لوٹ فارمولا بن گیا جس کی کوئی مثال ہندستان کی ہزاروں سال کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

آزادی کے بعد ہندستان میں لاقانونیت کی جو صورت پیش آئی وہ کوئی اتفاقی بات نہ

تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا بیج ۱۹۴۷ سے پہلے آزادی کی تحریک کے دوران ہی ڈال دیا گیا تھا۔ آزادی کے بعد جو لا قانونیت کا مزاج ملک میں پایا جاتا ہے وہ آزادی سے پہلے کے حالات ہی کا ایک براہ راست نتیجہ ہے۔

سبھاش چندر بوس نے کہا تھا کہ تم مجھ کو خون دو میں تم کو آزادی دوں گا۔ اس کے مقابلہ میں مہاتما گاندھی نے کہا کہ تم انگریزی قانون کو توڑو اور پھر تم کو آزادی مل جائے گی۔ شبھاس چندر بوس کے انقلاب میں اگر انسان قتل ہوتے تھے تو گاندھی کے انقلاب میں روایات قتل ہو گئیں۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ قتل انسان کے مقابلہ میں قتل روایات کا طریقہ زیادہ سخت ہے۔

مہاتما گاندھی کی پوری تحریک گویا پر امن قانون شکنی تھی---- حکومت کو ماننے کے بجائے حکومت کو نہ ماننا، اسکولوں اور کالجوں سے لوگوں کو نکالنا، اس قسم کی بہت سی خلافِ روایت چیزیں تھیں جن کو مہاتما گاندھی نے ملک میں رواج دیا۔ ان کی اس تدبیر کا ایک جزٔ وہ تھا جس کو سول نافرمانی (civil disobedience) کہا جاتا ہے۔

مہاتما گاندھی اور ان کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ قانون شکنی کی اس تحریک کے ذریعہ وہ برٹش اقتدار کو غیر مستحکم کر رہے ہیں۔ ہمارا سماج صدیوں سے کچھ اخلاقی روایات پر قائم تھا۔ یدھشٹر کا قصہ ان اخلاقی روایات کی ایک علامتی مثال ہے۔ کہانی بتاتی ہے کہ یدھشٹر ایک سچے انسان تھے۔ اس بنا پر ان کا رتھ زمین کے اوپر اوپر چلتا تھا۔ مگر ایک جنگ کے موقع پر انھوں نے بظاہر ایک جھوٹ بات کہہ دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا رتھ زمین پر آگیا اس کے بعد پھر وہ کبھی زمین سے اوپر اٹھ کر نہیں چلا۔

قدیم ہندستانی سماج اس قسم کی بہت سی اخلاقی روایات کے اوپر قائم تھا۔ اس وقت کے سماج میں اس اخلاقی روایات کے ڈھانچہ کو توڑنا بہت زیادہ برا سمجھا جاتا تھا۔ ان روایات کا غلبہ ذہنوں پر اتنا زیادہ تھا کہ کوئی بھی شخص ان کو توڑنے کی ہمت نہیں کرتا تھا مہاتما گاندھی کی عوامی تحریک نے پہلی بار اس کا خاتمہ کیا۔

روایت شکنی اور قانون کی پامالی کے اس طریقہ کا نشانہ ۱۹۴۷ سے پہلے برٹش اقتدار تھا، ۱۹۴۷ کے بعد اس کا نشانہ خود ہندستانی سماج بن گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستانی سماج ایک ایسا سماج بن گیا جس میں قانون اور اقدار کا احترام ختم ہو گیا تھا۔ جہاں لوگوں کے لئے قانون اور اخلاقی روایات کے خلاف عمل کرنا کوئی سنگین بات نہ تھی۔ آج ہندستانی سماج میں لوٹ اور انار کی کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اس کا کم از کم ایک بڑا سبب یہی ہے۔

22

دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد ایک بلین سے زیادہ ہو چکی ہے۔ اس تعداد کا تقریباً تہائی حصہ صرف بر صغیر ہند میں آباد ہے۔ اسی طرح انڈیا میں ہندو ستر کرور سے زیادہ ہیں۔ کوئی ایک کمیو نٹی اتنی بڑی تعداد میں کسی ایک ملک میں نہیں پائی جاتی۔ اس طرح ہندو اور مسلمان دونوں اس خطہ ارضی میں غیر معمولی امکانات کے حامل ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ پچھلے سو سال کی ہنگامہ خیز سرگرمیوں کے باوجود دونوں میں سے کوئی بھی کمیونٹی کوئی قابل لحاظ کارنامہ انجام نہ دے سکیں۔

اس المیہ کا سبب کیا ہے۔ میرے نزدیک اس کا واحد سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس پوری مدت میں کوئی دانش مند قیادت بر صغیر ہند میں ابھر نہ سکی۔ اس مدت میں کچھ ایسے لیڈر ضرور دکھائی دیتے ہیں جن کو قوم کے حق میں مخلص کہا جا سکتا ہے۔ مگر دور اندیشی اور گہرے تدبر سے تقریباً ہر ایک خطرناک حد تک خالی تھا۔ اس لئے ان میں سے کوئی بھی پورے معنوں میں نتیجہ خیز تحریک وجود میں نہ لا سکا۔

قائد کی مثال باغبان جیسی ہے۔ باغ کے درخت آج لگائے جاتے ہیں مگر ان کا پھل بہت سال بعد مستقبل میں حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے قائد کی صحیح پہچان یہ ہے کہ وہ ایسی تحریک اٹھا سکے جو مستقبل کے اعتبار سے نتیجہ خیز ثابت ہو۔ مگر بد قسمتی سے ایسا کوئی لیڈر نہ ہندوؤں میں پیدا ہوا اور نہ مسلمانوں میں۔

امریکہ کے ابتدائی لیڈروں نے امریکہ کو سائنسی تعلیم کے میدان میں ڈالا تھا۔ یہی کام بعد کو جاپان نے کیا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد ہندستان کے لیڈر اپنی سیاسی تحریک کو تیز کرنے کے لئے ہندستانی نوجوانوں کو اسکولوں اور کالجوں سے باہر لا رہے تھے، اسی زمانہ میں جاپانی لیڈر اپنے نوجوانوں کو اسکول اور کالج میں داخل کر کے انھیں بہترین تعلیم دلوا رہے تھے۔ یہ عمل لمبی مدت تک امریکہ اور جاپان میں جاری رہا۔ ان کی اگلی نسلوں کو اس نشانہ میں تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس کے بر عکس روس میں ۷۵ سال تک اسٹیٹ اکانمی کا غلغلہ رہا۔ اس کے بعد اس کو ترک کر کے لبرل اکانومی کے اصول پر قوم کو چلایا جانے لگا۔ یہی معاملہ چھوٹے پیمانے پر ہندستان میں پیش آیا۔

یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ اور جاپان ایک ترقی یافتہ ملک ہیں اور روس اور ہندستان دونوں غیر ترقی یافتہ ملک۔ ترقی مسلسل طور پر جاری رہنے والا عمل ہے۔ اس لئے ترقی کے لئے وہی اسکیم کار آمد ہے جو قابل بقا (sustainable) ہو۔ جو اسکیم قابل بقا نہ ہو وہ ترقی کا ذریعہ بھی نہیں بن سکتی۔

اس معیار کی روشنی میں دیکھئے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے تمام بڑے بڑے لیڈر اس پر پورے اترتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ مثال کے طور پر مہاتما گاندھی نے چرخا پر مبنی اکانمی کا نظریہ پیش کیا مگر وہ کچھ انفرادی لوگوں میں وقتی طور پر رہا اور اس کے بعد اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی طرح پنڈت نہرو نے سرکاری اکانومی کو رائج کیا مگر چالیس سال بعد اس کو لپیٹ کر رکھ دینا پڑا۔

مولانا محمد علی جوہر نے خلافت تحریک کے نام پر تھوڑے دنوں کے لئے پورے برصغیر کو ہلا دیا مگر ۱۹۲۴ میں ان کی زندگی ہی میں اس طوفانی تحریک کا اس طرح خاتمہ ہو گیا جیسے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ اسی طرح مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے طاغوتی نظام کا نظریہ پیش کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان انسانی ساخت کے تمام نظاموں سے قطع تعلق کریں اور ان سے لڑ کر دنیا

بھر میں ان کا خاتمہ کردیں۔ ورنہ اس دنیا میں ان کی زندگی ہی جائز زندگی نہ ہوگی۔ اس بے بنی
نظریہ نے بھی ایک محدود عرصہ کے لئے وقتی جوش و خروش دکھایا اس کے بعد وہ کتابوں کے
صفحات میں دفن ہو کر رہ گیا۔ اس کی وجہ بھی دوبارہ یہی تھی کہ اس عالم اسباب میں اس قسم کا ن
پسندادانہ تصور قابل بقا ہی نہ تھا۔

23

۱۹۳۸ میں عربی تعلیم کے لئے میں نے مدرسہ الاصلاح (اعظم گڈھ) میں داخلہ لیا۔ا
مدرسہ میں اس وقت ہندستان کی دو شخصیتوں کا زیادہ چرچا تھا۔ اردو میں مولانا ابوالکلام آز
(وفات ۱۹۵۸) اور عربی میں مولانا حمید الدین فراہی (وفات ۱۹۳۰) اس زمانہ میں یہاں کے کتب
خانہ (دارالمعلومات) میں مولانا آزاد کے الہلال کے پرچے مجلد صورت میں نہایت اہتمام کے
ساتھ رکھے گئے تھے۔ عام کتابوں کی طرح یہ جلدیں اشو نہیں کی جاتی تھیں۔ ان کو صرف کتب
خانہ میں ہی بیٹھ کر پڑھا جا سکتا تھا۔

الہلال کو پڑھ کر جو ذہن بنتا تھا وہ صرف استعمار سے نفرت کا ذہن تھا۔ اس کا ہر شمارہ گو
انگریزوں کے خلاف ایک بغاوت نمبر ہوتا تھا۔ اس کو پڑھ کر آدمی کے اندر صرف یہ ذہن پیا
ہوتا تھا کہ انگریز ایک قابل نفرت قوم ہے۔ ان کا مقصد حیات یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو
نقصان پہنچائیں اور اگر ممکن ہو تو ان کو دنیا سے مٹا دیں۔

مولانا حمید الدین فراہی کوئی سیاسی آدمی نہ تھے۔ ان کا موضوع اصلاً تفسیر قرآن تھا۔ لیکن
انگریزوں کے معاملے میں ان کے خیالات وہی تھے جو اس زمانے کے دوسرے علماء کے یہاں پا
جاتے تھے۔ اس زمانہ کے علماء عام طور پر انگریزوں سے سخت بیزار تھے۔ وہ انگریزوں کو اسلام
دشمن نمبر ایک سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ کے علماء کے حالات میں عام طور پر یہ لکھا ہوا ملے گا کہ
"حضرت کو انگریزوں سے بہت نفرت تھی" یہی حال خود مولانا حمید الدین فراہی کا بھی تھا
انھوں نے اپنی ساری زندگی قرآن کے مطالعہ میں گزاری۔ مگر قرآن سے انھیں آیتوں او

سورتوں میں نظم کا مسئلہ تو ملا مگر انسان سے محبت کا مسئلہ انھیں شاید اس میں نہیں ملا۔

انگریز پروفیسر آرنلڈ (T.W. Arnold) کتاب دعوت اسلام (The Preaching of Islam) پہلی بار ۱۸۹۶ میں چھپی۔ اس وقت مولانا حمید الدین فراہی علی گڑھ میں تھے۔ خود کتاب کے انگریز مصنف بھی اس وقت استاذ کی حیثیت سے علی گڑھ میں موجود تھے۔ پروفیسر ارنلڈ (وفات ۱۹۳۱) نے ۵۰۰ صفحہ کی اس کتاب میں کامیابی کے ساتھ یہ دیکھایا ہے کہ اسلام تلوار کے ذریعہ نہیں پھیلا بلکہ دعوت و تبلیغ کے ذریعہ پھیلا۔

یہ کتاب لندن سے چھپ کر جب علیگڑھ آئی تو مولانا حمید الدین فراہی نے اس کو پسند نہیں کیا۔ ان کے نزدیک یہ کتاب انگریزوں کی سازش کا ایک حصہ تھی۔ انگریز اپنے استعماری مفاد کے تحت مسلمانوں سے جہاد کا جذبہ ختم کردینا چاہتے ہیں، اس لئے انھوں نے پروفیسر ارنلڈ سے اس قسم کی کتاب لکھوائی ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی کا یہ احساس اتنا زیادہ بڑھا ہوا تھا کہ ایک انگریز ان کو اپنے عربی ترجمان کی حیثیت سے عرب لے جانا چاہتا تھا۔ انھوں نے اس کو دشمن اسلام کے ساتھ تعاون سمجھ کر اس سے انکار کردیا۔ بعد کو اپنے استاذ مولانا شبلی نعمانی (وفات ۱۹۱۴) کے کہنے پر بادل نخواستہ وہ مذکورہ انگریز کے ساتھ جانے پر راضی ہوئے۔

اس طرح مدرسہ میں مجھ کو جو ذہن ملا وہ نفرت انگریز (یا نفرت انسان) کا ذہن تھا۔ اسلام کا مطلوب ذہن محبت انسان کا ذہن ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ پچھلے سو سال کے درمیان ہمارے رہنماؤں نے مسلمانوں کے اندر جو ذہن بنایا وہ براہ راست یا بالواسطہ طور پر نفرت انسان کا ذہن تھا۔ نہ کہ محبت انسان کا ذہن مجھے یاد ہے کہ اس وقت کے مشہور مسلم شاعر انور صابری ہمارے مدرسہ میں آئے انھوں نے وہاں اپنی کچھ نظمیں سنائیں ان کا ایک شعر بہت مقبول ہوا جو اب تک مجھے یاد ہے:

تمنا ہے کہ دنیائے غلامی کو بدل ڈالوں　　شہنشاہوں کا سرپائے بغاوت سے کچل ڈالوں

مدرسۃ الاصلاح میں میرے استاذ مولانا امین احسن اصلاحی (وفات ۱۹۹۸) سیاسی اعتبار

سے کانگریسی تھے تاہم تقسیم (۱۹۴۷) کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ وہاں وہ لاہور میں مقیم رہے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ غالباً ۱۹۵۰ میں وہ کچھ دنوں کے لئے ہندوستان آئے تھے اور اپنے وطن بمھور (اعظم گڑھ) میں قیام کیا تھا۔ میں بھی چند دوسرے نوجوانوں کے ساتھ بمھور گیا۔ مولانا جب یہاں آئے تو ان کو حسب قاعدہ پولیس اسٹیشن جاکر اپنی آمد کا اندراج کرانا پڑا۔ اس قسم کی چیز ان کے مزاج کے خلاف تھی۔ چنانچہ ہم لوگوں سے گفتگو کے دوران انھوں نے کہا: پاکستان میں میں وزیراعظم کو ڈانٹ سکتا ہوں، مگر انڈیا میں میں نمبر ۱۰ کا مجرم ہوں۔

استاذ کی زبان سے یہ جملہ سن کر اس وقت میرے اندر یہ تاثر پیدا ہوا کہ انڈیا بہت خراب ملک ہے اور پاکستان اس کے مقابلے میں بہت اچھا ملک ہے۔ اس کے ایک عرصہ بعد ۱۹۷۱ میں خود پاکستان گیا اور وہاں لاہور میں چند دن قیام کیا۔ اس سفر میں میرے ساتھ ٹھیک وہی واقعہ پاکستان میں پیش آیا جو مولانا امین احسن اصلاحی کے ساتھ انڈیا میں پیش آیا تھا۔ مجھ کو بھی وہاں پہنچ کر پہلے ہی دن پولیس اسٹیشن جانا پڑا اور وہاں اپنی آمد کی تفصیل پولیس کے رجسٹر میں درج کرانی پڑی۔

ان چند متفرق واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلے سو سال کے اندر کس قسم کے خیالات چھائے رہے ہیں اور ہمارے اداروں اور ہماری شخصیتوں کے ذریعہ لوگوں کو کس قسم کا ذہن ملتا رہا ہے۔ مثلاً اس پورے دور میں ہم نے انگریز کے مسئلہ کو "غلامی" کا مسئلہ سمجھا حالانکہ زیادہ صحیح لفظوں میں وہ نو آبادیات (Colonialism) کا مسئلہ تھا۔ غلامی کا لفظ صرف نفرت اور حقارت پیدا کرتا ہے۔ وہ انگریزوں کا تعارف صرف ایک ظالم کے روپ میں کرتا ہے۔ اس کے برعکس نو آبادیات کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ انگریزوں نے علم اور صنعت کے میدان میں ترقی کر کے ہمارے اوپر برتری حاصل کرلی۔ اسی برتری کے بنا پر وہ اس قابل ہوگئے کہ سات سمندر پار کر کے وہ ہمارے ملک میں آئیں اور یہاں حکومت کریں۔

اس طرح نو آبادیات کا لفظ نئی سوچ پیدا کرتا ہے۔۔ وہ ترغیب دیتا ہے کہ ہم بھی علم اور صنعت کے میدان میں ترقی کریں اور صحت مند مقابلہ کر کے ان سے آگے بڑھ جائیں۔ جب کہ

غلامی کے لفظ سے اس قسم کا کوئی مثبت ذہن نہیں بنتا۔

اسی طرح لوگوں کے اندر ایک عام کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے قریبی حالات کے زیر اثر رائے قائم کرتے ہیں اس بنا پر ان کی رائے اکثر غلط ہو جاتی ہے۔ ایک پاکستانی مسلمان کو انڈیا میں پولیس کے دفتر میں حاضری دینی پڑے تو انڈیا کے بارے میں اس کی رائے خراب ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس نے معاملہ کو صرف اپنے محدود تجربہ کے دائرے میں دیکھا۔ اگر وہ اس کے اس حقیقت کو سامنے رکھے کہ انڈیا کا ایک مسلمان جب پاکستان جاتا ہے تو وہاں بھی اس کو پولیس اسٹیشن میں اسی طرح حاضری دینی پڑتی ہے۔ اگر وہ دونوں قسم کے واقعات کو ملا کر سوچے تو اس کی رائے میں توازن پیدا ہو جائے گا۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ سوچا جائے کہ یورپ میں لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک میں ویزا کے بغیر آسانی کے ساتھ آتے جاتے رہتے ہیں۔ پھر انڈیا میں اس کے خلاف صورت حال کیوں۔ اس پر غور کرنے کے بعد معلوم ہو گا کہ اس کا سبب ہمارے لیڈروں کی غلط سیاست ہے۔ یورپ میں ایک ملک اور دوسرے ملک کے درمیان نفرت کی سیاست نہیں چلائی گئی۔ اس لئے وہاں مختلف ملکوں کے درمیان معتدل حالات موجود ہیں۔ انڈیا اور پاکستان میں اس کے برعکس نفرت اور کشاکش کی سیاست چلائی گئی۔ دراصل یہی منفی سیاست ہے جس کا انجام آج برصغیر ہند کے لوگ بھگت رہے ہیں۔

24

۱۹۶۶ میں لکھنؤ مسلم سیاست کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد منظور نعمانی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی وغیرہ، نہایت جوش و خروش کے ساتھ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کی ''نان کانگریس ازم'' کی مہم میں شریک تھے۔ اس زمانے میں ایسی تقریریں کی جارہی تھیں جیسے کہ کانگریس کو ہرانا مسلمانوں کا مستقبل بنانے کے ہم معنی ہے۔

میں اس سیاست کو سراسر ایک بے فائدہ سیاست سمجھتا تھا۔ میں نے اس تحریک کے

اکثر رہنماؤں سے تبادلۂ خیال کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس وقت وہ اتنے جوش میں تھے کہ کوئی بھی شخص کچھ سننے کے لئے تیار نہ ہوا۔ آخر کار میں ۱۶/اپریل ۱۹۶۷ کو ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی سے ملا۔ یہ گفتگو لکھنؤ میں (فریدی بلڈنگ، حضرت گنج) میں ہوئی۔ پون گھنٹہ تک گفتگو جاری رہی۔ میں نے ان کے تمام دلائل کو رد کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ کسی پولیٹکل پارٹی کو ہرانا مسلمانوں کے لئے کسی مثبت نتیجہ کو پیدا کرنے والا نہیں بن سکتا۔ جب ڈاکٹر فریدی کے پاس میری دلیلوں کا کوئی جواب نہ رہا تو آخر میں انھوں نے کہا: اسٹیٹس کو میں چیلنج تو ہوگا (یعنی موجودہ سیاسی صورتحال میں تبدیلی تو ہوگی) اس کے بعد گفتگو ختم ہوگئی۔

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی (وفات ۱۹۷۴) کا یہ جواب علامتی طور پر موجودہ زمانہ کی پوری مسلم قیادت پر صادق آتا ہے۔ اس زمانہ میں تقریباً ہر مسلم قائد (نہ صرف ہندستان میں بلکہ ساری دنیا میں) بس پولیٹکل اسٹیٹس کو میں چیلنج لانے کی سیاست چلاتا رہا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ کسی نے شعوری طور پر ایسا کیا اور کسی نے غیر شعوری طور پر۔

موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں کی ہنگامہ خیز کوششیں کوئی مثبت نتیجہ پیدا کئے بغیر ختم ہوگئیں۔ اس کی واحد مشترک وجہ یہ تھی کہ انھوں نے سیاسی اسٹیٹس کو میں چیلنج کو کام سمجھ لیا۔ وہ بار بار اس اسٹیٹس کو میں تبدیلی لانے کے لئے دھواں دار تحریکیں چلاتے رہے، صرف اس لئے کہ جو کچھ پہلے حاصل تھا وہ بھی ان سے چھن جائے۔

اصل یہ ہے کہ اسٹیٹس کو میں چیلنج لانے کے لئے تحریک چلانا کوئی تحریک ہی نہیں۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ جو اسٹیٹس کو بن گیا ہے اس کو وقتی طور پر تسلیم کرتے ہوئے حاصل شدہ مواقع کار کو مثبت تعمیر کے لئے استعمال کیا جائے جو سیاسی اسٹیٹس کو آپ کو یہ موقع دیتا ہے کہ آپ اس کے خلاف تحریک چلائیں وہ مزید اضافہ کے ساتھ آپ کو یہ موقع دے گا اس کو چھیڑے بغیر غیر نزاعی دائرے میں خاموش تعمیر کی کامیاب جدوجہد کریں۔

اسٹیٹس کو میں چیلنج ایک سلبی عمل ہے اور اسٹیٹس کو سے ٹکرائے بغیر غیر سیاسی میدان

میں کوشش کرنا ایک ایجابی عمل۔

اس دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ مختلف اسباب سے ایک فریق اور دوسرے فر
درمیان ایک اسٹیٹس کو قائم ہو جاتا ہے۔ اگر کام کا آغاز اس اسٹیٹس کو کے بدلنے سے کیا
پہلے ہی مرحلے میں فریق ثانی سے ٹکراؤ پیش آ جائے گا۔ مزید یہ سراسر غیر یقینی ہوتا
اسٹیٹس کو بدل بھی جائے تو اس کے بعد جو صورت حال پیدا ہوگی وہ کس کے حق میں ہوگ
کے طور مصر کے اسلام پسندوں نے شاہ فاروق کے زمانے میں پولیٹکل اسٹیٹس کو کے
کوشش کی مگر جب وہ بدلا تو وہ اسلام پسندوں کے بجائے فوجی افسروں کے حق میں چلا گیا۔
کے اسلام پسندوں نے صدر ایوب خاں کے زمانہ میں پولیٹکل اسٹیٹس کو میں تبدیلی کی کو
۔ مگر جب وہ بدلا تو وہ اسلام پسندوں کے بجائے سیکولر لیڈروں کے حق میں چلا گیا۔ ا
ہندوستان میں انگریزوں کے زمانے میں جو پولیٹکل اسٹیٹس کو تھا اس کو نیشنلسٹ مسلما
بدلنے کی کوشش کی مگر جب وہ بدلا تو نیشنلسٹ مسلمانوں کے بجائے دوسری پارٹیوں کے
چلا گیا۔ وغیرہ۔ اس لئے صحیح اور مفید طریقہ کار یہ ہے کہ اسٹیٹس کو کو عملاً قبول کرتے ہو
دائروں میں اپنے تعمیر و استحکام کی جد و جہد جاری کی جائے۔ بالفاظ دیگر مسائل کو نظر اند
ہوئے مواقع کو استعمال کیا جائے۔ یہی طریقہ درست ہے اور یہی طریقہ نتیجہ خیز بھی۔

25

بی بی سی لندن سے ۱۳؍ مئی ۱۹۹۸ کو ایک ادبی پروگرام نشر ہوا۔ یہ سعادت حسن
بارے میں تھا۔ وہ اردو کے مشہور افسانہ نگار تھے۔ ان کی پیدائش انڈیا میں ہوئی۔ تقسیم ا
کے وقت وہ بمبئی میں تھے۔ اس کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ ۱۹۵۵ میں لاہور میں ان
ہو گیا۔ انھوں نے کیوں ایسا کیا کہ وہ انڈیا کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ نشریہ میں بتایا گیا ؔ
سوال کا جواب خود سعادت حسن منٹو نے عصمت چغتائی کو ان الفاظ میں دیا تھا: پاک
مسلمانوں کا مستقبل روشن ہے وہاں ہر طرف ہم ہی ہم ہوں گے۔ خوب ترقی کریں گے۔

یہی ذہن تمام ان لوگوں کا تھا جو پاکستان کے حامی تھے۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ پچاس سال گذرنے کے بعد بھی پاکستان کا مسلمان مطلوب ترقی حاصل نہ کر سکا۔ حتی کہ خود پاکستان کے لوگ اپنے ملک کے حالات سے اتنا زیادہ غیر مطمئن ہوئے کہ تعلیم یافتہ پاکستانیوں کی بہت بڑی تعداد باہر کے ملکوں میں چلی گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریہ بذات خود غلط تھا کہ جس ملک میں صرف ایک قوم کے لوگ بستے ہوں وہاں خوب ترقی ہو گی۔ بلکہ اصل معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ترقی کے لئے فطرت کا ایک اٹل قانون ہے اور جب بھی کوئی قوم ترقی کرتی ہے تو وہ اسی قانون کے مطابق کرتی ہے۔ کوئی خود ساختہ نظریہ کبھی کسی قوم کو ترقی کی طرف نہیں لے جاتا۔

فطرت کے قانون کے مطابق، ترقی کا تعلق چیلنج اور مسابقت پر ہے نہ کہ یکسانیت پر۔ کوئی قوم اس وقت ترقی کرتی ہے جب کہ وہ مسابقت کے ماحول میں ہو، جب کے اسے دوسروں کی طرف سے چیلنج پیش آرہا ہو۔ جہاں چیلنج نہ ہو وہاں یقینی طور پر ترقی بھی نہ ہو گی۔ مسلمانوں کی ترقی کا راز یہ تھا کہ وہ غیر منقسم ہندستان میں ہندوؤں کے درمیان مثبت ذہن کے ساتھ رہتے۔ اس طرح دونوں کے درمیان صحت مند مقابلہ (Healthy competition) جاری ہوتا۔ یہ مقابلہ دونوں کے لئے ترقی کا ضامن بن جاتا۔

جب بھی مختلف گروہ ملکر ساتھ رہیں تو ان کے درمیان مختلف قسم کے ناخوشگوار واقعات پیش آتے ہیں جو ایک دوسرے کے لئے شکایت کا باعث بنتے ہیں۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ایسا ہی معاملہ غیر منقسم ہندستان میں پیش آیا۔ یہاں ہندو اور مسلم دونوں طرف کے قائدین صحیح رہنمائی دینے میں ناکام رہے۔ ہندی اخبارات مسلمانوں کی باتوں کو زیادتی کا روپ دے کر پیش کرتے رہے۔ دوسری طرف اردو اخبارات مزید اضافہ کے ساتھ ہندوؤں کے واقعات کو تعصب اور ظلم کی شکل میں چھاپتے رہے۔ حالانکہ دونوں طرف کے لکھنے اور بولنے والوں کو یہ کرنا چاہئے تھا کہ وہ اپنی اپنی قوم کو بتائیں کہ اس طرح کی ناخوشگوار باتیں ہر سماج میں پیش آتی ہیں۔ حتی کہ

ایسے ماحول میں بھی جہاں تمام لوگ ایک ہی مذہب اور ایک ہی کلچر کے ماننے والے ہوں۔ان چاہیئے تھا کہ وہ لوگوں کے اندر یہ ذہن بنائیں کہ وہ اس طرح کے واقعات کو چیلنج کے روپ مٰں لیں نہ کہ زیادتی کے روپ میں۔

اگر بروقت لوگوں کو یہ رہنمائی دی جاتی تو وہ جانتے کہ غیر منقسم انڈیا ترقیاتی امکان ۔ اعتبار سے موزوں ترین ملک ہے۔یہاں وہ حالات پوری طرح موجود ہیں کہ آزاد ماحول مٰں دونوں فرقوں کے درمیان صحت مند مقابلہ جاری ہو۔اور پھر فطرت کے قانون کے مطابق دونوں تیزی کے ساتھ ترقی کا سفر طے کریں۔مگر بروقت صحیح رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے دونو میں سے کوئی بھی حقیقی ترقی حاصل نہ کر سکا۔

26

میرا احساس یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے ملک میں جو ہندو رہنما یا مسلم رہنما ابھرے۔ا میں سے کوئی بھی حقیقی معنوں میں کسی کریڈٹ کا مستحق نہیں۔دونوں نے یکساں طور پر حریف قسم کی تحریکیں چلائیں ایک طرف ظفر علی خاں نے کہا:

دنیا میں بلائیں دو ہی ہیں اک ساورکر اک گاندھی ہے
اک کفر کا چلتا جھکڑ ہے اک ظلم کی چلتی آندھی ہے

دوسری طرف گرو گولوالکر نے یہ نظریہ پیش کیا کہ بھارت میں صرف ہندو ہی ۔ نیشلسٹ ہیں۔کیوں کہ یہ صرف ہندو ہیں جو انڈیا کو ہولی لینڈ کے طور پر دیکھتے ہیں۔اس سرزمین ہر ذرہ ان کے لئے مقدس ہے۔مسلمان چونکہ نیشنلٹی کے ٹسٹ پر پورے نہیں اترتے اس لئے نیشنلسٹ نہیں ہیں (بنچ آف تھاٹ از گرو گولوالکر)

عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے محبوب شاعر اقبال نے بھی یہی بات ان لفظوں مٰں کہی تھی:

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

مگر اسی کے ساتھ اقبال نے اس کے برعکس بات بھی ان لفظوں میں کہی:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

تاہم اس معاملے میں مسلمانوں کا جو ذہن بنا وہ خواہ کسی اور کے موافق ہو یا نہ ہو، تاہم وہ اینٹی گرو گولوالکر ضرور تھا۔

یہ مزاج اتنا بڑھا کہ دونوں کی صحافت میں صرف الفاظ کا فرق رہ گیا۔ مثال کے طور پر ریڈینس ایک مسلم ہفتہ وار ہے اور آرگنائزر ایک ہندو ہفتہ وار۔ مگر باعتبار حقیقت دونوں میں اتنی ہی یکسانیت ہے کہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ آرگنائزر ہندوؤں کا ریڈینس ہے اور ریڈینس مسلمانوں کا آرگنائزر۔

برصغیر ہند میں مسلم پریس کی پہچان یہ بن گئی کہ وہ اینٹی ہندو لہجہ میں بولتا ہو اور ہندو پریس کی پہچان یہ بن گئی کہ وہ اینٹی مسلم لہجہ میں بولتا ہو۔ پر وانسانیت لہجہ نہ ہندو پریس کا رہا اور نہ مسلم پریس کا۔ اس معاملہ میں بعض استثناء ہو سکتے ہیں مگر برصغیر ہند کی پریس کا عمومی انداز یہی ہے۔

27

مہاتما گاندھی ہندوستان کی سیاسی آزادی کو ملک کے تمام مسائل کا حل سمجھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میرا مشن صرف انگریزوں کو ملک سے نکالنا نہیں ہے بلکہ میرا مشن ہر آنکھ کے آنسو پوچھنا ہے:

My mission is to wipe away tears from all faces.

مگر آزادی کے پچاس سال بعد بھی ملک کی یہ حالت ہے کہ رونے والی آنکھوں کی تعداد پہلے سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ آج ہمارا ملک اس سے بھی زیادہ مسائل سے دوچار ہے جس سے ۱۹۴۷ سے پہلے دوچار تھا۔

اس کا سبب کیا ہے۔ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مہاتما گاندھی اور ان کے

ساتھیوں کا یہ اندازہ درست نہ تھا۔ انگریز کے سیاسی غلبہ کا خاتمہ ملک میں ترقی اور خوشحالی کے نئے دور کا آغاز ہے۔ اس معاملہ میں ہمارے لیڈر معصومانہ حد تک ایک غلط اندازہ کا شکار ہوئے۔

وقت کے بہت سے دوسرے سیاسی رہنماؤں کی طرح، مہاتما گاندھی نے یہ سمجھ لیا کہ ملک میں انگریزوں کا راج تمام خرابیوں کا منبع (Source of all evils) ہے۔ جب بدیشی راج ختم ہوگا اور دیشی راج ملک میں آئے گا تو اس کے بعد اپنے آپ سارے معاملات درست ہو جائیں گے۔ مگر یہ انسانی نفسیات اور تاریخی عوامل سے معصومانہ حد تک بے خبری کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ سماجی حالات خود سماج کی اصلاح سے درست ہوتے ہیں نہ کہ حکومتی افراد کی تبدیلی سے۔ یہی وجہ ہے کہ مہاتما گاندھی اور ان کے ساتھیوں کا لایا ہوا سوراج محض ایک قسم کا (coupe) بن گیا۔ نہ کہ وہ چیز جس کو انقلاب (revolution) کہا جاتا ہے۔ کو میں صرف حکمراں افراد بدلتے ہیں، جب کہ انقلاب میں پورے سماجی حالات میں ایک نیا دور آجاتا ہے (اس معاملہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، انگریزی اخبار پانیر ۲۶ر جنوری ۱۹۹۷)

۲۰ر جنوری ۱۹۹۷ کی مذکورہ میٹنگ میں میری بات سن کر ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ آپ مہاتما گاندھی پر تنقید کر رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ یہ مسئلہ کسی شخصیت کا نہیں ہے بلکہ ملک کا ہے:

I love Gandhi, but I love India more than Gandhi.

میں نے کہا کہ یہ تنقید نہیں ہے بلکہ وہ از سر نو جائزہ (re-assessment) ہے اس قسم کا جائزہ اس لئے ضروری ہے کہ ہم بار بار اسی سابقہ غلطی کو دوہرا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۷ میں جے پرکاش نرائن نے پورن سوراج (Total revolution) کا آندولن چلایا اس کا فلسفہ بھی عین وہی تھا۔ ہمارے پچھلے لیڈروں نے برٹش راج کو تمام خرابیوں کا سرچشمہ سمجھا تھا۔ اسی نظریہ کے تحت جے پرکاش نرائن نے کانگریس راج کو ملک کی تمام خرابیوں کا سرچشمہ سمجھ لیا اور اس کے خلاف دھواں دھار تحریک شروع کر دی۔

کانگریس راج ختم کرنے کی حد تک یہ تحریک صد فی صد کامیاب رہی۔ مگر مطلوب ریولیوشن لانے میں وہ صد فی صد ناکام رہی۔ ٹوٹل ریولیوشن تو درکنار جزئی ریولیوشن بھی اس کے ذریعہ سے نہ آسکا۔ اس لئے انتہائی ضروری ہے کہ ماضی کی سیاسی تاریخ کا بے لاگ جائزہ لیا جائے تاکہ ہم ایک ہی غلطی کو بار بار دھرانے سے بچ جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انقلاب کا راز غیر سیاسی اداروں کی تبدیلی میں ہے نہ کہ کسی سیاسی گدی کے گدی نشین کو بدلنے میں۔

28

زیکوسلواکیا (Czechoslovakia) پر جرمن ڈکٹیٹر ہٹلر کے قبضہ کے بعد وہاں کے بہت سے یہودی بھاگ کر دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔ ان میں ایک یہودی جوڑا ڈاکٹر نیڈل اور مسز نیڈل ہندوستان آئے۔ یہ لوگ ایک دستکاری کے ماہر تھے جو اس وقت کے زیکوسلواکیا میں پائی جاتی تھی، وہ مخصوص ٹکنیک سے شیشہ کو پگھلا کر اس سے آرائشی چیزیں بناتے تھے۔ یہ ۱۹۳۸ کا زمانہ تھا جب کہ ہندوستان کی کئی ریاستوں میں کانگریس کی حکومت پہلی بار قائم ہوئی تھی۔ یوپی گورنمنٹ کے تکنیکل ایجوکیشن کے ڈپارٹمنٹ نے اس یہودی جوڑے کو بنارس ہندو یونیورسٹی میں ٹھہرایا۔ اور یہ انتظام کیا کہ وہ اپنا یہ فن ہندوستانیوں کو سکھائیں۔

یوپی کی کانگریس حکومت کے تعاون سے جن لوگوں نے اس صنعت کو سیکھا ان میں میرے بڑے بھائی عبدالعزیز خاں (وفات ۱۹۸۸) بھی تھے۔ اس فن کو سیکھنے کے بعد انھوں نے ۱۹۴۴ میں اعظم گڈھ میں لائٹ اینڈ کمپنی کے نام سے ایک کارخانہ کھولا جو بعد کو لائٹ اینڈ کمپنی لمٹیڈ بن گیا۔

میرے بھائی ڈاکٹر نیڈل کے بہت سے قصے سناتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر نیڈل ڈسپلن کا بہت زیادہ پابند تھا۔ ایک منٹ ادھر اُدھر ہونا اس کو گوارہ نہ تھا۔ ایک بار اس نے زیر تربیت نوجوانوں کو گورنمنٹ کی کوئی ہدایت بتائی ایک مرحلہ میں اس کو محسوس ہوا کہ لوگ سختی

سے اس ہدایت کی پابندی نہیں کر رہے ہیں۔ اس نے تقریباً چیخ کر کہا کہ یہ ایک سرکاری حکم ہے۔

It is a government rule.

میرے بھائی جو سامان تیار کرتے تھے وہ زیادہ تر باہر کے علاقوں میں بھیجا جاتا تھا۔ مثلاً ساؤتھ انڈیا، سری لنکا وغیرہ۔ یہ پورا کام ڈاکخانہ کے ذریعہ ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں ڈاکخانہ نہایت صحت کے ساتھ کام کرتا تھا۔ ایک بار ایک پوسٹ مین نے ہماری کوئی ڈاک گڑ بڑ کر دی۔ بھائی صاحب نے اس کی شکایت لکھ کر ڈاکخانہ بھیج دی۔ اس کے بعد ڈاکخانہ کا پورا محکمہ، حتی کہ پوسٹ آفس سپرنٹنڈنٹ اس طرح سرگرم ہو گئے جیسے کہ کوئی ہنگامی صورت حال پیدا ہو گئی ہو۔ یہ معاملہ صرف اس وقت ختم ہوا جب کہ پوسٹ مین نے آکر میرے بھائی سے معافی مانگی اور انھوں نے اس کو تحریری معافی نامہ دے دیا۔

یہ ۱۹۴۷ سے پہلے کا وہ ہندستان تھا جس کو بہت سے دوسرے دیکھنے والوں کے ساتھ میں نے بھی دیکھا اور جانا۔ آج یہ ہندستان کہیں موجود نہیں۔ آج یہ حالت ہے کہ سرکاری ہدایات آتی ہیں اور دفتروں میں فائل کر کے رکھ دی جاتی ہیں۔ نہ کوئی ان کو سنجیدگی کے ساتھ پڑھتا اور نہ وہ ان پر عمل کرتا۔

۱۹۴۷ کے بعد جب ہمارے سماج میں بگاڑ آیا اور ہر شعبہ میں گراوٹ کے آثار ظاہر ہوئے تو ہمارے نئے حکمرانوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ وہ ہر مسئلہ پر ایک قانون بنائیں۔ انگریزوں نے اپنے دو سو سالہ حکومت کے دوران صرف پانچ سو قانون بنائے تھے۔ مگر آزادی کے بعد ہماری حکومت نے پچاس سال کے اندر پانچ ہزار سے زیادہ قوانین بنا ڈالے۔ ان کے علاوہ قاعدوں اور ضابطوں کی صورت میں روزانہ جو احکام جاری ہوتے رہتے ہیں ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ مگر آج یہ حالت ہے کہ سرکاری دفتروں میں کوئی شخص قانون اور ضابطہ کے حوالہ سے اپنا کوئی حق نہیں پا سکتا۔ اب سرکاری دفتروں سے لے کر عدالتوں تک ہر جگہ رشوت اتنا زیادہ عام ہو چکی ہے کہ مزید پیسہ خرچ کئے بغیر کسی کا کوئی کام ہونا ممکن ہی نہیں۔

قانون کی کثرت نے موجودہ ہندستان کو قانون کا جنگل بنادیا ہے قوانین کی یہ کثرت ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے نہ کہ معاون، نئی دہلی کے ایک سینئر وزیر نے جون ۱۹۹۸ میں اپنی ایک گفتگو کے دوران کہا کہ میں حکومت میں بڑے بڑے ارادے لے کر آیا تھا مگر یہاں حالت یہ ہے کہ میرا بیشتر وقت قانون اور ضابطہ کی خانہ پوری میں الجھا رہتا ہے۔ دفتر میں ہر روز میرا تقریباً دس گھنٹہ کاغذوں کے انبار پر دستخط کرنے میں گذر جاتا ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے انگریزی حکومت کے زمانہ میں موجودہ قسم کے کرپشن کا کوئی تصور ہی نہ تھا جو آج ہر جگہ پایا جارہا ہے۔ میں نے ایک میٹنگ میں کہا کہ اس صورت حال کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہمارے ان لیڈروں پر ہے جو تحریک آزادی کے ہیرو سمجھے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے ان ہیروؤں نے اس حقیقت کو کیوں نہیں جانا کہ ملک کو انگریزوں سے آزاد کر کے وہ اس کو جس سماج کے حوالہ کر رہے ہیں وہ ایک دولت پرست سماج ہے۔ انگریزی دور میں محکوم ہونے کی بنا پر اس کی دولت پرستی چھپی ہوئی ہے۔ جیسے اس کو حاکمانہ حیثیت حاصل ہو گی اس کی دولت پرستی پورے طور پر ابھر آئے گی اور ملک لوٹ و بھرشٹاچار کا جنگل بن جائے گا جیسا کہ عملاً پیش آیا۔

آزادی کے بعد ملک کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ ہمارے ملک میں سب سے زیادہ جس چیز کی کمی ہے وہ سائنٹفک ٹمپر (سائنسی مزاج) ہے۔ یہ بلاشبہ ایک صحیح بات تھی۔ مگر یہ بات ان کو ۱۹۴۷ سے پہلے جاننا چاہئے تھا۔ ہمارے لیڈروں، ہندو اور مسلم دونوں پر فرض کے درجہ میں ضروری تھا کہ وہ سب سے پہلے یہ کام کریں کہ قوم سے دولت پرستی کا مزاج ختم کریں اور اس کے اندر صحیح معنوں میں سائنسی مزاج پیدا کریں۔ اگر وہ ۱۹۴۷ سے پہلے ذہنی تعمیر کا یہ کام کرتے تو آزادی بلاشبہ ہمارے لئے ایک نعمت ہوتی۔ مگر اس ابتدائی تیاری کے بغیر جب وہ آزادی لائے تو فطری طور پر یہ ہوا کہ ملک مالی بھرشٹاچار کا جنگل بن گیا۔

موجودہ زمانہ میں ایک لفظ کا بہت زیادہ چرچا کیا جاتا ہے، اور وہ دیش بھکتی ہے، میں دیش بھکتی کو ملک کی نئی تعمیر کے لئے بے حد اہم سمجھتا ہوں مگر دیش بھکتی کے شور میں مجھے کوئی سچا

دیش بھگت دکھائی نہیں دیتا۔اپنے علم اور تجربہ کی بنیاد پر میرا شدید احساس ہے کہ ہمارے لیڈروں میں شاید کوئی ایک شخص بھی نہیں جو حقیقی معنوں میں دیش بھگت ہو۔مجھے ہر ایک صرف خویش بھگت دکھائی دیتا ہے۔نہ کہ دیش بھگت۔

29

یشپال ایک ہندی ناول نگار ہے انھوں نے اپنی زندگی تشدد پسند انقلابی کی حیثیت سے شروع کی۔۱۹۳۱ میں انگریزی حکومت نے انھیں گرفتار کرلیا۔بعد کو وہ ایک زیرک دانشور کی حیثیت سے ابھرے۔انھوں نے پریم چند کی روایات کو آگے بڑھایا "جھوٹا سچ" ان کا ایک بہت مشہور ناول ہے۔

اس ناول میں وہ بتاتے ہیں ۱۹۴۷ سے پہلے برصغیر ہند کے نیتاؤں نے جن نعروں پر قوم کو سرحد کے دونوں طرف اٹھایا۔وہ سب تباہ کن نعرے تھے۔نعروں کی اس سیاست نے پورے برصغیر کو تباہی کے سوااور کچھ نہیں دیا۔نیتاؤں کے نعرے صرف جھوٹے تھے جن کو سچ کے روپ میں پیش کیا گیا۔"جھوٹا سچ" اسی کی کہانی ہے، تاہم ان کے ناول کا آخری باب پرامید الفاظ پر ختم ہوتا ہے۔"دیش کا مستقبل چند نیتاؤں کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ جنتا کے ہاتھ میں ہے۔

مگر ناول نگار کے یہ الفاظ بھی موجودہ مدت میں ایک فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔سوال یہ ہے کہ ہندستان کا نظام کیا وہ سو کروڑ باشندے چلائیں گے جن کو جنتا کہا جاتا ہے۔ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔عملی طور پر جو ہوگا وہ یہ کہ ملک میں الیکشن کرائیں جائیں گے۔ اس الیکشن میں جولوگ جیتیں گے وہی حکومت بنا کر ملک کا نظام چلائیں گے اس کا مطلب یہ ہے کہ دوبارہ یہ نیتا ہی ہوں گے جو ملک کے حال اور مستقبل کے مالک ہوں گے نہ کہ جنتا۔

ہمارے ملک کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کی عام جنتا ایک بے شعور بھیڑ ہے۔تعلیمی پس ماندگی کی بنا پر وہ نعرہ اور حقیقت کے درمیان فرق نہیں جانتے۔وہ استحصالی الفاظ اور تعمیری الفاظ کے درمیان تمیز نہیں کرسکتے۔جنتا کی یہی بے شعوری ہے جس نے نیتاؤں کو یہ موقع دیا کہ

ہ جھوٹ کو سچ کے روپ میں پیش کریں اور جنتا اس پر یقین کرتے ہوئے اپنا ووٹ دے۔

ے ۱۹۴۷ سے پہلے جب مہاتما گاندھی سیاسی آزادی کا اندولن چلا رہے تھے تو ان سے کہا گیا کہ آپ ملک کو آزاد کر کے اسے جن لوگوں کے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں وہ اشکچھت لوگ ہیں اور اشکچھت لوگ کسی ملک کا نظام درست طور پر نہیں چلا سکتے۔ مہاتما گاندھی نے اس کے جواب یں کہا کہ میرے دیش کے لوگ اشکچھت ہیں، مگر وہ آگیانی نہیں۔ لیکن پچھلے پچاس سال کا تجربہ ناتا ہے کہ جو لوگ آشکچھت ہوں وہ ہمیشہ آگیانی ہی ہوتے ہیں۔ گیان کے لئے شکچھا دینا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ جسم کی تندرستی کے لئے غذا، یہ فطرت کا ایک اصول ہے جس میں کوئی استثنا نہیں۔

جنتا کی اس کمزوری نے ہمارے لیڈروں کو یہ موقع دیا کہ وہ بڑے بڑے الفاظ بول کر ان کا سیاسی استحصال کریں۔ جو لوگ سنجیدہ طور پر قوم کی تعمیر کرنا چاہتے ہوں وہ ہمیشہ لو پروفائل میں کام کرتے ہیں۔ لیکن بے شعور جنتا لو پروفائل کی زبان نہیں سمجھتی۔ چنانچہ وہ ان لوگوں کے پیچھے دوڑ پڑتی ہے جو ہائی پروفائل میں بول رہے ہوں۔ سنجیدہ قائد لوگوں کے سامنے حقیقت پسندانہ پروگرام پیش کرتا ہے۔ مگر بے شعور جنتا حقیقت پسندانہ پروگرام کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتی۔ چنانچہ وہ ان لوگوں کے پیچھے دوڑ پڑتی ہے جو فرضی نقشے بنا کر جذباتی تقریریں کر رہے ہوں۔

یہ ساری خرابی اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ بے شعور یا کم علم لوگ معاملات کا تجزیہ نہیں کر پاتے۔ اس لئے وہ استحصالی نیتاؤں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مئی ۱۹۹۸ میں ہندستان کے موجودہ حکمرانوں نے فوجی خزانہ پر ناقابل برداشت بوجھ ڈال کر پانچ ایٹمی دھماکے کئے۔ اس پر امریکہ نے اعتراض کیا تو ہمارے لیڈروں نے کہا کہ امریکہ کو ہمارے اوپر اعتراض کرنے کا حق نہیں۔ کیونکہ ہم نے تو صرف پانچ ایٹمی دھماکے کئے ہیں، جب کہ امریکہ اب تک دو ہزار سے زیادہ ایٹمی دھماکہ کر چکا ہے۔ اس طرح ہمارے لیڈروں نے عوام کو جذباتی شراب پلا کر اتنا بے خود کر دیا کہ وہ معاملہ پر زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچ ہی نہ سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں اصل تقابل دھماکوں کی گنتی کا نہیں ہے بلکہ ہندوستان اور امریکہ کے درمیان اقتصادی فرق کا ہے۔امریکہ نے دو سو سال تک مسلسل تعمیری عمل کر کے اپنے ملک کو اعلیٰ ترین ترقی یافتہ ملک بنادیا۔وہاں ہر قسم کی شہری سہولتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ہندستان سے لاکھوں لوگ حتی کہ خود ہمارے لیڈروں کے بیٹے اور بیٹیاں بھاگ کر امریکہ پہنچ رہے ہیں۔ایسی حالت میں ہمارے لیڈروں پر فرض ہے کہ پہلے وہ ملک کے شہریوں کو وہ تمام سہولتیں فراہم کریں جو امریکہ کے شہریوں کو حاصل ہیں۔اس کے بعد ہی وہ ایٹمی دھماکے کر سکتے ہیں۔موجودہ حالت میں ایٹمی دھماکہ ایک ایسا ایٹمی تعیش ہے جس کا تحمل ہندوستان جیسا غریب ملک نہیں کر سکتا۔

دہلی کے ایک صاحب نے اس معاملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ دہلی میں میرے پاس اتنی پراپرٹی ہے کہ اگر میں ان سب کو بیچ دوں تو میں ایک ہوائی جہاز خرید سکتا ہوں۔مگر میرا ہوائی جہاز خریدنا صرف اس قیمت پر ہوگا کہ اگلے دن میں اور میرے بچے بالکل بے سہارا حالت میں سڑک پر ہوں گے۔ہندوستان کا ایٹمی دھماکہ جس اقتصادی تباہی کی قیمت پر ہوا وہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنا سارا اثاثہ بیچ کر ایک ہوائی جہاز خرید لے اور فخر سے کہے کہ فلاں شخص کی طرح میں بھی ہوائی جہاز کا مالک ہو گیا، حالانکہ اس کے بعد اس کے پاس نہ رہنے کا کوئی گھر ہو اور نہ کھانے پینے کا کوئی سامان۔

30

آل انڈیا مسلم لیگ کے لیڈر چودھری خلیق الزماں (۱۸۸۸-۱۹۷۳) ۱۹۴۷ میں فخر کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ نہرو سے زیادہ سیاست میرا کوچوان جانتا ہے۔چودھری خلیق الزماں اور دوسرے مسلمان لیڈر اس بھرم میں تھے کہ "مسلمان" چونکہ ہزار سال سے حکومت کرتے چلے آرہے ہیں۔اس لئے حکومت و سیاست ان کا خاندانی ہنر بن چکا ہے۔پاکستان بن جائے گا تو اپنے آپ ہی مسلمان اس کا نظام بہتر طور پر چلانے لگیں گے۔مگر پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ

ثابت کر رہی ہے کہ یہ مفروضہ مکمل طور پر بے بنیاد تھا۔

قومی یا ملی تعمیر ایک لمبا عمل ہے۔ وہ حال میں شروع ہو کر مستقبل میں اپنی تکمیل تک پہنچتا ہے۔ اس لئے قومی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ اس کو ایسے صاحب بصیرت لیڈر مل جائیں جو مستقبل بیں ہوں اور اپنے زمانہ میں قومی عمل کو ایسا رخ دے سکیں جو مستقبل میں مطلوب نتیجہ ظاہر کرنے والا ہو۔

۱۹۴۷ سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ قوم کو تعلیم کے رخ پر چلایا جائے کیوں کہ تعلیم ہی وہ انسان بناتی ہے جو زندگی کے کاروبار کو بہتر طور پر سنبھالنے کا اہل ہو۔ الطاف حسین حالی (وفات ۱۹۱۴) اپنے زمانے کے مسلمانوں میں ایک بدنام شخص کی حیثیت رکھتے تھے۔ معاصر مسلمان ان کو اپنے رہنما کے طور پر قبول نہ کر سکے تاہم انھوں نے اس معاملہ میں نہایت صحیح اور سچی بات کہی تھی:

بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے — کہ دنیا میں جو کچھ ہے تعلیم ہی ہے

مگر ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں تعلیم کے بجائے سیاسی آزادی کو زیادہ اہمیت دے دی گئی۔ اس غلط ترجیح کا بھیانک نتیجہ یہ نکلا کہ ایک عظیم ملک ایک ایسی بھیڑ کے ہاتھ میں آ گیا جس کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ اس کے نظام کو کس طرح چلانا ہے۔

آزادی کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی تھی کہ ملک میں بہترین مواقع کار پیدا کئے جائیں تاکہ ہر آدمی کو اپنے ترقیاتی حوصلوں کی تکمیل کے اسباب ملتے چلے جائیں۔

مگر آزادی کے بعد جس قیادت کے ہاتھ میں ملک کا سیاسی اختیار ملا وہ ایک بے شعور قیادت تھی۔ اس نے انتہائی نادانی کے ساتھ یہ کیا کہ زندگی کے تمام شعبوں کو حکومت کے کنٹرول میں لینے کو سب سے اہم کام سمجھ لیا۔ اس نے دیو پیکر پبلک سکٹر (صحیح تر لفظ میں سرکاری سکٹر) قائم کئے۔ ہر سرگرمی کے لئے سرکاری پرمٹ اور سرکاری لائسنس کو ضروری بنادیا۔ سماجی فلاح کے نام پر ایسے غیر فطری قوانین بنائے کہ جے آر ڈی ٹاٹا کے الفاظ میں ایک کمپنی کا مالک اپنی

بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ مگر وہ اپنے ایک کارکن کو برخواست نہیں کر سکتا۔"

ٹاٹا کا اشارہ اس صورت حال کی طرف تھا کہ لیبر کے حقوق کے تحفظ کے نام پر ایسے قوانین اور ضابطے بنائے گئے جو مکمل طور پر لیبر کے حق میں تھے۔ ہمارے حکمرانوں نے اپنے سوشلسٹ ذہن کی بنا پر یہ فرض کر لیا کہ کمپنی کا مالک لازماً ظالم ہو گا اور کمپنی کا ملازم لازماً مظلوم۔ چنانچہ انھوں نے آزادی کے بعد ایسے قوانین اور ضابطے بنائے جو یک طرفہ طور پر ملازمین کے موافقت میں تھے یہ قوانین ملازمین کے حق میں اندھا ہتھیار بن گئے ہیں جن کے ذریعہ وہ اقتصادی ادارہ کو اکسپلائٹ کریں اور اقتصادی ادارے بے بسی کے ساتھ اس کا تماشہ دیکھتے رہیں۔ مزید یہ کہ تحفظِ حقوق کے اس سوشلسٹ نظریہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ اقتصادی عمل سے مسابقت کا عنصر ختم ہو گیا۔ ان غیر فطری قوانین نے کروڑوں لوگوں کو اس بات سے بے خوف بنا دیا کہ ان کے جاب کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ وہ ڈیوٹی ادا کئے بغیر بھی اپنے حقوق کو پا سکتے ہیں۔ اس طرح ان نام نہاد قوانین نے ملک کے کروڑوں لوگوں کو کاہل بنا دیا اور ڈیوٹی کی اہمیت کا احساس ان کے اندر سے ختم کر دیا۔

31

ملک کی تقسیم کی تحریک ایک غیر فطری تحریک تھی۔ مزید یہ کہ وہ انتہائی غیر فطری انداز میں چلائی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا نقصان واقعی نقصان سے کئی گنا زیادہ ہو گیا۔

تقسیم بذات خود کوئی گناہ کی بات نہیں۔ مگر کوئی کام حتی کہ کھانا اور پینا بھی اگر غلط طریقہ سے کیا جائے تو وہ آدمی کے لئے نقصان کا سبب بن جائے گا۔ یہی معاملہ تقسیم کے ساتھ پیش آیا۔

۱۔ پہلی بات یہ کہ تقسیم کی تحریک کسی ایجابی سوچ کے تحت نہیں اٹھی وہ تمام تر ردعمل کے تحت اٹھی۔ کچھ ہندوؤں کے فرقہ وارانہ تحریک نے مسلمانوں میں جوابی فرقہ واریت پیدا کی۔ اور اس نے آخر کار تقسیم کی تحریک کا رخ اختیار کر لیا۔ اس تحریک کے سب سے بڑے قائد

زبردست نیشنلسٹ اور لمبی مدت تک کانگریسی تھے۔ بعض واقعات کی بنا پر وہ کانگریسی قائدین سے غصہ ہو گئے اور آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہو کر تقسیم کی تحریک کے علمبردار بن گئے۔

رد عمل کی نفسیات کے تحت جو تحریک شروع کی جائے وہ منفی نتائج تو ضرور پیدا کر سکتی ہے مگر وہ مثبت نتائج کا سبب نہیں بن سکتی۔ یہی پاکستان کے ساتھ پیش آیا۔

۲۔ تقسیم کے بعد پاکستان عملاً جہاں بننے والا تھا وہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا۔ مگر یہ تحریک زیادہ تر ان علاقوں میں چلائی گئی جہاں مسلمان اقلیت کی حیثیت رکھتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اکثریتی علاقہ کے مسلمان اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ مل جل کر رہ رہے تھے۔ ان کے یہاں "ہندو مسئلہ" نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ اس لئے ان کے درمیان تقسیم کی تحریک پنپ نہ سکی۔ البتہ مسلم اقلیت والے علاقے کے مسلمان ہندو کی طرف سے عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا تھے۔ اس لئے یہاں اس تحریک کو مفید میدان مل گیا۔ مگر تحریک کا یہ انداز خطرناک حد تک غیر فطری تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان عملاً مسلم اکثریت کے علاقہ میں بنا مگر اس کی قیمت تمام تر اس علاقہ کے مسلمانوں کو دینی پڑی جہاں وہ اقلیتی حیثیت رکھتے تھے کیوں کہ اسی علاقہ میں پاکستانی تحریک کی دھوم مچائی گئی تھی۔

۳۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پاکستان کی تحریک کی قیادت مسٹر طبقہ نے کی۔ علماء کا طبقہ تقریباً ۹۹ فیصد اس سے الگ رہا۔ بالفاظ دیگر پاکستان کی تحریک ایک قومی اور مادی تحریک تھی۔ وہ کسی بھی درجہ میں کوئی مذہبی یا اسلامی تحریک نہ تھی۔ مگر عوام کا استحصال کرنے کے لئے مسلسل طور پر اس کے حق میں اسلام کا نام استعمال کیا گیا۔ اس کی حمایت میں یہ لفظی نعرہ وضع کیا گیا کہ : پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ۔

ایک قومی تحریک کو اسلامی تحریک بنانا سراسر دو عملی کا ایک فعل تھا۔ یہ وہی چیز تھی جس کو شریعت کی زبان میں منافقت کہا جاتا ہے۔ یہ منافقانہ سیاست کا ایک ایسا واقعہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال اسلام کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منافقانہ روش پاکستان

کی تمام پالیسیوں کا اہم ترین عنصر بن گیا۔ ہر غیر دینی کام کو دینی اصطلاح میں بیان کرنا پاکستان کے دانشوروں کا کمال قرار پایا۔ اسلام کی پوری تاریخ میں میرے علم کے مطابق، کوئی بھی مسلم گروہ ایسا نہیں جس نے منافقت ہی کو اپنی تمام پالیسیوں کی بنیاد بنایا ہو۔ تقسیم کے نتیجہ میں بننے والا مسلم ملک ہی اس کی واحد تاریخی مثال ہے جس کو بر عکس طور پر پاکستان کہا جا سکتا ہے۔

۴۔ پاکستان جب بنا تو لیڈروں کی ناعاقبت اندیشانہ سیاست کے نتیجہ میں سرحد کے دونوں طرف بھیانک فسادات پھوٹ پڑے۔ لوٹ مار اور قتل و غارتگری کا زبردست سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں نفرت کی ایک خونیں فصل اگ آئی۔

تقسیم کے بعد سرحد کے دونوں طرف عرصہ دراز تک لوگ زبان اور قلم کے ذریعہ اس کی خونیں داستانیں دہراتے رہے۔ اس داستان سرائی کا بدترین پہلو یہ تھا کہ پاکستان میں لکھی جانے والی کتابوں میں صرف ان واقعات کا تذکرہ تھا جو بوقت تقسیم ہندوؤں نے مسلمانوں پر کئے۔ اور انڈیا میں لکھی جانے والی کتابوں میں صرف ان واقعات کا تذکرہ تھا جس میں ہندو مسلمانوں کے ظلم کا شکار ہوئے۔ مکمل رپورٹینگ کی جاتی تو دونوں کے درمیان توازن قائم رہتا مگر مذکورہ قسم کی یکطرفہ رپورٹنگ نے سرحد کے دونوں طرف نفرت اور عداوت کی آگ بھڑکا دی جو کسی طرح ختم ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔

۵۔ پاکستان کی بنیاد اگر اسلام پر ہوتی تو وہاں اپنے پڑوسیوں کے لئے محبت اور خیر خواہی کا جذبہ ابھرتا کیونکہ اسلام دوسری قوموں کو اپنا مدعو سمجھتا ہے۔ اور مدعو کے حق میں ہمیشہ محبت کی نفسیات پیدا ہوتی ہے نہ کہ عداوت کی نفسیات۔ مگر پاکستان کی بنیاد باعتبار حقیقت اسلام تھی ہی نہیں۔ پاکستان ہندوؤں سے قومی نفرت کی بنیاد پر بنا اسی کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ پاکستان بننے کے بعد وہاں رات دن ہندو اور بھارت کے خلاف نفرت کا پروپیگنڈہ ہونے لگا۔ بھارت کا لفظ پاکستانی زبان میں، ایک نفرت انگریز چیز کی ہم معنی بن گیا۔ پاکستانی علماء اور دانشوروں کا ذہن یہ بن گیا کہ پاکستان کی بقا اور اس کے استحکام کے لئے ضروری ہے کہ ہر پاکستانی کو بھارت سے متنفر کر دیا جائے۔

پچھلے پچاس سال میں پاکستان کی ہر تقریر و تحریر بھارتی نفرت سے بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ بلاشبہ ایک عظیم نقصان ہے۔ کیونکہ کوئی قوم نفرت کی بنیاد پر نہ کھڑی ہو سکتی ہے اور نہ ترقی کر سکتی ہے۔

۲۔ تقسیم کا مطلب علیحدگی ہے۔ دو بھائیوں میں جائداد کی تقسیم ہو تو دونوں کی فلاح اس میں ہے کہ اول دن ہی ہر چیز کا کامل بٹوارہ ہو جائے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ خاندانی بٹوارہ کے بعد اگر ایک درخت بھی متنازع رہ جائے تو اس پر بھی لڑائی شروع ہو جاتی ہے جو دونوں کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔

پاکستان کے قائدین کے لئے فرض کے درجہ میں ضروری تھا کہ وہ اس حقیقت کو جانیں اور ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ ہی کو اس طرح مکمل طور پر الگ ہو جائیں کہ اس کے بعد کوئی بھی چیز غیر منقسم حالت میں باقی نہ رہے۔ مگر اس سنگین حقیقت کو نہ پاکستانی قائدین نے سمجھا اور نہ ہندوستانی قائدین نے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقسیم کے باوجود کشمیر کی ریاست نزاعی حالت میں پڑی رہی۔

یہ بلاشبہ دونوں طرف کے قائدین کے لئے ایک ہمالیائی غلطی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انڈیا اور پاکستان دونوں ہی کے وسائل کا پچاس فیصد سے زیادہ حصہ کشمیر کے نزاع پر قربان ہو رہا ہے۔ پچاس سال گذرنے کے باوجود یہ مسلسل تباہی ختم ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔

دونوں ملکوں کے قائدین کا یہ اہم ترین فرض تھا کہ تقسیم کے وقت ہی وہ کسی بھی صورت میں اس مسئلہ کا مکمل خاتمہ کر دیتے۔ مگر دونوں میں سے کسی بھی ملک کی قیادت نے اس معاملہ میں تدبر کا ثبوت نہیں دیا۔ پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے بعد از خرابی بسیار ۱۹۷۲ء میں وہ معاہدہ کیا جس کو عام طور پر شملہ ایگریمنٹ کہا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کے تحت پاکستانی وزیر اعظم نے بلا اعلان یہ مان لیا تھا کہ قبضہ کی لائن (LoC) دونوں ملکوں کے درمیان تسلیم شدہ سرحد ہوگی۔

پاکستان کے لوگوں نے اگر ۱۹۷۲ کے اس معاہدے کو دل سے مان لیا ہوتا تو پچھلے پچیس

ال میں پاکستان نے اتنی ترقی کی ہوتی کہ اس کے عوام کشمیر کو بھول جاتے۔ مگر پاکستانی حکمرانوں نے کاغذ پر تو دستخط کر دیئے مگر وہ اس کو اپنی عملی پالیسی نہ بنا سکے۔ ۱۹۷۲ کے بعد پاکستان میں ایک ں تاریخ بننے والی تھی مگر وہ بنتے بنتے رہ گئی۔

32

۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں ایک انقلابی شاعر نے ایک نظم لکھی جس کا ایک شعر یہ تھا:

برج محن سے نکلا سورج　　روشن اپنا مستقبل ہے

اس تصور کو لیکر طفیل احمد منگلوری نے ایک کتاب لکھی۔ جس کا نام انھوں نے روشن مستقبل رکھا یہ کتاب اس زمانہ میں بہت مقبول ہوئی۔ اس واقعہ کے تقریباً ۶۰ سال بعد یکم ون ۱۹۹۸ کو میں آل انڈیا نشریات سن رہا تھا۔ اس تاریخ کو بھاجپا گورنمنٹ کے وزیر مالیات مسٹر شونت سنہا نے ۹۹۔۱۹۹۸ کا بجٹ پیش کیا۔ اپنی بجٹ اسپیچ انھوں نے اس جملے سے شروع کی کہ ج ایک نیا انڈیا ابھر رہا ہے:

A new India is rising.

انھوں نے کسی قدر جوش کے ساتھ کہا کہ ۱۱ر مئی کو پوکھرن سے جو سفر شروع ہوا وہ پیچھے جانے والا نہیں، میں نے سوچا کہ اپنی نوجوانی کی عمر سے اب تک میں بار بار مختلف لفظوں میں یہ ات سنتا رہا ہوں۔ مگر آج تک یہ الفاظ واقعہ نہیں بنے۔ نہ سورج نے نکل کر ہماری تاریکیوں کو روشن کیا اور نہ نئے انڈیا کا محل تعمیر ہو سکا۔ بظاہر مستقبل قریب تک اس کی کوئی امید نہیں۔

اس ناکامی کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے رہنما ایک چیز سے ایسی امید باندھتے رہے ہیں جس سے اس کا حصول ممکن ہی نہیں تھا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے لوگوں نے جس چیز کو روشن مستقبل سمجھا تھا اس کا تعلق صرف سیاسی تبدیلی سے تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کے انگریزی راج کا ختم ہونا ملک کے افق پر نئی صبح کا طلوع ہونا ہے۔ حالانکہ محض پولیٹیکل ٹیم کی تبدیلی کسی قوم کے لئے روشن مستقبل کی ضمانت نہیں اسی طرح اب ۱۹۹۸ میں ایٹمی دھماکہ کے بعد نئے انڈیا کی

باتیں کی جارہی ہیں۔ مگر یہ بھی محض ایک فرضی امید ہے۔ایٹمی دھماکہ کا تعلق ایک ایسی سرگرمی سے ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے تمام تر سلبی ہے اور ایک سلبی سرگرمی سے خواہ بظاہر وہ کتنا ہی بڑی ہو، کوئی ایجابی نتیجہ بر آمد ہونے والا نہیں۔اس قسم کی ایٹمی سرگرمی صرف وسائل کو کھانے والی ہے نہ کہ وسائل کو مفید چیزوں میں تبدیل کرنے والی۔

روشن مستقبل یا نئے انڈیا کا ظہور جس چیز پر منحصر ہے وہ وسیع تر سماجی تبدیلی ہے نہ کہ محض سیاسی تبدیلی۔ پھیلے ہوئے ملک کے قدرتی ذرائع مثبت مقاصد کے لئے استعمال ہوں۔ایسی پلاننگ کی جائے جس کے نتیجہ میں لوگوں کو صاف پانی اور تازہ ہوا مل سکے۔ملک کو ایسا ایڈمنسٹریشن دیا جائے جس کے تحت دفتروں میں رشوت کے بغیر کام ہو۔ عدالتوں میں ایک عام آدمی کو انصاف ملے، سڑک، بجلی، ٹیلی فون اور دوسری ضروری چیزیں معیاری صورت میں دستیاب ہوں۔ ریل اور ٹرانسپورٹ کے شعبے اس طرح منظم ہوں کے لوگوں کے لئے محفوظ اور بروقت سفر کرنا ممکن ہو جائے۔اسپتالوں میں ہر آدمی بہ آسانی اپنا علاج پاسکے۔ مگر ان چیزوں کا تعلق نہ ایٹمی دھماکہ سے ہے اور نہ سیاسی گدی پر ایک کو ہٹا کر دوسرے کو بٹھانے سے۔

میرے جیسے ایک آدمی کو مذکورہ قسم کے الفاظ سے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ میری بوڑھی آنکھیں ملک میں تعمیر و ترقی کا ایک حقیقی عمل دیکھنا چاہتی ہیں۔ مگر بدقسمتی سے ابھی تک اس کا آغاز بھی نہیں ہوا۔

33

ہندستان نے بھارتیہ جنتاپارٹی کی سیاسی قیادت کے تحت پانچ ایٹمی دھماکے کئے۔ یہ دھماکے ۱۱ مئی اور ۱۳ مئی ۱۹۹۸ء کو پوکھرن (راجستھان) میں کئے گئے۔اس کے بعد پاکستان میں اس کا ردّ عمل ہوا۔پاکستانی عوام کی طرف سے شدید مطالبہ ہونے لگا کہ پاکستان کو بھی اس کے جواب میں ایٹمی دھماکہ کرنے چاہیے۔ یہ معاملہ پر شور طور پر عالمی میڈیا میں گونجتا رہا۔امریکہ نے اصرار کے ساتھ کہا کہ پاکستان خاموشی اختیار کرلے اور ہندستان کے جواب میں ایٹمی دھماکہ نہ

کرے۔ امریکی حکومت نے کہا کہ دھماکہ کرنے کی صورت میں پاکستان کے خلاف سخت اقتصادی پابندیاں عائد کی جائیں گی اور دھماکہ نہ کرنے کی صورت میں نہ صرف اس کی اقتصادی مدد جاری رہے گی بلکہ اس کو "ایٹمی چھتری" بھی دی جائے گی۔ تاکہ اس کے لئے ہندستانی حملہ کا خطرہ باقی نہ رہے۔ آسٹریلیا نے یہ تجویز پیش کی کہ پاکستان اگر ایٹمی دھماکہ نہ کرے تو ترقی یافتہ ممالک اس کی امداد کی رقم کو دوگنا کردیں۔

مگر پاکستان کے وزیراعظم نواز شریف کے لئے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ پاکستان کے جذباتی عوام کا یہ مطالبہ اتنا شدید تھا کہ اس کو نہ ماننے کی صورت میں یقینی طور پر اتنا ہنگامہ کھڑا ہوتا کہ نواز شریف کی حکومت ختم ہو جاتی۔ کئی دن کے متضاد خبروں کے بعد آخر کار ۲۸، مئی ۱۹۹۸ء کی شام کو پاکستانی وزیراعظم نواز شریف نے ٹی وی پر اعلان کیا کہ آج شام چار بجے ہم نے بلوچستان کے صحرا میں پانچ ایٹمی دھماکہ کئے ہیں۔ اگلے دن پاکستان نے ایک اور ایٹمی دھماکہ کیا۔ اس دھماکہ کے فوراً بعد امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں نے اعلان کردیا کہ وہ پاکستان کی اقتصادی امداد کو فوری طور پر بند کر رہے ہیں۔

پاکستان کے اس دھماکہ کے بعد امریکی صدر بل کلنٹن نے شدید رنج کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان نے ایک نہایت قیمتی موقع (Priceless opportunituy) کھودیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تبصرہ بالکل درست تھا بد قسمتی سے پاکستان میں جتنے بھی لیڈر پیدا ہوئے، ابتدائی قائد سے لے کر آخری قائد تک، ہر ایک پاکستانی مسلمانوں کو جذباتی شراب پلاتا رہا۔ پاکستان کے تمام علماء اور دانشور دہاں کے لوگوں کو فخر کی خوراک دیتے رہے۔ اسی بگڑے ہوئے مزاج کا یہ نتیجہ تھا کہ پاکستان کے یہ عوام وخواص اپنی تاریخ کے اس انتہائی فیصلہ کن موقع پر جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ وہ معاملات میں حقیقت پسندانہ رائے قائم کرنے سے قاصر رہے۔

پاکستان کے لوگ اگر سوچ بوجھ سے کام لیتے تو یقیناً وہ جان لیتے کہ ہندستان کے ایٹمی دھماکہ کا جواب دوبارہ ایٹمی دھماکہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا زیادہ موثر جواب یہ ہے کہ عالمی رائے

احترام کیا جائے۔ اگر پاکستان کو ہندستان کی طرف سے ایٹمی حملہ کا خطرہ تھا تو اس کا زیادہ کارگر حل یہ تھا کہ امریکہ کے پیشکش کے مطابق اس کی طرف سے فراہم کردہ ایٹمی چھتری کو قبول کرلیا جائے، جیسا کہ جاپان نے قبول کرر کھا ہے، اس کے مقامی وسائل اور عالمی ادارہ کے ذریعہ ملک کی اقتصادی اور تعلیمی ترقی کا کام پوری توجہ کے ساتھ شروع کردیا جائے۔ پاکستان اگر اس حقیقت پسندانہ منصوبہ پر عمل کرتا تو دس سال میں وہ اتنی زیادہ ترقی کرلیتا۔ کہ ایٹمی دھماکہ کے بغیر ہی وہ ایک ناقابل تسخیر طاقتور ملک بن جاتا۔

حقیقی لیڈر شپ وہ ہے جو اپنی قوم کو حقیقت پسند بنائے۔ اس کے برعکس جو قیادت اپنی قوم کو جذباتیت کی خوراک دے وہ سرے سے قیادت ہی نہیں۔

صاحب بصیرت لوگ جانتے ہیں کہ کسی ملک کے لئے دفاع کا مسئلہ ہو تب بھی اس کا حل عوام کو ایجوکیٹ کرنا ہے نہ کہ مہلک ہتھیاروں کا ذخیرہ اکٹھا کرنا۔ ۹/ جولائی ۱۹۹۸ء کو نئی دہلی کے مالینکر ہال میں ایک جلسہ تھا۔ موجودہ ہندوستانی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی بطور چیف گیسٹ وہاں موجود تھے۔ وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں ہندستان کے ایٹمی دھماکہ کو ڈیفنس کی ایک اعلیٰ تدبیر کے طور پر پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ پوکھرن کے ایٹمی دھماکے نے ساری دنیا کو ہلا دیا ہے۔

پروفیسر یشپال نے بھی اس موقع پر تقریر کی انھوں نے وزیر اعظم کا حوالے دیئے بغیر کہا کہ دفاع سمیت ہر مسئلہ کا ایک ہی حل ہے، اور وہ ہے قوم کو اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانا۔ انھوں نے اس کی تفصیل کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم سب سے زیادہ اعلیٰ دفاع ہے :

No defence is higher then education

بدقسمتی سے زندگی کی اس حقیقت کا علم نہ ہندستان کے لیڈروں کو ہے اور نہ پاکستان کے لیڈروں کو۔

34

۲۸/ مئی ۱۹۹۸ کو پاکستان نے اپنے اعلان کے مطابق، ایک ہی دن پانچ ایٹم ٹسٹ کئے

تھے۔ ۳۰ر مئی ۱۹۹۸ء کو حکومت پاکستان نے اعلان کیا کہ آج اس نے بلوچستان کے ریگستان میں ایک اور ایٹمی ٹسٹ کیا ہے۔ اس کے آخری دھماکہ کی طاقت ہیروشیما میں گرائے جانے والے ایٹم بم (۱۹۴۵) کے مقابلہ میں دوگنا تھی۔ اس طرح پاکستان نے انڈیا کے پانچ ایٹمی دھماکہ کے مقابلہ میں چھ ایٹمی دھماکے کیے۔

۳۰ر مئی کے اس دھماکہ کے بعد پاکستانی حکومت نے اعلان کیا کہ اب ہم نے دوبارہ اس علاقہ میں طاقت کا وہ توازن قائم کر لیا ہے جو ہندستان کے ایٹمی دھماکہ کے بعد ٹوٹ گیا تھا۔ مگر کیا ایٹمی دھماکہ اس مسئلہ کا حل ہے۔ تاریخ کا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔

ٹھیک اسی قسم کی صورت حال امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان پیش آچکی ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران ۱۹۴۵ میں جب امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر اپنے ایٹم بم کا تجربہ کیا تو اس کے بعد سوویت یونین کے لیڈروں نے کہا کہ اب فوجی طاقت کا توازن امریکہ کے حق میں چلا گیا ہے۔ اس لئے ہم کو بھی ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنانا چاہیئے۔ سوویت یونین جس کا رقبہ اس وقت ہندستان اور پاکستان سے زیادہ تھا اس نے اپنے تمام اقتصادی وسائل اٹامک ریسرچ اور ایٹم بم کی تیاری میں لگا دیئے یہاں تک کہ اس کے وسیع اسلحہ خانہ میں ۲۹ ہزار چھوٹے بڑے ایٹم بم بن کر اکٹھا ہو گئے۔

اب سوویت یونین اس پوزیشن میں تھا کہ امریکہ سمیت اپنے تمام دشمنوں کو اسی طرح تباہ کر دے جس طرح ہیروشیما تباہ ہوا تھا۔ مگر انتہائی نازک حالات کے باوجود سوویت یونین اپنا ایک بم بھی اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۱ میں سوویت یونین ٹوٹ گیا۔ ایٹم بموں کا ذخیرہ اس کے لئے اپنی سپر پاور حیثیت کو بچانے میں کامیاب نہیں ہوا۔

اس کھلی ہوئی قریبی مثال سے انڈیا اور پاکستان کے سیاسی لیڈروں نے کوئی سبق نہیں لیا۔ دونوں میں سے ہر ایک یہ اعلان کر رہا ہے کہ ہم سلف ڈیفنس کے لئے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنا رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقی واقعات یہ ثابت کر رہے ہیں کہ ایٹم بم کا کوئی بھی تعلق سلف ڈیفنس

سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق صرف سلف ڈسٹر کشن (خود تخریبی) سے ہے۔ایٹم بم اگر استعمال ہوں تب بھی وہ ہلاکت ہیں اور اگر وہ استعمال نہ ہوں تب بھی ہلاکت۔

انڈیا اور پاکستان کے لیڈروں کو یہ خبر نہیں کہ ایٹم بم اگر بالفرض استعمال ہوں تب بھی ان کی زد میں صرف حریف قوم نہیں آتی بلکہ خود استعمال کرنے والا بھی ان کے غیر معمولی نقصانات کے زد میں آجاتا ہے۔ایٹمی جنگ بلا شبہ ایک بوم رینگ(boomerang) کھیل ہوگا۔ کیوں کہ اس کے نتیجہ میں نہ صرف زیر نشانہ پڑوسی ملک تباہ ہوگا بلکہ خود ایٹم بم مارنے والا ملک بھی یقینی طور پر اس کے زد میں آجائے گا۔ایٹم بم گرانے کے بعد جو تابکاری (tadiactivity) پھیلے گی، فضائی کثافت میں جو اضافہ ہوگا، سمندروں کا پانی جس طرح زہر آلود ہوگا اور ان سب کے نتیجہ میں جو بیماریاں پھیلیں گی، دونوں ملک یکساں طور پر اس کی لپیٹ میں آجائیں گے۔

تاہم ایٹم بم اگر استعمال نہ ہوں وہ بنا بنا کر صرف رکھے جاتے رہیں تب بھی وہ نا قابل بیان حد تک ہلاکت خیز ہیں۔اس کے نتیجہ میں جو طرح طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ان میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ وہ اتنی مہنگی قیمت پر تیار ہوتے ہیں کہ پورے ملک کی اقتصادی حالت تباہ و برباد ہو جائے ، چیزوں کی قیمت میں بے پناہ اضافہ ، ضروری اشیا کی شدید قلت، چیزوں میں ملاوٹ کا طوفان، حتی کہ تازہ پانی اور صاف ہوا جیسی چیزوں کے حصول کا بھی مشکل ہو جانا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کے لئے ایٹمی طاقت بننا ہولناک حد تک اس کی اقتصادی کمزوری پر منتج ہوتا ہے۔اس کا کھلا ہوا نمونہ سوویت یونین (موجودہ روس) کو اس صورت میں دیکھا جاسکتا ہے۔جو ملک ۱۹۹۰ تک سپر پاور سمجھا جاتا تھا۔وہ آج اقتصادی اعتبار سے ایک تباہ شدہ ملک بن چکا ہے۔میں نے خود اپنے ایک سفر کے دوران سوویت یونین کی یہ تباہ حالت دیکھی ہے۔جس کو میں اپنے سفر نامہ میں لکھ چکا ہوں۔ (سفر نامہ روس، مطبوعہ الرسالہ فروری۔مارچ ۱۹۹۱)

کہا جاتا ہے کہ ایٹمی ہتھیار مانع جنگ کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس طرح وہ امن کی

ضمانت (پیش گارنٹر) ہیں۔ مگر یہ ایک شدید مغالطہ ہے۔ امریکہ اور سوویت یونین کا تجربہ بتاتا ہے کہ جب دونوں ملکوں نے ایٹمی مانع کی صلاحیت حاصل کرلی تو صرف یہ ہوا کہ دونوں میں براہ راست فوجی ٹکراؤ کا امکان ختم ہو گیا۔ اور اس کے بجائے وہ ٹکراؤ شروع ہو گیا جس کو مخفی جنگ (covert war) کہا جاتا ہے۔ کولڈ وار اور پراکسی وار اسی کی صورتیں ہیں۔ دوسری قسم کی جنگ جو امریکہ میں اور سوویت یونین کے درمیان جاری ہوئی، ۱۹۹۱ تک اس کے تحت دنیا کے مختلف حصوں میں تقریباً دو کروڑ انسان ہلاک ہو گئے۔ گویا ایٹمی ہتھیار جنگ کو روکنے والا نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف یہ کرتا ہے کہ جنگ کے میدان کو بدل دیتا ہے۔

جنگ کیوں ہوتی ہے۔ جنگ کا اصل سبب دو گروہوں کے درمیان دشمنی کی نفسیات ہے۔ جب دلوں میں دشمنی کے جذبات موجود ہوں تو کوئی ہتھیار جنگ کو بند نہیں کرتا، وہ صرف جنگ کی صورت کو بدل دیتا ہے، اس طرح اکثر حالات میں جنگی ٹکراؤ اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے۔ اس کا نمونہ ہمیں انڈیا اور پاکستان کے درمیان بھی نظر آتا ہے۔ مئی ۱۹۹۸ میں جب دونوں ملکوں نے اس بات کا مظاہرہ کیا کہ انھوں نے ایٹمی ہتھیار بنالئے ہیں تو اس کے بعد ہی سرحد پر متشددانہ سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ بم اور گن کے استعمال میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہو گیا۔

35

پاکستان نے نواز شریف حکومت کے تحت ۲۸/ مئی اور ۳۰/ مئی کو مجموعی طور پر چھ ایٹمی دھماکے کئے۔ بالفاظ دیگر، یہ ثابت کیا کہ وہ ایٹم بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ایٹمی دھماکے ہندستان کے جواب میں کئے گئے جو ۱۱/ مئی اور ۱۳/ مئی ۱۹۹۸ کو پانچ کی تعداد میں کئے گئے تھے۔

اس کے بعد ایران کے وزیر خارجہ مسٹر کمال خرازی پاکستان آئے۔ ۲/ جون ۱۹۹۸ کو انھوں نے اس کے بارے میں کہا کہ پاکستان کے کامیاب ایٹمی دھماکہ نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو نیا اعتماد عطا کیا ہے۔ ملیشیا کے مسلم لیڈر انور ابراہیم کا تاثر اس سے مختلف تھا۔ انھوں نے انڈیا اور پاکستان دونوں ملکوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ یہ دھماکے دونوں ملکوں کے غریب لوگوں کی

قیمت پر کئے گئے ہیں:

It is a nuclear adventurism on the cost of poor people of both the country.

میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ میں انور ابراہیم کا تبصرہ ہی زیادہ درست ہے۔ کسی قوم کے اعتماد اور طاقت کا راز یہ نہیں ہے کہ اس کے پاس ایٹم بموں کا ذخیرہ ہو، اگر ایسا ہوتا تو سوویت یونین کبھی نہ ٹوٹتا جس کے پاس ہندوستان اور پاکستان کے مقابلہ میں ہزاروں گنا زیادہ ایٹم بم تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی اعتماد اور قومی طاقت کا راز یہ ہے کہ ملک میں سماجی امن ہو۔ ضرورت کی چیزیں مناسب قیمت پر مل رہی ہوں۔ شہری سہولتیں ہر ایک کو بخوبی طور پر پہنچ رہی ہوں۔ تعلیم اور علاج کا عمدہ انتظام ہو، دفتروں میں رشوت کے بغیر کام ہوتا ہو۔ وغیرہ۔

موجودہ صورتحال یہ ہے کہ انڈیا اور پاکستان دونوں انتہائی غریب ملک ہیں۔ جہالت سے لے کر بھڑشٹاچار تک ہر قسم کی برائیوں نے عام انسان کی زندگی کو مصیبت بنا رکھا ہے۔

ایسی حالت میں ان ملکوں میں ایٹم بم بنانا دراصل لوگوں کو غریب اور بدحال رکھ کر قومی دولت کو ایٹمی دھماکوں میں تباہ کرنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ عمل اتنا زیادہ تباہ کن ہے کہ کسی ملک کے عوام بھی اس کو برداشت نہیں کر سکتے۔ مگر سطحی قسم کے لیڈر عوام کو نفرت اور جوش کی شراب پلا کر اس طرح بدہوش کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے فائدہ اور نقصان کو بھی سمجھ نہیں پاتے۔ ان کا نشہ صرف اسی وقت اترتا ہے جب کہ بربادی اپنی آخری حد تک پہنچ چکی ہو اور سرے سے واپس لوٹنے کا امکان ہی باقی نہ رہے۔

دونوں ملک دفاع کے نام پر ایٹمی دھماکہ کر رہے ہیں۔ مگر دفاع کا کوئی تعلق ایٹم بم سے نہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایٹم بم جیسی ہلاکت خیز چیز تاریخ میں صرف ایک بار استعمال ہوتی ہے۔ پھر جب ایک بار استعمال کئے جانے کے بعد ایٹم بم کے مزید استعمال کے خلاف عالمی سطح پر ایک طاقتور مانع (Deterrent) قائم ہو چکا ہو، تو اس پر نہ ہونے والے حملہ

سے دفاع کی آخر کیا ضرورت۔

36

مئی ۱۹۹۸ء سے پہلے تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ دنیا میں مبینہ طور پر پانچ ایسی قومیں ہیں جن کے پاس ایٹمی ہتھیار ہیں۔ مگر اب انڈیا اور پاکستان کی طرف سے ایٹمی دھماکہ کے بعد ایسی طاقتوں کی تعداد سات ہو چکی ہے۔ حتی کہ فرانس نے تجویز کیا ہے کہ ان کو شامل کرتے ہوئے سات نیو کلیر قوموں (N-7) کا اجتماع بلایا جائے۔ عجیب بات ہے کہ انڈیا اور پاکستان دونوں ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں مگر دونوں نے مئی میں جو ایٹمی دھماکے کئے ہیں ان کے پیچھے اصل دماغ دونوں جگہ دو مسلم سائنس دانوں کا ہے۔ انڈیا میں ڈاکٹر عبد الکلام، اور پاکستان میں ڈاکٹر عبد القدیر۔

بی بی سی لندن نے یکم جون ۱۹۹۸ کو پاکستانی سائنس داں ڈاکٹر عبد القدیر کا ایک انٹرویو نشر کیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ ایسے خونیں اور امن شکن ہتھیار آپ کیوں بنا رہے ہیں۔ ان کا جواب یہ تھا کہ: ایٹم بم کو میں سب سے بڑا ضامن امن (peace guaranter) سمجھتا ہوں اب جب کہ انڈیا اور پاکستان دونوں کے پاس ایٹم بم ہیں تو مجھے یقین ہے کہ اب ان کے درمیان کبھی جنگ نہیں ہو گی۔

مگر ایک غیر جانب دار مبصر کے لئے اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ پاکستان کا کہنا کہ انڈیا نے جارحیت کر کے کشمیر پر قبضہ کر رکھا ہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس کے لئے ہمیں ایٹم بم کی تیاری تک جانا پڑا مگر صرف ایٹم بم بنانے سے پاکستان کو کشمیر نہیں مل سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ انڈیا کو پاکستان کے خلاف کسی آئندہ جارحیت سے روک سکے مگر تمام واقعات بتاتے ہیں کہ انڈیا کا ایسا کوئی جارحانہ ارادہ نہیں۔

پھر پاکستان نے ایٹم بم کیوں بنایا اگر پاکستان اپنے ایٹم بم کو استعمال کرے تو خود ڈاکٹر عبد القدیر کے اعتراف کے مطابق یہ اس کے لئے ایک خودکشی کا فعل ہو گا جس میں کشمیر اور پاکستان دونوں تباہ ہو جائیں گے۔ گویا کہ ایٹم بم کو استعمال کرنا یا اس کو استعمال نہ کرنا دونوں ہی

پاکستان کے لئے غیر مفید ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالت میں پاکستان کے لئے دوسرا زیادہ بہتر انتخاب (choice) موجود تھا اور وہ تھا صورت موجودہ (status quo) کو مان لینا۔

نہایت مہنگی قیمت پر ایٹم بم بنانے کے باوجود پاکستان کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ کشمیر کے معاملہ میں صورت موجودہ (لائن آف ایکچول کنٹرول) پر نہ چاہتے ہوئے بھی راضی رہے۔ کیوں کہ اس کا دوسرا بدل صرف قومی خودکشی ہے۔ ایسے حالات میں پاکستان کو یہ کرنا چاہیے تھا کہ وہ اس معاملہ میں امریکہ اور دوسری مغربی قوموں کی پیشکش کو مان لے۔ اس پیشکش میں اس کو دو قیمتی چیزیں مل رہی تھیں۔ ایک نہایت فیاضانہ اقتصادی امداد۔ دوسرے امریکہ کی طرف سے قابل اعتماد نیوکلیر تحفظ۔

حقیقت یہ ہے کہ ایٹم بم نہ انڈیا کے لئے مفید ہے اور نہ پاکستان کے لئے۔ دونوں ہی کے لئے وہ سفید ہاتھی پالنے کے ہم معنی ہے۔ دونوں ہی نے اس کو اپنے قومی فخر (pride) کے لئے بنایا ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں قومی دفاع کے لئے جب متفقہ طور پر ایٹم بم قابل استعمال ہی نہ ہو تو کوئی فوجی مقصد اس سے کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں فوجی یا غیر فوجی مقاصد کے لئے پر امن ڈائیلاگ ہی ایک ممکن تدبیر ہے۔ متشددانہ تدبیر اب سرے سے قابل عمل ہی نہیں پر تشدد عمل میں یقینی خطرہ ہے کہ آج جو کچھ آپ کے پاس ہے وہ بھی آپ کے پاس باقی نہ رہے۔

یہاں میں اضافہ کروں گا کہ پچھلے کچھ سالوں سے برازیل اور ارجنٹینا کے درمیان ایٹمی اسلحہ کی وہی دوڑ جاری تھی جو آج انڈیا اور پاکستان میں دکھائی دے رہی ہے۔ مگر اس کے برے اقتصادی نتائج کو دیکھ کر دونوں ملکوں کے سنجیدہ لوگ تڑپ اٹھے۔ دونوں نے آپس میں گفت شنید شروع کردی یہاں تک کہ ۱۹۹۷ میں دونوں ملکوں میں ایک مشترکہ فیصلہ کے ذریعہ ایٹمی اسلحہ کی تیاری مکمل طور پر بند کردی گئی اور اپنے وسائل کو پوری طرح اقتصادی ترقی کی طرف موڑ دیا گیا۔

برازیل اور ارجنٹینا کا یہ فیصلہ بلاشبہ نہایت درست ہے۔ انڈیا اور پاسکتان دونوں کو اسی فیصلہ کی پیروی کرنا چاہیئے۔ ایٹمی ہتھیاروں کا راستہ بلاشبہ دونوں کے لئے تباہ کن ہے، خواہ یہ ہتھیار استعمال ہوں یا استعمال نہ ہوں۔

۲۰ویں صدی کے نصف اول کا زمانہ بر صغیر ہند کے لئے نازک زمانہ تھا۔اس زمانہ کے لوگ ایک قسم کے رومانی تصورات میں جی رہے تھے۔وہ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار تھے کہ کوئی شخص خوبصورت نظریہ پیش کرے تو وہ دوڑ کر اسے قبول کرلیں۔اس زمانہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مختلف قسم کے اہل فکر اٹھے۔انھیں میں سے ایک گروہ وہ تھا جو نظریاتی انتہا پسندی میں مبتلا تھا اور طلسماتی الفاظ کے ذریعہ اپنی قوم کو اس کی طرف بلا رہا تھا۔ان میں سے ایک کو میں ہندو انتہا پسند اور دوسرے کو مسلم انتہا پسند کا نام دونگا۔چونکہ اس وقت دونوں فرقوں میں رومانی جوش خروش پایا جارہا تھا۔اس لئے جوانوں کی بڑی تعداد دونوں طرف اکٹھا ہوگئی۔اس طرح تقریباً ایک ہی زمانہ میں دو مختلف گروہ وجود میں آئے۔ایک ہندو انتہا پسندوں کا گروہ اور دوسرا مسلم انتہا پسندوں کا گروہ۔۲۰ویں صدی میں بر صغیر ہند میں جو تباہ کن حالات پیش آئے اس کے سب سے بڑے ذمہ دار یہی دونوں انتہا پسند گروہ ہیں۔

نظریاتی انتہا پسندی ایک قسم کا جنون ہے۔ایسے لوگ ہمیشہ تاریخ کو اپنے خود ساختہ نظریات میں ڈھالنے پر اصرار کرتے ہیں۔وہ تاریخ کے پہیہ کو الٹی طرف چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔اس کے نتیجہ میں تاریخ کا سفر تو الٹی طرف جاری نہیں ہوتا البتہ ترقی اور تعمیر کے امکانات تباہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ہندو انتہا پسند گروہ کے پچھلے پچاس سال کے ریکارڈ کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے اس مدت میں صرف تین بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔اول،۱۹۴۸ میں مہاتما گاندھی کو گولی مار کر ہلاک کرنا۔دوم،۱۹۹۲ میں اجودھیا کی تاریخی مسجد کو ڈھا دینا جب کہ اس کا کیس ابھی عدالت میں زیر سماعت تھا۔سوم،۱۹۹۸ میں پانچ ایٹمی دھماکے کر کے اس پورے علاقے میں ایٹمی ہتھیار کی دوڑ شروع کر دینا۔

یہ بات میں نے دہلی کی ایک مجلس میں آر ایس ایس اور اس کی پولیٹیکل ونگ بھارتیہ

جنتاپارٹی کے بارے میں ان الفاظ میں کی:

There are three feats to their credit: In the 1948 they killed Mahatma Ghandhi. In 1992.........

مسلم انتہا پسندوں کا ریکارڈ بھی اس معاملہ میں کچھ زیادہ مختلف نہیں۔اپنے نظریاتی جنون کے تحت انھوں نے ۱۹۴۷ میں برصغیر ہند کا بٹوارہ کرایا۔ اور اس پورے علاقہ میں ابدی طور پر نفرت کی فصل اگائی۔اس کے بعد اسی نظریاتی جنون کے تحت انھوں نے نام نہاد اسلامی جنگ جوئی کا طوفان برپا کیا جس کے نتیجہ میں نہ صرف لیاقت علی خاں (وفات ۱۹۵۱) اور ذوالفقار علی بھٹو (وفات ۱۹۷۹) جیسے بہت سے لوگوں کو قتل کیا گیا بلکہ کشمیر میں اور خود پاکستان میں تشدد کا ایک آتشیں جنگل اگ آیا جس کا بظاہر کوئی خاتمہ نظر نہیں آتا۔اور پھر یہی مسلم انتہا پسند ہیں جنھوں نے وہ حالات پیدا کئے جس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ انڈیا اور پاکستان ہلاکت خیز انجام کے کنارہ کھڑے ہو گئے۔

انتہا پسندی کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ سمجھوتہ اور مصالحت (conciliation) کو نہیں جانتی ایسے لوگ صرف ایک بات کو جانتے ہیں۔اور وہ ہے ساری دنیا کو اپنے خیالات کے سانچے میں ڈھالنا۔یہی وجہ ہے کہ نظریاتی انتہا پسندی ہمیشہ نفرت اور تشدد تک پہنچتی ہے۔بد قسمتی سے برصغیر ہند میں ہندو انتہا پسندی اور مسلم انتہا پسندی دونوں نے ہمارے سماج میں یہی غیر مطلوب فصل اگائی ہے۔

38

کسی لیڈر کی سب سے زیادہ تباہ کن چیز نظریاتی جنون ہے۔لیڈر کے دماغ میں جب ایک نظریہ بس جائے تو بقیہ تمام چیزیں اس کے لئے ثانوی بن جاتی ہیں۔وہ اپنے خود ساختہ نظریہ کو قائم کرنے کے لئے تمام دوسری چیزوں کو بلڈوز کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اخلاق اور انسانیت جیسی اعلیٰ قدروں کو بھی۔ اسٹالن نے اپنے اسی نظریاتی جنون کی بنا پر ۲۵ بلین انسانوں کو ہلاک کر دیا۔ ہٹلر نے اپنے اسی نظریاتی جنون کی بنا پر تاریخ کی وہ ہولناک جنگ چھیڑ دی

جس کو دوسری عالمی جنگ کہا جاتا ہے، وغیرہ۔

بد قسمتی سے بر صغیر ہند بھی آزادی کے بعد اس قسم کے نظریاتی جنون کا شکار ہو رہا ہے۔ پاکستان میں وہاں کے نام نہاد اسلام پسندوں نے اپنے نظریاتی جنون کے تحت پاکستان کے تمام بہترین امکانات کو ملیا میٹ کر دیا۔ انڈیا میں پہلے ہمارا ملک نہرو کے سوشلسٹ جنون کا شکار ہوا۔ اب وہ بھاجپا کے ہند تو جنون کا شکار ہو رہا ہے۔ یہ صرف خدا کو معلوم ہے کہ اس قسم کی جنونی سیاست بر صغیر ہند میں مزید کب تک جاری رہے گی۔

ہر سماج میں ایسے افراد ہو سکتے ہیں جو اپنے نظریہ کے حق میں مجنونانہ یقین رکھتے ہوں۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سماج میں ہمیشہ مختلف سوچ اور مختلف نظریہ رکھنے والے پائے جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ مختلف اور متضاد ذہن رکھنے والوں کے درمیان حکومتی نظام کس طرح بنایا جائے یہ ضروری ہے کہ ہمارے پاس اس مقصد کے لئے پر امن اور قابل عمل فارمولا موجود ہو۔ بصورت دیگر، ہر سماج ابدی طور پر تشدد کا سماج بنا رہے گا۔

یہ فارمولا دریافت ہو چکا ہے اور اس فارمولے کا نام ڈیموکریسی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سماج کے مختلف گروہ اس پر راضی ہو جائیں کہ حکومت سازی کا معاملہ الیکشن پر اس کے حوالے کر دیا جائے۔ ہر پانچ سال پر آزادانہ اور منصفانہ (free and fair) الیکشن منعقد کیا جائے اس الیکشن میں جو گروہ بھی جائز طور پر اکثریت لائے اس کو محدود مدت کے لئے حکومت (صحیح تر لفظ میں، ایڈمنسٹریشن) کا کام چلانے کا موقع دیا جائے۔ یہ فاتح گروہ دل سے راضی رہے کہ اگلے الیکشن میں اگر وہ ہار جاتا ہے تو وہ اسی طرح معتدل طور پر اپنی ہار کو قبول کرلے گا جس طرح اس سے پہلے اس نے اپنی جیت کو قبول کیا تھا۔

اس کے بعد وہ لوگ ہیں جو اپنے دماغوں میں کوئی اصلاحی نظریہ رکھتے ہیں مگر عوامی رائے بر وقت ان کے ساتھ نہیں ہے ایسے لوگوں کے لئے واحد صحیح اور قابل عمل بات یہ ہے کہ وہ انتظار کی پالیسی اختیار کریں۔ یعنی وہ جائز حدود میں اپنے نظریہ کی پر امن تبلیغ کریں وہ لوگوں کو ایجوکیٹ

وقت ان کے ساتھ نہیں ہے ایسے لوگوں کے لئے واحد صحیح اور قابل عمل بات یہ ہے کہ وہ انتظار کی پالیسی اختیار کریں۔ یعنی وہ جائز حدود میں اپنے نظریہ کی پر امن تبلیغ کریں وہ لوگوں کو ایجوکیٹ کر کے ان کے ذہن کو اپنے موافق بنانے کی کوشش کریں۔ اس عمل میں وہ نہ کوئی متشددانہ طریقہ اختیار کریں اور نہ غیر اخلاقی طریقہ۔ وہ اسی طرح پر چار کے دائرہ میں اپنی تعمیری مہم جاری رکھیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت آ جائے جب کہ خود انتخابی عمل ان کے حق میں فیصلہ دے دے۔

39

۱۹۴۷ میں جب ایک طرف انڈیا اور دوسری طرف پاکستان بنا تو اول دن ہی سے دونوں میں حریفانہ تعلق قائم ہو گیا۔ حریفانہ تعلق قائم ہونا کوئی بری چیز نہیں۔ وہ ترقی کا زینہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ کی ترقی کا راز روس کی صورت میں اس کے ایک حریف کا وجود میں آنا تھا۔ چنانچہ جب ۱۹۹۱ میں سوویت یونین ٹوٹ گیا تو امریکی ماہرین یہ کہنے لگے کہ ہمیں اب کوئی دوسرا حریف تلاش کرنا چاہیے ورنہ ہمارے یہاں ترقی کا عمل رک جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ حریفانہ کشاکش اپنی ذات میں کوئی بری چیز نہیں ہے۔ یہ خود فطرت کا بنایا ہوا کورس ہے۔ فطرت نے انسانی ترقی کے لئے یہی کورس مقرر کیا ہے کہ لوگوں میں مقابلے ہوں اور ان مقابلوں کے دوران ہر ایک اپنے کو اونچا دکھانے کی کوشش کرے اور اس طرح انسانیت کی مجموعی ترقی جاری رہے۔

انڈیا اور پاکستان کے درمیان حریفانہ کشمکش پیش آئی وہ اپنی ذات میں اس قسم کی ایک چیز تھی۔ مگر یہ حریفانہ کشمکش دونوں ہی ملکوں کے لئے تباہی کا ذریعہ بن گئی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے یہاں اس حریفانہ کشمکش نے منفی رخ اختیار کر لیا ہمارے یہاں یہ حریفانہ کشاکش منفی کشاکش بن گئی وہ مثبت رخ اختیار نہ کر سکی۔

ابتدا میں دونوں ملکوں کا میڈیا ایک دوسرے کے خلاف منفی پروپیگنڈے کے لئے وقف ہو گیا۔

تجربہ ہوتا ہے۔ وہ انڈیا واپس آکر کہتا ہے کہ پاکستان کے لوگ تو ہم سے انسانیت اور پیار کے ساتھ ملتے ہیں پھر دونوں ملکوں میں قومی سطح پر دشمنی کیوں۔

یہی معاملہ ان پاکستانی مسلمانوں کے ساتھ پیش آتا ہے جو پاکستان سے انڈیا آتے ہیں۔ اور یہاں کے ہندوؤں سے انفرادی طور پر ملتے ہیں وہ بھی پاکستان واپس جا کر یہی بات کہتے ہیں کہ انڈیا کا ہندو تو ہم سے انتہائی پیار کے ساتھ ملا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ قومی سطح پر دونوں ملکوں کے درمیان مسلسل دشمنی قائم ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں ملکوں میں جب ہندو اور مسلمان آپس میں ملتے ہیں تو یہ ایک انسان کی دوسرے انسان سے ملاقات ہوتی ہے۔ جب بھی ایک انسان دوسرے انسان سے انفرادی طور پر ملے تو یہ ملاقات فطرت کے دو پیکروں کے درمیان ہوگی، اور جہاں تک فطرت کا سوال ہے وہ ایک ہندو کے اندر بھی وہی ہے جو ایک مسلمان کے اندر ہے۔

مگر قومی تعارف کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ انفرادی ملاقات میں دونوں کی رہنما ان کی فطرت ہوتی ہے مگر ایک پاکستانی مسلمان جب ہندستانی قوم کے بارے میں جاننا چاہے تو وہ اپنی اس واقفیت کو اخبارات کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح جب ایک ہندستانی ہندو پاکستانی قوم سے آگاہ ہونا چاہے تو وہ بھی اخبارات کے ذریعہ یہ آگہی حاصل کرتا ہے۔ اور جب کہ معلوم ہے اخبارات صرف نفرت وعداوت کے باتیں چھاپتے ہیں وہ حریف قوم کو ایک قابل نفرت دشمن کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔

انفرادی اور قومی تصویر کا یہ فرق اس مطالعہ کے فرق کا نتیجہ ہے۔ اگر دونوں ملکوں کے اخبارات میڈیا کو ہٹادیا جائے اور دونوں ملکوں کے لوگ ایک دوسرے کے بارے میں قومی تعارف بھی اس طرح براہ راست حاصل کریں جس طرح وہ انفرادی تعارف براہ راست حاصل کرتے ہیں تو یہ تضاد ختم ہو جائے گا۔

ہیں تو یہ تضاد ختم ہو جائے گا۔

40

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰ میں فطرت کا ایک قانون ان الفاظ میں بتایا گیا ہے۔ پھر ہم نے ان کے بعد تم کو زمین میں بااقتدار بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسا عمل کرتے ہو (یونس ۱۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں جب کسی فرد یا گروہ کو سیاسی اقتدار ملتا ہے تو وہ اس کا ذاتی حق نہیں ہوتا۔ زمین خدا کی ہے اور وہی جس کو چاہتا ہے اس کو یہاں اقتدار عطا کرتا ہے، یہ اقتدار ہر ایک کے لئے صرف محدود مدت کے لئے ہوتا ہے، اور اس کا مقصد یہ ہوتا کہ سیاسی مواقع دے کر اس کو جانچا جائے کہ اس نے اپنے اختیار کو کس طرح استعمال کیا۔ پھر اس کی اس کارکردگی کی بنیاد پر آخرت میں اس کے لئے انعام یا سزا کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اس اعتبار سے برصغیر ہند کو دیکھئے۔ پانچ سو سال پہلے یہاں مختلف راجاؤں کی حکومت تھی۔ اس کے بعد مغلوں کا سیاسی دور آیا جو انیسویں صدی کے وسط تک جاری رہا۔ اس کے بعد انگریزوں کو اس ملک میں سیاسی اقتدار ملا۔ یہ اقتدار ۱۹۴۷ میں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ملک کے دو حصے ہو گئے۔ ایک حصے میں ہندو اکثریت کو سیاسی بالاتری حاصل ہوئی اور دوسرے حصے میں مسلم اکثریت کو سیاسی بالاتری کی حیثیت حاصل ہوئی۔

پچھلے تمام سیاسی دور صرف وقتی تھے۔ ان میں سے کوئی بھی مستقل نہ تھا اسی طرح موجودہ سیاسی دور بھی صرف وقتی ہے۔ دونوں میں سے کسی فرقہ کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کو مستقل طور پر زمین کے اس حصے کا سیاسی الاٹ مینٹ مل گیا ہے۔ دونوں ہی گروہ، قرآن کے مطابق مالک کائنات کی براہ راست نگرانی میں ہیں۔ وہ جب تک چاہے گا ان کا اقتدار رہے گا، اور جب وہ چاہے گا دونوں کا اقتدار ختم کر کے کسی اور گروہ کو یہ سیاسی مواقع دے دے گا۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو ہندو اور مسلمان دونوں ہی گویا سیاسی امتحان ہال میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دونوں ہی کو ایک مشترک پرچہ حل کرنا ہے، وہ پرچہ کیا ہے، وہ پرچہ یہ ہے کہ دونوں ہی

لئے ایک ذمہ داری سمجھیں نہ کہ کوئی ذاتی حق کا معاملہ۔ وہ اس بارے میں آخری حد تک سنجیدہ ہوں کہ انھیں اپنے اختیار کو ذاتی خواہش کے تحت استعمال نہیں کرنا ہے بلکہ اس کو خدا کی مرضی کے تحت استعمال کرنا ہے۔ وہ پورے شعور کے ساتھ اس حقیقت کو اپنے ذہن میں تازہ رکھیں کہ انھیں اپنے ہر قول و عمل کے لئے خدا کی عدالت میں اپنا حساب دینا ہے جہاں انصاف کے سوا کسی بھی دوسری چیز کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔

دونوں فرقوں کو یہ جاننا چاہیے کہ انھیں یہ سیاسی موقع اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ خدا کی زمین کو سنواریں نہ کہ اس کو بگاڑیں۔ وہ خدا کے بندوں کو انصاف دیں نہ کہ انھیں اپنے ظلم کا نشانہ بنائیں۔ وہ تمام انسانوں کو راحت پہنچائیں نہ کہ انھیں نئے نئے مسائل میں الجھادیں، وہ ملک کے وسائل کو ملک کی مثبت تعمیر میں لگائیں، نہ کہ اس کو اپنے ذاتی عیش یا ذاتی برتری کے لئے استعمال کریں۔ وہ ان مواقع کو خدا کی امانت سمجھیں نہ کہ ذاتی ملکیت۔

صبح کو جب سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ اس بات کا پیغام دیتا ہے کہ مالک کائنات تمہاری نگرانی کر رہا ہے۔ ہر روز جب رات آتی ہے تو وہ یہ پیغام لاتی ہے کہ تمہارا عروج بھی لازماً زوال کا شکار ہوگا۔ زمین کی مسلسل گردش بتا رہی ہے کہ اس دنیا میں نہ کسی کی زندگی کے لئے ٹھہراؤ ہے اور نہ کسی کی سیاسی اقتدار کے لئے۔ یہ گویا دونوں گروہوں کے لئے، اور اس طرح تمام انسانوں کے لئے فطرت کی زبان میں خدا کی ایک چیتاؤنی ہے۔ دانش مند وہ ہے جس کے لئے یہ چیتاؤنی اس کی اصلاح حال کا ذریعہ بن جائے اور نادان وہ ہے جو اس چیتاؤنی کو نظر انداز کر دے، اس کے لئے ذلت اور ناکامی کے سوا کوئی دوسرا انجام نہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

دسمبر 1999 شمارہ 277

روزہ کی حقیقت

مسند احمد اور الترمذی میں یہ روایت آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے یہ پیشکش کی کہ وہ میرے لئے مکہ کی وادی کو سونا بنادے۔ میں نے کہا کہ نہیں اے میرے رب، بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میں ایک دن سیر ہو کر کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔ پس جب میں بھوکا رہوں تو میں تجھ سے تضرع کروں اور تجھ کو یاد کروں اور جب میں شکم سیر ہوں تو میں تیری حمد کروں اور تیرا شکر کروں (عرض علی ربی لیجعل لی بطحاء مكة ذهباً، فقلت : لا يا رب! ولكن أشبع يوماً و اجوع يوماً، فاذا جعت تضرعت اليك و ذكرتك، وإذا شبعتُ حمدتك وشكرتك) مشكاة المصابيح ۳/ ۴۳۳

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ احوال کے بغیر کیفیات پیدا نہیں ہوتیں۔ بھوک آدمی کے اندر عجز کی کیفیت ابھارتی ہے اور اس کو خدا کی یاد کرنے والا بناتی ہے۔ اس کے بعد جب آدمی کو سیری حاصل ہوتی ہے تو وہ اس کے اندر شکر کے جذبات کو بیدار کرتی ہے اور اس کو حمد خداوندی میں مشغول کر دیتی ہے۔

یہی روزہ کا اصل مقصد ہے۔ روزہ ایک سالانہ تربیتی کورس ہے جس کے ذریعہ آدمی کے اوپر بھوک کے احوال پیدا کئے جاتے ہیں، تاکہ اس کے اندر عجز اور تضرع اور انابت کی کیفیات ابھریں، وہ اللہ کو یاد کرنے والا بن جائے۔

روزہ میں دن کے وقت آدمی کو بھوک کا تجربہ کرایا جاتا ہے۔ اس کے بعد رات کو اسے اس تجربہ سے گذارا جاتا ہے کہ وہ شکم سیر ہو کر کھائے اور پئے، تاکہ اس کے اندر شکر کے جذبات بیدار ہوں اور اس کا سینہ حمد خداوندی سے معمور ہو جائے۔

تضرع اور شکر دو انتہائی مطلوب دینی کیفیات ہیں۔ رمضان کے روزے کا مقصد یہ ہے کہ دن کی بھوک اور رات کی شکم سیری کے ذریعہ یہ دونوں مطلوب کیفیات آدمی کے اندر پیدا کی جائیں۔

عقیدہ کی طاقت

مسٹر یوسف خان (نئی دہلی) اگست ۱۹۹۰ میں امریکہ (نیوجرسی) میں تھے۔ وہاں کی ٹی وی کمپنی سی این این (C. N. N.) پر ۲۴ گھنٹہ دنیا بھر کی خبریں نشر ہوتی رہتی ہیں۔ مسٹر یوسف خان نے اکتوبر ۱۹۹۰ کی ملاقات میں بتایا کہ ایک روز وہاں ٹی وی پر فوجی پروگرام تھا۔ خلیج میں جانے والے امریکی فوجیوں کا انٹرویو دکھایا جارہا تھا۔

ٹی وی کا عملہ اپنے پورے سامان کے ساتھ بندرگاہ پر اور ایرپورٹ پر پہنچا اور سمندری جہاز یا ہوائی جہاز سے خلیج کے لئے روانہ ہونے والے امریکی فوجیوں کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو آوازوں اور تصویروں کے ساتھ ٹی وی پر دکھایا گیا۔ ٹی وی کے عملہ اور فوجیوں کے درمیان جو باتیں ہوئیں ان میں سے ایک سوال وجواب یہ تھا:

Q. How do you feel going to Middle East?

A. When Muslims fight and die, they believe they go to heaven, but we don't have any such belief. I am scared.

سوال: مشرق اوسط میں جاتے ہوئے آپ کیسا محسوس کرتے ہیں۔

جواب: مسلمان جب لڑتے ہیں اور میدان جنگ میں مرتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ وہ جنت میں جائیں گے۔ مگر ہمارے پاس اس قسم کا کوئی عقیدہ نہیں۔ میں خوف زدہ ہوں۔

یہی بات قرآن (النساء ۱۰۴) میں کہی گئی ہے۔ تاہم اس کا تعلق صرف جنگ سے نہیں بلکہ ہر قسم کی جدوجہد سے ہے۔ غیر جنگی مقاصد میں بھی اس کی سخت ضرورت ہوتی ہے کہ لوگوں میں بلند ہمتی ہو۔ وہ خطرہ مول لے کر آگے بڑھ سکیں۔ نتیجہ کے غیر یقینی ہونے کے باوجود وہ آگے بڑھنے کا ثبوت دے سکیں۔ ایسے پرامن موقع پر بھی اسلام کا عقیدہ انتہائی مددگار ہے۔ وہ آدمی کے اندر اولوالعزمی کی صفت پیدا کرتا ہے، اور جن لوگوں کے اندر اولوالعزمی ہو ان کے راستے میں نہ کوئی سمندر حائل ہوتا ہے اور نہ کوئی پہاڑ۔

تفقہ فی الدین

اسلام میں تفقہ فی الدین کی بے حد اہمیت ہے۔ قرآن میں اس کا ذکر فرض کفایہ کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ اگر امت کے تمام لوگ نہیں تو کچھ لوگوں کو ایسا کرنا چاہئے کہ وہ اپنے اندر اعلیٰ درجہ میں تفقہ فی الدین کی صلاحیت پیدا کریں (التوبہ ۱۲۲)

حدیث سے بھی اس کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ حضرت معاویہ بن سفیان کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: **من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین** (فتح الباری ۳۰۶/۱۳) یعنی اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اس کو وہ تفقہ فی الدین عطا کر دیتا ہے۔

تفقہ کے معنی فہم و بصیرت کے ہیں۔ یہاں تفقہ کا لفظ معروف فقہی معنی میں نہیں ہے۔ موجودہ زمانہ میں فقہ کا لفظ بولا جائے تو اس کا مطلب ان احکام و مسائل کو جاننا ہوتا ہے جن کو فقہاء اسلام نے بعد کے زمانہ میں مرتب کیا۔ مگر مذکورہ آیت یا حدیث میں تفقہ کا لفظ اس مفہوم میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ بلکہ وہ اصولی اور اساسی دین میں گہری فہم و بصیرت کے لئے آیا ہے۔

اس اعتبار سے، تفقہ کا مطلب معروف نوعیت کا مقلدانہ علم نہیں ہے۔ بلکہ وہ سراسر ایک مجتہدانہ علم ہے۔ تفقہ فی الدین کا مطلب سطور سے گذر کر بین السطور کو پڑھ لینا ہے۔ الفاظ سے نکلنے والے سادہ مفہوم سے گذر کر اس کی چھپی ہوئی معنویت کو دریافت کرنا ہے۔ فنی اور ظاہری تفصیلات سے آگے بڑھ کر معنویت کے سمندر میں داخل ہو جانا ہے۔

تفقہ فی الدین بلاشبہہ ایک مومن کے لئے خیر اعلیٰ کا درجہ رکھتا ہے۔ جس آدمی کے اندر تفقہ کی صلاحیت پیدا ہو جائے اس کا ایمان اس کے اندر ربانی شخصیت کی تشکیل کرنے لگتا ہے۔ وہ حقیقتوں کو براہ راست دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ وہ واقعات و معاملات کو ان کی صحیح روشنی میں دیکھنے لگتا ہے۔ خواہ اپنی ذات کا معاملہ ہو یا دوسروں کا معاملہ، وہ صحیح ترین رائے تک پہنچنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ کی ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
خصلتان لاتجتمعان فی منافق حسن سمت ولا فقه فی الدین (الترمذی بحوالہ مشکاۃ المصابیح ۱/۷۶) دو صفتیں ایسی ہیں جو کسی منافق میں جمع نہیں ہوتیں ــــــ خوش خلقی اور تفقہ فی الدین۔

منافقت کے ساتھ تفقہ فی الدین کیوں جمع نہیں ہوتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ منافق ایک غیر سنجیدہ انسان ہوتا ہے، اور غیر سنجیدہ ذہن اس قابل ہی نہیں ہوتا کہ وہ گہری حقیقتوں کو سمجھے یا ان کا ادراک کر سکے۔ گہری بصیرت کے لئے سنجیدگی (sincerity) ایک لازمی شرط ہے۔ منافقت کے ساتھ سنجیدگی کبھی جمع نہیں ہوتی۔ اس لئے منافق انسان کبھی تفقہ فی الدین کی لذت سے آشنا بھی نہیں ہوتا۔

تفقہ فی الدین کا درجہ اس کے حصہ میں آتا ہے جو اپنے ذہن کو دوسری غیر متعلق چیزوں سے ہٹا کر صرف دین کو اپنے غور و فکر کا موضوع بنائے۔ یہ ذہنی یکسوئی (concentration) ہی تفقہ فی الدین کا دروازہ ہے۔ جو لوگ ذہنی یکسوئی کی یہ قیمت ادا نہ کریں وہ کبھی اس خیر کو نہیں پا سکتے جس کو قرآن و حدیث میں تفقہ فی الدین کہا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **فقیه واحد اشد علی شیطان من الف عابد** (الترمذی، ابن ماجہ، بحوالہ مشکاۃ المصابیح ۱/۳۴) یعنی ایک فقیہ شیطان کے اوپر ہزار عابد سے زیادہ سخت ہے۔

غیر فقیہ صرف چیزوں کے ظاہر کو دیکھتا ہے۔ اس کے برعکس فقیہ کی نظر چیزوں کی اصل حقیقت تک پہنچ جاتی ہے۔ غیر فقیہ چیزوں کے فرق کو نہیں سمجھتا جب کہ فقیہ ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو جان لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر فقیہ نہایت آسانی سے شیطان کی تزئین کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب کہ فقیہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ شیطانی تزئین کا پردہ پھاڑ کر حقیقت کو اس کے برہنہ روپ میں دیکھ سکے۔ اور اس طرح اس کی گمراہی سے بچ جائے۔

مذہب کی حقیقت

انڈونیشیا (جکارتا) میں ایک ادارہ قائم ہے۔اس کا مقصد مذاہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔اس ادارہ کے ایک شعبہ کا نام اسکول آف ہائر اویرنس (School of Higher Awareness) ہے۔اس ادارہ کا پورا نام و پتہ یہ ہے:

Anand Ashram, JI. Sunter Mas Barat 11-E, Block H-10/1, Jakarta- 14350
Tel. (021) 650-8648, (0818) 701658, Fax (021) 650-3459, e-mail: ashram@indo.net-id, Homepage: http//members.tripod.com/ anandashram

اس ادارہ کی طرف سے ایک درجن انڈونیشی مرد و عورت کا وفد ہندستان آیا۔ یہ لوگ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے۔اس وفد کے قائد مسٹر آنند کرشنا تھے وہ انڈونیشی زبان کے ایک معروف رائٹر ہیں۔ یہ پورا وفد ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۹ کو اسلامی مرکز (دہلی) میں آیا۔ راقم الحروف سے سوال و جواب کی صورت میں ایک گھنٹہ سے زیادہ دیر تک ان لوگوں سے گفتگو ہوئی۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اسلام اور دیگر مذاہب سے تھا۔

ایک خاتون نے بتایا کہ ان کی ماں مسلمان تھیں اور ان کے والد ہندو تھے۔ خود انھوں نے ایک کرشچن سے شادی کی ہے۔انھوں نے کہا کہ میں اپنے کو مسلمان سمجھتی ہوں مگر میرا طریقہ یہ ہے کہ میں مندر جاتی ہوں تو میں وہاں کے لحاظ سے پوجا کر لیتی ہوں۔ جب میں چرچ میں جاتی ہوں تو میں وہاں کی عبادت میں شریک ہو جاتی ہوں۔ اور جب میں مسجد میں جاتی ہوں تو میں مسلمانوں کی طرح نماز پڑھ لیتی ہوں۔ میرا یہ طریقہ درست ہے یا نہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں۔

پھر میں نے اس کی تفصیل کرتے ہوئے کہا کہ اس قسم کا مذہب، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، کوئی مذہب نہیں۔ وہ صرف ایک قسم کا سماجی رکھ رکھاؤ یا سماجی توافق ہے:

It is not a religion. It is a kind of social adjustment.

مذہب کیا ہے۔ مذہب ایک سچائی ہے۔ سچائی خود اپنی نیچر کے لحاظ سے وحدت چاہتی

ہے۔ جب آدمی ایک چیز کو سچائی کے طور پر دریافت کرتا ہے تو وہ اس کے لئے ایک یقین کی دریافت کے ہم معنی ہوتی ہے۔ وہ اس پُر اعتماد جذبہ سے سرشار ہوتا ہے کہ میں نے حقیقت اعلیٰ کو پالیا ہے۔ میں نے زندگی کے جنگل میں اس واحد راستہ کو معلوم کرلیا ہے جو مجھے منزل مقصود تک پہنچانے والا ہے۔

مذکورہ قسم کا مذہب کسی آدمی کو عین اس قیمتی چیز سے محروم کر دیتا ہے جو مذہبی سچائی کا اصل مقصود ہے، یعنی اعتماد و یقین۔ اس دنیا میں انسان کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ یہ جانے کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے۔ وہ انسان اور کائنات کے بارہ میں ایک واضح اور غیر مبہم تصور رکھتا ہو۔ وہ اس یقین پر کھڑا ہوا ہو کہ اس نے زندگی کے گہرے رازوں کو دریافت کرلیا ہے۔ سچا مذہب حقیقۃً اسی دریافت کا نام ہے۔

اگر آپ ایک لمبے سفر پر جارہے ہوں تو آپ کو اپنی منزل کا واضح اور متعین شعور ہونا چاہئے۔ اس یقینی شعور کے بغیر جو آدمی سفر پر روانہ ہو جائے وہ صحیح معنی میں ایک مسافر نہ ہوگا بلکہ ایک بھٹکا ہوا انسان ہوگا۔ اس کے سفر کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ کوئی اختتام۔ اس قسم کا سفر مختلف وادیوں میں بھٹکنا ہے نہ کہ حقیقۃً سفر طے کرنا۔ یہی معاملہ مذہب کا ہے۔ حقیقی مذہب وہ ہے جو آدمی کے لئے سچائی کی دریافت بن جائے۔ جو آدمی کو وہ فکری سرمایہ دے سکے جس کو اعتماد کہا جاتا ہے۔ ہر آدمی فطری طور پر اس کا ضرورت مند ہے کہ وہ ایک ایسی صداقت کو پائے جس پر وہ یقین کرسکے۔ مذہب آدمی کی اسی طلب کا جواب ہے۔ آدمی کا یہ احساس کہ اس نے سچے مذہب کو پالیا ہے، اس کو لازوال یقین کی دولت عطا کرتا ہے۔ ''ہر مذہب سچا ہے'' کا تصور خود مذہب کی نفی ہے۔ ایسا تصورِ مذہب آدمی کے لئے کبھی مطلوب یقین کا سرچشمہ نہیں بن سکتا۔

جہاں تک سماجی ہم آہنگی کا تعلق ہے، اس کے حصول کا ذریعہ یہ نہیں ہے کہ یہ کہا جائے کہ ہر مذہب سچا ہے۔ سماجی ہم آہنگی کے حصول کا ذریعہ یہ ماننا ہے کہ ہر انسان قابل احترام ہے۔ سماجی ہم آہنگی کی بنیاد احترام انسانی کے تصور پر قائم ہوتی ہے نہ کہ وحدت مذاہب کے تصور پر۔

تبلیغ کیا ہے

جناب ابو البرکات علوی (۷۵ سال) نظام پور ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے ہیں۔ ۲۱ اگست ۱۹۹۹ کو ان سے دہلی میں ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے گاؤں کے قریب مخدوم پور کی بستی ہے۔ یہاں ایک مسلمان نھو صاحب (تقریباً ۴۰ سال) رہتے ہیں۔ ان کو شراب کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ اکثر نشہ میں رہتے تھے۔ گھر والے ان کی طرف سے مایوس ہو گئے تھے۔

چند سال پہلے کی بات ہے، تبلیغی جماعت کے کچھ لوگ مخدوم پور آئے۔ وہ گشت کرتے ہوئے نھو صاحب کے گھر پہنچے۔ ان سے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ جماعت میں چلیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں تو ایک شرابی آدمی ہوں۔ دیکھو اس وقت بھی میری جیب میں ایک پنی ہے۔ تبلیغی جماعت والوں نے اصرار کیا تو انھوں نے جیب سے پنی نکالی اور ساری شراب پی گئے۔ اس کے بعد وہ مدہوش ہو کر چارپائی پر لیٹ گئے۔ اب تبلیغ والے چارپائی کے چاروں طرف بیٹھ کر ان کے لئے دعا کرنے لگے۔

کئی گھنٹہ کے بعد انھیں ہوش آیا تو انھوں نے دیکھا کہ تبلیغ والے ان کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہے ہیں۔ نھو صاحب نے پوچھا کہ آپ لوگ ابھی تک یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ تبلیغ والوں نے کہا کہ ہاں، جب آپ مدہوش ہو گئے تو ہم لوگ آپ کے لئے دعا کرنے لگے۔ اس واقعہ کا نھو صاحب پر بہت اثر ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اچھا میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ اس کے بعد وہ گھر کے اندر گئے۔ اپنے بچوں سے کہا کہ غسل خانہ میں پانی رکھو۔ مجھ کو نہانا ہے اور کپڑے بدل کر تبلیغ والوں کے ساتھ جماعت میں جانا ہے۔ گھر والوں نے اس کو مذاق سمجھا۔ انھوں نے کہا کہ کیا آپ شراب کی پنی لے کر جماعت میں جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں میں شراب چھوڑ کر جاؤں گا۔ اس کے بعد وہ جماعت میں گئے۔ تین دن کے بعد جب وہ واپس آئے تو وہ ایک بدلے ہوئے انسان تھے۔ اب نھو صاحب کو لوگ ایک دیندار انسان کی

ثیت سے جانتے ہیں۔

حال میں جناب ابوالبرکات علوی کی ملاقات نھو صاحب سے ہوئی۔ ابوالبرکات صاحب نے ان سے پوچھا کہ آپ کو کبھی شراب پینے کا جی نہیں چاہتا۔ انھوں نے جواب دیا کہ تبلیغ والوں نے جو بات بتائی وہ مجھ کو شراب سے بھی زیادہ اچھی لگتی ہے۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کی حقیقت کیا ہے۔ تبلیغ نام ہے سرے کے درد کو اپنے سینہ میں محسوس کرنے کا۔ تبلیغ یہ ہے کہ آدمی آخری حد تک اس کا خیر اہ ہو جائے جس کی وہ اصلاح چاہتا ہے۔ دوسرے شخص کی برائی کو دیکھ کر وہ اس سے نفرت نہ ے بلکہ وہ اور زیادہ اس کی اصلاح کا حریص بن جائے۔ مدعو کے منھ سے شراب کی بدبو آرہی پھر بھی وہ اس سے اپنا رخ نہ پھیرے۔ وہ بات سننے سے انکار کردے تب بھی وہ اس سے ناامید ہو۔

تبلیغ دراصل بھٹکے ہوئے لوگوں کا خیر خواہ بننے کا دوسرا نام ہے۔ سچے داعی کا حال یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف وہ اپنے مدعو کی اصلاح کے لئے اپنی ساری کوششیں صرف کر دیتا ہے۔ دوسری رف وہ مدعو کے لئے مسلسل دعائیں کرتا رہتا ہے تاکہ اس کی اپنی کوشش میں جو کمی رہ گئی ہے ۔ااس کی تلافی کردے اور اپنی مدد سے اس کی کوششوں کو تکمیل تک پہنچادے۔

تبلیغ کی شریعت میں نفرت حرام ہے۔ جہاں دوسرے لوگ غصہ سے بھڑک اٹھتے ہیں، عی وہاں یک طرفہ طور پر لوگوں کو معاف کر دیتا ہے۔ جہاں دوسرے لوگ منفی قسم کی جوابی ،روائی کرنے لگتے ہیں وہاں داعی آخری حد تک مثبت روش پر قائم رہتا ہے۔ جہاں دوسرے ئ صرف اپنے جذبات کے مجروح ہونے کو جانتے ہیں، وہاں داعی کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کے جذبات مجروح نہ ہونے پائیں۔ خلاصہ یہ کہ دوسرے لوگ اگر اپنے آپ ، جیتے ہیں تو داعی اس لئے جیتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے بھلائی کا دروازہ کھول سکے۔

نظریاتی سپر پاور

اسلام ایک نظریاتی سپر پاور ہے۔ اور اس دنیا میں بلاشبہہ نظریاتی سپر پاور سے زیادہ طاقت ور کوئی دوسری چیز نہیں۔ دوسری طاقتیں مادی چیزوں پر غلبہ حاصل کرتی ہیں۔ اور نظریہ انسان کے اوپر غلبہ حاصل کرتا ہے۔ دوسری طاقتوں کا زور صرف جسم کے اوپر چلتا ہے۔ نظریاتی طاقت آدمی کے ذہن ودماغ کو مسخر کر لیتی ہے۔ دوسری طاقتیں صرف وقتی طور پر کسی کو مجبور کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ نظریاتی طاقت کی یہ خصوصیت ہے کہ لوگ آمادگیٔ قلب کے ساتھ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اسلام فطرت کا دین ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا مثنیٰ پیشگی طور پر ہر آدمی کے سینہ میں موجود ہے۔ آدمی پیدائشی طور پر اپنے اندر اس کی طلب رکھتا ہے۔ اسلام میں اور انسان میں وہی رشتہ ہے جو پانی میں اور پیاسے میں ہوتا ہے۔ اسلام کو پانا خود اپنے آپ کو پانا ہے۔ اسلام کی دریافت خود اپنی دریافت ہے۔

جس خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اسی خدا نے انسان کے لئے اس کا دین بھی مقرر کیا ہے۔ اسی دین خداوندی کا نام اسلام ہے۔ خدا کی طرف سے جو رسول آئے، سب اسی دین کو لے کر آئے۔ مگر زمانہ کے انقلابات میں دوسرے ادیان بگڑ گئے۔ وہ اپنی اصلی اور ابتدائی حالت پر باقی نہیں رہے۔ مگر اسلام اپنی اسی اصل حالت پر آج بھی باقی ہے جس حالت میں اول دن اسے رب العالمین نے اپنے پیغمبر پر نازل کیا تھا۔ دوسرے مذاہب محرف دین ہیں اور اسلام غیر محرف دین۔

اسلام علم کے تمام معیاروں پر پورا اترتا ہے۔ اس کے تمام کردار تاریخی کردار ہیں نہ کہ افسانوی یا غیر تاریخی کردار۔ اسلام میں اور سائنس میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ جدید علمی دریافتوں نے صرف اسلام کی تصدیق کی ہے۔ زمانہ کی ترقیوں سے اسلام کا کوئی ٹکراؤ نہیں۔ اسلام کی ان خصوصیات نے اسلام کو نظریاتی سپر پاور کی حیثیت دے دی ہے۔ افکار و نظریات کے میدان میں وہ بلا مقابلہ کامیابی حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہے۔

خدا کی عبادت

ایک حدیث میں ہے کہ خدا کا فرشتہ انسان کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آیا۔ فرشتے نے آپ سے سوال و جواب کے انداز میں گفتگو کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو دین کے بارہ میں بتایا جائے۔ ایک سوال یہ تھا کہ احسان کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ تم خدا کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اور اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔ فتح الباری ۱۴۰/۱

عبادت دراصل اس عمل کا نام ہے جو خدا کی معرفت سے پیدا ہوتا ہے۔ جب ایک آدمی خدا کو گہرائی کے ساتھ دریافت کرتا ہے تو اس کا پورا وجود خدا کے آگے جھک جاتا ہے۔ وہ پورے معنی میں خدا کا پرستار بن جاتا ہے۔ اس کے صبح و شام خدا کی یاد میں گزرنے لگتے ہیں۔ اس کی داخلی کیفیت خارجی پرستش کی صورت میں ظاہر ہونے لگتی ہے۔ وہ سراپا خدا کا عبادت گذار بندہ بن جاتا ہے۔ اس عبادت گذاری کے دو درجے ہیں۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان کی معرفت اتنی زیادہ گہری ہو کہ اس کا یہ حال ہو جائے گویا کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔ ادراک کی شدت کی بنا پر اس کو مشاہدہ جیسے تجربات ہونے لگیں۔ غیب میں ہوتے ہوئے خدا اس کے لئے ایک موجود حقیقت بن جائے۔ بظاہر نہ دیکھنے کے باوجود اس کو محسوس ہونے لگے کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔ اس کیفیاتی شدت کے تحت جو عبادت کی جائے اس میں انسان یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ جس خدا کی عبادت کر رہا ہے گویا کہ وہ ایک زندہ ہستی کے طور پر اس کے سامنے موجود ہے۔

اس کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی کو خدا کی موجودگی کا ایسا زندہ احساس تو نہ ہو مگر یقین کی بنا پر اس کے دل و دماغ میں یہ تصور چھایا ہوا ہو کہ اگرچہ خود میں تو خدا کو نہیں دیکھ رہا ہوں مگر خدا بلاشبہ مجھ کو پوری طرح دیکھ رہا ہے۔ خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین اس کو خدا کے آگے جھکا دے۔

مسئولیت نہ کہ خودی

ایک صاحب نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ ان کے اندر خودی اور خود شناسی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل الٹی تدبیر ہے۔ مسلمانوں کی زندگی کا راز نفی خودی میں ہے نہ کہ اثبات خودی میں۔ خودی آدمی کی انانیت کو ابھارتی ہے، جب کہ آدمی کی اصلاح کے لئے ایسا نظریہ چاہئے جس سے آدمی کی انا مغلوب ہوتی ہو۔

انھوں نے کہا کہ نفی خودی تو خودکشی کے ہم معنی ہے۔ کیوں کہ اس سے آدمی کے اندر عمل کے جذبات بیدار نہیں ہوتے۔ اس سے منفعلانہ قسم کی درویشی پیدا ہو سکتی ہے۔ فعال اوصاف اس کے ذریعہ پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ میں نے کہا کہ آپ کے اس خیال کی بنیاد یہ ہے کہ آپ خودی کا تقابل درویشوں کی انفعالیت سے کر رہے ہیں۔ آپ خودی کا تقابل صحابہ کرام کی فعالیت سے کیجئے۔ اس وقت آپ اس معاملہ میں صحیح رائے قائم کر سکیں گے۔

صحابہ کرام دنیا کے سب سے زیادہ فعال لوگ تھے۔ مگر ان کی اس فعالیت کا سرچشمہ خود شناسی نہیں بلکہ مسئولیت شناسی تھی۔ وہ احساس مسئولیت سے متحرک ہوئے تھے نہ کہ احساس خویشی سے۔ حقیقت یہ ہے کہ خودی یا خود شناسی کی بنیاد پر جو لوگ متحرک ہوتے ہیں، ان کی ایک حد ہوتی ہے۔ ایک خاص حد پر پہنچ کر ان کی عملیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس احساس مسئولیت سے جو عمل پیدا ہوتا ہے، اس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو جس چیز نے متحرک کیا تھا وہ یہ احساس تھا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی پوچھ ہوگی۔ ابو بکر صدیق و عمر فاروق مثالی درجہ کے فعال افراد تھے۔ مگر ان کی فعالیت کا سرچشمہ یہی مسئولیت کا احساس تھا۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ "خودی" جیسے کسی نظریہ نے ان کی صلاحیتوں کو متحرک کیا ہو۔

توحید کی حقیقت

حضرت آدم کے بعد غالباً سب سے پہلے پیغمبر حضرت نوح ہیں۔ حضرت آدم کی امت میں بگاڑ آگیا تو اس کو دوبارہ خالص توحید کا پیغام دینے کے لئے حضرت نوح بھیجے گئے۔ حضرت نوح نے قوم کی گمراہیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے جو کچھ کہا، اس میں ایک بات یہ تھی کہ تم لوگوں کو کیا ہوا کہ تم اللہ کی عظمت کے معتقد نہیں ہو (مالکم لا ترجون لله وقارا) نوح ۱۳

یعنی تم اللہ کی بڑائی کا اعتقاد کیوں نہیں رکھتے۔ اور اللہ کے عظمت و جلال سے ڈرتے کیوں نہیں۔ حضرت نوح کی قوم اللہ کو مانتی تھی۔ مگر تعظیم و توقیر کا جو درجہ اللہ کو دینا چاہئے، وہ درجہ انھوں نے اپنے قومی اکابر کو دے رکھا تھا۔ ان قومی اکابر کا نام قرآن میں وَد، سُواع، یعوق اور نَسر بتایا گیا ہے (نوح ۲۳) ایک روایت کے مطابق، یہ لوگ حضرت آدم کی ابتدائی نسل سے تعلق رکھتے تھے (تفسیر قرطبی)

قوم نوح کی گمراہی یہ تھی کہ وہ اللہ کا اقرار کرتی تھی مگر اسی کے ساتھ وہ اکابر پرستی کی بیماری میں مبتلا تھی۔ وہ وجود الٰہی کی منکر نہ تھی۔ مگر اپنے دل و دماغ میں اس نے جن کو سب سے اعلیٰ مقام دے رکھا تھا وہ اس کے مزعومہ اکابر تھے نہ کہ ذات خداوندی۔ اس کے قلب و دماغ پر اللہ کی عظمت کا احساس اس طرح چھایا ہوا نہ تھا جس طرح رب العالمین کو ماننے والے ایک انسان پر فی الواقع چھایا ہوا ہونا چاہئے۔ اللہ کو صرف ماننا کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ آدمی اس کو اپنی روح اور اپنی نفسیات میں سب سے اونچا مقام دئے ہوئے ہو۔ جو آدمی اللہ کی عظمت میں جی رہا ہو وہ خدا پرست ہے، اور جس آدمی کا دل اللہ کے سوا کسی اور کی عظمت میں ڈوبا ہوا ہو وہ غیر خدا پرست۔ یہ غیر خدائی معبود انسانی اکابر بھی ہو سکتے ہیں اور دوسری مزعومہ ہستیاں بھی۔

مشرک انسان خدا کا منکر نہیں ہوتا۔ مشرک انسان کی گمراہی یہ ہے کہ خدا کے لئے اس کے پاس صرف لفظی اظہار ہوتا ہے اور دوسری ہستیوں کے لئے قلبی کیفیات۔

ایمان ایک زلزلہ خیز عقیدہ

آپ اپنے گھر میں اپنے بچہ کے ساتھ ہیں۔ اتنے میں زمین سے گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ دیواریں اور چھتیں ہلنے لگیں۔ کھڑکیاں زور زور سے کھلنے اور بند ہونے لگیں۔ بچہ پوچھتا ہے کہ ابا، یہ کیا چیز ہے۔ آپ اس کو جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ بھونچال ہے۔

غور کیجئے کہ اس طوفان خیز لمحہ میں آپ کا یہ کہنا کہ "یہ بھونچال ہے" کیا صرف چند الفاظ کا مجموعہ ہوگا۔ آپ یہ جملہ بول کر بھی سکون کے ساتھ اپنے گھر میں بیٹھے رہیں گے۔ یقیناً ایسا نہیں ہو سکتا۔ "یہ بھونچال ہے" کا جملہ بظاہر ایک لفظی جملہ ہے۔ مگر وہ ایک عظیم واقعہ کا اعلان ہے۔ وہ ایسا جملہ ہے جس کو زبان سے ادا کرتے ہی آدمی کے اوپر کپکپی طاری ہو جائے۔

"یہ بھونچال ہے" کا لفظ بولتے ہی خود آپ کے اندر بھی ایک بھونچال آجائے گا۔ آپ کی پوری شخصیت ہل جائے گی۔ سر سے پیر تک آپ کا پورا وجود ایک نیا وجود بن جائے گا۔ اس کے بعد آپ ایک ایسے انسان بن جائیں گے جو آپ اس سے پہلے نہیں تھے۔

اسی طرح آپ اپنے دوست کے ساتھ ایک جنگل میں چل رہے ہیں۔ اچانک آپ دیکھتے ہیں کہ پاس کی جھاڑی میں ایک خوفناک شیر کھڑا ہوا ہے۔ آپ اپنے دوست سے کہتے ہیں کہ "یہ ایک شیر ہے" یہ جملہ بھی اس وقت محض ایک لفظی کلمہ نہیں ہوگا بلکہ وہ ایک طوفان خیز تجربہ ہوگا۔ آپ کے جسم میں خون کی گردش خون کا طوفان بن جائے گی۔ یہ ایک ایسا لمحہ ہوگا جو آپ کو اندر سے باہر تک ایک نیا انسان بنا دے گا۔ اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ جب ایک انسان کہتا ہے کہ لاالہ الا اللہ تو اس کا مطلب کیا ہے۔ یہ محض چند الفاظ کو اپنی زبان سے دہرانا نہیں ہے بلکہ یہ اس خدا کی موجودگی اور کار فرمائی کا اقرار کرنا ہے جو شیر کا اور بھونچال کا اور ہر چیز کا خالق ہے۔

کیسی عجیب بات ہوگی اگر شیر اور زلزلہ کی موجودگی کا اقرار آدمی کے اندر طوفان برپا کر دے اور خداوند ذوالجلال کی موجودگی کا اقرار آدمی کے اندر کوئی ہلچل برپا نہ کرے۔

درس حدیث

امام احمد نے مکی دور کا ایک واقعہ اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔ عمرو بن عبسہ اپنے آپ کو چوتھا مسلم (ربع الاسلام) کہتے تھے۔ ابو امامہ نے ان سے پوچھا کہ آپ اپنے کو چوتھا مسلم کیوں کہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے سنا کہ مکہ میں ایک شخص ظاہر ہوا ہے جو خبریں بتاتا ہے۔ میں اونٹ پر سوار ہو کر مکہ گیا۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھپ چھپ کر کام کر رہے ہیں اور آپ کی قوم آپ پر جری ہو گئی ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے علاوہ آپ کے ساتھ کون ہے۔ آپ نے کہا کہ ایک آزاد اور ایک غلام (ابو بکر اور بلال)۔ میں آپ پر ایمان لایا۔ اس طرح میں تین کے بعد اسلام میں چوتھا شخص بنا۔

عمرو بن عبسہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ نے آپ کو کن باتوں کے ساتھ بھیجا ہے۔ آپ نے فرمایا، یہ کہ اللہ کو ایک مانا جائے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کیا جائے، اور بتوں کو توڑنا اور صلہ رحمی کرنا۔ (**بان یوحد الله و لا یشرك به شیٔا و کسر الاوثان وصلة الرحم**) حیات الصحابہ، ۱/۱۷

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت کے بنیادی نکات کیا ہیں۔ اس کا پہلا نکتہ توحید ہے۔ اسلام کا پہلا اور اہم ترین تقاضہ یہ ہے کہ آدمی اپنے دل کو ہر قسم کے مشرکانہ خیالات سے پاک کرے اور ایک اللہ کا پرستار بن جائے۔ بت کو توڑنے سے مراد صرف پتھر کے بت کو توڑنا نہیں ہے بلکہ ہر اس چیز کو توڑنا ہے جو بت کا درجہ حاصل کر لے۔

توحید یہ ہے کہ آدمی کی تمام عقیدتوں اور تمام امیدوں کا مرکز ایک خدا بن جائے۔ اور شرک یہ ہے کہ اپنی عقیدتوں اور امیدوں میں خدا کے سوا کسی اور کو شامل کر لیا جائے۔

صلہ رحمی ایک علامت ہے۔ اس سے مراد عام انسانوں کے حقوق ادا کرنا ہے۔ تاہم اس ادائگیٔ حقوق کی فہرست میں رشتہ داروں کے حقوق کی ادائگی کا نمبر سب سے پہلے آتا ہے۔

حقائق پر اعتماد

٦ھ میں پیغمبر اسلام اور مشرک سرداروں کے درمیان صلح کا وہ معاہدہ ہوا جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ لمبی بات چیت کے بعد جب معاہدہ کی دفعات طے ہو گئیں تو پیغمبر اسلام نے اس کو کاغذ پر لکھوانا شروع کیا۔ حضرت علی بن ابی طالب اس کی کتابت کر رہے تھے۔ آپ نے کہا کہ **هذا ما صالح عليه محمد رسول الله ۰۰۰** (سیرت ابن کثیر جلد ۳ صفحہ ۳۲۰)

مشرکین کے نمائندہ نے اس پر اعتراض کیا۔ اس نے کہا کہ ہمارے آپ کے درمیان یہی تو جھگڑا ہے کہ ہم آپ کو رسول اللہ نہیں مانتے۔ اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول مان لیں تو جھگڑا اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ اس لئے آپ اس طرح لکھئے کہ **هذاما صالح عليه محمد بن عبد الله**۔ آپ فوراً اس پر راضی ہو گئے۔

حضرت علی سے آپ نے کہا کہ معاہدہ کے کاغذ سے محمد رسول اللہ کا لفظ مٹا دو اور اس کی جگہ محمد بن عبد اللہ لکھو۔ حضرت علی نے کہا کہ میں اپنے ہاتھ سے رسول اللہ کا لفظ نہیں مٹا سکتا۔ اس کے بعد پیغمبر اسلام نے کاغذ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور رسول اللہ کے لفظ کو مٹا دیا۔ اس کے بعد حضرت علی سے آپ نے کہا کہ اب یہاں محمد بن عبد اللہ لکھ دو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا (صفحہ ۳۲۱)

پیغمبر اسلام کی اصل حیثیت یہی تھی کہ وہ اللہ کے رسول تھے۔ آپ کا پورا مشن آپ کے اسی دعوے پر کھڑا ہوا تھا۔ رسول اللہ کے لفظ کو مٹانا گویا اپنی اصل حیثیت کو مٹا دینے کے ہم معنی تھا۔ یہ ایک بے حد نازک موقع تھا۔ رسول اللہ کا لفظ مٹانے کا مطلب لوگوں کو یہ کہنے کا موقع دینا تھا کہ آپ کو خود اپنی اس حیثیت کے بارے میں شک ہے۔

لیکن پیغمبر اسلام نے ان باتوں کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ایک ایسے بلند انسان تھے جو حقائق میں جینے والا ہو، جو ظواہر سے اوپر اٹھ کر چیزوں کو دیکھ سکے۔ اپنی اس نفسیات کی بنا پر آپ محسوس کر رہے تھے کہ کاغذ پر خواہ جو بھی لکھا جائے مگر آخر کار جو چیز غالب

رہے گی وہ حقیقت ہے۔ آپ کا یہ غیر متزلزل یقین کہ میں خدا کا رسول ہوں، یہی اس بات کی کافی ضمانت تھا کہ آپ ایک ایسی چیز کو کوئی اہمیت نہ دیں جو خود حقائق کے زور پر ایک دن مٹ کر رہ جائے گی۔ کوئی نہ اس کا حامی ہوگا اور نہ کوئی اس کا وکیل۔

رسول اللہ ﷺ کے اس واقعہ سے اسلام کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ یہ اصول ہے ــــــ اجتماعی معاملات میں حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرنا۔

ایک شخص جب اپنی انفرادی نماز پڑھ رہا ہو تو اس کو اختیار ہے کہ وہ اس میں خواہ لمبی سورہ پڑھے یا چھوٹی سورہ۔ لیکن جب وہ ایک بڑی جماعت کی امامت کر رہا ہو تو اس کو دوسروں کا لحاظ کرنا پڑے گا۔

یہی حکم دوسرے اجتماعی معاملات کا بھی ہے۔ اجتماعی معاملات میں ہمیشہ ایک سے زیادہ فریق ہوتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایسے معاملات میں دوسروں کی رعایت کی جائے۔ ورنہ بار بار ایسی رکاوٹیں پیش آئیں گی کہ اجتماعی زندگی کا سفر طے کرنا ہی مشکل ہو جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل اسلام کی نظر حال سے زیادہ مستقبل پر ہونی چاہئے۔ ایک معاملہ میں اگر فریق ثانی کسی شرط پر اصرار کرے اور اہل اسلام بھی جوابی ضد کرنے لگیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ تعطل پیدا ہو جائے گا۔ حتی کہ طرفین کی یہ ضد متشددانہ ٹکراو کی صورت بھی اختیار کر سکتی ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کی پالیسی یہ ہے کہ وقتی طور پر فریق ثانی کی ضد کو مان لیا جائے اور اسی کے ساتھ اپنے تعمیر واستحکام کے عمل کو جاری رکھا جائے۔ اور یہ یقین کیا جائے کہ جو چیز حال میں بظاہر حاصل نہیں ہو رہی ہے وہ مستقبل میں ضرور حاصل ہو جائے گی۔

اختلافی معاملے میں ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کیا جائے تو پیش قدمی کا عمل رک جاتا ہے۔ اس کے برعکس مصالحانہ طریقہ اختیار کرنے کا یہ فائدہ ہے کہ بظاہر وقتی نقصان کے باوجود پیش قدمی کا عمل جاری رہتا ہے۔ اور کامیاب عمل وہی ہے جو کسی وکاوٹ کے بغیر مسلسل جاری رہے۔

منافقت کا نیا دور

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ اس کے مطابق، رسول اللہ ﷺ نے رمایا کہ بعد کے زمانے میں لوگوں کے درمیان سے امانت (honesty) اٹھ جائے گی۔ تقریباً تمام رگ خائن (dishonest) ہو جائیں گے۔ مگر یہ زوال صرف داخل کے اعتبار سے آئے گا۔ جہاں نک ظاہر کا تعلق ہے معاملہ اس سے بالکل مختلف ہوگا۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ:

ویقال للرجل : ماأعقله وما اظرفه وما اجلده وما فی قلبه مثقال حبة خردل ن ایمان (صحیح البخاری، کتاب الفتن) یعنی اور ایک آدمی کے بارے میں کہا جائے گا کہ ہ کتنا زیادہ عقل مند ہے، وہ کتنا زیادہ خوش گفتار ہے، وہ کتنا زبردست ہے۔ حالانکہ اس کے دل یں رائی کے ایک دانہ کے برابر بھی ایمان نہ ہوگا۔

اس حدیث میں غالباً ان منافقین کا ذکر ہے جو صنعتی تہذیب کے دور میں پیدا ہونے والے تھے۔ منافقت دراصل مفاد پرستانہ کردار کا دوسرا نام ہے۔ یعنی آدمی کے اندر ایمان واخلاق کی روح موجود نہ ہو۔ مگر مادی فائدے کے لئے یا لوگوں کے درمیان اچھا بننے کے لئے وہ ظاہری طور پر ایمان واخلاق کی نمائش کرے۔

یہ عین وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانے میں پروفیشنل اخلاق کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں اس قسم کے مصنوعی اخلاق کے فائدے ہزاروں گنا بڑھ گئے ہیں۔ اسی کے ساتھ مصنوعی اخلاق کے وسائل میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اس زمانی فرق نے منافقانہ روش اختیار کرنے کے محرکات میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔ اس بنا پر یہ بالکل فطری ہے کہ صنعتی تہذیب کے دور میں ایسے شاندار منافقین ظہور میں آئیں جن کا ظہور قدیم زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ نئے دور کی منافقت کو دوسرے لفظوں میں پروفیشنل اسلام بھی کہا جا سکتا ہے۔ دور جدید کے پر رونق اسباب و وسائل نے پروفیشنل اسلام کو اتنا زیادہ شاندار بنا دیا ہے جو بظاہر مخلصانہ اسلام میں بھی موجود نہیں۔

مسوری کا سفر

۲۵ جولائی ۱۹۹۹ کو مسوری میں ایک خصوصی پروگرام انٹر فیتھ ڈائیلاگ (Inter-faith Dialogue) کے نام سے ہوا۔ اس کا انتظام لال بہادر شاشتری نیشنل اکیڈمی آف ایڈمنسٹریشن کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس موقع پر مختلف مذاہب کے اہل علم کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ مجھے اسلام کے نمائندہ کی حیثیت سے بلایا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں مسوری کا سفر ہوا۔

۲۵ جولائی ۱۹۹۹ کی صبح کو روانگی ہوئی۔ مجھ کو شتابدی اکسپریس کے ذریعہ دہلی سے دہرہ دون پہنچنا تھا۔ دہرہ دون سے بذریعہ کار مسوری کا سفر کرنا تھا۔ ڈاکٹر ڈے اور ڈاکٹر سمتانی وغیرہ کل سات آدمی دہلی سے اس سیمنار میں جارہے تھے۔

پہلا تجربہ نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر ہوا۔ یہاں ہماری ٹرین (شتابدی اکسپریس) پلیٹ فارم نمبر ۱۲ سے روانہ ہونے والی تھی۔ ہماری گاڑی ٹھیک پلیٹ فارم کے گیٹ تک پہنچ گئی۔ معلوم ہوا کہ یہاں یہ نیا انتظام کیا گیا ہے۔ کار کے ذریعہ اسٹیشن آنے والے لوگ سیدھے اپنی کار کو پلیٹ فارم تک لے جاسکتے ہیں۔ یہاں آنے والی کاروں کے لئے خصوصی پاس ۲۵ روپیہ کا ہوتا ہے۔

نئے ہندستان میں اس طرح دھیرے دھیرے عین وہی چیز ہوتی جارہی ہے جس کا الزام انگریزوں کو دیا جاتا تھا۔ یعنی ایلیٹ کلاس (Elite Class) کے لئے ہر جگہ خصوصی انتظام۔ یہ فرق پہلے انگریز اور ہندستانی کے درمیان تھا، اب وہ خود ہندستانی اور ہندستانی کے درمیان ہے۔ تحریک آزادی کے بڑے بڑے لیڈر جو ۱۹۴۷ سے پہلے انگریزوں کو یہ الزام دیتے تھے کہ انھوں نے ملک میں اپنے لئے خصوصی رعایتیں لے رکھی ہیں، وہ مستقبل کے حالات سے کتنا زیادہ بے خبر تھے۔

ٹرین دہلی سے آگے بڑھ کر پنجاب میں داخل ہوئی تو ریلوے لائن کے دونوں طرف

ہرے بھرے میدانوں کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ یہ سر سبز منظر دہرہ دون تک کے پورے سفر کے دوران جاری رہا۔ سر سبز درخت زمین کا حسن ہیں۔ زمین پر اگر سر سبزی نہ ہو تو زمین بالکل ایسی ہو جائے جیسی کوئی گنجے سر کا آدمی۔

میں اپنی پوری زندگی سر سبز مناظر کا دلدادہ رہا ہوں۔ اس قسم کا کوئی منظر دیکھ کر میں اس میں اس طرح کھو جاتا ہوں کہ دوسری کوئی چیز یاد ہی نہیں رہتی۔ سر سبز مناظر کو دیکھ کر ایک ایسی بے پناہ روحانی مسرت ہوتی ہے جس کا میں نے کسی اور چیز میں تجربہ نہیں کیا۔ یہ سر سبز مناظر زمین کے سوا وسیع کائنات میں کسی بھی دوسرے مقام پر موجود نہیں۔ میں نے سوچا کہ ایسا کیوں ہے کہ صرف زمین کی سطح کے اوپر استثنائی طور پر یہ سر سبز مناظر پیدا کئے گئے ہیں۔ وسیع کائنات میں کسی بھی دوسرے مقام پر اس قسم کا منظر موجود نہیں۔

یہ سوچتے ہوئے ایک عجیب خیال دل میں پیدا ہوا۔ میں نے سوچا کہ خالق کو یہ منظور تھا کہ جب وہ اس قسم کا حیرت انگیز حسن پیدا کرے تو وہاں ایک انسان بھی موجود ہو جو اس کو دیکھے تو اس کے اندر ایسا پر ارتعاش جذبہ پیدا ہو کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئیں اور وہ کہہ پڑے:

ربنا ما خلقت هذا باطلاً ، سبحانك فقنا عذاب النار.

ہماری بوگی (چیئر کار) میں اتفاق سے انگریزی اسکول کی لڑکیاں سفر کر رہی تھیں۔ وہ مسلسل زور زور سے بول رہی تھیں۔ یہاں تک کہ ان کی آواز ٹرین کی آواز پر غالب آگئی۔ وہ سب انگریزی بول رہی تھیں۔ بظاہر وہ گیارہویں یا بارہویں کلاس کی لڑکیاں تھیں۔ ان کا شور سن کر مجھے کسی کا قول یاد آیا کہ: سب سے زیادہ غیر تعلیم یافتہ وہ لوگ ہیں جو کہ تعلیم یافتہ ہیں۔

The most uneducated people are those who are educated people.

تعلیم بلاشبہہ بے حد اہم ہے۔ مگر صرف فارمل ایجوکیشن کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ انفارمل ایجوکیشن بھی بے حد ضروری ہے جس کا مقصد شعور کی تعمیر اور کیرکٹر بلڈنگ ہو۔ اس کے بغیر صرف فارمل ایجوکیشن کافی نہیں ہو سکتی۔

اس کی ایک مثال تبلیغی جماعت ہے۔ سر سید نے تعلیم کے ساتھ ہر ہاسٹل میں نماز خصوصی انتظام کیا مگر اس انتظام سے بہت کم لوگ نمازی بن سکے۔ لیکن تبلیغی جماعت کی خارج کوششوں کے نتیجہ میں لاکھوں لوگ نمازی بن گئے حتی کہ خود کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لوگ بھی۔

لڑکیوں کا شور جب ختم نہیں ہوا تو ایک صاحب سے رہا نہیں گیا۔ انھوں نے کھڑے ہو کر بلند آواز سے لڑکیوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

This coach does not belong to you alone.

مگر اس کے باوجود لڑکیوں کا شور ختم نہیں ہوا۔

میں نے مغربی ملکوں میں بار بار سفر کیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کے لڑکے اور لڑکیاں بہت دھیمی آواز میں بولتے ہیں۔ ان لوگوں کو میں نے کبھی شور کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ وہ لوگ آزادی کے ساتھ اپنی سماجی ذمہ داریوں کو بھی جانتے ہیں جب کہ ہمارے نوجوانوں کا حال یہ ہے کہ انھیں اپنی آزادی کی خبر تو ضرورت سے زیادہ ہے مگر اپنی سماجی ذمہ داریوں کی خبر انھیں بقدر ضرورت بھی نہیں۔

تاہم ہمارے ساتھی ڈاکٹر ایس کے ڈے (ڈائرکٹر گاندھی پیس فاؤنڈیشن) کا رول ابھی باقی تھا۔ وہ ظرافت کے انداز میں بات کرنے کے ماہر ہیں۔ ایک بار ہماری مجلس تھی۔ جو دیر تک قائم رہی۔ ڈاکٹر ڈے نے اپنی شگفتہ باتوں سے لوگوں کو احساس نہیں ہونے دیا کہ ان پر دو گھنٹہ کا وقت گذر چکا ہے۔ جب میں مجلس سے اٹھنے لگا تو ایک صاحب نے کہا کہ شاید آپ بور ہو گئے۔ میں نے جواب دیا:

Where there is Dr. Day, there is no question of boredom.

چنانچہ ڈاکٹر ڈے نے اپنی ظرافت کی تدبیر سے ٹرین میں لڑکیوں کے شور کے مسئلہ کو حل کیا۔ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر لڑکیوں کے پاس گئے اور نرمی کے ساتھ ان سے کہا: اس سے اچھا تو یہ تھا کہ آپ نے ہمیں ایک گانا سنایا ہوتا۔ ڈاکٹر ڈے کا یہ جملہ سن کر لڑکیاں شرمندہ ہو گئیں اور

اس کے بعد ان کا شور کرنا بند ہو گیا۔

ہمارے قافلہ میں ایک سینئر پروفیسر تھے جن کا نام ڈاکٹر ایم ایچ سمتانی تھا۔ ان کا سبجیکٹ بدھزم رہا ہے۔ انھوں نے اس پر ریسرچ کی ہے۔ وہ پالی اور سنسکرت زبان بھی جانتے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ کیا گوتم بدھ کی تعلیمات اوریجنل زبان میں موجود ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ اب بدھزم کا جو لٹریچر ہمارے پاس موجود ہے وہ پالی اور سنسکرت میں ہے جو کہ سب کا سب ترجمہ ہے۔ میں نے پوچھا کہ گوتم بدھ کے اپنے بولے ہوئے الفاظ کا کوئی ریکارڈ کیا آج بھی پایا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ کچھ مثالیں دی جاتی ہیں مگر وہ تاریخی طور پر مستند نہیں ہیں۔

اس قسم کا سوال اگر پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں پوچھا جائے تو کوئی بھی مسلمان یہ کہے گا کہ ہاں، آپ کی تعلیمات آج بھی اسی ابتدائی زبان میں موجود ہیں۔ آپ کے بولے ہوئے الفاظ آج بھی وہی کے وہی حدیث کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ کتنا زیادہ فرق ہے اسلام میں اور دوسرے مذہبوں میں۔

راستہ میں ایک عیسائی پروفیسر ڈاکٹر پی کے جان سے گفتگو ہوئی وہ دہلی میں رہتے ہیں اور مسوری کے سیمنار میں شرکت کے لئے جارہے تھے۔ وہ کرسچین تھیالوجی پڑھاتے ہیں۔ ان سے مسیحی عقائد پر دیر تک باتیں ہوئیں۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ ہم مسیح کو پرافٹ اور سن آف گاڈ دونوں مانتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کیا سن آف گاڈ اسی سنس میں جس میں کہ ہر آدمی اپنے باپ کا بیٹا ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ میں نے کہا کہ پھر مسیح کا تو ایک فزیکل وجود تھا۔ آپ کے عقیدہ کے مطابق ان کو پھانسی بھی دی جاسکتی تھی۔ پھر کیا خدا بھی اسی طرح فزیکل وجود ہے۔ جس پر موت و حیات کے قوانین وارد ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ خدا ایک غیر فزیکل وجود ہے۔ میں نے کہا کہ بیٹا تو ہمیشہ اپنے باپ کا جزء ہوتا ہے۔ پھر ایسا کیوں کر ممکن ہے کہ خدا تو غیر فزیکل وجود ہو اور اس کا بیٹا فزیکل وجود کی شکل میں ظاہر ہو۔ اس کا وہ کوئی واضح جواب نہ دے سکے۔

اسی طرح میں نے پوچھا کہ تثلیث (Trinity) کا عقیدہ جو موجودہ مسیحیت کا بنیادی عقیدہ ہے وہ انجیل مقدس میں کہاں ہے۔ لمبی گفتگو کے بعد انھوں نے اقرار کیا کہ تثلیث کا عقیدہ اپنی موجودہ شکل میں دوسری صدی عیسوی میں وجود میں آیا۔

ڈاکٹر ڈے بھی اس سفر میں چل رہے ہیں۔ وہ ایک معمر آدمی ہیں۔ اور تقسیم سے پہلے کی ہندستانی سیاست سے کافی واقف ہیں۔ ایک گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ مسٹر محمد علی جناح کو میں قریب سے جانتا ہوں۔ ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ ایک پکے سیکولر آدمی تھے۔ میں نے کہا کہ پھر کیسے وہ مسلمانوں کے سب سے بڑے لیڈر بن گئے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں میں کوئی دوسرا آدمی تھا ہی نہیں۔ میں نے مولانا ابو الکلام آزاد کا نام لیا۔ انھوں نے کہا کہ میں مولانا آزاد کو بھی قریب سے جانتا ہوں۔ ان کا کیس لینگویج بیریر (Language barrier) کا کیس تھا۔ ان کی کمی یہ تھی کہ وہ جناح صاحب کی طرح انگریزی نہیں بول سکتے تھے۔

میں نے سوچا کہ مولانا آزاد نہایت ذہین تھے۔ ان کا حافظہ بھی بہت اچھا تھا۔ وہ بہت آسانی سے انگریزی بولنے کی مشق پیدا کر سکتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے جیسے آدمی کے لئے ایک سال سے بھی کم محنت کافی تھی۔ انھوں نے تقسیم کے بعد جامع مسجد دلی میں جو تقریر کی تھی اس میں انھوں نے مسلمانوں سے شکایت کرتے ہوئے کہا کہ میں نے چلنا چاہا مگر تم نے مجھے چلنے نہیں دیا۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ شکایت ان کو اپنے آپ سے کرنی چاہئے تھی۔ اگر وہ محنت کر کے جناح اور نہرو کی طرح انگریزی اسپیکر بن جاتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ ہندستانی مسلمانوں کے بلا شرکت غیرے لیڈر بن جاتے۔ اس کے بعد دوسری قیادتی لکیریں اپنے آپ چھوٹی ہو جاتیں۔

دہرہ دون ریلوے اسٹیشن سے روانگی ہوئی تو تھوڑی دور آگے بڑھ کر پہاڑ کی چڑھائی شروع ہو گئی۔ ہماری گاڑی گھومتی ہوئی سڑکوں پر چڑھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ پہاڑی راستہ طے کرنے کے لئے اس قسم کی چکر دار سڑکیں بنانے کا کام انگریزوں نے کیا۔ اس طرح انھوں نے میدانی لوگوں کے لئے پہاڑ پر چڑھنا آسان بنا دیا۔ انہیں سڑکوں کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ

پہاڑی علاقے (hill stations) پر آبادیاں قائم ہوں اور قدرت کے اس نادر مقام کو شہروں کی تعمیر کے لئے استعمال کیا جاسکے جس کو پہاڑی مقام (hill station) کہا جاتا ہے۔ یہ پہاڑی سفر ایک ایسے ماحول میں ہو رہا تھا جہاں اوپر پھیلا ہوا آسمان تھا اور نیچے چاروں طرف پھیلی ہوئی سرسبز کائنات۔ فطرت کا یہ حسن شاید اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ آدمی آخرت کے جنتی حسن کا تصور کر سکے اور اس کا طالب بنے۔

دہرہ دون ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہو کر ہمارا قافلہ بذریعہ کار لال بہادر شاستری نیشنل ایڈمنسٹریٹیو اکیڈمی پہنچا۔ یہاں ہم لوگ جب پہنچے تو مسٹر سنجیو چوپڑا (I A S) ہم لوگوں کو ریسیو کرنے کے لئے موجود تھے۔ ڈاکٹر ڈے نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ انھوں نے یہاں کے سیمنار میں آپ کی شرکت پر بہت اصرار کیا تھا۔ یہ آپ کو پڑھتے رہتے ہیں اور آپ کے بہت ایڈ مائرر (admirer) ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر ڈے نے ہنستے ہوئے کہا:

When you are going to convert him to Islam.

یہاں ہم لوگوں کو ھیپی ویلی (Happy Valley) میں ٹھہرایا گیا۔ میرا کمرہ نمبر ۲۰۳ تھا۔ اس ھیپی ویلی گیسٹ ہاؤس کا جائے وقوع نہایت عمدہ تھا۔ وہ گویا قدرت کے حسین مناظر کے درمیان واقع ہے۔

یہاں لازوال سکون کا ماحول ہے۔ ہوا، دہلی کے برعکس بالکل خالص ہے۔ شبلی نے "جنجیرہ" کے بارے میں جو کہا تھا وہ اس مقام کے اوپر صادق آتا ہے:

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر ‏ ‏ ‏ ‏ بادہ نوشی ہے باد پیمائی

۲۵ جولائی کی سہ پہر کو میں مسوری پہنچا تھا۔ دن میں یہاں کے مختلف مقامات دیکھتا رہا اور مختلف لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ رات کو اپنے کمرے میں سویا تو اچھی نیند آگئی۔ رات کے پچھلے پہر خواب میں دیکھا کہ میں کسی شخص (غالباً مولانا محمد فاروق خاں صاحب) سے کہہ رہا ہوں کہ ہم لوگ تین زبان میں الرسالہ نکال رہے تھے ـــــ اردو، ہندی اور انگریزی۔ اس سے پہلے میں اردو کو پرائمری اہمیت دیتا تھا۔ اور انگلش کو صرف سیکنڈری درجہ دئے ہوئے تھا۔ مگر اب میں نے

یہ طے کیا ہے کہ انگلش کو پرائمری اہمیت دی جائے۔ اور اردو اور ہندی کو سکینڈری درجہ میں رکھا جائے۔

یہ خواب بظاہر ایک اہم خواب معلوم ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں انگریزی زبان نے غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ تاریخ میں پہلی بار صحیح معنوں میں ایک عالمی زبان وجود میں آئی ہے اور وہ انگریزی ہے۔ انگریزی کو عالمی زبان کی حیثیت دینے کا کام پہلی بار برٹش ایمپائر نے کیا جس کا رقبہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں سورج نہیں ڈوبتا تھا۔ اس کے بعد امریکہ نے انگریزی کو بہت زیادہ وسعت دی۔ آزادی کے بعد جب امریکی اسمبلی میں یہ سوال آیا کہ ملک کی قومی زبان کیا ہو تو صرف ایک ووٹ سے اسپینی زبان کے مقابلہ میں انگریزی کو امریکہ کی قومی زبان کا درجہ حاصل ہوا۔

مسوری کا نام میں نے شاید پہلی بار سب سے پہلے ۱۹۲۸ کے آخر میں سنا جب کہ میرے خاندان کے ایک بزرگ مولانا اقبال احمد سہیل مرحوم مسوری گئے اور وہاں کے مناظر کو دیکھ کر اس پر ایک نظم لکھی۔ یہ نظم ۳۰ سے زیادہ اشعار پر مشتمل تھی۔ اس کے پہلے حصہ میں کوہ مسوری کے فطری حسن کا ذکر تھا۔ اس کے بعد اس کے دوسرے حصہ میں کچھ سبق آموز باتیں کہی گئی تھیں۔ اس نظم کا خاتمہ اس شعر پر ہوا تھا:

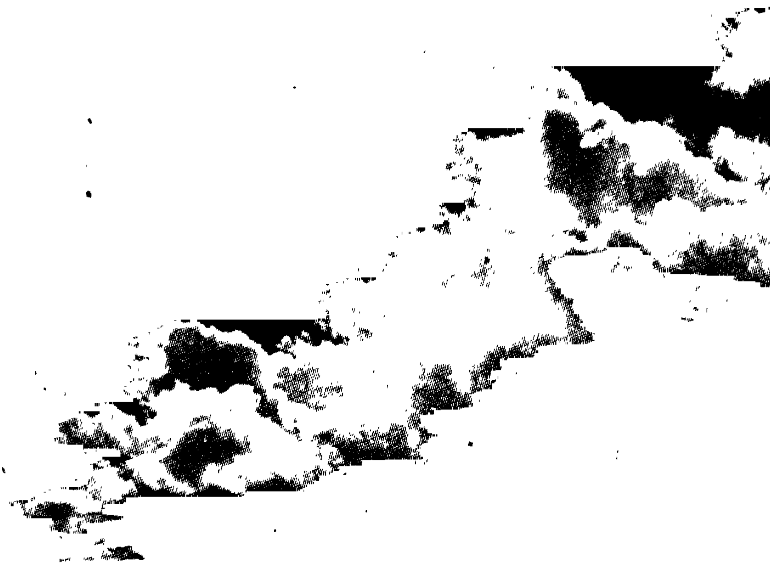
خیز و گلزارِ وطن را آب و رنگ از سر بدہ   ایں خرابات کہن را رونقِ دیگر بدہ

اسی کے ساتھ اس میں توحید کا پیغام بھی ان الفاظ میں دیا گیا تھا:

دہر کو معمور کر دے نغمۂ توحید سے   چھیڑ دے ناخن سے پھر تار ربابِ زندگی

مولانا اقبال احمد سہیل جب ۱۹۲۸ میں مسوری آئے تو انھوں نے اپنی نظم (کوہ مسوری) میں جن تاثرات کا تذکرہ کیا تھا ان میں سے ایک تاثر یہ تھا:

اے مسوری تیرے صدقے تو نے دکھلایا ہمیں
کس طرح ہیں اہلِ مغرب کامیاب زندگی



نظم میں یہ شعر تو موجود تھا مگر اس میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ مسوری میں وہ کون سی مثالیں ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ اہل مغرب نے کس طرح کامیاب زندگی حاصل کی ہے۔ یہی شعر کی کمزوری ہے۔ یہ ایک محدود اسلوب کلام کا نام ہے۔

شعر میں کسی کو نغمہ تو مل سکتا ہے مگر شعر میں رہنمائی نہیں مل سکتی۔ رہنمائی کا کام صرف نثر کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ شاعری کا آخری فائدہ ذہنی تفریح ہے نہ کہ فکری رہنمائی۔

مسوری میں ادھر اُدھر سفر کرتے ہوئے میں نے وہاں جو مناظر دیکھے اس سے میں نے یہ سمجھا کہ مسوری کس طرح اہل مغرب کی کامیاب زندگی کی داستان بیان کرتا ہے۔ وہاں کی سڑکیں بتاتی ہیں کہ دشوار گزار مقامات پر معمول کا سفر طے کرنا کس طرح ممکن ہوتا ہے۔ سطح سمندر سے ۶ ہزار فٹ کی بلندی پر شہر بسا کر انھوں نے بتایا کہ سخت گرمی کے موسم میں بھی کس طرح ٹھنڈی رہائش گاہیں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ کمیونی کیشن کے ذرائع دریافت کر کے انھوں نے یہ دکھایا کہ کس طرح دور دراز مقامات سے قریبی تعلقات قائم کئے جا سکتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں اونچے نیچے مقامات پر گھر بنانے کے لئے پہلے اس کو ہموار کیا جاتا تھا۔ اہل مغرب نے اونچے نیچے مقامات کو اسی طرح استعمال کرتے ہوئے ایک نیا اور دلکش طرز تعمیر ایجاد کیا جس کی ایک کامیاب مثال نیشنل ایڈمنسٹریٹیو اکیڈمی کی عمارتیں ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

مسوری ایک پہاڑی مقام ہے جو یوپی کے ضلع دہرہ دون میں واقع ہے۔ مسوری کو عوامی زبان میں منسوری کہا جاتا ہے۔ یہاں پہلے اس نام کا ایک معمولی گاؤں تھا۔ اس کے بعد برٹش دور میں ایک انگریز کیپٹن ینگ (Captain Young) نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا اور ۱۸۲۶ میں اس نے پہلی بار یہاں برٹش آبادی قائم کی۔ اس کے بعد سے اس کا نام مسوری ہو گیا۔

اس کے بعد وہاں ترقیاتی کام شروع ہوئے۔ سڑکیں بنائی گئیں۔ اسکول اور لائبریری اور کلب بنائے گئے۔ یہاں پہلا اینگلکن چرچ ۱۸۳۷ میں تعمیر کیا گیا۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک پورا شہر قائم ہو گیا۔

مسوری کو نہایت خوبصورت مقام سمجھا جاتا ہے لیکن اگر آپ مسوری شہر میں داخل ہو کر اس کی سڑکوں پر چل رہے ہوں تو وہ عام شہروں جیسا ایک شہر دکھائی دے گا۔

انگریزوں کے آنے سے پہلے بھی یہ پہاڑی مقامات (hill stations) موجود تھے مگر ان کو develop کرنے کا کام انگریزوں نے کیا۔ عام لوگ غالباً یہ سوچتے ہوں گے کہ سڑک تو صرف سیدھی بنائی جاسکتی ہے اور چونکہ پہاڑ پر سیدھی سڑک نہیں بنائی جاسکتی اس لئے اس کو استعمال کرنے کا خیال بھی ان کے دماغ میں نہ آیا۔ انگریزوں نے ہندستان میں غالباً پہلی بار پہاڑوں پر چڑھنے کے لئے چکردار سڑک بنانے کا رواج شروع کیا جو سلوپ (slope) کو کاٹ کر اور ہموار کر کے بنائی جاتی ہے۔ اس طرح انگریز چکردار سڑکیں بنا کر پہاڑ کے اوپر پہنچے اور اس کے اوپر ایک خوبصورت شہر آباد کر دیا اور پرکشش تفریح گاہیں بنائیں۔

مسوری اور اس کے آس پاس کا پہاڑی علاقہ ۱۹ویں صدی کے آغاز تک نیپال کا ایک مضافاتی حصہ تھا۔ اس کے بعد برٹش فوجیں ۱۸۰۱ میں گورکھپور تک پہنچ گئیں۔ برٹش فوجوں نے جب مزید آگے بڑھنا چاہا تو ان کی جھڑپیں نیپال کے گورکھا قبائل سے شروع ہو گئیں۔ یہ سلسلہ دیر تک قائم رہا۔ ۱۸۱۶ میں انگریزی فوجوں نے مکوان کے مقام پر نیپالی فوجوں کو آخری شکست دی۔ اس کے بعد انگریزوں اور نیپالی حکومت کے درمیان ایک اگریمنٹ کے تحت اس پورے علاقہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا جس میں مسوری بھی شامل تھا۔

مسوری اور اس کے آس پاس کے پہاڑی علاقوں کی اہمیت ہل اسٹیشن کے علاوہ انگریزوں کے لئے یہ تھی کہ وہ اس کے ذریعہ سنٹرل ایشیا سے اپنے تعلقات کو قائم کر سکتے تھے:

> They obtained greater facilities for communications with the regions of central Asia.

اگر بہادری کے اعتبار سے تقابل کیا جائے تو گورکھا قبائل انگریزوں سے زیادہ بہادر تھے. مگر دونوں میں یہ فرق تھا کہ گورکھا لوگ صرف روایتی ہتھیاروں اور روایتی طریقوں سے مسلح تھے۔ جب کہ انگریزی فوج جدید ٹکنالوجی اور بہتر فوجی پلاننگ کی مالک ہو چکی تھی۔ اس لئے

بہادرانہ ٹکراؤ کے باوجود گورکھا فوج کو انگریزوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ تاہم اس کامیابی کے بعد انگریزوں نے گورکھا کو دشمن کے روپ میں دیکھنے سے زیادہ ان کو ان کی غیر معمولی جنگی صلاحیت کے اعتبار سے دیکھا۔ چنانچہ بعد کو انھوں نے گورکھا قبائل سے تعلقات بڑھا کر ان کو اپنی فوج میں شامل کر لیا۔ گورکھا رجمنٹ آخر وقت تک انگریز فوج کا اہم حصہ بنی رہی۔

ایک بنگالی پروفیسر سے ملاقات ہوئی۔ وہ رابندر ناتھ ٹیگور کو قریب سے جانتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ٹیگور شانتی نکیتن میں روز آنہ صبح کو سورج کے سامنے بیٹھا کرتے تھے۔ اس وقت ان کے لئے جوس کا ایک گلاس لایا جاتا تھا جس کو وہ روز آنہ پیتے تھے۔ اس وقت اکثر اسٹوڈنٹ وغیرہ ان کے پاس جمع ہو جاتے تھے۔ ان لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ ٹیگور تنہا جوس پی لیتے ہیں ہم لوگوں کو کبھی آفر نہیں کرتے۔

ایک روز ایک طالب علم نے یہ بات ٹیگور سے کہہ دی کہ آپ اکیلے جوس پی لیتے ہیں اور ہم لوگوں کو کبھی آفر نہیں کرتے۔ ٹیگور نے ایک چمچہ جوس گلاس سے نکالا اور طالب علم سے کہا کہ اس کو چکھو۔ طالب علم نے جب اس کو منھ میں ڈالا تو وہ اتنا کڑوا تھا کہ وہ اس کو پی نہ سکا۔ معلوم ہوا کہ یہ کوئی پھل کا جوس نہیں ہوتا بلکہ کریلے کا جوس ہوتا ہے۔ اس کے بعد لوگ مطمئن ہو گئے۔

کریلا بعض سخت امراض کے لئے بے حد مفید ہے۔ اگر کوئی شخص کچا کریلا روز آنہ کھائے تو اس کو ذیابیطس وغیرہ جیسی بیماریاں نہیں ہوں گی۔ حال میں امریکہ کی بعض کمپنیوں نے اسی لئے کریلا اور جامن جیسی کچھ مفید چیزوں کو اپنے لئے پیٹنٹ کرالیا ہے۔

یہاں کی اکیڈمی میں ایک بہت عمدہ لائبریری ہے۔ جس میں نہ صرف اردو زبان کی کافی کتابیں موجود ہیں بلکہ اسلام پر اتنا زیادہ لٹریچر موجود ہے کہ آدمی ان کا مطالعہ کر کے اسلام کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ یہاں پر سکون ماحول میں بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ کرنے کا مکمل ماحول ہے۔ مزید یہ معلوم ہوا کہ کتابوں کا یہ وسیع ذخیرہ دہرہ دون کے ایک ہندو

مسٹر پی کے جین نے اپنے ذاتی کتب خانہ کے لئے جمع کیا تھا۔ انھوں نے اپنی آخری عمر میں اس پورے ذخیرہ کو اکیڈمی کی لائبریری کو بطور عطیہ دے دیا۔

اس لائبریری کو دیکھتے ہوئے خیال آیا کہ کیسا عجیب زمانہ تھا جب اس ملک میں اردو، فارسی، عربی کا اتنا زیادہ رواج تھا کہ غیر مسلم حضرات بھی ان زبانوں کو سیکھتے تھے اور ان زبانوں میں جو لٹریچر ہے ان کا مطالعہ کرتے تھے۔ اس طرح اسلام کے عمومی تعارف کا کام کسی براہِ راست دعوتی مہم کے بغیر اپنے آپ جاری تھا۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کی وہ قومی تحریکیں بلاشبہہ جرم کی حیثیت رکھتی ہیں جنھوں نے اس فضا کو برہم کر کے اس کی جگہ نفرت اور تشدد کا ماحول قائم کر دیا۔

ایک روز ہم لوگوں کی غیر رسمی میٹنگ تھی۔ اس میں اکیڈمی کے ڈپٹی ڈائرکٹر کی تین سالہ بچی اپنے بھائی کے ساتھ آگئی۔ اس کا نام یونیکا تھا۔ لوگ اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگے۔ ایک صاحب نے اپنی جیب سے دو ٹافی نکالی اور اس کو دیتے ہوئے کہا کہ ایک تمہارے لئے ہے اور ایک تمہارے بھائی کے لئے۔ یونیکا ٹافی لے کر خوش خوش اپنے بھائی کے پاس گئی اور پھر یہ کہتے ہوئے دونوں ٹافی خود لے لی کہ بھائی کا دانت خراب ہو جائے گا۔

میں نے سوچا کہ ذاتی انٹرسٹ کے معاملہ میں ہر آدمی کتنا زیادہ ہوشیار ہوتا ہے، حتی کہ چند سال کا ایک چھوٹا بچہ بھی۔ ذاتی انٹرسٹ کا جذبہ بلاشبہہ انسان کے اندر سب سے زیادہ طاقتور جذبہ ہے۔ اگر یہ جذبہ نہ ہو تو دنیا کی تمام سرگرمیاں ٹھپ ہو کر رہ جائیں۔ تاہم وہ ایک آزمائش بھی ہے۔ آدمی اگر ذاتی معاملہ میں کچھ ہو اور دوسروں کے معاملہ میں کچھ اور بن جائے تو آخرت کی عدالت میں اس سے پوچھا جائے گا کہ جب اپنے انٹرسٹ کے معاملہ میں تم اتنا زیادہ ہوشیار تھے تو دوسروں کے انٹرسٹ کے معاملہ میں تم اتنا زیادہ نادان کیوں بن گئے۔

ذاتی انٹرسٹ کا طاقتور جذبہ آدمی کے لئے نہایت مفید چیز ہے مگر اسی کے ساتھ وہ امتحان کا ایک پرچہ بھی ہے۔

مسوری کے اس سمینار میں پوری کارروائی انگریزی میں ہوئی۔ مجھے ۲۶ جولائی کی دوپہر

کو تقریر کرنے کا موقع ملا۔ سبجکٹ کے مطابق میں نے کنورژن اور اسلام کے موضوع پر خطاب کیا۔ میری تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ کنورژن کے دو مطلب ہیں۔ایک ہے کسی دنیوی مقصد کے لئے مذہب بدلنا۔اس قسم کا کنورژن اسلام میں پسندیدہ نہیں۔ہجرت کے موقع پر ایک شخص نے مکہ سے مدینہ کی طرف اس لئے ہجرت کی کہ اس کو مدینہ کی ایک خاتون سے نکاح کرنا تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے عورت سے نکاح کے لئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی کے لئے تھی جس کے لئے اس نے ہجرت کی۔

کنورژن کی دوسری قسم جس کو اسلام پسند کرتا ہے وہ سچائی کی دریافت کے ہم معنی ہے۔ جب آدمی اس لئے اپنا مذہب بدلے کہ اس نے اس مذہب میں سچائی کو دریافت کیا ہے تو ایسی حالت میں مذہب کو بدلنا عین فطری چیز ہے۔اس قسم کا کنورژن سادہ طور پر کنورژن نہیں ہوتا بلکہ وہ انٹلکچول ٹرانسفارمیشن (intellectual transformation) یا ذہنی ارتقاء کے ہم معنی ہوتا ہے۔

اس کے بعد میں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ اسلامی تعلیمات کا تعارف کرایا اور یہ بتایا کہ اسلام امن اور رحمت اور اخوت انسانی کا مذہب ہے۔ مسلمان اگر اس کے خلاف کریں تو اس کی ذمہ داری مسلمان پر ہوگی نہ کہ اسلام پر۔ آپ کو چاہئے کہ مسلمانوں کے عمل کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جانچیں۔ آخر میں سوال وجواب کا وقفہ تھا۔لوگوں نے اسلام کے بارے میں کئی سوالات کئے۔اس کا میں نے جواب دیا۔لوگوں کے تاثر سے معلوم ہوا کہ وہ ان جوابات پر مطمئن ہوئے۔

یہاں حاضرین سب کے سب ہندو نوجوان تھے۔یہ وہ لوگ تھے جو I A S کے امتحان میں پاس ہوتے ہیں۔اس اکیڈمی میں ان کو پروفیشنل ٹریننگ کے لئے مختصر مدت تک کے لئے بلایا جاتا ہے۔

ایک سوال یہ تھا کہ اسلام میں کیوں ایسا مانا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام آخری پیغمبر ہیں۔ان کے بعد کوئی دوسرا پیغمبر آنے والا نہیں۔اس کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ یہ صرف عقیدہ کی

بات نہیں بلکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ پیغمبر اسلام نے یہ اعلان کیا تھا کہ میں خدا کا آخری پیغمبر ہوں۔ میرے بعد کوئی اور پیغمبر نہیں آئے گا۔ آپ کے یہ الفاظ آپ کے بعد تاریخ کا حصہ بن گئے۔ چنانچہ آپ کے بعد کوئی بھی شخص پیدا نہیں ہوا جو یہ دعوی کرے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔

آج ۲۵ جولائی ۱۹۹۹ تک آپ کا یہ قول ایک تاریخی حقیقت بنا ہوا ہے۔ آپ کو ایسا کہے ہوئے چودہ سو سال ہو گئے مگر ابھی تک دنیا میں کوئی بھی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا جو یہ کہے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ انھوں نے کہا کہ رام کرشنا پرم ہنس نے کہا تھا کہ میں نے خدا کو دیکھا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں خود بھی یہ کہتا ہوں کہ میں نے خدا کو دیکھا ہے۔ یہ قول مجازی معنوں میں ہوتا ہے۔ مگر یہ کہنا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں بالکل دوسری بات ہے اور جب کسی نے ایسا دعوی نہیں کیا تو پیغمبر اسلام کا یہ اعلان اپنے آپ قائم ہے۔ اس کے لئے مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ مذہب سب پاکھنڈ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے کبیر داس کا ایک دوہا سنایا جس میں انھوں نے ہندو دھرم اور اسلام دونوں کے مذہبی رسوم کا مذاق اڑایا ہے۔ اسلام کے بارے میں انھوں نے یہ کہا ہے:

کاکر پاتھر جوڑ کر مسجد گئی چنائے
تا چڑھ ملا بانگ دے
کیا بہرا ہوا خدائے

میں نے کہا کہ جہاں تک ہندو دھرم کا سوال ہے تو ہندو مذہب کے نمائندے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں وہ اس کا جواب دیں گے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو کبیر کو اذان کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنے دوہے میں جو کچھ کہا ہے اس کا سبب ان کی ناواقفیت ہے نہ کہ اذان کی حقیقت۔

میں نے کہا کہ مسجد کا ملا (موذن) جو بانگ یا اذان دیتا ہے اس میں وہ خدا کو نہیں پکارتا۔ خدا کو دعا میں پکارتے ہیں نہ کہ اذان میں۔ اذان میں مسجد کے آس پاس رہنے والے مسلمانوں کو پکارا جاتا ہے۔ چنانچہ اذان میں یہ الفاظ بھی ہوتے ہیں کہ: **حي على الصلاة حي على الفلاح**

Come to the mosque for prayer.

اس غلط فہمی کا سبب یہ ہے کہ جس پکار کا خطاب انسان سے تھا اس کو انھوں نے خدا کے ساتھ جوڑ دیا۔ اکثر غلط فہمیوں کا سبب یہی ہوتا ہے۔ لوگ کہیں کی بات کہیں جوڑ دیتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک سیدھی بات کا عجیب و غریب طور پر الٹا مطلب نکال لیتے ہیں۔

ایک سوال یہ تھا کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ اسلام کو مسلمانوں سے الگ کر کے دیکھو۔ ایسا کیوں کر ممکن ہے۔ ہم تو دونوں کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ آپ کا یہ اصول استثنائی طور پر صرف اسلام کے لئے نہیں ہو سکتا۔ پھر یہی اصول آپ کو ہر جگہ ماننا پڑے گا۔ مثلاً ہندستان کا ایک دستور ہے۔ اسی کے ساتھ ہندستان میں ایک سماج آباد ہے جس کو ہندستانی سماج کہا جاتا ہے۔ آپ ایسا نہیں کرتے کہ دستور اور سماج دونوں کو ایک سمجھ لیں۔ اس کے برعکس آپ دستور کو معیار کا درجہ دیتے ہیں۔ اور ہندستانی سماج کو اسی معیار کی روشنی میں جانچتے ہیں۔ اگر آپ دونوں میں فرق نہ کریں تو یہ ہوگا کہ جو ہندستانی سماج کے لوگ کریں گے وہی دستور اور قانون سمجھا جانے لگے گا۔ آپ ملکی دستور اور ملکی سماج کو الگ الگ کر کے دیکھتے ہیں۔ یہی طریقہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بھی آپ کو اختیار کرنا چاہئے۔

ایک سوال یہ تھا کہ مسلمانوں کا ماننا یہ ہے کہ اسلام مذہب سب سے زیادہ سچا مذہب ہے۔ اس کے برعکس ہندوؤں کا ماننا یہ ہے کہ ہر مذہب میں سچائی ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ہندوؤں کے فارمولے کو اپنا لیں کیوں کہ اس کے بغیر مختلف مذاہب کے درمیان اتحاد قائم نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنے جواب میں کہا کہ مختلف مذاہب کا امتزاج (amalgamation) اتحاد کا فارمولا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف فطرت میں شامل ہے۔ اس لئے وہ کسی حال میں ختم نہیں ہو سکتا۔ یہی

وجہ ہے کہ ہر مذہب میں خود اس کے اندر طرح طرح کے اختلافات پائے جاتے ہیں۔اس لئے اگر بالفرض آپ تمام مذہبوں کو ملا کر ایک مذہب بنادیں تب بھی اختلاف باقی رہے گا۔

اصل یہ ہے کہ مذہبی اتحاد کا صحیح فارمولا باہمی اعتراف (mutual recognition) نہیں ہے بلکہ اس کا صرف ایک فارمولا ہے اور وہ باہمی احترام (mutual respect) ہے۔ اسلام نے اسی باہمی احترام کے فارمولے پر زور دیا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ جس ڈھنگ سے اسلام کو پیش کرتے ہیں اس سے ہم کو اختلاف نہیں مگر دوسرے کئی لوگ اسی اسلام کو دوسرے ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں پھر ہم کس کی بات کو سچا سمجھیں۔ میں نے کہا کہ آپ یہ نہ دیکھیں کہ میں نے کیا کہا اور دوسرے نے کیا کہا۔ بلکہ یہ دیکھئے کہ اسلام کی مقدس کتاب قرآن میں کیا کہا گیا ہے۔ آپ قرآن کا ایک نسخہ لیں اور اپنے ذہن کو خالی رکھ کر اس کو پڑھیں۔ مجھے پکا یقین ہے کہ آپ قرآن کے مسیج کو پالیں گے۔

میری تقریر کا خدا کے فضل سے بہت اچھا اثر ہوا۔ تمام لوگوں نے بہت غور سے سنا اور اس کا اعتراف کیا۔ میں نے اپنی تقریر میں اسلام کی کھلی وضاحت کی تھی۔ لیکن کسی نے بھی منفی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ ہر ایک مطمئن نظر آیا۔ ادارہ کے ڈپٹی ڈائرکٹر سنجیو چوپڑا نے کہا: ''آپ کی اسپیچ کے دوران پن ڈراپ سائلنس تھا۔ اس طرح کسی کو بھی نہیں سنا گیا''۔ اسی طرح کے تأثر کا دوسرے لوگوں نے بھی اظہار کیا۔ کئی لوگوں نے کہا کہ میں آپ کے اسلامک سنٹر میں آؤں گا۔ کئی لوگوں نے اسلام کے مطالعہ کی خواہش ظاہر کی اور قرآن کا ترجمہ طلب کیا۔

اس ادارہ کے موجودہ ڈائرکٹر مسٹر سنجیو چوپڑا ہیں۔ یہ ایک مرکزی ادارہ ہے جو IAS اور IPS میں پاس شدہ نوجوانوں اور افسران کی پروفیشنل ٹریننگ کے لئے ۱۹۵۹ میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کی عمارتیں نہایت خوبصورت انداز میں تعمیر کی گئی ہیں۔ اور چاروں طرف کے سرسبز ماحول نے اس کو اور بھی پرکشش بنادیا ہے۔

خطاب کے وقت وسیع ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ یہ سب کے سب وہ لوگ تھے جو آئی

اے ایس کا امتحان پاس کر چکے ہیں اور اب جلد ہی کوئی بڑا انتظامی عہدہ سنبھالنے والے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو عملاً کلکٹر یا کمشنر کے عہدوں پر کام کر رہے ہیں۔ اور یہاں وقتی طور پر بطور استاد بلائے گئے تھے۔ یہ میرے لئے ایک بڑا خوشگوار تجربہ تھا کہ مجھ کو ایسے ذمہ دار حضرات کے سامنے خطاب کرنے کا موقع ملا۔ پروگرام کے بعد ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے اسلام کی نسبت سے جو باتیں کہیں وہ بہت قیمتی تھیں کیوں کہ اس سے لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہوئی ہیں۔ اور اگر آپ اعلیٰ انتظامی عہدیداروں کی غلط فہمیاں دور کر دیں تو کتنے مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔

یہ "انٹر فیتھ ڈائلاگ" اکیڈمی کے وسیع ہال میں ہوا۔ سامعین تقریباً سب کے سب ہندو تھے۔ میری تقریر کے بعد کئی لوگوں نے کہا کہ آپ کی تقریر سن کر ہمارے اندر یہ جذبہ ابھرا ہے کہ ہم اسلام کا مطالعہ اوریجنل سورسز سے کریں۔ ایک تعلیم یافتہ ہندو خاتون مادھوری سنتم سوندھی نے واپسی کے بعد اپنے خط مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۹۹ میں لکھا ہے کہ آپ کی تقریر سننے کے بعد میں نے قرآن کا مطالعہ شروع کر دیا ہے:

I have begun to read the Quran with some attention after listening to your speech.

۲۵ جولائی کی شام کو مسوری سے واپسی ہوئی، مسوری میں یہ بارش کا زمانہ تھا لیکن اللہ کے فضل سے پورے دوران قیام میں موسم بہت اچھا رہا۔ مسوری سے واپس ہو کر بذریعہ کار ہم لوگ دہرہ دون پہنچے۔ شام کا وقت ہونے کی وجہ سے چاروں طرف کہر پھیل گیا تھا جس نے قدرتی مناظر کو اپنے اندر ڈھک لیا تھا۔

لینن نے لکھا ہے کہ مذہبی اور اخلاقی تصورات ذہن کو کہر آلود کرنے (befogging of the mind) کا سبب بنتے ہیں۔ لینن کی بات مذہب کے بارے میں درست نہیں۔ لیکن بجائے خود یہ بات درست ہے کہ، خاص طور پر موجودہ زمانہ میں، غلط تعبیرات و تشریحات گہرے کہر کی طرح پھیل گئی ہیں کہ لوگ اس سے باہر آکر چیزوں کو ان کے اصل روپ میں دیکھ نہیں

پاتے۔مادی کہر قدرتی مناظر کو ڈھک لیتا ہے اور غلط افکار کا کہر معانی اور حقائق کو۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ سفر کر کے ہم لوگ دہرہ دون ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ یہاں کچھ دیر ویٹنگ روم میں قیام کیا۔ یہاں پروفیسر این ایچ سمتانی سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ وہ ایک بدھسٹ ہیں اور انھوں نے بدھزم پر ریسرچ کی ہے۔ ریٹائر منٹ کے بعد اب وہ سنٹر فار مہاینا بدھسٹ اسٹڈیز کے اعزازی ڈائرکٹر ہیں۔ ۷۵ سال کی عمر میں بھی ان کی صحت کافی اچھی ہے۔ اس کا راز انھوں نے یہ بتایا کہ وہ روز آنہ جنگل میں دیر تک ٹہلتے ہیں اور روزانہ صبح کو نیم کی پتی (پھنگی) کھاتے ہیں۔

ہندستان میں کریلا اور نیم کی پتی وغیرہ بہت عرصہ سے صحت کے لئے مفید سمجھے جاتے رہے ہیں۔ اب امریکنوں نے اس راز کو دریافت کر لیا ہے۔ انھوں نے کریلا اور نیم جیسی کئی چیزوں کو پیٹنٹ کرالیا ہے۔ بہت جلد ان چیزوں کا روایتی کڑواپن ختم ہو جائے گا۔ امریکی کمپنیاں ان کو پراسس کر کے کیپسول میں بھر دیں گی اور پھر لوگ اس کو پانی کے ایک گھونٹ سے نگل لیا کریں گے۔ کریلا اور نیم کے فائدے کو جاننے کے باوجود ابھی تک بہت کم لوگ ان کو استعمال کر پاتے تھے۔ اب ان کا استعمال عمومی سطح پر ہونے لگے گا۔

۲۶ جولائی کی رات کو مسوری اکسپریس کے ذریعہ دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ اس سفر میں کئی لوگ میرے ساتھ تھے۔ ڈاکٹر ڈے مطالعہ کے اتنے شوقین ہیں کہ انھوں نے دہرہ دون کے پلیٹ فارم پر ۴۰۰ روپے میں دو کتابیں خریدیں۔ وہ ہر قسم کی کتابوں کا بکثرت مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کی عمر اب ۷۵ سال ہو چکی ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے بہت کتابیں پڑھی ہیں۔ دنیا کے مختلف ملکوں کے سفر کئے ہیں۔ اپنی کوئی خاص ذہنی دریافت (intellectual finding) بتائیے۔ انھوں نے کچھ دیر سوچا اور اس کے بعد ٹیگور کا ایک شعر پڑھ دیا۔ میں نے کہا کہ میں ٹیگور کی دریافت نہیں آپ کی دریافت پوچھ رہا ہوں۔ مگر انھوں نے اپنی کوئی ذاتی دریافت نہیں بتائی۔

یہ سوال میں اکثر لوگوں سے کرتا ہوں۔ مگر مجھے بہت کم آدمی ایسے ملے جو اس سوال کا

کوئی واضح جواب دے سکیں۔ احمد دیدات صاحب سے میری ملاقات مالدیپ میں ہوئی۔ ان سے میں نے یہی سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ سب موشگافی (hairsplitting) ہے۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ لوگ سیکڑوں کتابیں پڑھتے ہیں اور لمبی عمریں گزار دیتے ہیں مگر ان کے پاس یہ کہنے کے لئے نہیں ہوتا کہ فلاں بات میری اپنی دریافت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فلاں بات پہلی بار میرے اوپر منکشف ہوئی۔

جاپانیوں سے یہ سوال کیا جائے تو اکثر ان سے اس سوال پر کوئی مثبت جواب ملے گا۔ جاپانیوں کے مزاج کا اندازہ جاپانی زبان کی اس کہاوت سے ہوتا ہے کہ ہر روز کوئی نئی بات سیکھو، خواہ وہ سوئی میں دھاگہ ڈالنے کا نیا طریقہ ہی کیوں نہ ہو۔

ٹرین دہرہ دون سے دہلی کے لئے روانہ ہوئی۔ ٹرین کے دونوں طرف دوبارہ سرسبز میدان موجود تھے۔ مگر وہ ہمیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس لئے کہ رات کی وجہ سے چاروں طرف اندھیرا چھا چکا تھا۔ کسی چیز کو دیکھنے کے لئے صرف آنکھ کافی نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ روشنی بھی ضروری ہے۔ اگر روشنی نہ ہو تو آنکھ کے باوجود آدمی کچھ دیکھ نہ سکے گا۔

دہرہ دون اور دہلی کے درمیان سفر کرتے ہوئے ٹرین میں پروفیسر سمتانی سے تفصیلی باتیں ہوئیں۔ وہ بنارس ہندو یونیورسٹی میں بدھزم کے استاد رہے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ گوتم بدھ نے کہا تھا کہ میرے بعد ایک اور بدھا آئے گا جو تم کو اور زیادہ جانکاری دے گا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے عقیدے کے مطابق وہ آچکا ہے اور وہ اسپرٹ کے روپ میں موجود ہے۔ مجھے یہ بات بہت عجیب لگی کیوں کہ پیشین گوئی کے مطابق دوسرے بدھا کو بھی جسم اور روح کا مجموعہ ہونا چاہئے نہ کہ صرف روح کا مجموعہ۔

ایک موقع پر انھوں نے بدھزم پر ایک کتاب کی نشاندہی کی اور کہا کہ بدھزم کے مطالعہ کے لئے یہ کتاب بہت اچھی ہے۔ میں نے کہا کہ اس کتاب کا نام اور اس کے مصنف کا نام ایک کاغذ پر لکھ دیجئے۔ انھوں نے اپنے بیگ سے قلم نکالنا چاہا تو وہ فوراً انھیں نہیں ملا۔ کچھ دیر تلاش کرنے

کے بعد آخر کار قلم انھیں مل گیا۔ اس موقع پر ان کی زبان سے نکلا کہ قلم کا گم ہو جانا گویا ہر چیز کا گم ہو جانا ہے۔

When pen is lost everything is lost

قلم بلاشبہہ انسان کے لئے بے حد اہم ہے۔ اس لئے قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ **علم بالقلم**۔ اللہ نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔

ٹرین کے ذریعہ یہ سفر تقریباً ۹ گھنٹہ کا تھا۔ کچھ دیر کے بعد نیند آگئی۔ اس کے بعد جب نیند کھلی تو ٹرین دہلی کے قریب پہنچ چکی تھی۔ نیند کیسی عجیب نعمت ہے۔ نیند مشکل کو آسان بناتی ہے اور لمبے سفر کو مختصر کر دیتی ہے۔ تاہم وہ آج بھی فطرت کا ایک راز ہے۔ جدید دور میں اہل علم نے اس موضوع پر کافی ریسرچ کی ہے مگر وہ اس کی کوئی توجیہ ابھی تک دریافت نہ کر سکے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ "خدا نے نیند کو تمہاری تکان رفع کرنے کے لئے بنایا ہے" (النبا۹)۔ اس اعتبار سے نیند ایک عظیم نعمت ہے۔ انسان دن بھر کام کرتا ہے۔ جس میں اسے ذہنی اور جسمانی تکان آجاتی ہے۔ اس تکان کو دور کرنے کا فطری طریقہ اللہ تعالیٰ نے نیند کی صورت میں پیدا فرمایا۔ اگر نیند نہ ہو تو کسی بھی دوسرے ذریعہ سے آدمی یہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ جنھیں مستقل نیند نہیں آتی وہ پاگل ہو جاتے ہیں۔

۲۷ جولائی ۱۹۹۹ کو صبح تقریباً ۸ بجے ہماری ٹرین دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر کھڑی ہو گئی۔ سفر اپنے اختتام تک پہنچ گیا۔ اسی طرح ہر سفر ایک مقام سے شروع ہو کر دوسرے مقام پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہی معاملہ آخرت کا بھی ہے۔ ہر آدمی صبح و شام اس سفر کو طے کر رہا ہے۔ موت اس سفر کا خاتمہ ہے۔ موت کے بعد جو دوسرا سفر شروع ہوتا ہے، اس کے بارے میں موجودہ دنیا میں کسی کو بھی کچھ نہیں معلوم۔ ایک مصنف کے الفاظ میں، کتاب زندگی کے اگلے ورق سر بمہر ہیں۔

سوال

ستمبر ۱۹۹۹ کے اردو الرسالہ کے صفحہ ۴۶ میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "۱۹۹۲ میں بابری مسجد کے ڈھائے جانے سے پہلے اس وقت کے وزیر اعظم نرسمہاراؤ نے مجھے بابری مسجد کے بارے میں بات چیت کے لئے بلایا تھا۔ پرائم منسٹر ہاؤس، نئی دہلی میں جب ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں بے اختیار رو پڑا۔ میں نے کہا کہ بابری مسجد کو بچانے سے بھی بڑا مسئلہ ملک کو بچانا ہے۔" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ حضرت ملک کے وزیر اعظم کے سامنے مسجد کو بچانے کے لئے نہیں مسلمانوں کو بچانے کے لئے نہیں بلکہ ملک کو بچانے کے لئے رو پڑے۔ ایک داعی کے لئے جس پر دنیا بھر کے لوگوں کی نظر لگی ہوئی ہو یہ بات کہنا دعوت کے لئے بہت مضر ہے۔ لوگ اس کو لے کر چہ مگوئیاں کر رہے ہیں۔ **أ حب البلاد الى الله مساجدها** حدیث میں آیا ہے۔ آپ حضرت ملک کے لئے روتے ہیں لیکن مسجد کے لئے یا مسلمانوں کے لئے یہ رونا نہیں۔ کسی بھی پیغمبر سے اس طرح کا رونا ملک کے لئے ثابت نہیں۔ (محمد اکرم الزہری، سلالہ، سلطنت عمان)

جواب

مذکورہ حدیث کا حوالہ یہاں غیر متعلق ہے۔ یہ حدیث تفصیل کے ساتھ صحیح ابن حبان (جلد اول) میں آئی ہے۔ صحیح مسلم (کتاب المساجد) میں اس کے پورے الفاظ یہ ہیں: **احب البلاد الى الله مساجدها وابغض البلاد الى الله اسواقها** (اللہ کے نزدیک شہروں میں سب سے محبوب جگہ اس کی مسجدیں ہیں اور اللہ کے نزدیک شہروں میں سب سے مبغوض جگہ اس کے بازار ہیں)۔ اس حدیث میں جو تقابل ہے وہ مساجد اور بلاد کے درمیان نہیں ہے بلکہ وہ مساجد اور اسواق کے درمیان ہے۔ امام نووی نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: **المساجد محل نزول الرحمة والاسواق ضدها** (صحيح مسلم بشرح النووى ۱۷۱/۵) یعنی مسجدیں اللہ کی رحمت کے نزول کا مقام ہیں اور بازار اس کا ضد ہیں۔ عجیب بات ہے کہ لوگوں نے اس حدیث سے بلاد کے مبغوض ہونے کا مسئلہ نکال لیا۔ حالاں کہ اس حدیث میں جس چیز کے مبغوض ہونے کا

مسئلہ بیان کیا گیا ہے، وہ اسواق ہیں، یعنی شاپنگ اور مارکیٹنگ کا تباہ کن شوق جس میں آج دنیا بھر کے مسلمان مرد اور مسلمان عورت بری طرح مبتلا ہیں۔ دوسری بات یہ کہ میری مذکورہ گفتگو کا تعلق عمومی معنوں میں مساجد کے بارے میں نہیں تھا بلکہ وہ خصوصی طور پر صرف ایک مسجد کے بارے میں تھا جو لمبے عرصے سے ہندستان کے دو بڑے فرقوں کے درمیان نزاعی بنی ہوئی تھی۔ کچھ خود ساختہ لیڈروں نے اس مسجد کے سوال پر انتہائی غیر حکیمانہ رویہ اختیار کر کے دونوں فرقوں کے درمیان نفرت اور تشدد کو بھڑکا دیا۔ جس کا سب سے زیادہ براخمیازہ فطری طور پر خود مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔ نیز اس کے نتیجہ میں جو باہمی تلخی پیدا ہوئی اس نے ملک میں دعوت کے ماحول کو بگاڑ دیا۔ میں نے چاہا کہ اس کشیدگی کو ختم کر کے دوبارہ یہاں امن کی فضا اور دعوت کا ماحول قائم کروں۔ آپ نے لکھا ہے کہ "کوئی پیغمبر ملک کے لئے نہیں رویا"۔ جب میں نے وزیراعظم سے کہا کہ ملک کو بچایئے تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ یہاں کی زمین اور پہاڑ کو بچایئے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ ملکی سماج کو تشدد سے بچایئے اور یہاں امن قائم کیجئے۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اگر اس ملک میں امن قائم ہو تو اس کا فائدہ کس کو ملے گا ــــــ چھری کو یا خربوزہ کو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں میرا مسلک عین وہی تھا جو تمام دنیا کے علماء نے اس طرح کے حالات میں عملاً اختیار کر رکھا ہے۔ ہندستان میں ۱۹۴۷ کی تقسیم کے وقت سیکڑوں مسجدوں کا وہی انجام ہوا جو ۱۹۹۲ میں بابری مسجد کا ہوا۔ مگر ہندستانی علماء نے ان مساجد کو اشو نہیں بنایا بلکہ ملک و قوم کے تحفظ کو اشو بنایا۔ پاکستان (لاہور) میں برٹش حکومت کے دور میں مسجد شہید گنج کو ڈھانے کا واقعہ پیش آیا۔ اور سکھوں نے اس کو گوردوارہ کی حیثیت دے دی۔ آج بھی اس مقام پر "گوردوارہ سنگھیاں" کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ ۱۹۴۷ میں پاکستان بن گیا اور یہاں کا اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گیا مگر اس کے بعد تمام پاکستانی علماء اپنے اپنے انداز میں ملک کی تعمیر میں لگ گئے۔ کسی نے اس مسجد کا اشو نہیں اٹھایا۔ اسی طرح موجودہ زمانے میں تقریباً تمام عرب ملکوں میں سیکڑوں کی تعداد میں مسجدیں ڈھائی گئی ہیں۔ اور یہ سب شہری ترقی کے مقصد کے تحت ہوا۔ اب تمام دنیا کے علماء اور ان کے متعلقین

انھیں عرب ممالک میں جارہے ہیں تاکہ ان شہروں کی ترقی میں اپنا حصہ لے سکیں۔ انھوں نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ پہلے تمام ڈھائی ہوئی مسجدوں کو ان کی سابق جگہ پر دوبارہ تعمیر کرو، اس کے بعد ہم تمہارے ملکوں میں آئیں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بابری مسجد (اجودھیا) کے معاملہ میں جو مسلک میں نے اختیار کیا وہ عین وہی تھا جو عقل اور شریعت کا تقاضا ہے۔ بابری مسجد کے سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ وہ عام مسجدوں کی طرح ایک مسجد نہیں۔ بلکہ آغاز ہی سے وہ ایک نزاعی مسجد کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور کسی بھی نزاعی معاملہ میں عقل اور شریعت دونوں کا تقاضا ہے کہ اس کو حکمت اور تدبر کے ذریعہ حل کیا جائے نہ کہ غوغا آرائی کے ذریعہ۔ بابری مسجد کی مخصوص حیثیت کو بتانے کے لئے یہاں میں صرف ایک حوالہ نقل کرتا ہوں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد (مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "ہندستان اسلامی عہد میں"۔ وہ ۱۹۷۲ میں (عربی میں) حیدر آباد سے اور ۱۹۷۳ میں (اردو میں) لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے ساتھ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ایک مبسوط مقدمہ شامل ہے۔ اس میں انھوں نے اس کتاب کے بارے میں یہ الفاظ درج کئے ہیں: "ہم اہل ملک کے سامنے یہ قیمتی تحفہ اور تاریخی دستاویز پیش کرتے ہوئے مسرت محسوس کر رہے ہیں۔" (صفحہ ۲۴) اس کتاب کے ایک باب کا عنوان ہے "ہندستان کی مسجدیں"۔ اس باب میں "بابری مسجد اجودھیا" کے ذیلی عنوان کے تحت یہ سطریں درج ہیں: "یہ مسجد بابر نے اجودھیا میں تعمیر کی تھی، جسے ہندو رام چندر جی کی جائے ولادت کہتے ہیں، ان کی بیوی سیتا کا ایک واقعہ مشہور ہے، کہا جاتا ہے کہ سیتا کا یہاں ایک مندر تھا، جہاں وہ رہتیں اور اپنے شوہر کے لئے کھانا پکاتی تھیں، اسی جگہ بابر نے ۹۲۳ھ میں یہ مسجد تعمیر کی۔" (صفحہ ۱۴۱) حقیقت یہ ہے کہ بابری مسجد کا مسئلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک انتہائی نازک مسئلہ تھا۔ لازم تھا کہ اس معاملہ میں خاموش تدبیر کا انداز اختیار کیا جائے۔ ۱۹۴۷ کے بعد ابتدائی دور میں ملک کے بڑے علماء نے ایسا ہی کیا۔ بعد کے زمانے میں بدقسمتی سے یہ مسئلہ کچھ غوغا پسند مسلمانوں کے ہاتھ میں آگیا۔ ان کی ناعاقبت اندیشانہ ہنگامہ آرائیوں نے اس مسئلہ کو خطرناک حد

تک بگاڑ دیا۔ بعد کے دور کی غوغائی سیاست کے نتیجہ میں نہ صرف بابری مسجد زد میں آگئی بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور کشیدگی پھیل گئی جس نے دعوت کے ماحول کو انتہائی حد تک بگاڑ دیا۔ میری کوشش ہر مرحلہ میں یہ رہی ہے کہ بابری مسجد بھی بچی رہے، مسلمان بھی محفوظ رہیں اور دعوت کا ماحول بھی بگڑنے نہ پائے۔ اس پورے پس منظر میں دیکھئے تو آپ کو اس معاملہ میں کوئی اشکال باقی نہ رہے گا۔ آپ کا یہ ارشاد بڑا عجیب ہے کہ میرا رونا مسلمانوں کے لئے نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ الرسالہ کا ہر شمارہ اس غلط فہمی کی تردید کے لئے کافی ہے۔ دیگر مسلم مسائل میں عمومی طور پر اور بابری مسجد کے مسئلہ میں خصوصی طور پر اللہ کی توفیق سے میرا وہ مثبت رول رہا ہے جس کا ذکر سورۃ المائدہ آیت ۶۴ میں کیا گیا ہے۔ بابری مسجد کے مسئلہ کو خود ساختہ مسلم رہنماؤں نے جس ناعاقبت اندیشانہ طریقہ پر اٹھایا اس کے نتیجہ میں ملک میں زبردست فساد پھوٹ پڑا۔ اس وقت میں اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر فسادات کی آگ بجھانے کے لئے اس میں کود پڑا۔ اس معاملہ میں اللہ کی توفیق سے میں نے جو کام کیا اس کا کچھ تذکرہ الرسالہ کے شماروں میں آتا رہا ہے۔ یہاں میں صرف ایک حوالہ نقل کروں گا۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد جب ملک میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تو میں نے کچھ ممتاز ہندو شخصیتوں کو ساتھ لے کر ایک شانتی یاترا نکالی اور ۳۵ مقامات پر گیا۔ تقریباً تین ہفتہ کی یہ شانتی یاترا ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں تفصیل سے کور کی گئی۔ اللہ کے فضل سے اس شانتی یاترا کا غیر معمولی اثر ہوا اور اس کے بعد فسادات کی آگ بجھ گئی۔ یہ سفر کن ہنگامی حالات میں ہوا تھا اس کا اندازہ "شانتی یاترا" کے نام سے شائع ہونے والی رپورٹ (الرسالہ اکتوبر ۱۹۹۳) سے ہو سکتا ہے۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ شہروں میں کرفیو نافذ تھے اور جگہ جگہ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس وقت میرا کیا حال تھا اس کا اندازہ اس سے ہو گا کہ ایک مقام پر جب میں آگ اور دھوئیں کے ماحول میں تقریر کرنے کھڑا ہوا تو میں بے اختیار رو رہا تھا۔ میں نے اپنی تقریر ان الفاظ سے شروع کی۔ ہم یہاں اس لئے آئے ہیں کہ جس آگ کو فائر بریگیڈ کا پانی نہ بجھا سکا اس کو ہم اپنے آنسوؤں سے بجھا دیں۔ (اسفار ہند صفحہ ۹۶)

سوال

دسوالات کے جوابات آپ سے مطلوب ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ مولانا روم
ارون سے پہلے اصول ارتقاء پیش کر چکے ہیں۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔ دوسرا سوال
یہ ہے کہ درج ذیل شعر میں نے کہیں پڑھا تھا، شعر یوں ہے:

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغِ مصطفوی　　جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بو لہبی

س کا خالق کون ہے، اگر بتا سکیں تو مہربانی ہوگی۔ (احساس آفاقی، ونوبا بھاوے نگر،
رلا۔400070)

جواب

یہ صحیح ہے کہ مولانا جلال الدین رومی (وفات ۱۲۷۳) کے یہاں حیاتیاتی ارتقاء کا ابتدائی تصور پایا
جاتا ہے۔ مثلاً ان کا یہ شعر: از نباتی در حیاتی او فتاد۔ اسی طرح ابن مسکویہ (وفات ۱۰۳۰) نے بھی
سی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مگر یہ ان حضرات کی ذاتی ایجاد نہیں۔ اصل یہ ہے کہ پانچ
زار سال پہلے یونان کے بعض فلسفیوں نے حیاتیاتی ارتقاء کا تصور اپنی ابتدائی صورت میں پیش کیا
تھا۔ جب یونانی کتابوں کے عربی ترجمے ہوئے تو یہ نظریہ مسلمانوں تک پہنچا اسی یونانی تصور کو
مولانا روم اور ابن مسکویہ وغیرہ نے دہرایا ہے۔ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے بعد یورپی علماء نے اپنی
کتابوں میں اس کا تذکرہ کیا۔ اس سلسلہ میں ایک درجن سے زیادہ یورپی علماء کے نام لئے جاتے
ہیں۔ مثلاً لامارک (وفات ۱۸۲۹) وغیرہ۔ چارلس ڈارون (وفات ۱۸۸۲) کی خصوصیت یہ ہے کہ
س نے حیاتیاتی ارتقاء کے قدیم نظریہ کو پہلی بار مرتب علمی انداز میں پیش کیا۔ اس موضوع پر
س کی کتاب انواع حیات (The Origin of Species) ۱۸۵۹ میں شائع ہوئی۔ تاہم حیاتیاتی
رتقاء یا عضویاتی ارتقاء کا نظریہ قدیم اور جدید دونوں صورتوں میں غیر ثابت شدہ ہے۔ یہ آج
بھی صرف ایک قیاسی نظریہ ہے نہ کہ کوئی ثابت شدہ واقعہ۔ مثلاً مختلف ملتی جلتی انواع حیات کو
یک ترتیب میں کھڑا کر کے یہ کہا جاتا ہے کہ ایک سے دوسرا نکلا، دوسرے سے تیسرا نکلا،

تیسرے سے چوتھا نکلا، وغیرہ۔ مگر یہ صرف ایک دعویٰ ہے۔ ان مماثل مظاہر حیات کی دوسری زیادہ قریب تر توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو مستقل اور منفرد نوع حیات مانا جائے۔

آپ نے جو شعر نقل فرمایا ہے اس کے شاعر کا نام تو مجھے معلوم نہیں۔ البتہ وہ مجھ کو پسند آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے اس مشہور شعر کے مقابلہ میں وہ بہت زیادہ درست اور با معنی ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز   چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

اقبال کا مذکورہ شعر میرے نزدیک صرف ایک شاعرانہ تخیل ہے، قرآن وحدیث سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے مقابلہ میں آپ کا نقل کردہ مذکورہ شعر موجودہ صورت حال کی نہایت صحیح ترجمانی ہے۔ موجودہ زمانے میں مختلف مقامات پر نظام مصطفیٰ اور نظام اسلام کے نام پر جو نام نہاد متشددانہ جہاد جاری ہے وہ بلاشبہہ اس شعر کا مصداق ہے۔ یہ اسلام کے نام پر ایک ایسا غیر اسلامی فعل ہے جس کی کوئی دوسری مثال چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس موضوع پر الرسالہ میں بار بار لکھا جا چکا ہے۔ یہاں مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔

سوال

عام طور پر مسلمانوں کے اخبارات اور رسائل یہ شکایت کرتے ہیں کہ ہندستان میں مسلمانوں پر ظلم کیا جاتا ہے اسی لئے وہ اقتصادی ترقی نہیں کر پاتے۔ اگر یہ شکایت صحیح ہے تو مسلمانوں کی اقتصادی ترقی کی صورت کیا ہے۔ (ایک قاری الرسالہ، دہلی)

جواب

یہ شکایت درست نہیں۔ اس دنیا میں ہر آدمی اور ہر گروہ اپنے کیے کو بھگتتا ہے۔ ایک کا مقدر کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں۔ واقعات بھی اس کی تردید کرتے ہیں۔ مسلمان اس ملک میں مسلسل اقتصادی ترقی کر رہے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آج ہندستان کا سب سے زیادہ دولت مند آدمی بنگلور کا ایک مسلمان ہے جس کا نام مسٹر عظیم ہاشم ہے۔ ملاحظہ ہو (ٹائمس آف انڈیا، ۲۷ جون ۱۹۹۹)

۱۔ دوردرشن (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۱۳ اگست ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ مسٹر کمار بھولیش انٹرویور تھے۔ یہ انٹرویو اس موضوع پر تھا کہ ہندستانی مسلمانوں کا سیاسی رخ کیا ہے۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ سیاسی رخ یا سیاسی موقف کا تعلق اصلاً سیاسی لیڈر شپ سے ہے۔ موجودہ مسلمانوں کے مخصوص مزاج کی بنا پر ابھی تک ان کے اندر کوئی صحیح سیاسی لیڈر شپ نہیں ابھری۔ اسی مزاج کا یہ نتیجہ بھی ہے کہ موجودہ مسلمانوں میں نہ اتحاد رائے ہے اور نہ ان کی کوئی ملی صحافت۔ ان چیزوں کی حیثیت سیاسی بیس کی ہے اور جب تک بیس نہ ہو کوئی اگلا کام نہیں کیا جاسکتا۔ سیاسی مواقع کو استعمال کرنے کے لئے اس کے موافق سیاسی بنیاد ضروری ہے۔ یہ انٹرویو ''صبح سویرے'' کے پروگرام کے لئے تھا۔

۲۔ ہندو کالج (نئی دہلی) کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ۱۷ اگست ۱۹۹۹ کو اس کے ایک فنکشن میں شرکت کی اور طلبہ کے سامنے ایک تقریر کی۔ تقریر میں انھوں نے بتایا کہ کامیاب زندگی کے اصول کیا ہیں۔ تقریر کے بعد سوال و جواب کا پروگرام تھا۔ بہت سے سوال کئے گئے۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ لِونگ رول ماڈل ضروری نہیں ہے۔ اصل مسئلہ لِونگ رول ماڈل کا نہیں ہے بلکہ لِونگ اسپرٹ کا ہے۔ اگر اسپرٹ زندہ ہو تو آدمی کتابوں سے اور آس پاس کے واقعات سے ہر قسم کے مفید سبق حاصل کرتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کرسکتا ہے۔

۳۔ انڈین اکسپریس کے نمائندہ مسٹر اشیش شرما نے ۱۸ اگست ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ''مذہب اور میڈیا'' سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ مذہبی طبقہ کی یہ بات درست نہیں کہ میڈیا ان کی تصویر بگاڑتا ہے۔ میڈیا کا مقصد نہ تصویر بگاڑنا ہے اور نہ تصویر بنانا۔ اس کی تمام تر دلچسپی سنسنی خیز چیزوں سے ہے کیوں کہ ایسی باتوں کو لوگ دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور سنتے ہیں۔ ایسی حالت میں اہل مذہب

کو چاہئے کہ وہ خود اپنے آپ کو سنسنی خیز سرگرمیوں سے بچائیں تاکہ میڈیا کو یہ موقع ہی ملے کہ وہ ان کو نمایاں کرے اور پھر اس کے نتیجہ میں مذہب کی تصویر بگڑے۔

۴۔ ۱۵ اگست ۱۹۹۹ کو بنگلہ دیش کے ایک جرنلسٹ مسٹر شہریار کبیر نے صدر اسلامی مرکز کا ایک تفصیلی انٹرویو ویڈیو ٹیپ پر ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ان مسلم تحریکوں سے تھا اسلام کے نام پر متشددانہ جہاد کر رہی ہیں۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ ان تحریکوں کا اسلا احیاء سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ کچھ خود ساختہ مسلم لیڈروں کی سیاسی شورش ہے جس کو غلط طور پر اسلام کے نام پر جاری کئے ہوئے ہیں۔ ان متشددانہ تحریکوں کا کوئی بھی مثبت نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ یہ تحریکیں صرف مسلمانوں کی تباہی میں اضافہ کرنے والی ہیں۔ لوگ اپنے آپ کو اسلام پسند کہتے ہیں مگر اصل حقیقت کے اعتبار سے وہ صرف فساد پسند ہیں۔ وہ اسلام کے نام پر زمین میں بگاڑ پیدا کرنے کے مجرم ہیں۔

۵۔ بہت سے غیر مسلم الرسالہ پڑھتے ہیں اور اپنے انداز میں اس کی تعلیمات کی اشاعت کر رہے ہیں۔ مثلاً مکھیڑ (مہاراشٹر) کے مسٹر پرکاش دی پوار نے دیوالی کے موقع پر گریٹنگ کارڈ بڑی تعداد میں چھپوا کر لوگوں کے پاس بھیجا۔ اس کارڈ میں سورۃ اخلاص کا ترجمہ ہندی اور مراٹھی میں شامل کیا گیا تھا۔

۶۔ مختلف مقامات سے جو خبریں مل رہی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں نے واضح طور پر یوٹرن (U turn) لیا ہے۔ وہ جذباتیت سے لوٹ کر تیزی سے حقیقت پسندی کی طرف آرہے ہیں۔ اب اکابر سے لے کر اصاغر تک سب وہی بولی بول رہے ہیں جس کی طرف الرسالہ پچھلے ۲۵ سال سے لوگوں کو متوجہ کر رہا تھا۔ یہ براہ راست طور الرسالہ مشن کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ **فالحمد لله علی ذلك۔**

۷۔ الرسالہ فورم بمبئی کی مختلف دعوتی سرگرمیوں میں سے تازہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے کتابوں کا مرہٹی زبان میں ترجمہ شائع کیا ہے۔ مثلاً مذہب اور جدید چیلنج، پیغمبر انقلاب

تعمیر ہند، وغیرہ۔ الرسالہ فورم بمبئی کا کنٹیکٹ نمبر یہ ہے: 4625201

۸۔ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی نے ۸ جولائی ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس کا موضوع اسلام اور امن تھا۔ گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ اسلام میں دفاع کے سوا کوئی اور جنگ جائز نہیں۔

۹۔ مسوری میں لال بہادر شاستری ایڈ منسٹریٹیو اکیڈمی کے تحت ۲۵ جولائی ۱۹۹۹ کو ایک انٹر فیتھ ڈائیلاگ ہوا۔ اس میں وہ لوگ شریک تھے جو آئی اے ایس کرنے کے بعد پروفیشنل ٹریننگ کے لئے یہاں آتے ہیں۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور اسلامی تعلیمات پر تقریر کی اور لوگوں کے سوالات کے جواب دئے۔ مزید تفصیل سفر نامہ کے تحت آئے گی۔

۱۰۔ ۱۳ اگست ۱۹۹۹ کو زی ٹی وی (نئی دہلی) کی ٹیم نے صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ یہ ہندستان کی مسلم خواتین کے بارے میں تھا۔ سوالات کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندستان کی مسلم خواتین سیاسی شعور کے اعتبار سے کس درجہ پر ہیں۔ کیا حال میں ان کے اندر کوئی نئی سیاسی بیداری آئی ہے۔ اور الیکشن ستمبر ۱۹۹۹ میں کیا وہ کوئی اہم رول ادا کریں گی۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ اسلام میں عورتوں کے لئے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے سیاسی سرگرمیوں میں شرکت کی اجازت ہے۔ اس لئے ہر دور میں مسلم خواتین اپنا یہ رول ادا کرتی رہی ہیں۔ موجودہ صدی کے آغاز میں مولانا محمد علی وغیرہ نے جب خلافت تحریک اٹھائی تو اس وقت سارے ہندستان میں یہ نغمہ گونج رہا تھا: بولیں اما محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو۔ تاہم مجھے امید نہیں کہ اگلے الکشن میں مسلم خواتین کوئی بڑا رول ادا کریں گی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پورا ملک، اقلیت اور اکثریت دونوں، سیاسی شعور میں ابھی بہت پیچھے ہے۔ ابھی ہمارے یہاں حقیقی جمہوریت نہیں آئی۔ ایسی حالت میں یہاں نہ مسلم خواتین سے کوئی بڑا رول متوقع ہے اور نہ غیر مسلم خواتین سے۔

Revised Subscription Rates of

Al-Risāla

(w.e.f. January 2000)

	Urdu	**English**
Single Copy	Rs. 10	Rs. 12
One year	Rs. 110	Rs. 70
Two years	Rs. 200	Rs. 135
Three years	Rs. 290	Rs. 200
Five years	Rs. 450	Rs. 300